سرما ۱۹۹۶

ترتیب : اجمل کمال

کراچی کی کہانی (۲)

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

شمارہ ۲۱: سرما ۱۹۹۶

جنوری ـ مارچ ۱۹۹۶

مینیجنگ ایڈیٹر

زینت حسام

اہتمام

آج کی کتابیں

بی ۱۴۰، سیکٹر ۱۱ بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی ۷۵۸۵۰

طباعت

ایجوکیشنل پریس

پاکستان چوک، کراچی

رابطے کے لیے پتا:

اے ۱۶، سفاری ہائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

فون: ۸۱۱۳۴۷۴

ای میل: aaj@biruni.erum.com.pk

بیرونِ ملک خریداری کے لیے پتا:

محمد عمر میمن

۵۴۱۷، ریجنٹ اسٹریٹ، میڈیسن، وسکانسن ۵۳۷۰۵، یو ایس اے

کراچی کی کہانی (۲)

فہمیدہ ریاض

۷

کراچی

اختر حمید خاں

۹۲

جینے کا ہُنر

آصف فرخی

۱۱۴

اس شہر میں رہنا

محمد حنیف

۱۴۵

ایک اخبار نویس کا کراچی

Scanned with CamScanner

زینت حسام

۱۵۱

گزرے دن، گزرتے دن

بنجمن انتھونی　شریف سوز

لیاقت منوّر　بیکسٹر بھٹی　نسرین اسٹیفن

آصف شہباز　محبوب جان

۱۸۶

عیسیٰ نگری کی زبانی تاریخ

تسنیم صدیقی

۲۲۹

کچی آبادیاں کیوں؟

عارف حسن

۲۳۸

سہراب گوٹھ کا انہدام

Scanned with CamScanner

کینتھ فرنانڈیز

۲۴۶

بے دخلی اور بے گھری

یان فانڈرلنڈن

۲۵۸

دلال آباد

عارف حسن

۲۷۳

شہری بدانتظامی اور تشدد

اکبر زیدی

۲۸۹

سندھی بمقابلہ مہاجر

تضادات، ٹکراؤ اور سمجھوتا

Scanned with CamScanner

مارک ٹلی

۳۰۹

چھوٹے ہتھیار

عارف حسن

۳۲۷

کراچی کی صورتِ حال ــــ تناظر اور تجزیہ

***

ضمیمہ ۱

۳۸۰

کراچی ــــ چند اہم حقائق

ضمیمہ ۲

۳۹۸

کتابیات

Scanned with CamScanner

فہمیدہ ریاض

کراچی

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

Scanned with CamScanner

میرا وطن ملیر

وقت کے جادو گھر میں تحلیل ہوتی صدی کے آخری برسوں، اس برس کے آخری مہینے، اس مہینے کے آخری دنوں کی بات ہے۔

بحیرۂ عرب کے ساحل پر آباد، تیسری دنیا کے ایک غریب، بین الاقوامی مالی اداروں سے مستقل امداد خواہ ریاست کے ایک عظیم الجثہ شہر کے نو تعمیر اور شان دار ہوائی اڈے سے ایک جہاز علی الصباح، منہ اندھیرے پرواز کرنے والا ہے۔

اس میں بیٹھی ہوئی ایک عورت نے کس کر حفاظتی پیٹی باندھ رکھی ہے۔ اس کے بغیر، اسے یقین ہے کہ وہ اپنی سیٹ ہی سے نہیں بلکہ جہاز سے بھی نیچے گر پڑے گی، اور شاید اس گول کرۂ ارض سے پھسلتی ہوئی، زمین کی گرفت پکڑنے میں ناکام، کہیں خلا میں گم ہو جائے گی۔

برطانیہ جانے والی اس پرواز میں، جو آدھے گھنٹے کے لیے دوبئی میں رکے گی، بہت کم مسافر ہیں۔ عورت اپنے دفتر سے پندرہ دن کی چھٹی لے کر مہینا بھر برطانیہ میں رہنے کی غرض سے جا رہی ہے۔ (چھٹی بڑھانے کی درخواست، بہ سبب علالت، وہ برطانیہ سے بھجوا دے گی۔)

وطن چھوڑتے ہوئے وہ کافی خوش ہو رہی ہے۔ شہر میں کئی برس سے بدامنی پھیلی ہے۔ فائرنگ ہوتی ہے اور لوگ مارے جاتے ہیں۔ چوریاں، ڈاکے، اغوا، غرض تمام پرتشدد جرائم یا واقعات اکتا دینے والی یکسانیت سے مسلسل ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ کبھی ان کی رفتار تیز اور کبھی سست ہو جاتی ہے۔ چند دنوں سے قتل کی وارداتوں میں تیزی آ گئی تھی۔ ہر روز اوسطاً سات آٹھ لوگ مارے جا رہے تھے۔ اس لیے وہ تشدد اور قتل و غارت گری کے شعلوں میں جھلستا ہوا شہر چھوڑ کر کچھ دنوں کے لیے تازہ ہوا کھانے کے خیال سے بہت خوش تھی؛ اس بات پر تو اور بھی خوش کہ جہاز کا رخ مغرب کی طرف تھا۔ "گڈ اولڈ لنڈن!" اس نے بخوشی ایک گھسا پٹا جملہ دُہرایا (منہ میرا کعبے شریف کی طرف، اللہ اکبر) اور لندن جانے کی نیت باندھ لی۔

زمین پر تیزی سے دوڑتا جہاز اب ہوا میں بلند ہو چکا تھا۔ نیچے شہر تھا، جو اس کی نظروں کے سامنے تیزی سے آڑا ترچھا ہو رہا تھا۔ گڑیا گھروں کی طرح چھوٹے پڑتے مکانوں، فیتوں میں بدلتی سڑکوں، کھجوروں کے مور پنکھوں اور ترچھے ساحلِ سمندر کو کھڑکی کے شیشے سے بغور دیکھتے ہوئے، جن پر دسمبر کے کمزور سورج کی پہلی کرنیں دمک رہی تھیں، عورت نے آنکھوں میں گرم پانی آتا محسوس کیا۔ اس نے شہر سے محبت اور سینے میں لاحاصل محبت کی شدید تکلیف محسوس کی، گویا کوئی تیز دھار چیز سینے میں پیوست ہو اور کوئی ان دیکھا ہاتھ اسے نکالنے کی کوشش کرتا ہو۔ مگر یہ کیفیت ایک دو منٹ سے زیادہ نہیں رہی۔ گرم آنسو اس کی آنکھوں میں خشک ہو گئے۔ اس کا دھیان کہیں اور لگ گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ انگلینڈ پہنچ کر کیا کیا کرے گی۔ اسے لینے کون آیا ہو گا، اور دیگر یہ کہ اب چائے ملنی چاہیے۔

عورت کھڑکی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ کی دو نشستوں پر ایر ہوسٹس نے نہ جانے کیوں (اتنی بہت سی خالی سیٹیں چھوڑ کر صرف اسی کے ساتھ کیوں؟) دو مسافر بٹھا دیے تھے جو کسی اور پرواز سے کراچی آئے تھے۔ ان میں سے ایک بڑے اشتیاق سے جھانک جھانک کر کھڑکی کے نیچے دور کہیں ڈگمگاتے شہر کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"وہ نیچے لانڈھی نظر آ رہا ہے کیا...؟" دبلے پتلے مسافر نے بڑے اشتیاق سے انگلی کا اشارہ کر کے پوچھا۔

عورت چکرا گئی۔ اتنی بلندی سے وہ لانڈھی کو کیسے پہچان سکتی تھی۔

"نہیں تو... پتا نہیں..." اس نے کہا۔ پھر ایک نظر اپنے ہم سفروں پر ڈال کر سوچا کہ کیا وہ لانڈھی سے آئے ہوں گے۔ عورت نے آنکھیں موند لیں۔ اچانک اسے خیال آیا۔ لانڈھی کا کیا مطلب ہے؟ اس نے سوچا کہ وہاں اب رہنے والے یہ بات مشکل سے جانتے ہوں گے کہ سندھی زبان میں لانڈھی کا مطلب کوئی صاف ستھرا، آرام دہ جھونپڑا ہے جو گاؤں کے راستے میں مسافروں کے آرام کرنے کے لیے بنایا گیا ہو۔ شاید، اس نے سوچا، صدی بھی پہلے، اس علاقے میں ایسی کوئی گھاس پھوس کی کٹیا ہو جہاں مسافر پل بھر آرام کرتے ہوں۔ اس نے ایک پرسکون راستے کا تصور کیا جہاں دو رویہ کھجوریں کھڑی ہوں اور جھاڑیوں میں کالے تیتر بولتے ہوں۔

لانڈھی —۔ اب شہر کا ایک خطرناک علاقہ، گولیوں کی بوچھاڑوں سے دھواں دھار۔

دور ہوتا گیا کراچی، مقتولوں کے خون سے جا بجا شرابور، وارداتوں کی کثرت اور اسرار پر بھونچکا۔

وہ حفاظتی پیٹی کو تھوڑا سا ڈھیلا کر کے، کرسی کی پشت پیچھے کھسکا کر، آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی دیر کے لیے سو جانے کی کوشش کرنے لگی۔

آنکھیں بند کیے کیے عورت نے تصور کیا — نہ جانے کیوں یہ خیال اس کے ذہن میں آیا، شاید اس لیے کہ شہر کی حالت واقعی بہت خراب تھی — گویا کوئی اس سے سوال کر رہا ہو:

"بھئی کراچی میں دراصل ہو کیا رہا ہے؟"

یہ ایسا سوال تھا جو دراصل اس سے کوئی نہ پوچھتا۔ اس شہر کے بارے میں لوگ سوال نہیں پوچھتے تھے بلکہ صرف تبصرہ کرتے تھے: کراچی کی تو حالت اتنی خراب ہے، وغیرہ۔ مگر عورت کے تصور نے اس سے من چاہا سوال پوچھ لیا۔ (پورا تصور یہ تھا گویا کوئی اس سے انٹرویو لے رہا ہے۔)

عورت تصور میں اپنے تئیں ایک نہایت اہم اور معتبر شخصیت محسوس کرتے ہوئے مفصّل جواب دینے کی کوشش کرنے لگی۔ دماغ پر زور ڈالتے ہوئے اس نے سنبھل سنبھل کر کہنا شروع کیا:

"دراصل یہ ایک پیچیدہ صورتِ حال ہے۔ ایک سطح پر تو... کہا جاتا ہے کہ یہ ایجنسیوں کی لڑائی ہے..."

"کیسی ایجنسیاں؟" اس کے چوکنے تصور نے سوال کیا، کیوں کہ حال ہی میں امریکہ سے آئی ایک

Scanned with CamScanner

پاکستانی لڑکی نے حیرت زدہ ہو کر اسے بتایا تھا کہ وہ ایجنسیوں کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہے، دیگر یہ کہ اس کے اپنے باپ کی ایک اسٹیٹ ایجنسی تھی۔ لہذا عورت نے بلاتامل وضاحت کی:

"بھئی خفیہ ایجنسیاں... جن کے ایجنٹ ہوتے ہیں..."

"جیسے؟" انٹرویو کرنے والے نے دل چسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

وہ کچھ گڑبڑا گئی۔ ایجنسیوں کو حروف تہجی سے یاد کیا جاتا ہے اور وہ ہمیشہ انھیں گڈمڈ کر دیتی تھی۔ پھر بھی اس نے ہمت کر کے، حواس مجتمع رکھتے ہوئے (کیوں کہ وہ انٹرویو لینے والے پر اپنی حماقت زدگی اور کم علمی کو کسی قیمت پر فاش نہیں کر سکتی تھی) گننا شروع کیا:

"بھئی بہت سی ایجنسیاں لڑ رہی ہیں... سی آئی اے ہے، آئی بی ہے، آئی ایس آئی ہے..." پھر کچھ جھجک کر اس نے اضافہ کیا، "سی آئی ڈی ہے..." حالاں کہ یہ سوچ کر اسے شرمندگی ہو رہی تھی کہ اس قدیم ادارے کو کہیں برسوں پہلے ختم ہی نہ کر دیا گیا ہو۔

"اس کے علاوہ..." اس نے کہا، "ایم کیو ایم کے دو متحارب گروہ ہیں۔ پھر شیعہ اور سنی، سیاسی اور نیم سیاسی جماعتیں ہیں۔ اور پھر..." وہ کچھ رک گئی، اس احساس کے ساتھ کہ بات پوری نہیں ہوئی۔ پھر اس نے کہا: "پھر پولیس ہے، رینجرز ہیں، شہری ہیں... اور... اور امریکی ایجنٹ ہیں، ہندوستانی ایجنٹ ہیں، افغان ایجنٹ ہیں... تو یہ سب... یعنی کہ... لڑ رہے ہیں..."

انٹرویو لینے والے نے قہقہہ لگایا۔ عورت ہنس رہی تھی۔ خود ہی تو لے رہی تھی وہ اپنا انٹرویو۔

"لاحول ولاقوۃ،" اس نے کہا، "کیا بکواس کر رہی ہوں میں!"

"تو پھر، کراچی میں ہو کیا رہا ہے؟"

"واللہ اعلم!" عورت نے سر کھجایا۔ پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا: "فائرنگ ہو رہی ہے۔ روز کتنے ہی لوگ مارے جاتے ہیں، دس بارہ، دس بارہ، ہر روز..."

اسے اپنے پڑوس کی مسجد پر حملہ یاد آیا۔

روانگی سے دو دن پہلے اس کے محلے کی مسجد میں اکٹھے آٹھ آدمیوں کو مارا گیا تھا۔ مرنے والے کہا جاتا تھا سپاہِ صحابہ کے تھے۔ کیا مارنے والے یقیناً شیعہ رہے ہوں گے؟ اس سے پہلے شیعوں سے بھری بس میں بم پھٹا تھا۔ اخباروں میں روزانہ مرنے والوں کی تصویریں چھپتی تھیں اور حالاں کہ شہر کے لوگ مدت مدید سے ان اموات میں دل چسپی کھو بیٹھے تھے، پھر بھی کوئی کوئی شخص (مثلاً یہ عورت ہی) شہر کے معنے کو سمجھنے کی کوشش میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا کہ مرنے والوں کا تعلق کس فرقے یا سیاسی جماعت یا لسانی گروہ سے ہے۔ بعض اوقات خبریں اس طرح ہوتیں:

"مرنے والوں میں دو ایم کیو ایم کے کارکن، ایک ایم کیو ایم حقیقی کا کارکن، تین شیعہ اور دو سنی ہیں۔

پڑھنے والے اس گورکھ دھندے کو حل کرتے۔ یہ بات ناقابلِ یقین تھی کہ شہر میں مدت سے بھی

سب کچھ ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ ہلاک کرنے والے افراد نہ صرف ایم کیو ایم کے خلاف ہیں بلکہ حقیقیوں، شیعوں اور سنّیوں کے بھی جانی دشمن ہیں۔ پھر وہ کھی کھی کر کے ہنستی: "ارے نہیں بھئی... آپس میں ایک دوسرے کو مار رہے ہیں لوگ!"

کبھی لڑکپن میں وہ شمع معمّے حل کیا کرتی تھی۔ یہ سب سے پہلے معمّے تھے جن پر ہزاروں روپوں کے انعام ملتے تھے۔ اُس زمانے میں ہزاروں روپے بڑی بات ہوتے تھے۔ حروف تہجی کے الفاظ خانوں میں بھرنے ہوتے تھے۔ "شمع" نامی رسالہ نئی دہلی سے نکلتا تھا اور پاکستان میں بکتا تھا۔ جس صفحے پر معمّا شائع ہوتا تھا اس کی پشت پر صحیح حل کے لیے کچھ "سجھاؤ" درج ہوتے تھے؛ ان کا دل چسپ اور خیال انگیز عنوان ہوتا تھا، "اشارے۔"

کراچی میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ بھی اب معمّا تھا۔ یوں ہی دل بستگی کے لیے لوگ اخباروں میں "اشارے" ڈھونڈتے، جب کہ صحیح حل پر کوئی انعام ملنے والا نہ تھا۔ بلکہ شاید صحیح حل کوئی تھا ہی نہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ یہ بلاحل معمّا ہو جسے صرف بےوقوف بنانے کے لیے پیش کر دیا گیا ہو۔ لوگ برسوں دماغ پچی کرتے رہیں اور پھر پتا چلے... اوہو! ہمیں یوں ہی الو بنایا گیا۔

تھوڑی دیر میں فضائی میزبان چائے لے آتی ہے۔ ایک ٹرالی پر اخبار بھی ہیں۔ لڑکی اسے اخبار پیش کرتی ہے۔ خوشی سے تقریباً کپکپاتے ہوئے عورت نے اخبار لینے سے انکار کر دیا۔ وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ وہ پہلے سے جانتی تھی اخبار میں کیا لکھا ہو گا (وہی دو شیعہ، ایک ایم کیو ایم، شاید ڈیڑھ حقیقی، وغیرہ)، بلکہ اس لیے کہ اب وہ جاننا ہی نہیں چاہتی تھی، کم از کم مہینے بھر تو نہیں۔ ارے بھئی وہ باہر جا رہی ہے... کوئی یوں ہی تو نہیں، اس اکتا دینے والے مسلسل تشدد سے بچ کر ہی تو وہ جا رہی ہے... بلکہ (اس نے تفاخر اور تحقیر کی لہر میں ناک اٹھا کر سوچا) وہ جا چکی ہے۔ یہ بات اب ماضی بعید کی ہوئی کہ وہ کراچی میں تھی۔ اخبار کے بدلے وہ فضائی کمپنی کے رسالے میں "کم سن مسافروں کے لیے" کے عنوان سے چھپے بندروں اور طوطوں پر لکھے باتصویر مضامین پڑھنے لگی۔ مضمون بےحد معلوماتی تھے اور تصویریں بہت دلکش تھیں۔ چند ہی لمحوں میں وہ ان میں کھو کر رہ گئی اور سوچنے لگی کہ دوبئی اترنے پر محصول معاف دکان سے وہ اپنی نواسی کے لیے مخمل کا بندر خریدے گی، کرسمس کا تحفہ!

وہ کرسمس کا دن تھا۔ اس کی بیٹی، داماد اور نواسی اس جگمگاتے دن اسے لینے ہوائی اڈے پر آئے ہوں گے۔ "فادر کرسمس کے بدلے مدر کرسمس آ رہی ہیں!" اس کی بیٹی نے دور دراز ٹیلی فون پر خوشی سے چیخیں مارتے ہوئے کہا تھا۔ عورت خوشی سے مسکرانے لگی۔ دور کہیں، اجنبی دیس کے ہوائی اڈے پر، خوشی اس کا انتظار کر رہی تھی؛ ایک سجے ہوئے شہر میں، جیسے اسے اس کی آمد کے لیے خاص طور پر سجایا گیا ہو۔ اس وقت وہ ہرگز نہیں جاننا چاہتی کہ کل کراچی میں کون کون مارا گیا، لانڈھی میں اور ملیر میں...

ملیر تو وہ خود گئی تھی۔ حیرت! حیرت! وہ ملیر کیوں کر جا پہنچی؟

Scanned with CamScanner

مقتول کے گھر تعزیت کے واسطے، جب کہ لاش ہسپتال سے لائی جا رہی تھی۔

اُن دنوں دو تین روز سے قتل کی وارداتوں میں تیزی تھی۔ اچانک ایک صبح اسے خبر ملی کہ جس دفتر میں وہ بیٹھتی تھی وہاں کام کرنے والا ایک کلرک مارا گیا ہے۔ کون تھا وہ؟ اسے اس کی صورت بھی یاد نہ آئی تھی۔ یہ خبر اس نے ٹیلی فون پر سنی تھی، اور اس کی عجیب تفصیلات۔

سرکاری دفتروں میں کام کرنے والے کم گریڈ کے زیادہ تر ملازم دفتری اوقات کے بعد، مہنگائی کے زمانے میں کسی طرح پورت کرنے کے لیے، کوئی اور بھی کام کرتے ہیں۔ یہ کلرک بھی ــــ جس کو زید، بکر یا عمر کہیے ــــ دفتر کے بعد نمکو بیچتا تھا۔ تلی ہوئی دالیں، مرمرے، سیو، پاپڑ، نمک پارے وغیرہ وہ پلاسٹک کی تھیلیوں میں اسٹیپل کے دھتیلے تار کے دانت کے بند کر کے (تاکہ وہ ہوا اور نمی سے محفوظ رہیں) اپنی موٹر سائیکل پر لوگوں کے گھروں اور دکانوں میں پہنچایا کرتا تھا۔

واردات والے دن (مگر واردات والا تو ہر دن تھا! یعنی جس روز اُس کے ساتھ واردات ہوئی) زید، بکر یا عمر گھر نہیں پہنچا تھا۔ گھر والوں نے بہت دیر تک، یعنی اگلی صبح تک، انتظار کیا۔ جب وہ صبح تک گھر نہ پہنچا اور آسمان پر [illegible] اور سیاہ ڈو[illegible] نمودار ہو گیا، اور پھر وہ بھی پگھل گیا اور سورج مشرق سے جھما جھم طلوع ہو گیا، اور چڑیوں نے پچھواڑے میں اگے امرود اور کیلے کے تین پیڑوں میں گانا اور چہچہانا بھی ختم کر دیا اور ان کے بدلے کراچی کے آسمان کی وہی شناسا چیلیں اور کوے چکر کاٹتے قسائی کی دکان کا رخ کرنے لگے جہاں دکان کے باہر پڑے چھیچھڑوں پر بلیوں سے لڑتی ہوئی چیلیں اپنے حصے پر جھپٹے مارتی ہیں، اور روشنی میں سب کچھ صاف نظر آنے لگا تو زید، بکر یا عمر کی بیوی نے پوری طرح دہل کر ملگجے، ملے دلے بستر پر سوتے دیور یا جیٹھ کو جگایا اور کہا:

"وہ نہیں آئے۔"

گھر والوں نے دفتر کھلنے کا انتظار کیا۔ ان کے گھر میں ٹیلی فون نہیں تھا۔ انھوں نے باہر کسی دکان سے دفتر فون کیا۔ انھوں نے استفسار کیا کہ کیا بات ہے، وہ دفتر سے گزشتہ رات گھر کیوں نہیں پہنچا؟ دفتر والوں نے حیرت اور پریشانی کے عالم میں بتایا کہ وہ تو دفتر کے وقت کے بعد سب لوگوں کے ساتھ گھر چلا گیا تھا۔ پھر کچھ توقف کے بعد انھوں نے مشورہ دیا کہ بھائی، حالات کچھ اچھے تو ہیں نہیں، خدا کرے سب خیریت ہی ہو، مگر آپ لوگ ذرا کسی ہسپتال میں بھی معلوم کر لیجیے۔ گھر والوں اور عزیز و اقارب نے ہسپتالوں سے رجوع کیا۔ دس بجتے بجتے ایک ہسپتال میں زید، بکر یا عمر کی لاش کی شناخت ہو گئی، اور یہ خبر بارہ بجے نکلنے والے اخباروں کے دفتروں میں بھی پہنچ گئی۔ وہیں سے کسی نے ٹیلی فون پر اسے بتایا تھا کہ اس کے دفتر کا ایک آدمی بھی کل رات...

بے تابی سے اس نے اپنے دفتر فون کیا تھا۔ وہاں اسے مزید تفصیلات بتائی گئی تھیں۔ یہ سب سن کر عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ وہ اس قدر کیوں رو رہی ہے۔ بہر صورت وہ روتی دھوتی دفتر چل دی تھی۔

دفتر کا نچلا اسٹاف تجہیز اور تکفین کے لیے بسوں میں ملیر جا چکا تھا۔ صرف ڈائرکٹر اور ان کے نائب بیٹھے تھے۔ وہ منتظر تھے کہ ہسپتال سے پوسٹ مارٹم کے بعد لاش گھر آ جائے اور جنازہ اٹھنے والا ہو تو پھر وہ بھی ملیر جائیں۔ ملیر ــــ جو پہلے شہر کے مضافات میں تھا۔

ملیر جاتے ہوئے وہ سڑک پر رواں ٹریفک کو دیکھتی رہی۔ یہ رکشا والے اور ٹیکسی ڈرائیور، اور اپنی گاڑیوں میں جاتے ہوئے لوگ، یہ سب جیسے کسی جنازے میں جا رہے تھے۔ ان کے چہرے سختی سے الم میں منجمد تھے۔ راستے میں اسے اور تفصیلات معلوم ہوئیں۔ لاش علی الصباح ہسپتال لائی گئی تھی۔ واردات شام کو ہوئی تھی جب زید، بکر یا عمر نمکو تقسیم کر کے گھر واپس جا رہا تھا۔ رات بھر لاش سڑک کے کنارے پڑی رہی تھی۔

راستے میں اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے ہم سفر ڈائرکٹر سے کہا، "فلاں بھائی..." (جیسا کہ اس کے شہر کا قاعدہ تھا ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کا، جسے اس نے غیر شعوری طور پر اپنا لیا تھا)، "آپ کو یاد ہے کئی برس پہلے... یہاں ملیر میں... ایک صاحب کے گھر ادبی محفل ہوتی تھی..." اس نے ٹوٹتے ہوئے جملوں میں کہا۔ یاد میں ایک چھوٹے سے گھر کا ایک نیم تاریک کمرہ بجلی کے پیلے، مدھم بلب سے روشن ہو گیا۔ فرش پر بچھی دری، اس پر سٹ کر بیٹھے ہوئے لوگ۔ نظم یا افسانہ پڑھنے والے۔ سننے والوں کے تبصرے۔ اسے یاد آیا، کتنی کتنی دور سے جاتے تھے لوگ وہاں۔ وہ خود کتنی دور سے گئی تھی۔ تب دھوراجی کالونی میں رہتی تھی وہ۔ ڈائرکٹر صاحب ذرا دیر خاموش رہے۔ پھر ان کی ٹوٹی ہوئی سی آواز آئی۔

"ہاں صاحب، خوب یاد ہے۔ میں خود وہاں جاتا تھا۔"

"پھر ان صاحب کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ محفلیں ختم ہو گئی تھیں،" عورت نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ آخری بار اس گھر میں وہ سب تعزیت کرنے گئے تھے۔

"نہیں، ختم تو نہیں ہوئی تھیں۔ ان کی بیوی نے جاری رکھی تھیں،" ڈائرکٹر صاحب نے کہا۔

کامریڈ تھے وہ صاحب، اسے مدھم سا یاد آیا۔ یہ ایک سوشلسٹوں کا حلقہ تھا۔ لینن اور مارکس کے نظریات پر وہاں طویل بحثیں چلتی تھیں۔

ایک موڑ کاٹ کر گاڑی ملیر میں داخل ہو گئی۔

علاقے میں مرگھٹ کا سا سناٹا تھا۔ اکا دکا دکانوں کے سوا تمام دکانیں بند تھیں۔ ڈرائیور فیصلہ نہ کر پا رہا تھا کہ آگے جائے یا نہیں۔ یہ ایک فساد زدہ علاقہ معلوم ہو رہا تھا۔ سڑک پر ایک آدھ جگہ لوگ گچھا سا بنائے کھڑے تھے۔ وہ ان کی آنکھوں کو مشکوک نظر آ رہے تھے اور خود انھیں شک بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

تبھی انھیں سامنے سے ایک کھٹارا بس آتی نظر آئی جس میں چند مسافر بھی تھے۔ بس اسٹاپ پر نہ جانے کہاں سے ایک عورت آ کھڑی ہوئی۔ سڑک پر عورت: امن کے آثار! انھوں نے ہمت کر کے آگے جانے کی ٹھانی۔

لاش ہسپتال سے یا تو آچکی تھی یا وہاں سے روانہ کر دی گئی تھی، اُسے ٹھیک سے پتا نہ چل سکا کیوں کہ اسے گھر کے اندر عورتوں کی طرف بھیج دیا گیا۔ چھوٹی سی کچی انگنائی پار کر کے گھر تھا، عورتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا۔ پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی عورتیں۔ کسی نے اشارے سے اسے بتایا: ''یہ ان کی اماں اور وہ بیوی ہیں۔''

بیوی تیس کے پیٹے میں رہی ہو گی۔ روتے روتے نڈھال، لانبی اور چھریری۔ اس کی ناک میں کیل چمک رہی تھی۔ موٹی ململ کا گلابی دوپٹا، ٹانگوں میں سفید لٹھے کا پہناوا، چست پاجامے کی کفایتی شکل جو گھٹنا کھلاتی ہے۔ ارے واہ! اس نے دل میں سوچ کر حیرت کی۔ یہ تو بالکل سونی پت یا ریواڑی کے کسی مسلمان محلے سے نکلی تصویر لگ رہی ہے، مومیائی ہوئی۔ پچاس برس میں ان گھروں کی اندرونی حالت جوں کی توں رہی کیا؟ مگر نہیں، یہاں پہلے گھر تھے کہاں؛ جھگیاں ہی جھگیاں تھیں چند دہائیوں پہلے تک۔ اور اب ہر طرف پکے گھر کھڑے تھے۔ راستے میں وہ یہی تبصرہ کرتے آئے تھے، اس کچی آبادی پر جو اَب کھوکھراپار تک جا پہنچی تھی۔

کھوکھراپار ـــــ ہجرت کی سرحد!

بیوی نے ہاتھ اٹھایا۔ کلائی میں کانچ کی چوڑیاں چھنکیں۔ اس کے زانو پر اسی چھرے مہرے کی تیرہ چودہ سالہ لڑکی سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ یہ زید، بکر یا عمر کی بیٹی تھی۔ دو چھوٹے بچے وہیں کہیں دوسرے بچوں میں رُل کھُل رہے تھے۔ اب یہاں تک پہنچ کر عورت کو بالکل رونا دونا نہیں آ رہا تھا۔ اس نے چبا چبا کر تعزیتی جملے بھی کہہ دیے تھے۔ یہاں اسے رونا چاہیے، اس نے سوچا۔ اس قدر رقت انگیز سین ہے، اور اسے رونا نہیں آ رہا۔ وہ غور کر رہی تھی کہ مجمعے میں لوگ زیادہ تر اس بات پر زور دے رہے تھے کہ زید، بکر یا عمر کا تعلق کسی سیاسی جماعت یا دھڑے سے نہیں تھا۔ باہر نکلنے پر معلوم ہوا کہ مردوں میں بھی یہی باتیں ہوئی تھیں۔ لوگوں کی ملی جلی رائے یہ بن رہی تھی کہ زید، بکر یا عمر دراصل اُس روز نمکو والوں سے وصولی کر کے آ رہا تھا۔ ڈاکوؤں نے اس پر حملہ کیا اور پیسے لے کر فرار ہو گئے۔ اس قتل کے پیچھے کوئی دوسرا مقصد نہیں تھا۔

واپسی میں اس کے ہم سفر ڈائرکٹر صاحب نے بھی یہی رائے ظاہر کی تھی۔ ''کچھ نہیں صاحب، محض غنڈا گردی کی کارروائی ہے، پیسوں کے لیے۔''

تعجب اس پر تھا کہ یہ بات سب کے لیے باعثِ اطمینان کیوں تھی۔ دیگر یہ کہ اس بات پر مقتول کے عزیز اتنے مصر کیوں تھے اور اس قدر جلد بازی سے، جب کہ ابھی جنازہ ٹھنڈا بھی نہیں ہوا تھا، شرکائے جنازہ کو کیوں یقین دلانا چاہ رہے تھے کہ اس قتل کے پیچھے کوئی دوسرا مقصد نہیں تھا۔

خیر، اس نے سوچا، یہ تو سمجھ میں *نے والی بات ہے۔ مقتول کے عزیز واقارب ڈرتے ہوں گے۔ اگر کسی پر قتل کا الزام آتا ہے تو انتقامی کارروائی میں دوسروں کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ لیکن جنازے میں شریک معتبر، بااثر، اعلیٰ افسر قسم کے لوگ اس بات پر کیوں مطمئن نظر آ رہے تھے کہ یہ

Scanned with CamScanner

محض غنڈا گردی ہے، اور اس قتل کا اس شہر کے تار و پود میں پڑی سیاسی گرہ سے کوئی تعلق نہیں؟

اس بات میں عجیب سا اطمینان تھا۔ نہیں صاحب، محض غنڈا گردی ہے! سارا زور "محض" پر تھا۔

کیوں؟

دوسری صورت میں سیاسی الجھاؤ اور اس کے ممکنہ حل کو فوکس میں لانا ناگزیر ہو جاتا تھا، اس لیے اس منطق پر قدم بہ قدم چلا جائے کہ:

(۱) اس قتل کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں،

(۲) کسی قتل کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں،

(۳) ہم جو کوئی سیاسی رائے نہیں رکھتے، اور اس کا اظہار کرنے سے بھی اب پرہیز کرنے لگے ہیں تو ہم خصی نہیں ہو گئے،

(۴) اس قتل میں، یا کسی بھی قتل میں، ہماری کوئی ذمے داری نہیں۔

ایک محلّے والا اسفاکی اور عیاری سے مسکراتا ہوا ان کی طرف بڑھا اور رازداری سے گویا ہوا:

"خوب صاحب، پیسوں کے لیے قتل کیوں کر ہوا ہو گا؟ جیب میں اس کی تین چار سو روپوں سے زیادہ رقم نہ تھی۔ گولی بہت قریب سے ماری گئی ہے۔ قمیص کی جیب کے پاس خون کا معمولی سا داغ ہے۔ یہ تو..." اس نے سرگوشی میں کہا، "کوئی اور ہی معاملہ لگتا ہے۔"

کیا یہ بدبخت اس قتل کو سیاسی ثابت کرنا چاہتا ہے؟ آنے والوں نے سنسنا کر سوچا تھا۔ خوف زدہ آنکھوں سے انھوں نے متحارب گروہوں کے اس گڑھ میں فاصلوں پر کھڑے لوگوں کے مشکوک گچھوں کو دیکھا تھا اور سرعت سے کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے تھے۔

راستے میں انھوں نے اس بات پر غور کیا تھا کہ زید، بکر یا عمر کیوں کر گولی کھا کر مرا۔ کئی امکانات تھے: (۱) کہ یہ محض ایک ڈاکے جمع قتل کی واردات تھی؛ (۲) کہ وہ ایم کیو ایم کا تھا اور حقیقی والوں نے قتل کر دیا؛ (۳) کہ وہ حقیقی والوں کا تھا اور ایم کیو ایم نے مار دیا؛ (۴) شیعہ تھا، سنیوں نے قتل کر دیا؛ (۵) سنّی تھا، شیعوں نے مار دیا؛ (۶) حالات خراب کرنے کے لیے بغیر نشانہ لیے چلائی گئی گولیوں کی زد میں یوں ہی آ گیا۔

زید، بکر یا عمر کو کس نے قتل کیا؟

اچانک آسمان پر بادل چھا گئے۔ عورت نے سندھ کے شاعر شاہ لطیف کی ایک نظم یاد کی جو انھوں نے کراچی پر لکھی تھی۔ کیا تب بھی "کراچی" تھا؟ ہاں، تب بھی تھا۔ ایک چھوٹا سا مچھیروں کا گوٹھ، کلاچی۔ وہاں ایک مچھیرا اپنے بھائیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ دن بھر سمندر میں مچھلیاں پکڑتے اور شام پڑے گھر لوٹتے۔ کہیں سے سمندر میں ایک مگرمچھ آ نکلا۔ اور پھر ایک دن وہ مچھیرا گھا تو گھر نہ لوٹا۔ یہی نظم تھی۔

Scanned with CamScanner

گھا تو گھر نہیں آیا
شام پڑ گئی اور پھر رات
گھا تو گھر نہیں آیا

کار کے بونیٹ پر ٹپ ٹپ بوندیں گرنے لگیں۔

***

مسئلے کا حل

"سیاسی مسئلہ حل کرنا ضروری نہیں ہوتا،" فلائٹ پی کے سات چار پانچ میں بیٹھی عورت نے ذاتی، تقریباً نجی مشاہدوں پر مبنی ایک نجی، سنہرا نتیجہ اخذ کیا۔ "مسئلے کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو کچھ عرصے بعد، آکسیجن کی کمی کے باعث، وہ مر جاتا ہے۔ پھر اس کی لاش گلنے سڑنے لگتی ہے۔ بدبو پھیلتی ہے۔ کیڑے مکوڑے گلا سڑا گوشت کھانے آ نکلتے ہیں۔ غرض جب تک مسئلہ خاک میں ملے، خوب گند پھیلاتا ہے۔"

وہ اس نادر و نایاب نظری تشکیل پر خوش ہونے کی کوشش کرنے لگی، شہر میں ہر روز پابندی سے گرتی لاشیں یاد کر کے، جو اس شہر میں رہنے والوں کے وجودی نظاموں میں گرتی رہی تھیں؛ انتظامیہ تمام آثار و شواہد کے مطابق معدوم ہو چکی تھی، اور چند دنوں میں محسوس ہونے لگا تھا کہ کراچی کو اس کے اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے، جب کہ قتل و غارت گری کی قوتیں بلا جھجک یا روک ٹوک ہر طرف منڈلا رہی تھیں۔

اس شہر کی (ایک حد تک پوری ریاست کی) آبادی پر ٹھونسی ہوئی بے عملی (در حقیقت بے بسی) کی پھنک میں عورت نے اس طرح کی کئی سنہری عمرانی نظری تشکیلات پلو میں باندھ لی ہیں جن پر وہ گاہے بگاہے خوش ہونے کی کوشش کر سکتی ہے۔ مثلاً یہ کہ سیاسی تنظیمیں مار کھانے سے ختم نہیں ہوتیں۔ اگر طویل عرصے تک کوئی سیاسی جماعت کچلی جاتی رہے (بقول سندھیوں کے، "موچڑوں میں رہے") تو وہ مرتی نہیں بلکہ لولی لنگڑی، اندھی کانی یا گونگی بہری ہو جاتی ہے۔ پھر جب طاقت ور عناصر اسے اپنے کام میں لانا چاہیں تو وہ لکڑی کی ٹانگ یا کانچ کی آنکھ لگائے، پھدکتی ہوئی، میدانِ عمل میں آتی ہے۔ وہ پہلے جیسی باقی نہیں رہی ہوتی۔ دیکھنے والے کچھ ہی عرصے میں سمجھ جاتے ہیں کہ یہ اب اپنا ہی ایک نوحہ ہے، اپنے ماضی کا ایک مسخ خاکہ۔ پھر آپ اگر اسے حکمران بھی بنا دیں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس کی اصل طاقت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ حکمران بن کر تو اور بھی بے ضرر ہو جاتی ہے۔

Scanned with CamScanner

موچڑوں کی یاد اس کے حیاتیاتی خلیوں میں سرایت کر چکی ہوتی ہے۔ متوقع جھانپڑ سے بچنے کے لیے وہ ہمیشہ کہنیوں سے منہ ڈھانپ کر بات کرتی ہے۔ متواتر مار کھانے کے بعد آپ اسے الزام نہیں دے سکتے۔ وہ جنات یا آسمانی طاقت سے بہرہ ور پہلوانوں کا گروہ نہیں تھا، محض فانی، اور انسانی کمزوریاں رکھنے والے لوگوں کی ایک سیاسی جماعت ہی تو تھی۔

ہوائی میزبان ان کے لیے ناشتہ لائی۔ عورت کا خیالی انٹرویو ادھورا رہ گیا۔

انٹرویو کا خیال دراصل اسے اس لیے آیا تھا کہ چند دن پہلے اخباروں میں مولانا عبدالستار ایدھی کا انٹرویو چھپا تھا۔ وہ کراچی سے پراسرار طور پر لندن جا پہنچے تھے۔ ان کی بات غیر ملکی ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر بھی ہوئی تھی۔ ملک کے نامور، ہر طبقے میں محترم، عمر رسیدہ سماجی فلاحی شخصیت، وہ اپنے گجراتی لہجے میں کہہ رہے تھے: "میرے کو قتل کرنے کا پلان ہے۔ پھر مزار بھی بہت بڑا بنوائیں گے۔ پھر کہہ دیں گے کہ ایم کیو ایم نے یا کسی مذہبی جماعت نے مارا۔ ارے، میں کہتا ہوں یہ سب مت کرو۔ اس سے تو ڈائرکٹ آجاؤ۔ بات یہ ہے بھائی کہ پاکستان میں سچ لکھا نہیں جاسکتا۔"

پاکستان سناٹے میں آگیا تھا۔ یہ کیا ہوا! اس نے تو بھانڈا ہی پھوڑ دیا۔ ناگفتنی بات کہہ ڈالی۔ لوگ دم بخود، منہ پھاڑے، دن بھر ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے تھے۔ سب سے زیادہ مشکل اخبارات کی تھی جو آزادیِ اظہار کے اس جمہوری دور میں عاقلانہ اور فاضلانہ مقالات کے ذریعے عرصے سے کچھ نہ کہنے کی سعی میں مصروف تھے۔ پھر لوگ ذرا کھانسے، گلا صاف کیا، کسمسائے۔ اخباروں نے مرے مرے لہجے میں کچھ تبصرہ کیا۔ ایک انگریزی اخبار نے اداریے میں لکھا: "مولانا نے ایجنسیوں کی طرف اشارہ کیا ہے،" وغیرہ وغیرہ۔ "اور یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔"

پھر بڑی سرعت سے اخباروں نے موضوع بدل دیا۔ وہ اس بدقسمت شہر کے روگ کی تشخیص سے گریزاں تھے جس کی بدامنی ضرب المثل بن چکی تھی۔ شہر کراچی پاکستان ہی کا سب سے بڑا نہیں، اپنی گنجان آبادی اور حیرت انگیز پھیلاو کے باعث دنیا کے بڑے شہروں میں شمار کیا جاسکتا تھا۔ ریاست کی معیشت کی شہ رگ، ریاستی خزانے کو سب سے زیادہ رقم فراہم کرنے والا، ملک کا سب سے زیادہ (درحقیقت واحد) جدید شہر، موٹرکاروں سے رواں، کسی بھی جدید کاروباری میگاپولس کی طرح غریب سے غریب اور بالدار سے بالدار شہریوں کا مسکن جس کی اب برسوں کی بے توجہی اور بدامنی سے اُدھڑی ہوئی سڑکوں پر ننھی منی مورسوں اور بیتے برسوں کے کسی تہہ خانے سے ثابت و سالم اور صاف ستھری نکل آئی فوکس ویگنوں کے ساتھ ساتھ سالِ رواں کے ماڈل کی بی ایم ڈبلیو گاڑی بھی نظر آسکتی ہے، جہاں ملک کے مہنگے ترین فائیو اسٹار ہوٹلوں کے ساتھ ساتھ سستی ترین نہاری بھی میسر آسکتی ہے، اور جہاں برسوں سے، کبھی تیز تواتر کے ساتھ اور کبھی رک رک کر، سڑکوں پر، محلوں پر گولیاں برسا کر بیک وقت متعدد مقتولوں کی لاشیں گرائی جاتی رہی ہیں۔ محلّے محلّے میں وارداتیں۔ ایسا زمانہ جب شہری سانس روک کر سوچتے تھے: "آج کس علاقے کی باری ہے؟" جس شہر کی خبریں پڑھ کر ــــ صرف خبریں پڑھ کر ــــ محفوظ

فاصلے پر واقع ملک کے دوسرے شہر اب نفرت کرنے لگے تھے۔ (ملک کے امورِ خارجہ کے سیکرٹری بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں: "ہم تو کراچی کو اتنا چاہتے ہیں کہ کوئی نہ چاہتا ہوگا۔" غیر ملکی نشریاتی ادارے کے سامنے اعتراف کی مانند، گویا دنیا سے یا غالباً سماج سے چھپائے ہوئے اپنے شہر سے اس عشق کے اظہار پر تشدد کی لپیٹ میں آئے ہوئے شہری زار و قطار روتے اور ہنستے ہوئے!) جہاں ہمیشہ گڑبڑ رہتی ہے۔ جہاں سے لاشیں لوٹائی جاتی ہیں اور گجرات اور پشاور، جانے کہاں کہاں بھیجی جاتی ہیں۔ جہاں کے شہری پاگل ہیں، جنونی ہیں۔ جہاں مسلح لڑکوں کے ٹولے، اور شہریوں اور راہ گیروں پر بندوقیں تانے سپاہیوں کے ٹرک، یکساں دہشت پھیلاتے، برسوں سے گھوم رہے ہیں، جیسے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں۔

پاکستان میں کیا سچ نہیں لکھا جا سکتا؟ عورت سوچتی ہے۔ کیا یہ کہ دہشت گردی کی وارداتیں حکومت کو متزلزل کرنے، بدلنے کے لیے، حالات کو ایک نیا، من چاہا موڑ دینے کے لیے طاقت ور اداروں کی جانب سے استعمال کی جا سکتی ہیں، جیسے کرسی کے نیچے سے قالین گھسیٹنے کے لیے جھٹکے دیے جائیں؟ (جیسے ہندوستان میں بعض اوقات ہندو مسلم فسادات کرا کے کیا جاتا ہے، یا جیسے اندرا گاندھی کے قتل کے بعد راجیو گاندھی کو فوری طور پر وزارتِ عظمیٰ کی گدی پر بٹھانے کے لیے مبینہ طور پر کانگریسیوں نے سکھ ہندو فسادات کروائے تھے؟) یا یہ کہ گو بظاہر ملک میں جمہوریت ہے ("فری ورلڈ" کی ایک اور کامرانی، مسلح آمریت کے دقیانوسی نظام سے نکال کر جمہوریت میں داخل کی ہوئی ایک اور شاداں ریاست، نئے عالمی نظام کے تاج میں سُرخاب کا پَر، جس پر یورپ اور امریکا کے حساس اور نازک دل انسانیت پرست مہذب حلقے سکون کا سانس لے سکتے ہیں، بلکہ ایک دوسرے کو مبارک باد دے سکتے ہیں)، مگر در حقیقت سابق حکمراں فوجی جنرل کی ایک دن اچانک فضا میں دھماکا دار تحلیل کے باوجود ملک میں حکومت کسی سیاسی جماعت کے ہاتھ میں آئی نہیں ہے، اور یہ کہ انتخابات کے متعدد بار انعقاد کے باوجود، جس کے بعد حکومتیں کرسیِ اقتدار پر بٹھائی اور اُٹھائی اور پھر بٹھائی جاتی رہی ہیں مگر اس تمام اٹھک بیٹھک کے کھیل میں اصل قوت ہنوز روپوش ہاتھوں میں ہے؟

کراچی کیوں تشدد کے سفاک خونیں شکنجے میں سسک رہا ہے؟ اور اس کے شہری... اس کے شہری کن حالات سے گزر رہے ہیں؟

کہا جا سکتا تھا، عورت نے سوچا، کہ آمریت سے جمہوری جدید ریاست بننے کا عمل ہموار نہیں ہوتا اور اس میں رکاوٹوں کا در آنا ناگزیر ہوتا ہے، مگر شاید، اس نے سوچا، منفی حالات اس قسم کے ہر ملک میں اس طرح اپنے عروج پر نہیں ہوتے جیسے اس کے اپنے وطن میں ہیں، اور ممکن ہے تضادات بھی لازماً اتنے متنوع اور متعدد نہ ہوتے ہوں۔

اس کے ذہن میں بنگلادیش کا خیال آیا، جو طویل مدت بعد فوجی حکومت کے دور سے نکلا تھا، ایک تقریباً یک قومی ریاست جو کئی لحاظ سے اس کے اپنے وطن سے بہتر صورتِ حال رکھتی تھی؛ جب کہ اس کا وطن کسی لاطینی امریکی یا نو آزاد افریقی ریاست سے زیادہ مماثل تھا جہاں آزادیِ اظہار ملنے تک اظہار کے

وسائل مسخ اور برباد ہو چکے تھے۔ خفیہ ایجنٹوں سے بھرے ہوئے، خوف زدہ، دولت مند مالکان کے یہ اخبارات سچ لکھنے سے معذور تھے۔ قومی زبان کے اخبارات، جنھیں ملک کی خواندہ آبادی کا بڑا حصہ پڑھ سکتا تھا، سنسرشپ کی طویل، ریاست کی تقریباً تمام ترزندگی پر محیط، روایت سے جاں بر نہ ہو سکے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ اشاعت رکھنے والا اخبار توازلی و ابدی طاقت ور عناصر کی خوشنودی کا اتنا عادی تھا کہ اسے فسطائی رجحانات کی چھت کا مضبوط ترین ستون قرار دیا جاسکتا تھا۔ انگریزی اخبارات، جو آمریت کے اختتامی دور میں، حکومت پر نکتہ چینی کے لیے نسبتاً آزاد تھے، مقامی قارئین کی کم تعداد تک پہنچ سکتے تھے، مگر مغربی دنیا، خصوصاً امداد دینے والے ملکوں کے واسطے، جو اب امداد کے ساتھ حقوقِ انسانی کی رٹ لگا رہے تھے، اس ملک میں آزادیِ اظہار کے مزین نمائشی جھروکے کا کام دے سکتے تھے، اپنے بہتر شعور اور روشن خیالی کے باوجود بے بس اور حددرجہ محتاط تھے اور ایک مشکل وقت سے گزر رہے تھے۔ ان کے لیے بھی یہ حقیقت ناگفتنی تھی کہ اصل طاقت کن عناصر کے پاس ہے۔ اس غیبی اور طاقت ور ہاتھ کے لیے انھوں نے، حیاداری کے ساتھ، "اسٹیبلشمنٹ" کی ترکیب اختراع کرلی تھی تاکہ پہلو بچا کر اس کا ذکر کر سکیں، یا گاہے گاہے اس کو کوئی دردمندانہ مشورہ دے سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ ایک مدت سے پڑھنے والے ان میں شائع شدہ تبصروں کیا رپورٹوں تک پر اعتماد کرنا چھوڑ چکے تھے اور انھیں محض یہ اندازہ لگانے کے لیے پڑھتے تھے کہ ان گنت ایجنٹوں کے ذریعے داخل (پلانٹ) کی گئی یہ خبریں کس خفیہ ادارے نے لکھوائی ہیں اور ان کی بنیاد پر آئندہ حالات کے کون سا رخ اختیار کرنے کی پیشین گوئی ہو سکتی ہے۔

ملک کی سیاسی جماعتیں، جن کا مفاد سونے کی چڑیا، اس شہر کراچی، سے وابستہ تھا، گو صلح نہ تھیں، مگر ان کی کم شعوری یا نااہلی کو اس پس منظر میں دیکھنا ناگزیر تھا کہ کم از کم تیس برس کے طویل عرصے میں ظاہر یا پس پردہ آہنی طاقت ور ہاتھ نے عوامی حمایت رکھنے والی ہر سیاسی تنظیم کو بزور طاقت کچلنے اور پھر سازباز، اندر ہی اندر گٹھ جوڑ، رسا گیری، دھمکی، بلیک میل اور نرخرے پر گھٹنا رکھنے کے مسلسل عمل کے ذریعے ـــــ اس سے قبل کہ وہ سنبھلے اور روپوش ہاتھ کے پس پردہ اشاروں اور امداد کے بغیر کاروبارِ حکومت چلا سکے ـــــ اپاہج بنا دیا تھا اور برسوں اس بات کا پروپیگنڈا کیا تھا کہ دراصل یہی پوری قوم کے مفاد میں ہے۔ تیسری دنیا کے نوآزاد، عوام دوست نظام قائم کرنے کے لیے تڑپتی ریاستوں میں وہ ادارے جنھیں ماضی میں خود مغربی جمہوریتوں نے پالا تھا، اپنے تسلسل اور عام لوگوں کی ان تک نارسائی کے باعث اب ایسے قائم بالذات طبقے بن چکے تھے جن کے دانت معیشت کی رگ گلو میں پیوست تھے اور جو نوآزاد ریاستوں کا ایک بالکل نیا فِنامِنن (phenomenon)، ایک جدید مظہری وقوعہ تھے جو ابھی مغرب کی عمرانی کتب میں شامل نہیں کیے گئے تھے۔

مگر کراچی ہی کیوں؟ آخر یہ شہر اس ہولناک تشدد کا شکار کیوں ہو رہا ہے؟

کیوں کہ یہ سچ بھی لکھنا ہمت کی بات ہے کہ کراچی تیسری دنیا کے کسی عام سے ملک کا عام سا شہر نہیں تھا۔ یہ ایک خاص الخاص ملک کا خاص شہر تھا؛ دنیا کی دو بڑی ریاستوں کی رساکشی میں سامنے کا فریق

بننے کا اعزاز رکھنے والے ملک کا ایسا شہر جس پر سرد جنگ کو اختتام پذیر کرنے والی افغان جنگ اور اس کی خاطر جلد بازی میں کی گئی کچی پکی تعمیروں کے ٹوٹ کر دھڑام سے زمیں بوس ہونے کا تمام دھما کا خیز ملبہ برسوں سے گِر رہا تھا؛ ایسا شہر جسے اس ملک کے جنگ جو حکمرانوں نے جرائم، تشدّد اور مذہبی جنون کی تاریک جہالت کا زہریلا فضلہ پھینکنے کے لیے کوڑے دان کی طرح استعمال کیا تھا، جب کہ وہ خود ایک خواب خرگوش میں فتح و نصرت کے ڈنکے بجا رہے تھے۔ اور اس وقت جب وہ جرائم، تشدد اور تاریک جہالت کو کام میں لاتے ہوئے، دنیا کو یک قطبی (uni-polar) بنانے کی مہم میں جُٹے تھے (کیوں کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے)، یہ زہریلا فضلہ شہر کی نسوں میں رواں تھا۔

***

دو.بئی کا درزی

عورت کے ساتھ والی نشستوں پر بیٹھے ہوئے مسافر لانڈھی سے نہیں آئے تھے۔ جیسا کہ اسے بعد میں معلوم ہوا، اور یہ معلوم کر کے اسے حیرت بھی ہوئی، وہ ہندوستان سے آئے تھے۔

"اخاہ! تو کیا آپ وہاں پی آئی اے سے سفر کر سکتے ہیں؟" اس نے تعجب سے پوچھا تھا۔

"کیوں نہیں،" انھوں نے تُرنت جواب دیا تھا۔ "ایرانڈیا سے آدھی قیمت پر لے جاتے ہیں۔"

اس کے برابر والی نشست پر ایک سانولی، سوکھی کانکھ عورت بیٹھی تھی؛ تیز جامنی ساری اور گھرے سیاہ بالوں کا بڑا سا جُوڑا جس کو بھگونے والے ناریل کے اصلی تیل کی تیز، کچی نباتی مہک ان کی چائے اور کافی میں گھُل رہی تھی۔ وہ آندھرا پردیش سے آئی تھی اور اب دو.بئی میں کسی شیخ کے پاس آیا گیری کے لیے جا رہی تھی۔ اس کے برابر بیٹھا مرد الہ آباد سے دو.بئی جا رہا تھا۔ دو.بئی میں اس کا درزی کا کام تھا، جیسا کہ اس نے بتایا۔

"آپ کبھی کراچی گئے ہیں؟" عورت نے اسے اتنے اشتیاق سے ہزاروں فیٹ کی بلندی سے لانڈھی کو پہچاننے کی کوشش کرتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

"جی نہیں،" درزی نے الہ آباد کی پختہ، الفاظ کے شستہ صوتی زیر و بم رکھنے والی اردو میں جواب دیا۔ "بس ہوائی اڈے پر رکے ہیں، دو ایک گھنٹے کے لیے۔"

"تو آپ کے رشتے دار ہوں گے یہاں؟"

"جی ہاں، دونوں چچا یہیں ہیں۔ لانڈھی میں رہتے ہیں۔ پارسال والدہ گئی تھیں۔"

"ویسے ہندوستان کے حالات اب کیسے ہیں؟" اس نے بے ساختہ پوچھا تھا، ایسا سوال جو ہر پاکستانی

Scanned with CamScanner

ہندوستانی مسلمانوں سے پوچھتا ہے۔
"جی ٹھیک ٹھاک ہیں اب تو،" درزی نے کہا۔ "وہ جو پہلے پریشانی سی تھی سو تو اب دب دبا گئی۔"
"تو اب..." عورت نے کچھ گول مول سا سوال کیا تھا، "کچھ گڑبڑ نہیں آپ کی طرف؟"
"بالکل نہیں۔" دونوں ہندوستانیوں نے سر ہلایا۔ عورت آندھرا کی آیا کا اندرونِ ملک آمد کا کارڈ بھر رہی تھی (کیوں کہ آیا کو اردو یا انگریزی نہیں آتی تھی) اور اس وقت اس کے پاسپورٹ سے نقل کر کے اس کا مشکل سا تلیگو نام لکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ وہ آندھرا کے کسی بالکل گمنام گاؤں میں پیدا ہوئی تھی اور یہ تازہ، نیا نکور پاسپورٹ اسے حیدر آباد (دکن) سے ملا تھا جہاں ہو سکتا ہے وہ خاص اسی مقصد کے لیے گئی ہو۔ اس کے سوال کے جواب میں "نہیں نہیں" میں سر ہلاتے ہوئے وہ مسکرائی تو اس کے سفید دانت سیاہ لبوں میں چمکے۔ عورت کو اس کی نظروں میں امید بھری التجا دکھائی دی گویا کہتی ہو، "ہندوستان میں ہندو مسلم جھگڑا بالکل نہیں ہو رہا؛ اے مسلمان عورت، تو میرا کارڈ صحیح صحیح بھر دے۔"
دوبئی میں پتے کا خانہ بھروانے کے لیے اس نے سفید پلاسٹک کی جالی کے تھیلے سے بڑے بڑے رنگین پھولوں والے ریشمی رومال میں بہت احتیاط سے لپٹا ہوا ایک کاغذ نکالا۔ شیخ کا نام اور پوسٹ بکس نمبر لکھوانے کے بعد کاغذ تہہ کر کے اس نے دوبارہ اُسی طرح احتیاط سے تھیلے میں واپس رکھ دیا۔
"کیا اتنا کافی ہو گا؟" عورت نے کچھ تشویش سے پوچھا۔
"جی ہاں، جی ہاں، بالکل کافی ہو گا،" درزی نے فوراً کہا۔ وہ بڑی توجہ سے کارڈ بھروانے میں اپنی ہم وطن انجان تلیگو عورت کی مدد کر رہا تھا۔ چند گھنٹوں کے سفر میں ان دونوں میں جیسے کوئی بندھن بندھ گیا تھا۔ عورت نے سوچا، دوبئی اترنے پر درزی کمال ذمے داری سے آیا کو بخیریت شیخ کے حوالے کرے گا۔
وہ کون تھی؟ کیا شادی شدہ تھی؟ کیا اس کے بچے تھے؟ عورت یہ سب کچھ آندھرا کی آیا کی زبان نہ جاننے کے باعث اس سے نہ پوچھ سکی۔
وہ درزی سے باتیں کرنے لگی۔ توقع کے عین مطابق، درزی خوش حال تھا۔ جی ہاں، دوبئی میں تین رشتے داروں کو کام پر لگا چکا تھا۔ بیوی بچے وہیں الہ آباد میں رہتے تھے، لیکن وہ خود ہر دو ایک سال بعد چکّر لگا آتا تھا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس کا چھوٹا بھائی بی کام میں پڑھتا ہے؛ اب وہ بھی اگلے سال دوبئی آ کر اس کا ہاتھ بٹائے گا۔
"لیکن،" درزی نے تحمل سے کہا، "بی اے، ایم اے کیا ہوتا ہے بیگم صاحبہ! لاکھوں پڑھے لکھے جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں۔ دو چار ایم اے پاس کو تو..." اس نے سکون سے کہا، "خدا کے فضل و کرم سے میں خود اپنے پاس نوکری دے سکتا ہوں۔"
ہمارا دوبئی کا درزی تعلیم کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا تھا۔
"لیکن..." عورت نے چوں کہ چناں چہ کے چکر میں پڑتے ہوئے بات آگے بڑھائی تھی، "تعلیم

بھی تو ضروری ہے نا، یعنی روشن خیالی، سمجھ بوجھ، عقل و دانش وغیرہ کے لیے..."
درزی مسکرانے لگا۔
عورت نے شرمندگی سے کہا، "اس کے لیے، آج کل ایک باقاعدہ اصطلاح ہے... یعنی تربیت اور تعلیم کے لیے... ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ ــــ انسانی صلاحیتوں کی نشوونما۔"
پھر اس نے کہا، "ہمارے وہاں کے ایک شاعر نے بھی ایسا ہی ایک شعر کہا ہے۔"
"کیا شعر کہا ہے؟ ارشاد، ارشاد!"
بھلا یوپی کا آدمی اور شعر نہ سننا چاہے!
عورت نے پاکستانی مزدور شاعر کا شعر سنایا:

کاری گروں نے بابوؤں کو زیر کر لیا
محنت کی آنچ کاغذی اسناد کھا گئی

"واہ وا! بہت خوب!" درزی نے قہقہہ لگا کر داد دی۔ اس نے عورت کو بتایا کہ وہ دوبئی میں اپنے یاردوستوں کے لیے الہ آباد کے شہرۂ آفاق امرودوں کے کریٹ لے جا رہا ہے؛ اگر اسے خبر ہوتی کہ راستے میں اسے شعر سنانے والی ہم سفر ملے گی تو وہ ایک کریٹ اوپر ہی رکھ لیتا، اسے نذر کرنے کے لیے۔
گھبراتی ہوئی اور اپنے سانولے سوکھے وجود کی پوری قوت سے گھبراہٹ کو چھپاتی ہوئی تلگو آیا کے برعکس، درزی دوبئی لوٹنے پر خوش تھا، مسرور اور پُراعتماد۔ آخر وہ وہاں دس بارہ سال سے رہ رہا تھا۔
پھر وہ عورت کو اپنے گھر کے قصے سنانے لگا۔
"دیکھیے صاحب، حسد بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ ہم نے اپنے مکان کی مرمّت کروائی ہے، دو تین کمرے چھت پر بھی بنائے ہیں۔ تو اب کی بار میرے وہاں ہوتے ہوئے پڑوسیوں نے ہماری شکایت کر دی۔ پہلے ان سے بہت اچھے تعلقات تھے، لیکن اس بار تھانے میں رپٹ لکھوا دی کہ ان کے گھر کی دوسری منزل سے مرد ہمارے گھر جھانکتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے، ان کی عورتیں شہر بھر میں تو گھومتی پھرتی ہیں۔"
عورت غور سے درزی کی بات سنتی رہی۔ گہرے سانولے رنگ کا، گٹھے ہوئے جسم والا، کھڑے نین نقش، چمک دار سیاہ آنکھیں... خوش حالی اس کے ہنس مکھ ہونے کا یقیناً ایک سبب ہو گی۔ وہ ایک پُرکشش مرد تھا، پینتیس چالیس کا رہا ہو گا۔ سال بھر یہ دوبئی میں کیا کرتا ہو گا؟ بیوی تو ساتھ رہتی نہیں۔ پھر اس نے سوچا ــــ مگر آیائیں تو ہیں۔
درزی نے اسے بتایا تھا، "چھوٹا سا انتظام ہے دوبئی میں اپنا۔ خدا کے فضل سے سب کچھ ہے: فرج، ایرکنڈیشنر۔ ایرکنڈیشنر کے بغیر تو رہا نہیں جاتا نا، بڑی گرمی پڑتی ہے۔"
عورت نے آیا پر نظر ڈالی۔ اسے جوش ملیح آبادی کی نظم "تکنگن" یاد آئی۔ سنگِ سیاہ میں تراشی

Scanned with CamScanner

ہوئی، تھامے طوفان سی جوانی، وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ تو وہ والی عورت نہ تھی، یہ دوسری طرح کی تلنگن — دبلے بدن میں گھبراہٹ منجمد کیسے، کمائی کے لیے (کن کے لیے کمائی؟ ماں باپ کے لیے؟ چھوٹے بھائی بہنوں کے لیے؟ بچوں کے لیے) دور دیسوں کو جاتی ہوئی، یوں اکڑی بیٹھی جیسے فوجی لام پر جاتا ہو۔

عورت درزی سے یہ نہ پوچھ سکی تھی کہ اس کے پڑوسی ہندو تھے یا مسلمان۔ بعد میں اس نے سوچا کہ پوچھ لیتی تو اچھا ہوتا؛ اس طرح کچھ نظریاتی کلیوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ تو ایک مسلمہ اصول تھا کہ مخلوط معاشروں میں ایک فرقے کی معاشی ترقی سے فرقہ واریت کی کھیتی میں بیج پڑتے ہیں۔ اگر درزی کے پڑوسی ہندو تھے تب درزی کے مکان کی دوسری منزل انھیں بابری مسجد کا شدت سے مخالف بنا سکتی تھی۔

ہندوستان... ہندوستان... تقسیم سے شر کی دہائی تک، ایک غیر مختتم تسلسل... مراد آباد... میرٹھ... بلووں کا طویل سلسلہ... سنسان عیدگاہ کی مسلی، سلوٹیں پڑی دریوں پر خون کے دھبے... دروازے پر عید کے لیے خریدے گئے نئے جوتوں کا ڈھیر... ایک ننھامنا، کلابتو کا جوتا... کوڑے کے ڈھیر کے پاس پڑی ایک چھوٹی سی سفید کڑھی ہوئی ٹوپی...

اور برسوں پہلے کراچی میں... رنچھوڑلائن کی تنگ، پیچ دار گلیوں میں سلوٹا پاڑے کے دائیں جانب، جہاں سن سینتالیس اڑتالیس کا شاندار سنیما گھر لائٹ ہاؤس اپنی شفاف شیشے جڑی بلندی میں ہلکی دھوپ میں کھڑا جگمگا رہا تھا، چھ برس کا جلال ایک سہ منزلہ عمارت میں اپنے چھوٹے سے فلیٹ کے نیچے دروازے پر کچھ خوف زدہ سا کھڑا حیرت سے ٹکٹکی باندھے برابر کی گلی کی طرف دیکھ رہا ہے جہاں ایک متروکہ مکان کا تالا توڑا گیا ہے اور سامان لُوٹا جا رہا ہے۔

گلی میں شور ہے۔ چھین جھپٹ میں لوگوں کے بال بکھر گئے ہیں، دامنوں کے چاک اُدھڑ گئے ہیں۔

"منّے، اندر آجاؤ!" بالکنی سے اس کی اماں پکارتی ہیں۔

"یہ... یہ..." جلال چھوٹی سی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے تتلا کر پوچھتا ہے: "یہ کا ہو لہا ہے؟"

"کچھ نہیں، سامان لُوٹا جا رہا ہے۔ تم اندر آجاؤ۔" اماں جلال کی بڑی بہن کو اسے اوپر لانے کے لیے بھیج کر باورچی خانے میں واپس چلی جاتی ہیں۔

لُٹتے مکان کے سامان میں سے کسی ہندو بچے کی ایک چھوٹی سی گیند لڑھکتی ہوئی جلال کی گلی میں پہنچ جاتی ہے۔ ننھا جلال ڈرتے ڈرتے اسے اُٹھاتا ہے۔ پھر جب اس کا اعتماد بحال ہوتا ہے تو وہ اسے مضبوطی سے تھام لیتا ہے۔ گھر میں آکر وہ اماں کو گیند دکھاتا ہے۔

"اماں، دیکھو! ہم نے بھی لُوٹا!"

Scanned with CamScanner

مگر وہ پڑوسی ہندو تھے یا مسلمان، عورت یہ پوچھ نہ پائی تھی۔ وہ جھجک کر رہ گئی تھی۔ ان دونوں کے درمیان تلگو آیا بیٹھی تھی، اور وہ اردو انگریزی بھلے ہی نہ سمجھتی ہو مگر لفظ "ہندو" تو ضرور سمجھ سکتی تھی۔ آیا کا لحاظ کرتے ہوئے وہ ایسا سوال نہ پوچھ سکتی تھی جس میں فرقہ واریت کا پہلو نکلتا ہو۔

تو کیا ہم اس قدر تکلف سے بیٹھے تھے؟ عورت بعد میں سوچتی ہے۔ شاید تکلف سے نہیں، تہذیب سے۔ سویرے کی پرواز میں جہاز کی نشستوں پر شانے سے شانہ جوڑ کر بیٹھے، اپنا لحاظ سلامت لیے، ہوا میں اُڑے جاتے تین مسافر...

اور اگر ـــ عورت نے دو.بئی میں دونوں ہندوستانی مسافروں کو وداع کرنے کے بعد تینوں نشستوں پر اکیلے قبضہ جماتے ہوئے، ہاتھوں کے انگوٹھے اوپر تلے گھماتے ہوئے، پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ سوچا تھا ـــ اگر وہ پڑوسی مسلمان ہوتے تب؟ تب کیا ثابت ہوتا؟

مگر یہ بات وہ معلوم کر ہی نہ سکی تھی۔ وہ کسی بھی کلیے یا مسئلہ نظریے میں ٹھیک نہیں بیٹھ سکتے تھے اور عورت کے تخیل میں ہمیشہ یوں ہی پہیلی بن کر رہنے والے تھے ـــ عمرانی معلومات فراہم کرنے سے انکاری، ایک کھڑکی سے جھانکتے، ہنس کر اس کو چڑاتے صرف کچھ حاسد پڑوسی، جو نہ جانے ہندو تھے کہ مسلمان!

***

ناظم آباد نمبر چار میں علیم الدین اور کلیم الدین کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی کہ ان کے تحت الشعور میں بسے میں گورکھ پور سے ٹیکم چند نکل کر آ وارد ہوا اور عجیب طرح کے اشارے کر کر کے کچھ پوچھنے لگا۔ تنگ آ کر علیم الدین نے کہا: "نہیں بھائی ٹیکم چند، جداگانہ انتخابات کا مسلم لیگی مطالبہ کانگریس نے منظور نہیں کیا تھا۔ ۱۹۲۷ میں موتی لال نہرو نے اسے مسترد کر دیا تھا۔"

نہرو ـــ جو کشمیر سے آئے تھے، صدیوں پہلے۔ مغل حاکموں نے اُنھیں نہر کے پاس جاگیر عطا کی تو وہ نہرو کہلائے۔

سب لوگ کہیں نہ کہیں سے آئے ہیں اور کوئی بھی کہیں کا ابدالآباد سے رہنے والا نہیں ہے۔

انسانوں کے ہجوم گھوڑوں پر سوار، ہاتھیوں پر لدے، اونٹوں اور خچروں پر، ریل گاڑیوں اور ہوائی جہازوں میں، صحرا اور سمندر اُلانگتے جوق در جوق سفر میں ہیں اور ایک دوسرے سے جنگ و جدال میں مصروف ہیں ـــ رزق حاصل کرنے کے لیے، پیٹ میں دو نوالے روٹی ڈالنے کے لیے، اور تن ڈھانپنے کو کپڑا اور سر چھپانے کو مکان حاصل کرنے کے لیے۔ علاوہ ازیں ٹیپ ریکارڈر اور ٹیلی وژن، ایرکنڈیشنر اور بجلی سے چلنے والا تمام اٹرم کھٹرم سامان حاصل کرنے کے لیے انسانوں کے ہجوم بسوں اور ریل گاڑیوں میں، اونٹوں اور خچروں پر، چھوٹی چھوٹی کشتیوں اور جہازوں میں، ایک مقام سے دوسرے مقام کی جانب

Scanned with CamScanner

سفر کر رہے ہیں اور ایک دوسرے سے جدال و قتال میں مصروف ہیں۔

چناں چہ کلیم الدین گویا ہوا:

"اوہ! تو پھر... ایسا کیوں نہیں کیا جاتا... کہ... کہ بھئی، یہ ساری اشیا جن دکانوں میں بھری ہیں ان کو... کیا نام کہ لُوٹ لیا جائے اور یہ سب چیزیں برابر برابر تقسیم کردی جائیں لوگوں میں۔ بجائے ایک دوسرے کو قتل کرنے کے، میرے خیال میں تو یہ زیادہ بہتر طریقہ ہوگا۔"

"یعنی کرہ ارض پر مکمل طوائف الملوکی قائم کردی جائے؟" علیم الدین نے استفسار کیا۔

"نہیں نہیں، اس کا باقاعدہ نظام بنایا جائے۔ ایک تو یہ کہ زندگی سادگی سے گزاری جائے۔ انسانی ضروریات کیا ہیں، اس کی ازسرِنو تقسیم کی جائے۔ مثلاً ایرکنڈیشنر ــــ کیا یہ جائز انسانی ضرورت ہے؟"

"نہیں، مگر جب بغیر ایرکنڈیشنر والا ہجوم ایک طبقے کے کتّوں کو بھی ایرکنڈیشنڈ کمروں میں آرام کرتا دیکھتا ہے تو وہ بھی یہی سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے جو امرا کو اور اُن کے کتّوں کو حاصل ہے۔"

"یہ تو صحیح ہے۔ طبقات بڑی گڑبڑ چیز ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں طبقات ہونے کے باعث سب سے زیادہ بدامنی اور خوں ریزی ہوئی ہے۔ تو طبقات ختم کردیے جائیں!"

"ایسا ہوا تھا نا پیارے! سوویت یونین اور چین میں ایک اشتراکی معاشرہ قائم کیا گیا تھا نا! مگر یہ بیسویں صدی کا آخر ہے۔ دنیا نے سوشلزم کو مسترد کردیا ہے۔"

"وہ تو اس لیے کہ آزادی نہیں تھی... ضرورت سے زیادہ نوکرشاہی آگئی تھی اس نظام میں..."

"جی نہیں! اس لیے کہ اشتراکی ملکوں کے عوام اپنے اشتراکی قومی ملکیت کے کارخانوں میں بنے بھدّے کیمروں اور ناقص کلائی کی گھڑیوں سے نفرت کرتے تھے۔ اس کے بجائے وہ خوب صورت اور اعلیٰ ترجاپانی کیمرے اور گھڑیاں خریدنا چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ سوئس چاکلیٹ کھانا چاہتے تھے۔"

"آہ! صرف ان چیزوں کے لیے!" سننے والے نے کہا۔

"ہاں!" کہنے والے نے سنایا اور چند ردّی کاغذ ہوا میں اُچھالے۔ "وہ گیا اشتراکی نظام ــــ صرف ایک سوئس چاکلیٹ کے لیے!"

تو آدمی تو ایسا ہے!

ایسا ہے بھئی ایسا ہے!

علیم الدین رضوی اور کلیم الدین رضوی، سکنہ ناظم آباد نمبر چار، نے قوّالی گائی اور دھمال ڈالا۔

***

برسوں پہلے کی بات ہے، کراچی میں ناگن چورنگی کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے قدم اچانک رک گئے۔ چورنگی پر ایک ادھیڑعمر کا شخص کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مائیکروفون تھا اور وہ کچھ

تقریر سی کر رہا تھا۔ آس پاس سے گاڑیاں تو بغیر اس پر توجہ دیے گزر رہی تھیں، مگر چند پیدل چلنے والے رک کر اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ وہ آدمی کہہ رہا تھا:

"بھائیو اور بہنو! سندھیو اور مہاجرو! اور پنجابی پٹھان بلوچو! چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہنے والو! بسوں میں سفر کرنے والو! ہمارے خواب کہاں کھو گئے؟

کہاں کھو گئے ہمارے سنہرے سپنے ہمارے وطن پاکستان میں؟ سپنے جو ہماری آنکھوں کو سجائے رکھتے تھے۔ آدرش جن کی طاقت سے ہم پہروں بس اسٹاپ پر دھوپ میں کھڑے رہ سکتے تھے۔ اس دولت مند طبقے نے وہ خواب ہم سے چھین لیے۔ یہ لوگ اتنے مفلس تھے کہ انھوں نے مفلسوں کے خواب چُرا لیے۔ ثروت اور عیاشی میں محصور یہ لوگ ہمارے خوابوں کے جھوٹے دعوےدار بن چکے ہیں۔ یہ جیٹ سیٹر جنیوا اور نیویارک میں ہمارے خوابوں کا ناٹک رچا رہے ہیں۔ یہ انسانی حقوق کی انجمنیں بناتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ان کا طرزِ زندگی اس سرزمین پر سب سے گھناونا منظر ہے اور اس بدصورتی کو مٹا ڈالنا یہاں کے انسانوں کا جائز حق ہے۔

"اس طبقے کی عورتیں عورتوں کے حقوق کی انجمنیں بناتی ہیں اور ایک لاکھ روپے کا جوڑا پہن کر نو لاکھ روپے کی موٹر گاڑی میں بیٹھ کر ایک کروڑ روپے کی شادی کی تقریب میں شرکت کرتی ہیں۔ اور تمھاری بیٹیوں کے معمولی جہیز پولیس اور رہنبرز کے افراد گھروں میں گھس کر چھین لے جاتے ہیں۔

"اس امیر طبقے نے ہمارے خواب چُرا لیے اور ان کے بدلے میں اپنے خواب ہماری آنکھوں کے پپوٹوں میں کسی زہریلے انجکشن کی طرح داخل کر دیے ___ تموّل اور ثروت کے... عیاشی کے خواب۔ اب ہم وہی خواب دیکھ رہے ہیں اور ہاتھوں میں بندوقیں لیے ایک دوسرے پر فائر کر رہے ہیں، ایک دوسرے کی کھوپڑیاں پاش پاش کر رہے ہیں۔

"قومی حقوق! قومی حقوق کیا ہیں؟ روٹی، کپڑا اور مکان ___ یہی تو چاہیے انسان کو! اب اس کے ساتھ کار اور ایر کنڈیشنر اور بجلی سے چلنے والا جدید ترین سامان بھی شامل ہو چکا ہے۔ اسی لیے تو لڑ رہے ہیں ہم۔ جتھے اور گلّے بنا بنا کر ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔

"اور امیر طبقہ اپنی ساری ظاہری واویلا کے باوجود اس سے خوش ہے۔ وہ یہ صورتِ حال برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

"ہمیں قومی حقوق کے ساتھ اپنے چُرا لیے گئے خواب کی ضرورت ہے۔ اُس دنیا کی جو ہماری تھی اور جو برباد کر دی گئی۔ اتنی بُری تو نہ تھی ہماری چھوٹی سی دنیا۔ اس میں ایک پیڑ تھا، اور ایک مختصر آنگن پر پھیلا ہوا بسیط نیلا آسمان۔ ٹھنڈے پانی کی صراحی اور اُس پر ڈھکا کٹورا۔ اس میں کتابیں تھیں اور علم کی پیاس تھی۔ اور ایک پُرانی جاے نماز جس پر ہماری ماں یا باپ بغیر خوں خوار نعرے لگائے عبادت کر سکتے تھے۔ اور جوان لڑکیاں اور لڑکے جو سیاہ عبائیں پہنے بغیر، الف لیلہ کی رقاصاؤں کی طرح آنکھوں سے نیچے تک نقابیں اوڑھے بغیر، چغے پہنے بغیر اور سروں پر مسخروں کے سے رنگ برنگے عمامے

باندھے بغیر رہتے تھے، اور خدا کی جھوٹی قسم کھانے سے جھجکتے تھے۔
"ہمیں اپنی جھجھک کی بازیافت کی ضرورت ہے جو ہم سے چھین لی گئی ہے اور ہمارے ہاتھوں میں بندوقیں تھما دی گئی ہیں۔ اور اس قتل و غارت گری کو تقدس بخشنے کے لیے ہمارے شہروں کی شاہراہوں ہر جا بجا اللہ اکبر اور ہُوالصمد کے سبز بورڈ آویزاں کر دیے گئے ہیں..."
وہ یہاں تک کہہ پایا تھا کہ ہجوم سے ایک غلغلہ اٹھا۔
"بور... بور... بور! مارو! نکالو اسے!"
ہجوم اس پر سڑے ہوئے ٹماٹر اور گندے انڈے برسا کر تتر بتر ہو گیا۔
اب اس شخص نے پینترا بدل کر دوبارہ تقریر شروع کی۔ اس نے مکا لہرا کر کہا:
"مہاجروں کے حقوق کے لیے ہم خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے!"
ہجوم سُرعت سے جمع ہو گیا اور تالیوں کا ایسا شور بلند ہوا کہ آس پاس کی عمارتیں لرزنے لگیں۔
پھر اس نے لہجہ بدل کر کہا:
"ہم سندھیوں کے حقوق کے لیے آخری سانس تک جنگ کریں گے۔"
حیدر آباد اور سکھر اور نواب شاہ اور پورے سندھ سے نعروں کا ایسا شور اٹھا کہ دھرتی دھمکنے لگی۔
"مرسوں مرسوں سندھ نہ ڈیسوں!"
وہ آدمی سندھیوں اور مہاجروں کا رہنما بن گیا۔

***

کراچی کے شہری

پہلے لوگوں نے ایک سنسنی محسوس کی۔
پھر وہ مزید قتلوں کا انتظار کرنے لگے۔
اس کے بعد مزید قتل ہوئے۔ یہ سب قتل متوقع تھے۔
کراچی میں لوگ دو تین برس سے ایک بڑے قتلِ عام کی توقع کر رہے ہیں ـــــ حالاں کہ بیچ میں لوگ اپنی توقع بھول جاتے ہیں۔
کبھی اُنھیں لگتا ہے کہ قتل کی خبروں کا اب ان پر اثر نہیں ہو رہا۔ وہ کثیر التعداد قتل کی وارداتوں پر مذاق بنانے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے سے آج کا اسکور پوچھتے ہیں۔
ان میں سے چند کہتے ہیں، "قتل اور جرائم تو ہر شہر میں ہوتے ہیں۔"

Scanned with CamScanner

"بڑے شہروں میں قتل اور جرائم زیادہ ہوتے ہیں۔"
"شکاگو میں بہت قتل اور جرائم ہوتے ہیں۔"
"کراچی کی آبادی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔"
"یہاں کوئی تفریحی مقام نہیں۔" (اس لیے لوگ ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں؟)
"اگر سڑکوں کی مرمت ہو جائے، اگر سیوریج سسٹم ٹھیک ہو جائے، تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

***

پیاز کے چھلکے

سال بھر سے ریاست کے دارالخلافے میں ایک افواہ گشت کر رہی تھی (گو یہ بات بڑی رازداری سے کہی جاتی تھی) کہ بااختیار قوتوں نے کراچی کے مسئلے کو حل کرنے کا ایک منصوبہ بنا لیا ہے۔ منصوبہ یہ تھا کہ چوں کہ کراچی کا مسئلہ بہت پیچیدہ اور گنجلک ہے، اور اسے حل کرنا صوبائی انتظامیہ کے بس کی بات نہیں، لہٰذا مختصر پیمانے پر تھوڑے بہت خون خرابے کے بعد کراچی کو وفاقی تحویل میں دے دیا جائے گا۔ (دوسری صورت میں ___ کہا گیا تھا ___ بہت بڑے پیمانے پر خون خرابے کا خطرہ تھا۔) اس منصوبے کا کیا ہوا؟ کیا یہ چاروں طرف گرتی لاشیں ___ چھ سات، چار پانچ، دو تین، ہر روز، اور کبھی زیادہ ___ اسی منصوبے کی تکمیل کا حصہ ہیں؟ جیسے پرت در پرت، منصوبے کی پیاز کے چھلکے اترتے ہوں... یا یہ منصوبہ مناسب نہ سمجھتے ہوئے بیچ ہی میں چھوڑ دیا گیا؟ یا یہ محض افواہ تھی؛ ایسا کوئی منصوبہ بنایا ہی نہیں گیا تھا؟

کراچی کے شہری یہ نہیں جانتے؛ صرف اندازہ لگا سکتے ہیں۔ صحیح معلومات حاصل کرنے کا ان کے پاس کوئی راستا نہیں۔ مسائل کے حل کی حکمت عملی خفیہ ہے۔ ایسے مضبوط صندوقوں میں بند، آر پار نظر آنا جن کی خصوصیت نہیں۔ وہ اندھیرے میں ہیں، اور صرف امید کر سکتے ہیں کہ بااختیار ہاتھ کی حکمت عملی درست ہو گی، تیر (اب کی بار) نشانے پر بیٹھے گا، اور پھر... شاید سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اس منصوبے کی افواہ جب کراچی میں پھیلی تھی تو سننے والوں نے اطمینان تک محسوس کیا تھا۔ وہ ایک ناٹک کی طرح کھیلے جانے والے خون خرابے کو، جو خفیہ ہاتھوں کے قابو میں ہو، قبول کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گئے تھے۔ مگر ذہنی طور پر تیار ہونا ایک بات ہے، سچ مچ کسی صورت حال سے گزرنا بالکل دوسری بات۔ اب جب کہ خون بہنا شروع ہو گیا تھا (اگر یہ اس معجزہ، یا مبینہ، ناٹک کا حصہ تھا!) تو وہ بلبلا رہے تھے۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ خوں ریزی ان کا، ملک کا، قوم کا، کراچی کا بھلا چاہنے والوں

Scanned with CamScanner

کے (انھیں اتنا چاہنے والوں کے جتنا کوئی بھی نہیں چاہتا ہوگا) یہ قائمی ہوش و حواس بنائے ہوے کسی ایسے منصوبے کا حصہ شاید نہیں ہو سکتی جس کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔

کیا شہر کے لوگ اپنے حالات خود ٹھیک نہیں کر سکتے؟

لیکن اس کا جواب ایک اور حکمت عملی میں ہے؛ سن ۱۹۷۷ سے جاری و ساری اور سختی سے نافذ حکمت عملی جس کے ذریعے سے منظم طور پر عام لوگوں کو سیاسی عمل سے اور معاشرے کو کوئی بھی رخ دینے کی قوت سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔ دہشت ناک فوجی حکومت کے طویل، اعصاب شکن برسوں نے لوگوں کو، بحیثیت ہوش مند شہری، معطل کر دیا ہے، ایک سطح پر، ان جانے میں، کسی مقام پر وہ اپنی صلاحیتوں سے دستبردار بھی ہو گئے ہیں۔ فوجی آمریت میں جلاوطن ہو جانے والے لوگوں نے پاکستان واپس آ کر ہاتھ پر ہاتھ دھری ایسی مخلوق کو دیکھا تھا جس کی آنکھیں برسوں صرف وی سی آر اور ٹیلی وژن دیکھتے دیکھتے چوکور ہو چکی تھیں اور جو صوفوں پر، کرسیوں پر، چٹائیوں پر دراز یہی کہہ رہی تھی کہ کچھ کروایا جا رہا ہے، کچھ کروایا جانے والا ہے، اور اپنی انتہاے مفعولیت کی حالت سے بے خبر تھی۔

***

معیشت

اس شہر میں، مَیں اجنبی یوں تو نہ تھی میرے خدا
اس کی زمیں، اس کے فلک، اس کی ہوا کو کیا ہوا؟
پہچان میں آتا نہیں، پہچان بھی پاتا نہیں مجھ کو کوئی
بدلا ہوا سارا سماں
بے روشنی اتنی مگر کچھ بھی نظر آتا نہیں
گھر تھے یہاں
رہتے تھے جن میں کچھ مکیں
اک پیڑ تھا اس جا کھڑا
جھولا پڑا تھا ڈال پر
اک دوست رہتا تھا یہاں
کیوں مِٹ گئے سارے نشاں؟
اب تو فقط ہر موڑ پر، ہر گام پر

بازار ہے، بازار ہے، بازار ہے

بازار میں ہر روز عید
سستی فروخت، فوری خرید
میلے دکاں داروں کے ہیں
کیا شور ہرکاروں کے ہیں
اشیا کا جوبن ہے عیاں
پھر گاؤں کے صحن میں، خوشبو لٹاتا موگرا
پھر شور اٹھا ناگہاں
لو لڑ پڑے گاہک نئے
خنجر چھری پستول نکلے، بم پھٹا، پھیلا دھواں
دوڑا پولس کا آدمی، سیٹی بجی
بازار کے اوپر تنا ہے آسماں نیلم جڑا
اُبھری سمندر سے ہوا، نکلا ہے تارا شام کا
اور چاند ہے پیلا پڑا
بازار کے اندر مگر فرصت کسے، دیکھے ادھر
ساگر کے تٹ تک چھا گیا، سانسوں کی حد تک آ گیا
جو ہر طرف بازار ہے
بازار ہے، بازار ہے

(۱۹۸۷ میں، جلاوطنی سے لوٹنے کے بعد، کراچی میں لکھی ایک نظم)

ارے احمق! بازار کو تم بُرا سمجھتی ہو؟ تم مارکٹ اکانومی اور اس کی قوتوں کو کم گردانتی ہو؟ دراصل تمھیں معیشت کی سمجھ ہی نہیں تھی۔ بازار جتنا پھیلے، لوگوں کو اُتنا زیادہ روزگار ملتا ہے۔ کیا کہا، سادہ زندگی؟ آدمی ایک تو سادہ زندگی چاہتا بھی نہیں، دوسرے سادہ زندگی سے تو معیشت منجمد ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر (بی بی سی اکنامک رپورٹ برائے چین) اگر ایک محلّے کے لوگ ایک انڈا روز کھاتے ہیں تو اصراف کے لیے تین ہزار پانچ سو پندرہ مرغیاں پال لی جاتی ہیں۔ انھیں فوراً دو انڈے روز کھانے شروع کر دینے چاہییں، جس کے لیے سات ہزار تیس مرغیوں کی ضرورت ہو گی۔ اس سے ان کو دانہ کھلانے والوں کی آمدنی دُگنی ہو جائے گی؛ علاوہ ازیں مرغیوں کی دیکھ بھال کرنے والوں، انڈے جمع کرنے والوں اور مرغی خانے صاف کرنے والوں کی تعداد بھی دُگنی ہو جائے گی۔ یعنی روزگار میں اضافہ ہو گا۔

Scanned with CamScanner

شہر (۱)

اب یہ جہاز لندن ہی جا کر رکے گا، عورت سوچتی ہے۔ ہاتھ بڑھا کر بتی بند کرتی ہے اور ہوائی میزبان کا دیا ہوا کمبل اوڑھ کر، تینوں نشستوں کے ہتھے اٹھا کر، ننھا سا تکیہ لگا کر، آرام سے سونے کے لیے لیٹ جاتی ہے۔

بہت ہی دور رہ گیا کراچی۔ اس کے دماغ میں شہر کی تصویر گھومتی ہے۔

شہر جو بحیرۂ عرب کے کنارے لیٹا ہے، نقشے میں دیکھنے پر اس کی شکل ایک مچھلی کی دُم کی طرح دکھائی دیتی ہے جبکہ باقی مچھلی پانی میں ڈوبی ہوئی ہو۔ اس منقسم دم کا شمالی حصہ لس بیلہ سے متصل کیرتھر پہاڑی سلسلے کے ساتھ ساتھ باریک ہوتا ہوا ختم ہوتا ہے جبکہ جنوبی حصہ سندھ کے میدانی علاقے میں گولائی میں پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح کراچی میدانی، زرخیز سندھ اور کوہستانی، سنگلاخ بلوچستان کے درمیان دھوپ میں لیٹا ہے؛ جنوب مغرب میں عرب ساگر کی نرم لہروں کی تھپکیوں میں ہلکورے لیتا؛ اپنے بادلوں بھرے ساحلی آسمان کے نیچے؛ نمکین، گیلی ہوا سے سدا ٹھنڈا اور کچھ چپ چپا۔ یہاں آپ کا پسینا آسانی سے نہیں سوکھے گا، اور اگر آپ کے بال لمبے ہیں تو وہ اس کی گیلی ہوا کے پہلے ہی جھونکے میں گھنگھریالے ہو جائیں گے اور نمکین دھوپ تھوڑے ہی دنوں میں آپ کی جلد کی رنگت سنولا دے گی۔

یہاں کا پانی ہر ایک کو راس نہیں آتا۔ ۱۹۵۸ میں ملک میں مارشل لا لگانے کے بعد جب فیلڈ مارشل ایوب خاں یہاں آئے تو ان کا ہاضمہ مستقل طور پر خراب رہنے لگا۔ ملک کے دارالخلافے کو اس سمندری، گرم مرطوب علاقے سے (اور یہاں آ بسنے والے دبلے پتلے، سانولے، تیزی سے چرچر بہت زیادہ بولنے والوں کے شور مچاتے جنگل سے) نکال کر دور شمال میں اپنے گاؤں ریحانہ کے پاس بسانے میں فیلڈ مارشل ایوب خاں کی بد ہضمی کا بھی خاصا ہاتھ تھا۔

(یہ بات راقم الحروف کو ۱۹۶۲ یا ۶۳ میں ایوب خاں کی اُس وقت نوعمر صاحبزادی نے اُن کے پُرسکون گاؤں ریحانہ کی آبائی رہائش گاہ میں بتائی تھی۔ راقمہ کالج کی لڑکیوں کے ساتھ مری اور ایبٹ آباد کی سیر و سیاحت کو گئی تھی۔ ساتھ پڑھنے والی ایک لڑکی ایوب خاں کی صاحبزادی کی دوست تھی۔)

بڑی طاقتوں کی میزوں پر دھرے نقشوں میں یہ عمان کھاڑی کے دہانے پر نیلے پانیوں کے پار اپنے عین سامنے جڑواں شہر مسقط کو تاکتا اور ہاتھ ہلاتا نظر آ سکتا ہے؛ گرم پانیوں کے دہانے پر، جہاں سے تیل کی دولت سے مالامال مشرقِ اوسط کے وسائل تک رسائی سہل اور کم خرچ ہے اور خوش حال، پھلتے پھولتے بازار، زیادہ سے زیادہ چیزوں کی زیادہ سے زیادہ قیمت دینے کے اہل صارفین کی زیادہ سے زیادہ اور روزافزوں تعداد...

اردو میں کٹ کٹ بولنے اور بولتے ہی رہنے والے مہاجرین (جیسا کہ بہت سے دوسری زبان بولنے والوں کو شکایت ہے) ۱۹۴۷ میں جس شہر میں پہنچے وہ ایک خوب صورت، صاف ستھری اور

Scanned with CamScanner

مختصر بندرگاہ تھا، گو اُس وقت بھی یہ اپنی ماہیت میں وسیع المشرب تھا۔ یہاں ایران سے ہجرت کر کے سورت کی بندرگاہ پر اترنے اور پھر کراچی میں آ کر بس جانے والے پارسیوں اور بہائیوں کی کالونیاں آباد تھیں، بوہروں اور خوجوں کے محلّے تھے، پرتگالی اثرونفوذ میں عیسائیت اختیار کرنے والے رومن کیتھولک گوانیوں کی بستیاں تھیں جن کے بنائے ہوئے چرچ جا بجا ایستادہ ہیں۔ (پاکستان کا سب سے بڑا رومن کیتھولک چرچ کراچی میں ہے۔ اس کے برعکس، برطانوی راج کے زیرِاثر عیسائی بننے والے پروٹسٹنٹ، عموماً پنجابی خاکروبوں، کا چرچ گو تعمیر میں شاندار ہے مگر اس کے ممبروں کی تعداد کراچی کے قدیم تر رومن کیتھولکوں سے کم ہے۔ سفید پوش روزگار کمانے والے ان کیتھولکوں کا ایک خفیہ چٹکلا یہ ہے کہ کراچی کے امریکی اور برطانوی سفارت کار تیج تیوہار کے موقعے پر "بھنگی چرچ" میں عبادت کرتے ہیں۔)

شہر کی پرانی گلیوں میں کھارادر کے آس پاس جینا ذات کے ناموں کی اکادکا تختیاں آج بھی کہیں نظر آ سکتی ہیں (وہی ذات جو محمد علی نامی ایک عظیم سیاست داں کے ساتھ منسلک ہو کر مشرف بہ اسلام کیے جانے پر، یا اردوائے جانے پر، حاے حطّی سے لکھی گئی اور جناح بنی۔ مگر جسے اس نومسلم، اپنی اصل میں گجراتی، ذات کے دوسرے افراد نے نہ اپنایا، ورنہ آج کتنے جناح گھومتے پھرتے! کیا آپ کو کبھی تعجب نہیں ہوا کہ برصغیر میں جناح ذات کا کوئی دوسرا بندہ بشر کیوں نہیں؟)

انیسویں صدی کے وسط میں برطانوی قبضے میں آنے کے بعد بھی اس شہر کا کثیر قومی اور کثیر تہذیبی مزاج برقرار ہی رہا تھا جس میں یہاں رہنے والی ہندو آبادی اور اس سے تعداد میں بہت کم مسلم آبادی (جو یوں بھی اندرونِ سندھ کے علاوہ دوسرے ملحقہ علاقوں، کچھ، گجرات یا سوراشٹر سے آئی ہوئی تھی) کہیں جذب تھی۔ اسی لیے یہ شہر صرف سندھ کے دوسرے شہروں ہی سے نہیں بلکہ اس پورے خطّے سے قطعی مختلف تھا جسے اب مغربی پاکستان کہا جا رہا تھا، اور اپنی ماہیت اور خمیر میں بحیرۂ عرب کے اس کٹے پھٹے ساحل پر ذرا نیچے اتر کر آباد عروس البلاد بمبئی سے زیادہ مماثل تھا۔

مگر ۱۹۴۷ کے آس پاس مذہبی فرقے کا شعور بڑھنے کے باعث (جیسا کہ پورے برصغیر میں، کہیں کم، کہیں زیادہ، کہیں جلد اور کہیں بدیر، ارتقا پا رہا تھا) سندھ میں بھی مسلمان اپنی مذہبی حیثیت پر اصرار کرنا شروع کر رہے تھے۔ سندھ کے بمبئی سے علیحدہ ہونے کے بعد وہ اس شہر میں بتدریج رہائش اختیار کر رہے تھے۔ پچاس کے قریب برسوں میں ایک میگاپولس بن جانے والے اس شہر کی آبادی ۱۹۴۱ کی مردم شماری کے مطابق چار لاکھ نفوس کے لگ بھگ تھی۔ ۱۹۵۱ میں یہ آبادی گیارہ لاکھ ہو چکی تھی۔ قدیم آبادی سے بھی دُگنی تعداد میں یہاں آ کر بسے مہاجروں نے اس شہر کو پلک جھپکتے میں ایک مہاجر شہر بنا دیا تھا۔ ان میں بھاری تعداد اردو بولنے والوں کی تھی جو مہاجر کیمپوں سے نکل نکل کر شہر بھر میں پھیل رہے تھے؛ جن سے بن پڑا متروکہ مکانوں کے تالے توڑ کر ان پر قبضے کر رہے تھے، یا جھگیوں جھونپڑیوں میں رہ رہے تھے۔ پچاس کی دہائی تک کراچی میں آپ کو جا بجا جھگیوں جھونپڑیوں سے

Scanned with CamScanner

پٹے میدان نظر آسکتے تھے۔ ساٹھ کی دہائی تک یہ لوگ مکانوں، فلیٹوں میں منتقل ہو چکے تھے۔

دنیا بھر میں ہجرت کرنے والے گروہوں کی طرح، جو پرانے طور طریق، معاشرے اور عادات کی زنجیریں توڑ چکے ہوتے ہیں، یہ جمِ غفیر بھی اس سرزمین پر، یہاں کے قدیم بسنے والوں، پرانے طور طریق، عادات اور اقدار میں ہنوز بندھے باسیوں سے کہیں بڑھ کر، بہتر سے بہتر روزگار اور زندگی کے وسائل حاصل کرنے کی جدوجہد میں جٹا ہوا تھا۔ یہ لوگ بات بے بات "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگاتے، ایک ایسے ملک کے باسی تھے جو نصف زمین پر اور نصف ان کے اپنے ذہن میں تھا۔

آنے والے برسوں میں اس نئے اپنائے ہوئے وطن کی طبعی حقیقت (مع اپنے باشندوں کے) ان کے تصوراتی وطن سے ٹکرانے والی ہے۔

فی الحال تو وہ مسلم لیگ میں ہیں، اور قائدِ ملت نواب زادہ لیاقت علی خاں فضا میں مکا بلند کر رہے ہیں اور مہاجرین کے جمِ غفیر پاکستان زندہ باد کے پُرشور نعرے لگا رہے ہیں۔

آنے والے چند برسوں میں ہجرت کر کے آنے والے ہیولے جیسے انبوہ کے خط وخال نمودار ہونا شروع ہو جائیں گے، جیسے وقت کی ریگ پر تصویر کے نین نقش اُبھرتے ہیں۔ ان میں ایک ریوڑ کے بدلے افراد، گروہوں اور طبقوں کے نقوش قابلِ شناخت بننے لگیں گے۔ یہاں سے اردو کے دو بڑے اخبار "جنگ" اور "انجام" نکلیں گے۔ انگریزی کا اخبار "ڈان" جم جائے گا اور انگریزی مجلّہ "مرر" نکلے گا۔ ہفتہ وار "نمکدان" اپنے قہقہہ آور کارٹونوں سمیت خود غرض سیاست دانوں کے پرخچے اڑائے گا۔ یہاں کا پریس مختلف آرا کا ترجمان ہو گا۔ اس شہر کے کسی کوچے میں ابراہیم جلیس پبلک سیفٹی ایکٹ کی مخالفت میں "پبلک سیفٹی ریزر" لکھیں گے اور حسن ناصر مزدوروں کو منظم کرنے کی تحریک کا آغاز کریں گے۔ اونچے تعلیمی اداروں میں ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن مضبوطی سے جڑیں پکڑے گی۔ یہاں مختلف سیاسی رجحانات ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے اور تصادم کا شور اُٹھے گا، جیسا کہ دنیا بھر کی سیاست میں ہوتا ہے۔ دور، شمالی ہندوستان کے ہرے بھرے میدانی علاقوں سے آئے ہوئے یہ لوگ اپنے چھوٹے چھوٹے صحنچوں میں، گھروں میں اور گھروں کے باہر، ہر میسّر بیج اور پنیری بوئیں گے اور دور دور تک خالی پڑے چٹیل، غیر آباد ریتیلے علاقوں میں کسی آنے والے زمانے کی ہریالی کا انتظام کریں گے۔

یہاں بنیں گے دھڑادھڑ اسکول اور کالج۔ ہجرت کر کے آنے والی اس شہری آبادی کے سامنے آگے بڑھنے کا صرف ایک راستا ہے ___ تعلیم۔ حتیٰ کہ گجرات میں جنما ایک مزدور، اے ایم قریشی، کراچی آ کر دولت کمانے کے لیے اسکول اور کالج ہی بنائے گا، جب کہ اس کا حیرت انگیز طور پر مماثل ہمزاد، حاجی مستان، بمبئی میں نام اور پیسہ کمانے کے لیے اسمگلنگ کرتا رہے گا ___ ہجرت کا ایک تحیر خیز مثبت پہلو!

۱۹۵۸ میں ملک میں مارشل لا نافذ کرنے کے بعد، دراز قد، سرخ و سفید سربراہ مملکت جنرل ایوب خاں دارالسلطنت کو کراچی سے اپنے گاؤں ریحانہ کے نزدیک لے گئے۔ انھیں کراچی اور کراچی کے باشندے کچھ خاص پسند نہ تھے۔ کلبلاتی آبادی کے روزافزوں شور شرابوں اور مطالبوں سے اُکتا کر انھوں نے کہا تھا کہ اگر انھیں حکومت پسند نہیں تو جہاں چاہیں چلے جائیں، آگے تو سمندر ہے۔ (ان کے منھ سے نکلا یہ جملہ آناً فاناً مشہور ہو گیا تھا، اور آج تک اتنا مشہور ہے کہ وقتاً فوقتاً مہاجروں کے مسئلے سے تنگ آنے والے مذاق میں، طنز میں ـــــ اور کبھی سچ مچ ـــــ انھیں سمندر کا رخ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔) کچھ برس بعد جب ایوب خاں نئی مسلم لیگ بنائیں گے، جو در حقیقت ان کی ذاتی مسلم لیگ ہو گی، تو کراچی کے باسی اس میں شامل نہ ہوں گے۔

مگر اس دور میں، جب کہ ان کے شہر میں صنعت کاری کا سلسلہ عروج پر ہے، ملک کے شمال مغربی سرحدی علاقوں سے روزگار کی تلاش میں آنے والوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا ہے، اور ان کے ساتھ گنجان آباد پنجاب سے روزگار کاروبار کے لیے نت نئے مواقع ڈھونڈتے لوگ ایک موٹی دھارا کی مانند انسانوں کے اس سمندر میں گر رہے ہیں۔

شہر، حجم میں اضافہ کرتا ہوا، کسی نامیاتی اکائی کی طرح اپنے ہی ریشوں کی افزائشی قوت سے نئے عضلات پیدا کرتا، ان کی نشوونما کرتا، اپنے ہی زور میں کسمساتا، پیچھے ہی پیچھے سرکتا جاتا شہر ـــــ جیسے سمندر میں نصف دھڑ غرق کیے تسکین پانی پیتی مچھلی دھیرے دھیرے سرک کر باہر نکل رہی ہو جس کی پشت پر لوگ سند باد جہازی کی مانند کسی دور چلے جانے والے جہاز سے اتر پڑے ہوں۔

***

مسئلے کے پیٹ میں

اندرونِ سندھ سے سندھی کراچی میں پہلی بار ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں آئے ـــــ کلرکوں اور نائب قاصدوں کے کئی گروہ جو سستی آبادیوں میں کمکرائے پر ملنے والے فلیٹوں اور کوارٹروں میں رہنے لگے تھے۔ ان کے گول سروں اور گھنگھریالے بالوں والے چہرے اشتیاق سے چمکتے تھے۔ وہ جوش و خروش سے ہمارا کراچی کہنے لگے تھے۔ ماضی میں حکمرانوں اور حکمراں طبقوں نے سابق مشرقی پاکستان کی عددی برتری ختم کرنے کے لیے ملک میں "ون یونٹ" نامی جو نظام نافذ کیا تھا، جس نے تمام خطوں کی صوبائی حیثیت ختم کر دی تھی، اُسے توڑنے کی طویل تحریک کے دوران سندھی قومیت کا شعور پروان چڑھ چکا تھا۔ اس جدید سندھی تصور میں جو سندھ تھا اس میں کراچی بھی شامل تھا۔ یہ ایک ٹھوس جغرافیائی

Scanned with CamScanner

حقیقت بھی تھی؛ سندھ کے باقی زرخیز میدانی علاقے سے منسلک، یہ جغرافیائی لحاظ سے سندھ ہی کا حصہ تھا۔ برطانوی راج میں سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے اسے سندھ کا دارالحکومت بنانے کے لیے سندھیوں نے منظم اور کامیاب تحریک چلائی تھی، مگر پاکستان بننے کے بعد سندھی آبادی کراچی میں گزر نہ کر پائی تھی۔ ون یونٹ کے نظام میں سرکاری ملازمتوں پر پاکستان بھر کے ملازم بھیجے جاتے رہے تھے۔

۱۹۷۲ میں، جب ایک نیا دور شروع ہوا تھا تو سندھیوں کے داخلے کا بھی آغاز ہو رہا تھا، مگر یہاں آ کر وہ خود کو غیر سندھیوں کے سمندر میں پا رہے تھے۔ (ان کا سندھ کا تصور کراچی کی طبیعی حقیقت سے ٹکرا رہا تھا، وقت کے ہاتھ نے جس کو ماضی سے قطعی مختلف بنا دیا تھا۔) اسی لیے ان کو گھبرا نہیں، مگر ایک اُتھلا سا یقین تھا کہ کراچی سندھ کا حصہ ہے، کہ کراچی پر ان کا بھی حق ہے، اور اسی طرح کے چند ایک اور یقین...

اتفاق سے راقم الحروف کا اُنھیں دنوں اس طبقے میں کافی اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ان میں سے ایک ضلع کنڈیارو سے آیا تھا۔ اسے ایک پرائمری اسکول میں سندھی ٹیچر کی ملازمت ملی تھی، لیکن اس نے اپنے تئیں ہمیشہ ایک ادیب ہی تصور کیا تھا۔ وہ ہر وقت بغل میں پروگریسو پبلشرز کے ہاں نہایت سستی ملنے والی تالستائی، دستوئفسکی یا گورکی کی کوئی کتاب دبائے گھومتا تھا اور، گو کہ وہ سندھی قوم پرست تھا جیسا کہ اس کی نسل کے فیشن کا تقاضا تھا، درحقیقت وہ خود کو روسی محسوس کرتا تھا اور روس جا کر رہنا چاہتا تھا۔ اپنے جیسے دوسرے کئی چھڑوں کے ساتھ وہ لیاقت آباد اور ناظم آباد کے درمیان سندھی کلرکوں سے آباد کئی منزلہ گمنام سی عمارت میں رہتا تھا۔

ایک دفعہ میں نے ان لوگوں سے پوچھا تھا، "بھئی، آپ لوگ گھر والوں کو کیوں نہیں بلا لیتے؟ باقاعدہ گھر بسا کر کیوں نہیں رہتے؟"

اس پر انھوں نے معصوم اور بشاش قہقہہ لگایا تھا (جیسا کہ دیہات سے نئے نئے آنے والے سندھی کلرک لگاتے ہیں)، پھر ایک دوسرے کو چور نظروں سے تاکتے ہوئے کہا تھا:

"اڑی، ادھر کا بھروسا ہی کیا۔ ابھی کل کو بھٹو کی حکومت چلی جائے تو ہم سب کان لپیٹے وری گوٹھ جا رہے ہوں گے۔"

(اور ہوا بھی یہی۔ بھٹو حکومت کے خلاف ۱۹۷۷ کی پی این اے کی تحریک کے دوران سندھی کلرکوں کے فلیٹ کے نیچے رات رات بھر ڈھول بجائے جانے لگے۔ دو تین راتوں تک انھوں نے شہر کے خالی کر دینے کے اس صوتی مطالبے کی تھاپ سنی، پھر کان لپیٹ کر وری گوٹھ چلے گئے۔)

یا پھر کراچی میں وڈیرے آئے تھے، ایک گورنر یا وزیرِ اعلیٰ اور چند وزرا؛ ڈبل گھوڑا بوسکی کی کس کساتی شلواروں اور قمیصوں میں ملبوس، گلوں میں سونے کی زنجیریں ڈالے اور سونے کی انگوٹھیاں پہنے، وہ اپنے باورچیوں اور نوکروں اور مصاحبوں کی پلٹنوں سمیت کراچی میں وارد ہوئے تھے اور قیمتی کاروں میں دندناتے پھرتے تھے۔ وہ دھڑا دھڑ اشتیاق سے مہاجر عورتوں سے شادیاں کرتے اور معاشقے لڑاتے، اونچی

آوازوں میں شہوت بھرے قہقہے لگاتے، گفتگو کرتے ہوئے اپنی موٹی موٹی مونچھوں پر تاؤ دیتے اور اپنا بدن سہلاتے رہتے۔ ان کے مصاحب اور نوکر بھی اپنے شاہ سائیں کی شاہی کے نشے میں مست تھے۔

پی این اے کی تحریک کے دوران، جس کا رخ حیرت خیز طور پر آغاز ہی سے سندھی مخالف بن گیا تھا، میں نے چند مہاجر نوجوانوں سے سندھیوں کی مخالفت کا سبب پوچھا تھا۔ مختلف نجی اداروں، اخباروں اور چھوٹی موٹی دکانوں میں کام کرنے والے، موٹر سائیکلوں پر پورے خاندان کو بٹھا کر سفر کرنے والے ان محنتی، ہوشیار، متوسط طبقے کے نوجوانوں نے سندھیوں کا وہی حلیہ بتایا تھا جو اوپر وڈیروں کا تحریر ہے۔

مہاجر متوسط طبقے کو وہ صرف سندھی نظر آتے تھے، "سندھی وڈیرے" نظر نہیں آتے تھے۔ یہ نوجوان کراچی میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے؛ انھیں بالکل علم نہ تھا کہ ان کے اپنے آبائی وطن کے جاگیردار اور نوابین بھی بالکل اسی حلیے اور انھیں عادات کے تھے اور ان میں اسی قدر رعونت بھری تھی۔

ان نوجوانوں نے سندھی کلرکوں اور ہیڈ کلرکوں اور خود کو روسی ادیب سمجھنے والے پرائمری اسکول کے ٹیچر کو کبھی دیکھا تک نہ تھا، جو اگر چند برس یہاں رہ پاتے تو پیسے جمع کر کے اور دفتر یا بینک سے قرضہ لے کر موٹر سائیکل خرید سکتے تھے اور گوٹھ سے بچوں کو بلا کر، پورے خاندان کو ایک موٹر سائیکل پر متوازن کر کے، انھیں شام کو کلفٹن پر ساحلِ سمندر کی سیر کرا سکتے تھے۔ وہ اتنے تتر بتر اور دبے دبے تھے ــــ شہر کی بے گانگی اور خود اپنے نووارد وڈیروں کی رعونت سے اس قدر دبکے ہوئے ــــ کہ ان کا نظر آنا ممکن نہیں تھا، بالکل اسی طرح جیسے شہوت بھرے اونچے اونچے قہقہے لگاتے وڈیروں کا دور ہی سے دکھائی دے جانا لازمی تھا جو مملکت کے اس شہر کے اوّلیں بڑے اور مستحکم متوسط طبقے میں پیوند نہیں ہو سکتے تھے۔

مگر حقیقت یہی ہے کہ اگر پہلے منتخب وزیرِ اعظم اپنے جلو میں کس کساتے، رعونت بھرے وڈیروں کی کھیپ کراچی نہ لے آتے تو پہلی منتخب حکومت کے دور میں ہمارے، بظاہر سندھی قوم پرست مگر باطنی طور پر روسی ادیب، سندھی پرائمری ٹیچر کی موٹر سائیکل اور اس کے خاندان کی ساحلِ سمندر پر سیر کے امکانات موجود تھے۔ پھر شاید وہ روس جا کر بسنے کا ارادہ بھی ترک کر دیتا۔

***

مگر ہوگا نہیں ایسا

آنے والے برسوں میں ایم کیو ایم بنی ــــ مہاجر قومی موومنٹ ــــ اور تمام مہاجر، جیسا کہ انگریزی اصطلاح ہے، فردِ واحد کی طرح اس میں شامل ہو گئے، اتنی بھاری عددی قوت کے ساتھ کہ ایسا کسی

نے آنکھوں دیکھا اور نہ کانوں سنا۔
لوگ کہتے، "ارے خالہ، ارے چچی جان، ارے دولہا بھائی، ایسا جوش، ایسی وفاداری، ایسا جذبہ تو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا!"
مارٹن کوارٹرز میں اور حیدری میں اور محمود آباد میں بڑے بوڑھے سفید کرتوں میں لپ لپاتے، جھکی کمریں سیدھی کرتے ہوئے کہتے، "بھئی واہ، کیا بات ہے! یہ اتحاد دیکھ کر تو قیامِ پاکستان سے پہلے کا منظر آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ ارے اپنے آگرہ میں، کانپور میں، بنارس میں مسلم لیگ کے جلسوں میں نظر آتا تھا یہ جوش اور ولولہ! یہ عزم یا تو تب دیکھا تھا یا اب دیکھ رہے ہیں۔"

***

"دیکھیے کہ مسلم لیگ نے اپنے مُردہ بطن سے بچہ جنا ہے!" چھکن بھائی نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اور چہل قدمی کرتے ہوئے کہا۔ چھکن بھائی امریکا سے چند ہفتوں کے لیے آئے ہوئے ہیں اور حیدری میں اپنی بڑی بہن کے گھر ٹھہرے اس وقت رات کے کھانے کے بعد ہواخوری کر رہے ہیں۔ پیٹ پر ہاتھ کیوں پھیرتے ہیں؟ بھئی یوں ہی، طمانیت کے اظہار کے لیے!
"دیکھو بھئی، معاملہ تب بھی مائنارٹی کا تھا اور اب بھی وہی مسئلہ درپیش ہے۔" چھکن بھائی اپنے بھانجے اور بھانجی کو سمجھا رہے ہیں۔ "مائنارٹی پراونسز کے مسلمان پریشان تھے کہ ہندوستان میں ان کی حیثیت کیا ہوگی؛ سو وہ یک جان ہو کر پاکستان کے حصول کے لیے کوشاں ہو گئے۔ پاکستان بن گیا۔ اب یہاں آ کر وہ دوبارہ مائنارٹی ہو گئے۔ اس طرح تحریکِ پاکستان چلانے والوں، اس ریل گاڑی کو اصل ایندھن مہیا کرنے والوں کی اولاد نے ایم کیو ایم بنائی۔ یہ لوگ اُسی جوش و خروش سے اب ایم کیو ایم کے حامی بن چکے ہیں۔ دراصل یہ مسلم لیگ کا دوسرا جنم ہے۔"
"اور نظریۂ پاکستان؟"
"تو پیارے بیٹے، نورِ نظر، لختِ جگر! گروہی مفادات نظریے کی چھتر چھایا خود بناتے ہیں۔ یعنی آپ یہ کایا کلپ دیکھیے، اور اس پر غور کیجیے، کہ روٹی کپڑے اور آسائشوں کی ضرورت اجتماعی بننے کے عمل میں کسی قلبِ ماہیت سے گزر کر اپنی مادّی نجاست سے پاک ہو کر مقدّس، بلکہ الوہی بن جاتی ہے۔ آدمی اپنے روٹی کپڑے کے حصول کی لڑائی کو بہ آسانی اللہ کے نام اور حکم پر جہاد سمجھنے لگتا ہے۔"
چھکن بھائی امریکا میں رہتے ہیں اور "مفادات" کہتے ہوئے ذرا بھی نہیں گھبراتے۔
"تو فرض کیجیے کہ مہاجر اپنی نعرے بازی کے برعکس، اسلام اور پاکستان کے الوہی تصوّر کی خاطر نہیں آئے تھے، روٹی پانی کے لیے آئے تھے، تب کیا فرق پڑتا ہے؟ اکنامک مائیگریشن تو ایک بڑی حقیقت ہے۔ اب دنیا بھر میں حقیقت پسند سماجی ماہرین اسے ایک وے لِڈ (valid)، ایک معقول وجہ

ہجرت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ اماں تم نے کیوبا سے امریکا آنے والے مہاجرین کا نہیں سنا؟"

چھکن بھائی پہلے حیدر آباد کے کسی کالج میں نفسیات پڑھاتے تھے۔ اسکالرشپ پر امریکا گئے اور ڈاکٹریٹ کر کے واپس آئے۔ چند مہینوں میں انتظامیہ نے ان کا تبادلہ اندرونِ سندھ کسی انٹرمیڈیٹ کالج میں کردیا۔ چھکن بھائی چپ چاپ امریکا ہجرت کر گئے۔ اب وہاں کسی کالج میں پڑھاتے ہیں۔ اس وقت وہ بجلی کی روشنیوں میں جگمگاتی، حیدری کی پان کی دکان سے پان خرید کر کلّے میں دبا رہے ہیں۔ بس یہی نہیں ملتا انھیں ہیوسٹن میں؛ کھانے کے تمام مسالے اور درجنوں کے حساب سے لکھنوی کڑھائی کے کرتے اور سفید براق علی گڑھ کٹ پاجامے تو وہ ہر سال منگوا لیتے ہیں۔

"کیوبن مہاجرین..." چھکن بھائی کہتے ہیں، "تو اب تو دنیا اتنی بدل گئی ہے کہ قبلہ کاسترو سوشلزم کے ان بھگوڑوں کی فوری گرفتاری اور واپسی کے بجائے بڑے غصے سے امریکا سے مطالبہ کرتے ہیں کہ انھیں وہیں رہنے دیا جائے۔ ارے بھئی، کھائیں گے کمائیں گے، اَور کیا! بقول کسے کہ لینا ایک نہ دینا دو۔"

"تو باقی کے ملک سے بھی تو لاکھوں لوگ چلے آ رہے ہیں کراچی میں..." چھکن بھائی کے بھانجے نے بیزاری سے کہا۔ چھکن بھائی ہاتھ ہلاتے ہیں اور سمجھاتے ہیں۔

"دیکھو بھئی، ۱۹۹۲ میں ہماری یونیورسٹی کے ڈیموگرافی سنٹر کی ایک رپورٹ چھپی تھی ـــ آپ لوگوں کو بھی پڑھنی چاہیے؛ فوٹو کاپی بھجوادوں گا ـــ تو عالمی ماہرین نے پیش گوئی کی ہے کہ آنے والی دہائیوں میں روزگار کی تلاش میں آبادیاں بڑی لہروں کی صورت میں جنوب سے شمال کی طرف اور گاؤں سے شہروں کی طرف نقل مکانی کریں گی۔ اس کو تو کسی صورت روکا ہی نہیں جاسکتا۔" چھکن بھائی فیصلہ کن انداز میں کہتے ہیں، گویا کوئی کلاس لے رہے ہوں۔

چھکن بھائی کے بھانجے نے دوبارہ بیزاری سے کہا، "اور سندھی کہہ رہے ہیں کہ اتنے مہاجر! آ گئے، چھا گئے، کھا گئے سب کچھ!"

"بے شک، بے شک!" چھکن بھائی عقل مندی سے سر ہلاتے ہیں۔ "اتنی بڑی تعداد میں، ایک ہی جھٹکے میں اتنی بڑی ڈیموگرافک تبدیلی پر مقامی لوگوں میں غم و غصہ تو پیدا ہونا ہی تھا۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ بھئی کوئی معمولی بات تو نہیں ہوئی تھی؛ ہندوستان کی تقسیم! اتنا بڑا خون خرابا! آبادی کا اتنے بڑے پیمانے پر تبادلہ جس کی مثال دنیا بھر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ میں تو کہتا ہوں..." انھوں نے بھانجے کے ہاتھ سے الائچی قبول کرتے ہوئے کہا، "کہ سینتالیس میں ٹیلی وژن نہیں تھا، اور خبروں کی ترسیل کے لحاظ سے دنیا اتنی چھوٹی نہیں ہوئی تھی، ورنہ..."

"ورنہ کیا؟"

"ورنہ؟ ارے بھئی، مثلاً اگر بوسنیا پہلے ہو گیا ہوتا، تو دنیا کے بڑے عبرت پکڑ کر اور سبق سیکھ کر ہندوستان کی تقسیم کبھی نہ ہونے دیتے۔ یعنی کوئی بات ہے! ایسی اکھاڑ پچھاڑ جس نے سماجیات کی تو، کیا

کہتے ہیں، ایسی تیسی کر دی۔ اور مائناریٹی پراونسز کا مسئلہ جسے کہتے ہیں، وہ حل ہی نہیں ہوا۔ یعنی وہ وہیں ہیں جہاں تھے، بلکہ اَور بھی پیچھے چلے گئے۔

"اب یہ ہے کہ کوایگزسٹنس، یعنی ساتھ ساتھ، مل جل کر رہنا، نہایت اہم ماحولیاتی ضرورت ہے، بلکہ سَسٹین ایبل ڈویلپمنٹ کے لیے لازمی۔ علاوہ ازیں، دنیا بھر کے چھوٹے سے چھوٹے کلچر کی وائلڈلائف کی طرح پریزرویشن کی جارہی ہے، یعنی ملٹی کلچرازم۔"

"جیسا کہ گانا ہے، مل جل کے رہو اور پیار کرو، یہ چیز یہی جو رہتی ہے!" شکیلہ نے کہا۔ چکھن بھائی کی یہ نوعمر بھانجی وی سی آر پر خوب انڈین فلمیں دیکھتی تھی اور اس وقت حیدری کی ایک دکان پر جگمگ کرتی چوڑیوں پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔

"تو چکھن ماموں، آپ تو یہاں رہتے نہیں۔ آپ کے خیال میں ہونا کیا چاہیے؟"

چکھن بھائی مشورہ مانگے جانے پر خوش ہوئے۔ ان سے پوچھا جاتا تو وہ حیدر آباد سندھ میں اپنے کالج کی انتظامیہ کو کالج میں ایک بڑا نفسیاتی علوم کا مرکز قائم کرنے کا مشورہ دیتے۔ شہری نفسیات، دیہی نفسیات، کاروباری اور زرعی نفسیات ــــ الغرض پندرہ سیمینار کرواتے سال میں۔ پھر وہ امریکا نہ جاتے اور ان کا ہزاروں ڈالر ماہانہ کا نقصان ہوتا۔ خیر، پھر بھی انھوں نے کچھ سوچ کر مشورہ دیا۔

"بھئی ہونا یہ چاہیے کہ سندھیوں کو یہ خنّاس دماغ سے نکال دینا چاہیے کہ مہاجر تاعمر اور نسل در نسل یہاں مہمان یا دوسرے درجے کے شہری بن کر رہیں گے۔ سندھ اب عملاً دو زبانی صوبہ ہے۔ سو اس بات کو مان کر چلا جائے، دشمنی کا ماحول ختم کر کے کوشش کی جائے کہ سندھ کی ترقی میں مہاجروں کو شامل کیا جائے۔ اور مہاجروں کو بھی یہ خنّاس دماغ سے نکال دینا چاہیے کہ کراچی کوئی اُن کی ایسی جاگیر ہے جس میں دو سندھی داخل ہوں تو وہ واویلا مچانا شروع کر دیں۔ کراچی کو سندھیوں کے لیے ممنوعہ علاقہ بنانے کی خواہش کو الوداع کہنا چاہیے۔"

چکھن بھائی کا بھانجا غور سے ان کی عالمانہ باتیں سنتا رہا۔ پھر اس نے کہا:

"مگر ہوگا نہیں ایسا!"

"پھر کیا ہوگا؟" چکھن بھائی نے منہ اٹھا کر سوال کیا۔

"میرے خیال میں..." ان کے صرف ایم بی اے پاس پاکستانی تجربہ کار بھانجے نے کہا، "کہ پہلے ایک پر مار پڑی، اور دوسری کو حکومت دے دی گئی ــــ برائے نام سہی، مگر مار سے محفوظ حیثیت۔ پہلی انتظار کرتی رہی کہ کب میری باری آئے۔ پھر پہلی کی باری آئی، اور دوسری پر مار پڑی، خاصی تگڑی مار۔ پہلی کو حکومت دے دی گئی ــــ برائے نام سہی، مگر مار سے محفوظ حیثیت۔ تو آپ کے خیال میں اب دوسری کیا کر رہی ہے؟" اس نے چکھن بھائی سے پوچھا۔

"کیا کر رہی ہے! واویلا مچا رہی ہے، اَور کیا؟"

"وہ تو ہے مگر..." بھانجے نے سوچتے ہوئے کہا، "ساتھ ہی انتظار بھی کر رہی ہے۔ انتظار، کہ اب

Scanned with CamScanner

میری باری دوبارہ کب آئے گی۔"
چکن بھائی نے کہا، "اس پر مجھے اُس بلی کی کہانی یاد آرہی ہے جو دو چوہوں میں پنیر تقسیم کر رہی تھی۔"

***

شہر (۲)

پیچھے رہ گیا کراچی... دس ہزار فیٹ کی بلندی پر اُڑتے ہوئے آپ سوچتے ہیں، پیارا کراچی... اچھا کراچی... آپ دل ہی دل میں شہر کے طمانچے کھائے گال سہلاتے ہیں۔ شہر محنت کشاں، جو اپنے مزاج میں اتنا بے نیاز ہے کہ سخت ترین مارشل لا میں بھی کسی فوجی راج کے محکوم ملک کا شہر نہیں معلوم ہوتا؛ جہاں افسرانِ بالا آتے ہوئے اس بات کے لیے تیار رہتے ہیں کہ کم از کم اِس شہر میں ان کے گریڈوں سے، افسرشاہی کی سیڑھی پر ان کے خاص الخاص مقام سے کوئی مرعوب نہیں ہوگا؛ جہاں لوگوں نے اپنی دنیائیں آپ بنائی اور آباد کی ہیں۔ اور آپ یاد کرتے ہیں سینے میں فخر کا اُبال جب آپ کبھی رات کے دو بجے (اپنے سبزے، گیدڑوں اور بیوروکریٹوں میں غرق، خوابیدہ دارالسلطنت سے) وہاں پہنچے ہوں اور اسے بیدار اور روشن پایا ہو۔

جب فائرنگ سے شہر میں کثیرالتعداد قتل ہونا شروع ہوئے تو دو ایک روز ہی میں شہر میں ایک غیر مرئی خطِ فاصل کھنچ گیا۔ شہر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ــــ غریب اور امیر حصوں میں۔ یہ غریب حصے تھے جہاں فائرنگ ہو رہی تھی، سڑکوں پر چکراتی لاشیں گر رہی تھیں، گلیوں سے جنازے اُٹھ رہے تھے۔
یہ خوش حال علاقے تھے ــــ ڈیفنس سوسائٹی، کلفٹن ــــ جہاں رونق میں کمی نہیں آئی تھی؛ سی ویو پر ریستورانوں میں بیٹھنے کی جگہ نہ تھی، موٹرگاڑیوں کو پارک کرنے کی جگہ نہ تھی؛ جہاں کلاشنکوفوں کا دھواں نہیں، چرغوں اور تکّوں اور تلے ہوئے جھینگوں کی بھاپ کے مرغولے اُٹھ رہے تھے۔

جس رات ہاؤسنگ سوسائٹی کے ایک گھر میں اکٹھے سات قتل ہوئے (پولیس چوکی سے چند گز کے فاصلے پر، جب کہ پاس طارق روڈ کا بازار رمضان کی ان آخری راتوں میں پوری طرح بیدار تھا) لالہ رخ صبح یہ خبر سن کر دوڑتی ہوئی پڑوس میں گئی۔ اس کی پڑوسن، صائمہ باجی، اس وقت گھر میں اکیلی تھیں؛ ان کے شوہر دو دن کے لیے دفتر کے کسی کام سے فیصل آباد گئے ہوئے تھے۔ وہ ٹیلی فون پر کسی سے باتیں کر

رہی تھیں۔ لالی کے کان میں باتوں کے جو ٹوٹے ٹکڑے پڑے ان سے اُسے اندازہ ہوا کہ وہ اسی واردات کے بارے میں بات کر رہی ہیں جو ان کے گھر سے صرف تین گلی پیچھے ہوئی تھی۔

فون رکھ کر صائمہ پلٹیں۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں عورتیں دہشت سے ٹھٹک گئیں۔

دروازے کی گھنٹی دوبارہ بجی، اس بار ذرا زور سے۔

"کون... کون ہے؟" گھر والی نے بلند آواز سے پوچھا۔

"میں ہوں جی پلمبر،" ایک جانی پہچانی آواز آئی۔ محلّے کا نلکے ٹھیک کرنے والا آیا تھا۔ صائمہ باجی کے باورچی خانے کا نل کئی دن سے رس رہا تھا۔ کل ہی تو انھوں نے لڑکا بھیج کر کہلوایا تھا کہ وہ کسی وقت آ کر دیکھ لے۔ اور اب لالہ رخ کے ساتھ کھڑی وہ دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں، اس سوچ میں گم کہ دروازہ کھولیں یا نہ کھولیں۔ آخر انھوں نے پلمبر کو بلا لیا۔ وہ اسے نل دکھانے باورچی خانے میں لے گئیں۔

لالہ رخ گول کمرے کے وسط میں گم سم کھڑی رہی۔ جب صائمہ باورچی خانے سے نکلیں تو انھوں نے سوالیہ نظروں سے لالہ رخ کی طرف دیکھا۔

اس نے کہا، "باجی... آج آپ نے سنا نا... ہماری گلی کے پیچھے... کل رات یہ سب ہوا۔ یا اللہ! پورا روڈ چل رہا تھا۔ یہ کس وقت ہوا ہوگا؟ کسی کو خبر کیوں نہیں ہوئی؟"

صائمہ ساری کے پلو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی گول کمرے میں داخل ہوئیں۔

"کہتے ہیں گیارہ بجے وہ لوگ آئے تھے۔"

"تو یہ... یہ... کیا قصہ تھا؟" لالہ رخ نے انتہائی منتشر دماغ سے سوال کیا۔ "شیعہ سنّی؟ یا... یا کچھ اور؟"

صائمہ باجی کا زرد پڑا ہوا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ انھوں نے چیخ کر کہا:

"کہاں ہو رہی ہے شیعہ سنّی کی لڑائی؟ آپ جانتی ہیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے، کون لوگ یہ قتل کر رہے ہیں۔ جیسے جانتی نہیں..."

لالہ رخ بھونچکا رہ گئی۔ یہ حملہ اس قدر غیر متوقع تھا کہ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ گڑبڑاہٹ میں وہ "میرا مطلب تھا باجی..." بدبداتی، خاموشی سے صائمہ بیگم کے گھر سے نکل کر اپنے گھر آ گئی۔ گھر آ کر وہ گم سم اپنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی نند نے اسے اس حالت میں دیکھ کر پوچھا:

"کیا بات ہے بھابی؟ کہاں گئی تھیں؟"

"ہیں؟" اس نے چونک کر کہا۔ "کہیں، پڑوس میں، صائمہ باجی کے یہاں۔"

"تو کیا بات ہو گئی؟" نند نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" لالہ رخ بالکل گم سم تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ وہاں موجود نہیں ہے۔ اسے

Scanned with CamScanner

اپنے چاروں طرف سناٹا پھیلتا محسوس ہو رہا تھا جس میں وہ کسی چڑیا کی آواز، دور کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی غراہٹ اور پنکھے کی گھرر گھرر اچانک سن سکتی تھی۔ بہت دیر تک وہ دم بخود بیٹھی رہی۔ پھر اس نے تاثر سے خالی آواز میں کہا:

"صائمہ باجی... صائمہ سمجھتی ہیں کہ یہ قتل... شاید میں نے کرائے ہیں۔"

پلمبر کے جانے کے بعد صائمہ نے دروازہ بند کیا۔ صبح سے ان کے گھٹنے میں ہلکا ہلکا درد تھا جو اچانک شدت پکڑ گیا تھا۔ کچھ لنگڑاتی ہوئی وہ اپنے سونے کے کمرے میں آ کر پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ انھوں نے چار اطراف نظر ڈالی؛ خالی دیواریں، ہوا کے جھونکے سے سرسراتا پردہ، فرش پر بچھا پرانے قالین کا ٹکڑا۔ گھر خالی تھا۔ پچھلے گلیارے سے کوئی ٹین کھڑکھڑاتا ہوا گزرا۔ صائمہ بیگم دونوں ہاتھوں میں منھ دے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ وہ بہت دیر اکیلے گھر میں بیٹھی روتی رہیں۔ پھر انھوں نے اپنی بہن کو فون کیا:

"مجھ سے تنہا رہا نہیں جاتا۔ مجھے آ کر لے جاؤ۔"

پھر بعد میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ دراصل قاتلوں کو ایک شیعہ کی تلاش تھی جو کہ مارا گیا۔ (مرنے والوں میں ایک شیعہ بھی تھا۔) دوسرا خیال یہ تھا کہ قتل کا مقصد شہر میں دہشت پھیلانا تھا۔ تیسرا خیال یہ تھا کہ یہ دراصل ڈاکے کی واردات تھی۔

پھر ایک دھند ہر طرف چھا گئی۔

جوں جوں تشدد کی وارداتوں میں اضافہ ہو رہا تھا وہ نابینا ہوتے جا رہے تھے ــــ ایک اصطبل میں بند ــــ ان کے درمیان ایک ہاتھی تھا اور وہ اس کے اُس عضو پر جو ان کے سامنے تھا ہاتھ پھیر پھیر کر ہاتھی کی شکل کی وضاحت کر رہے تھے، اور انھیں اس کی پروا نہ تھی کہ اس کے پیروں تلے وہ سب کچلے جا رہے ہیں، کیوں کہ ان کی آنکھوں پر اپنے اپنے موقف کی پٹی بندھی تھی۔

بات صرف اتنی نہ تھی کہ وہ لوگ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے ــــ شہر کے ساتھ کی جانے والی ایک زبردستی، ایک بلاتکار کے دوران وہ حقیقت جاننے کی خواہش سے محروم ہو چکے تھے۔ وہ ہر وقوعے کو اپنی مرضی کا مطلب پہنا رہے تھے اور سرِمو جاننا نہیں چاہتے تھے کہ کراچی میں دراصل ہو کیا رہا ہے۔

شہر ان گنت لکیروں میں تقسیم تھا جو ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ اجتماعی ناگہانی میں خوف سے لرزتے ہوئے ــــ تنہا ــــ کسی سے جُڑ جانے کی اضطرابی سعی میں ان کے اندر قدیم ترین گلّے کی جبلت جاگ اٹھی تھی، جو فی الحال زبان کی بنیاد پر انھیں دوسروں سے جوڑ سکتی تھی۔

Scanned with CamScanner

سندھی سندھی سے، اردو بولنے والا اردو بولنے والے سے، پٹھان پٹھان سے اور پنجابی پنجابی سے جڑا ہوا...

نفرت اور انتقام کی آگ میں جھلستا ہوا شہر...

ریاستی مشینری سچ بتانے سے قاصر یا گریزاں؛ اپنی ہی کسی توڑمروڑ مہم میں غلطاں...

جب مساجد کے اندر خوں ریزی شروع ہوئی تو سرکاری اداروں نے کہا: "مسلمان ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ ہندو ہیں؛ بھارتی ایجنٹ!"

کراچی کے گلی کوچوں میں لوگوں نے کہنا شروع کیا: "مسلمان ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ ہندو ہیں۔ وہ سندھی پولیس جو اندرونِ سندھ سے کراچی لائی گئی ہے، سب ہندو ہے؛ کیوں کہ تمام سندھی ہندو ہیں، یہ بظاہر مسلمان بن گئے ہیں، راجہ داہر کی اولاد!" ان کی نظر میں ہندو اس وقت تک ٹھیک طرح سے قابلِ نفرت نہیں ہو سکتا تھا جب تک وہ سندھی بھی نہ ہو۔

اس طرح پاکستان بنانے سے پاکستان میں بسنے تک کا ایک دائرہ مکمل ہوتا ہے۔

ریاست کی داغ بیل پڑنے کے ساتھ ہی جس سرکاری پالیسی کا زور شور سے اعلان اور پرچار کیا گیا، یوں تھی: "مسلمان کے لیے مسلمان کو قتل کرنا بری بات ہے۔" دوسرے لفظوں میں: "قتل کرنا بری بات نہیں؛ مسلمان کو قتل کرنا بری بات ہے۔"

لوگوں نے ایک دوسرے کو کافر کہہ کر قتل کرنا شروع کر دیا۔

اور سندھی! مبادا آپ انھیں فرشتہ سمجھیں۔

کراچی سے متعدد سندھی اخبار نکلتے ہیں۔ ایک آدھ مضمون کو چھوڑ کر ان کا لہجہ اس مصیبت زدہ شہر کے لیے نفرت اور حقارت ہی کا ہوتا ہے۔ صوبائی خودمختاری کے لیے تحریک چلانے کے باعث سرکاری ادراک کے مطابق برسوں تک غیر محبِ وطن اور بھارتی ایجنٹ وغیرہ کہلائے جانے والے سندھی ___ ان کا پڑھا لکھا طبقہ، ان کے دانش ور ___ اقتدار اور سرکاری قبولیت کی پہلی جھلک ملتے ہی ایک قلبِ ماہیت سے گزرتے ہیں اور سرکاری زبان میں بات کرنے لگتے ہیں۔ وہ مہاجر صوبہ بنانے کا ___ ملک سے علیحدگی کا نہیں، صرف صوبہ بنانے کا ___ مطالبہ کرنے والوں کو حکومت کا، بلکہ ریاست کا، باغی قرار دیتے ہیں، اور انھیں (کم از کم کئی ہزار نفوس کو) سرِعام پھانسی پر لٹکانے کے جواز میں آئین سے شقیں نکال سکتے ہیں۔ وہ تمام مہاجروں کو صرف دہشت گرد کے نام سے یاد کر سکتے ہیں، اور گو انھوں نے ابھی تک مہاجروں کو ہندوؤں کی اولاد نہیں کہا ہے (انھیں اس کا موقع نہیں ملا ہے) لیکن طویل مدت سے دیے جانے والے سرکاری بیانات کو ___ کہ مہاجروں کی نمائندہ جماعت دراصل ہندوستانی خفیہ ادارے "را" کی ایجنٹ ہے ___ وہ بتدریج سنجیدگی سے قرارواقعی قدر و منزلت دینے لگے ہیں۔ سندھی اتنے طویل عرصے تک معتوب رہے ہیں، اپنے خلاف زہر آلود بیانات سنتے رہے ہیں، کہ شاید وہ اپنے اوپر تھوپی گئی

Scanned with CamScanner

اس جہالت اور تاریکی کا جواب جہالت اور تاریکی ہی سے دینا چاہتے ہوں۔ اپنے وطن میں بہتر اقدار کی جیت انھوں نے کبھی دیکھی بھی نہیں ہے۔

***

کراچی اور جرمن

برٹولٹ بریشٹ جرمن تھے، اور اڈولف ہٹلر بھی۔ نازی پارٹی کے لاکھوں ارکان اور حامی بھی جرمن تھے؛ پاکستانی، حتیٰ کہ ہندوستانی تک نہیں تھے۔

برٹولٹ بریشٹ اگر پاکستانی، اور کراچی میں رہنے والے مہاجر ہوتے، تو اپنی نظم یوں لکھتے:

پہلے، بہت پہلے، سب سے پہلے
وہ پٹھانوں کے لیے آئے
(یہ غدار ہیں، علیحدگی پسند ہیں،
پختونستان بنانا چاہتے ہیں، ہندوستانی ایجنٹ ہیں)
میں پٹھان نہیں تھا
میں چپ نہیں رہا، میں اس کورس میں شامل ہوا
اور میں نے گایا
مارو... پکڑو... جانے نہ پائے...

پھر وہ بنگالیوں کے لیے آئے
"غدار... علیحدگی پسند... ہندوستانی ایجنٹ"...
میں بنگالی نہیں تھا
میں چپ نہیں رہا، میں نے گایا
مارو... پکڑو... جانے نہ پائے...
نامنظور... نامنظور... بنگلادیش نامنظور

پھر وہ بلوچوں کے لیے آئے

Scanned with CamScanner

غدار... علیحدگی پسند... ہندوستانی ایجنٹ...
میں بلوچ نہیں تھا
میں چپ نہیں رہا، میں نے گایا
مارو... پکڑو... جانے نہ پائے...

پھر وہ سندھیوں کے لیے آئے
غدار... علیحدگی پسند... سندھودیشی... ہندوستانی ایجنٹ...
میں سندھی تو خیر ہرگز نہیں تھا
میں چپ نہیں رہا، میں نے زیادہ جوش و خروش سے سُر اٹھایا
مارو... پکڑو... جانے نہ دینا...

اب وہ میرے لیے آئے ہیں
غدار... علیحدگی پسند... ہندوستانی ایجنٹ...
میں نہایت حیران پریشان کھڑا ہوں
اور سن رہا ہوں ایک کورس
سندھیوں، بلوچوں، پٹھانوں، پنجابیوں کی آوازوں کا
کورس میں شامل ہونے والی تازہ تازہ، نو آموز، کمزور سی آوازیں
جنھیں ابھی ٹھیک سے غدار، ہندوستانی ایجنٹ کہنا بھی نہیں آیا
مگر پھر بھی وہ لوگ مشق کر رہے ہیں
دھڑکتے دلوں سے، امید بھری اُمنگ سے،
کہ ایک دن ان کی ادائیگی بے نقص ہو جائے گی

۱۹۹۶ تک، جب کہ مملکتِ خداداد اپنے استقرار کے انچاس برس پورے کر رہی ہے، ہر قوم کو باری باری غدّار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دیا جاچکا ہے ــــ ماسوا پنجابیوں کے۔

اب رہے پنجابی، تو اس قوم (قومیت؟) میں انفرادی طور پر تو ہندوستانی ایجنٹوں کی کمی نہیں: شاعر فیض احمد فیض، شاعر حبیب جالب، صحافی مظہر علی خاں، سیاست داں میاں افتخارالدین۔ یہ فہرست اتنی طویل تو یقیناً ہے کہ ان کی تعداد پاکستان میں بسنے والی کسی بھی قومیت کے انفرادی طور پر اعلان شدہ غداروں اور ہندوستانی ایجنٹوں سے بڑھ کر ہو گی، مگر ابھی تک پنجابیوں کو من حیث القوم غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار نہیں دیا گیا ہے۔ اب آگے چل کر دو ممکنہ صورتِ حالات ہو سکتی ہیں:

Scanned with CamScanner

(۱) بقیہ تمام پاکستانی قومیتیں ایک دن پنجابیوں کو کسی سیاسی تحریک کی بنیاد پر، یا کوئی دوسری جگاڑ لڑا کر، من حیث القوم غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دے دیں گی۔

(۲) دوسری قومیتیں اسٹیبلشمنٹ پر اس حد تک قبضہ نہ کر پائیں گی کہ پنجابیوں کو غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دے سکیں، لہذا اسٹیبلشمنٹ کے پنجابی افراد ہی باری باری دوسروں کو (ہر بار دوسرے دوسروں کی مدد سے) غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دیتے رہیں گے۔

واضح رہے کہ مندرجہ بالا دو امکانی صورت کے علاوہ یہاں تیسری صورت حال پیدا نہیں ہو سکتی۔ یا اگر آپ ایک ناقابلِ شکست رجائیت پرست ہوں تو اس بات کو یوں کہہ سکتے ہیں: کیا یہاں کوئی تیسری صورتِ حال پیدا نہیں ہو سکتی؟

اب رہا ہندوستان، تو ہندوستان تو بہت ہنس رہا ہو گا، ایمان سے، کھنی میں منہ چھپا چھپا کر، چپکے چپکے ہنستے ہوئے لوٹن کبوتر کی طرح زمین پر لوٹ رہا ہو گا اور ہنسی کے مارے آنکھوں سے بہتے پانی کو پونچھتے ہوئے کہہ رہا ہو گا:

"لو سالو، ہور چوپو! الگ تو ہم سے ہو گئے ہو تم، میاں بھائی! اب دیکھو کیسی جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے —— یعنی باری باری ہر قومیت ہماری ایجنٹ!! ہا ہا ہا! قہ قہ قہ!"

سالا بنیا... مکار ہندو! ہم پر ہنستا ہے سالا دال خور...

مگر ہندوستان ۱۹۹۵ میں ہنس نہیں رہا۔ شاید وہ کچھ خاص غور سے پاکستان کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا، بلکہ تندہی سے ماتھے پر سیندور کا گھسا مارے، مذہبی جنونی سیاست کی طرف رواں دواں ہے۔

کیوں کہ... کیوں کہ وہ پاکستان سے مختلف ہے ہی نہیں۔ بالکل اسی جیسا تو ہے ہندوستان!

***

لہو کا سُراغ

سمندر کے ساحل کلفٹن پر اونٹ کی سواری، پرانے شہر کے وسط میں بچھی چمکتی پٹریوں پر گھنٹی بجا بجا کر چلتی کھلونا سی ٹرام، اور سجی سجائی، دو گھوڑوں والی، کسی رتھ کی شان سے پکی سڑک پر ٹپ ٹپ کرتی جاتی وکٹوریا گاڑیوں کے علاوہ نعیم کی کراچی کی اولیں یادوں میں ایک ہلچل بھری رات بھی تھی۔ اُس رات کوئی نہیں سویا تھا۔

Scanned with CamScanner

نعیم کراچی سے چند گھنٹوں کے فاصلے پر حیدر آباد سندھ میں رہتا تھا اور اُن دنوں کراچی اپنی پھوپھی کے پیر الٰہی بخش کالونی کے تین تنگ کمروں، ایک دالان اور چھوٹے سے آنگن والے کوارٹر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس آنگن میں سلمانہ پھوپھی نے رات کی رانی اور چنبیلی کے جھاڑ لگائے تھے۔

پیر الٰہی بخش کالونی ـــــ جسے بعد میں سب صرف پی آئی بی کالونی کے نام سے جاننے لگے تھے ـــــ مہاجرین کی پہلی کھیپوں کے لیے عجلت میں تعمیر کی جانے والی مختصر اقامتی کالونیوں میں سے ایک تھی۔ دورویہ کوارٹر؛ بیچ میں سڑک اور دکانیں جہاں بدایوں کے پیڑے اور آگرہ کے سیو اور میرٹھ کی گزک ملتی تھی۔ اور دہی بڑے بھی۔

دہی بڑے، ایسے نہیں جیسے اب ملنے لگے ہیں۔ سلمانہ پھوپھی ۱۹۹۵ میں کہتی ہیں، "یہ تو دہی پھلکیاں ہیں، بیسن کی، وہ بھی نگوڑی میٹھی۔ یہ فریسکو والے اللہ جانے کیا بناتے ہیں!" سلمانہ پھوپھی جانتی ہیں کہ اصلی دہی بڑے کیسے بنتے ہیں۔ "اُرد کی دال کو رات بھر بھگوتے ہیں۔ دوسری صبح نرم پڑی دال کو سِل پر ہلکے ہاتھ سے پیستے ہیں کہ وہ بس دُردُری ہو جائے۔ پھر ملاتے ہیں اس میں توے پر سینک کر ہتھیلی پر مَسلا زیرہ، نمک اور موٹی پِسی ہوئی کالی مرچ۔ چاہو تو ذرا سی لال مرچ بھی ملا دو۔ پھر بڑے بنا کر اچھی طرح بھاپ دیتے ہیں تاکہ نیم پخت ہو جائے۔ شامی کباب کی طرح دہی بڑے بناتے ہیں۔ پھلکیاں نہیں، تمھارے فریسکو جیسی۔ بڑے تو چپٹے ہوتے ہیں، چپٹے اور گول...

"اور تم بڑوں کو تل کر بغیر دہی کے یوں بھی کھلا سکتی ہو،" وہ اپنی بیٹی نشاط بانو سے کہتی ہیں جو لپ جھپ باریک روپہلے گوٹے کی چٹکی بنا رہی تھیں۔ ان کی پتلی پتلی انگلیوں میں گوٹے کا فیتہ آن کی آن میں ایک خوب صورت، آرائشی، نفیس اور گراں قدر تر (value-added) شے میں تبدیل ہو رہا ہے۔ یہ چٹکی، کلی اور کرن پیر الٰہی بخش کالونی کی دکانوں میں فروخت ہوں گی۔

سلمانہ پھوپھی بیوہ ہیں۔ وہ آگرے سے پی آئی بی کالونی کیوں کر پہنچیں، یہ ایک دوسری داستان ہے۔ مگر عبدالقادر بھرانی کے موجودہ تصوّر کے برعکس ـــــ کہ ہندوستان سے پناہ گیر، جو اَب اپنے آپ کو مہاجر کہنے پر مصر ہیں، بس یوں ہی، سندھ پر قبضہ کرنے کے لیے آ گئے تھے ـــــ حقیقت یہ ہے کہ اقلیتی صوبوں میں مسلمان بھاری تعداد میں مارے بھی گئے تھے۔ سلمانہ پھوپھی اسی لیے پی آئی بی کالونی میں بیوہ پہنچی تھیں؛ اپنی اور اپنے بچوں کی خیر مناتی، ایک کٹی ہوئی ٹرین سے مہاجر کیمپ تک۔ انھوں نے کراچی پہنچ کر دھاروں روتے ہوئے باقاعدہ زمین کو بوسہ دیا تھا اور کہا تھا: "پ...ا...ک...س...ت...ا...ن۔"

سن سینتالیس میں، شادی شدہ زندگی کے دس برس گزارنے کے بعد، یہاں پہنچی سلمانہ پھوپھی شادی سے پہلے آگرہ سے ایف اے پاس کر چکی تھیں۔ اب وہ پی آئی بی کے اسکول میں پڑھائیں گی اور اپنے بچوں، نشاط، مسرّت اور احسن، کی پرورش کریں گی۔ (اور بڑے ہو کر یہ سب ایم کیو ایم ـــــ مہاجر

قومی موومنٹ ــــ میں بھرتی ہو جائیں گے!)

اُس ہلچل بھری رات سلمانہ پھوپھی کے گھر میں ان کے مہمان آئے چھوٹے بھائی، نعیم کے باپ، کے سوا کوئی مرد نہیں ہے۔

یہ ۱۹۶۵ ہے۔ جنرل ایوب خاں اور قائداعظم کی بہن فاطمہ جناح انتخابی حریف ہیں۔ اس کڑے مقابلے میں کراچی کے باسیوں نے ــــ مہاجروں کی اس پہلی بڑی لہر نے جو کراچی کی زمین پر چھا گئی ہے ــــ فوجی جنرل پر جناح کی بہن کو ترجیح دی ہے۔ کراچی شہر نے جنرل ایوب خاں کی ایجاد کردہ بنیادی جمہوریت کے مراعات زدہ نظام تک میں بغاوت کی راہ نکالتے ہوئے فاطمہ جناح کو ووٹ دیا ہے۔

ایوب خاں بہرحال جیت گئے ہیں (کرسی نشین فوجی جنرل ہار نہیں سکتے!) اور اب ان کے صاحبزادے مسمّی گوہر ایوب کراچی والوں سے اس گستاخی کا انتقام لینے آئے ہیں؛ ایک جشنِ فتح منانے جس میں ان چرچر چرچر تیزی سے بولنے والے، پست قد، دبلے پتلے اور سانولے، اور برصغیر کے نہایت گرم خطّوں سے نازل ہونے والے سرکشوں کو سبق سکھلایا جائے گا۔

پی آئی بی کالونی میں رات کو حملے کا اندیشہ تھا۔ سب لوگ جاگ رہے تھے۔ محلّے کے نوجوان گلیوں میں پہرہ دے رہے تھے۔ وہ بجلی کے کھمبوں کے ساتھ کھڑے تھے اور ہاتھ میں آ جانے والی کسی بھی چیز (لکڑی کے ٹکڑے، پتھر، چمچے، کفگیر) سے کھمبے بجا بجا کر ایک دوسرے کو بیدار رہنے کا پیغام دے رہے تھے۔

آواز سے نعیم کی آنکھ کھل گئی۔ وہ آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس چھ سات برس کا لڑکا۔ وہ دوڑتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ سلمانہ پھوپھی کے گھر کے سامنے والے کھمبے کے ساتھ سراج کھڑا تھا۔

"اوہو منّے، تم اندر جاؤ!" سراج نے کہا۔

"سراج بھائی، میں بھی کھمبا بجاؤں گا۔"

سراج ان کے اپنے کنبے کا لڑکا تھا۔ دو کوارٹر چھوڑ کر ان کا گھر تھا۔ سلمانہ پھوپھی اور اس خاندان کا ایک دوسرے کے گھر روزمرّہ کا آنا جانا تھا۔ سراج نے نعیم کو ایک چھوٹا سا بی پی کا چاکلیٹ دے کر گھر میں واپس بھیج دیا تھا۔

لوٹتے ہوئے نعیم نے کھڑکی میں نشاط کی چھوٹی بہن مسرت کے دھانی دوپٹے کی جھلک دیکھی۔

"تو مسرت آپا کھڑکی میں کھڑی تھیں۔ کیوں؟" اس نے سوچا تھا۔ "شاید وہ بھی کھمبا بجانا چاہتی ہوں۔"

Scanned with CamScanner

اُس رات پی آئی بی کالونی پر حملہ نہیں ہوا تھا۔ مگر شہر کی زیادہ غریب آبادیوں، جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والے مہاجروں پر حملہ ہوتا رہا تھا۔ مارنے والے مقامی نہ تھے؛ وہ ملک کے شمال مغربی سرحدی علاقوں سے خاص طور پر لائے گئے اجنبی بتائے جاتے تھے۔ ان وارداتوں نے شہر کے غریب اردو بولنے والے علاقوں میں شدید ہراس پھیلا دیا تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں اس کا ذکر شاید نہ ملے، مگر اس ملک کی اصل تاریخ اپنی لافانی نظموں میں رقم کرنے والے شاعر فیض احمد فیض نے ان ہی کے بارے میں لکھا تھا:

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سُراغ

قاتلوں کو کبھی پکڑا نہیں گیا تھا، نہ کسی پر فردِ جرم عائد کی گئی تھی۔

نہ مدعی نہ شہادت، حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

سلمانہ پھوپھی کا خاندان، نشاط بانو، مسرّت بانو اور احسن، عصمت چغتائی کی کسی کہانی (مثلاً "چوتھی کا جوڑا") سے سیدھا نکل کر آیا ہوا معلوم ہو سکتا ہے۔ نشاط بانو اسی طرح سر جھکائے پراٹھے سینکتی ہیں۔ مسرت دریچے میں کھڑی، نگاہیں جھکائے، کلائی میں چوڑی گھماتی ہے (جو سراج اُسے ہم آغوش کرتے ہوئے چٹخا دے گا)۔ وہ مسرت سے شادی نہیں کرے گا۔ اس کی اور بنیادی خالہ (اس کی اماں) کی نگاہیں نئے ملک میں سماجی حیثیت بنانے کی خاطر اونچے خاندانوں پر لگی ہیں (نبر لاگی راجہ تورے بنگلے پر!) جلد ہی یہ پی آئی بی کالونی سے کہیں اَور منتقل ہو جائیں گے۔ (ہاؤسنگ سوسائٹی؟ اس محلّے کی تعمیر کے رموز کے لیے دیکھیے "ہاؤسنگ سوسائٹی"، از قرۃ العین حیدر۔) آئندہ برسوں میں سراج سی ایس پی کا امتحان دے کر ڈپٹی کمشنر تعینات ہو جائے گا، اور ایک بلندی کی جانب حرکت کرتی ہوئی (upwardly mobile) تازہ و توانا کلاس کا حصّہ بن جائے گا۔

مگر چوں کہ کراچی کی پی آئی بی کالونی یوپی کا کوئی قدیم، اپنی روایتوں کی چھاؤں میں نیم خوابیدہ شہر نہیں ہے (اور یہ عصمت چغتائی کی کہانی نہیں ہے)، اس لیے نشاط بانو اور مسرّت بانو کی شادیاں جلد یا بدیر ہو جائیں گی۔ نشاط کی شادی فرقان سے ہوئی جو کسی چھوٹی موٹی فرم میں کلرک تھے (حالاں کہ ان کے پاس ایم اے کی تین ڈگریاں تھیں: اردو، اسلامیات اور تاریخ)۔ مسرّت نے بی اے کر کے اسکول میں ملازمت کر لی اور گھر کا خرچ چلانے میں ماں کی مدد کرنے لگی۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے زمانے میں سفید پوشی کا بھرم رکھنا اور بچوں کی تعلیم کا خرچ برداشت کرنا اتنا سہل نہیں تھا۔ سلمانہ پھوپھی صبح کے وقت مقامی اسکول میں پڑھاتی تھیں اور دوپہر کے بعد جہانگیر روڈ پر ٹیوشن سنٹر میں پڑھانے جاتی تھیں۔ احسن اسکول

کے بعد ڈرگ روڈ پر ایر فورس کے جہازوں میں لوڈر کا کام کرنے لگا۔ لوڈر کا نیلا لباس وہ گھر میں بھی چھپا کر رکھتا تھا کہ کسی دوست کی نظر نہ پڑ جائے۔ اسے رات کی شفٹ میں کام مل گیا تھا۔ وہ اپنا یونیفارم تھیلے میں چھپا کر لے جاتا اور صبح کو اسی طرح سفید پوش لوٹتا جیسا کہ محلّے کے لوگوں نے اسے دن کے وقت دیکھا تھا۔

پی آئی بی کالونی میں سلمانہ پھوپھی کا گھروندے جیسا یہ مکان کسی عبادت گاہ کی طرح مقدس ہے۔ اس کے درودیوار سے محنتِ شاقہ کی مہک آتی ہے اور اس کے دسترخوان پر ماسوا رزقِ حلال کے اناج کا ایک ذرّہ بھی نہ رکھا گیا ہوگا۔

اس مختصر اور پاس پڑوس میں نہایت محترم خاندان پر چند برس بعد ایک ناگہانی آفت ٹوٹ پڑی تھی۔ ایک رات ایرفورس کے ٹارمک پر جہاز سے سامان اتارتے ہوئے کسی ٹرک سے ایک بھاری بکس احسن کی پیٹھ پر آگرا۔ احسن کو بے ہوشی کی حالت میں اسپتال میں داخل کرایا گیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ آئی تھی۔

یہ خبر سن کر کنبے اور محلّے والوں کے دل دہل گئے۔ بیوہ کا لال، یتیم اور نیک بچہ — اس کی صحت یابی کے لیے اپنے تو کیا غیروں تک نے جھولی پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگیں۔

احسن کئی برس چارپائی سے لگا رہا۔ صحت یاب ہونے کے بعد بھی وہ دوبارہ جسمانی مشقت کا کام کرنے کے قابل نہیں ہوسکا، مگر اس نے تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کردیا۔

مسرّت نے سات برس اس لیے شادی نہیں کی کہ وہ چارپائی سے لگے چھوٹے بھائی کا بوجھ ماں پر چھوڑ کر بیاہ نہیں رچا سکتی تھی۔ (جیسا کہ فلم "وچن" میں گیتا بالی کرتی ہے؛ حیرت، کہ زندگی بالکل فلم جیسی ہو سکتی ہے!) اس کے بعد ایک شریف خاندان کے برسرِروزگار لڑکے سے اس کی شادی ہو گئی۔ لڑکے نے کراچی کے ایک انسٹیٹیوٹ سے ہوائی سفر کی ٹکٹنگ کا کورس کیا تھا۔ اسے سعودی ایرلائنز میں ملازمت مل گئی۔ کچھ دنوں بعد مسرّت بھی اپنے میاں کے ساتھ جدّہ چلی گئی اور اب ہر سال کراچی آتی ہے — تین گول مٹول بچوں کی خوش و خرم ماں۔

سلمانہ پھوپھی نے کمال سادگی سے زندگی گزاری۔ اپنے لیے انھوں نے کبھی چاندی کا چھلّا بھی نہ بنایا۔ صرف احسن کی شادی پر، احسن کے شدید اصرار پر، بَری کے زیوروں کے ساتھ انھوں نے اپنے لیے ایک سونے کا لاکٹ بنوایا تھا۔ یہی ان کی کل ذاتی جمع پونجی تھی، جو وہ ایک دن بہ خوشی ایم کیو ایم — مہاجر قومی موومنٹ — کو دے دیں گی۔

***

۱۹۶۵ میں سراج — جو ایک رات پی آئی بی کالونی میں کھڑا بجلی کا کھمبا بجا کر شمال مغربی سرحدی صوبے سے لائے گئے جشنِ فتح منانے والوں کے حملے سے اس مہاجر بستی کے بچاو کے لیے پہرہ دے رہا ہے اور دریچے میں کھڑی مسرت سے معاشقہ لڑا رہا ہے، اور جو مسرت سے شادی نہیں کرے گا اور سی ایس پی افسر بن کر آنے والے برسوں میں ڈپٹی کمشنر تعینات ہو گا — اس وقت یہ بالکل نہیں جانتا کہ جنرل ایوب کی مخالفت کرنے والوں میں صرف کراچی کے اردو بولنے والے ہی نہیں؛ اس سے بہت دور، اندرونِ سندھ میں، شہداد کوٹ کے پاس ایک گمنام گاؤں میں رہنے والا اللہ ورایو بھی ان میں شامل ہے۔

اللہ ورایو ایک اسکول ٹیچر کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا باپ صاحب ڈنو حیدر آباد کے نور محمد ہائی اسکول میں سندھی پڑھاتا تھا۔ وہ عمر بھر حیدر آباد میں رہا اور صرف کبھی کبھی اسکول کی سالانہ تعطیلات میں گاؤں آتا تھا۔ یہ خبریں گاؤں تک اڑتی اڑتی پہنچی تھیں کہ حیدر آباد میں صاحب ڈنو نے ایک ہندوستانی سہیلی کر لی ہے، لیکن اس سے صاحب ڈنو کی کوئی اولاد بہرحال نہ تھی۔

اللہ ورایو کی ماں کبھی حیدر آباد نہ گئی؛ کچے مکان میں چھاج پھٹکتی، چکی پیستی، دودھ بلوتی شاہ بی بی سر پر کپڑے کی ایک دھجی کس کر باندھے سر اور نظریں جھکائے زندگی گزارتی رہی اور مٹی کے چولھے پر چاول کی سُرخ روٹیاں سینک کر اللہ ورایو کو کھلاتی رہی۔

لیکن ۱۹۶۵ میں صاحب ڈنو ریٹائر ہو کر گاؤں آ پڑا ہے۔ سرطان اس کی آنتیں کھا رہا ہے۔ وہ چارپائی سے لگا اپنے شیر خوار پوتے سے کھیلتا ہے اور اللہ ورایو کو گالیاں دیتا ہے۔ (سترہ برس کی عمر میں اللہ ورایو کی شادی کر دی گئی تھی۔ آنے والے برسوں میں وہ چار بچے اور پیدا کرے گا۔ اللہ ورایو کو کبھی ملازمت نہیں ملے گی۔)

صاحب ڈنو جنرل ایوب خاں کے حق میں ہے۔ وہ کہتا ہے، "اڑے پہلی بار تو ان مکڑوں [مہاجروں] کی کسی نے خبر لی ہے۔ اڑے خدا کی مار... یہ تو ایک ٹڈی دل ہے، آیا اور سب کچھ کھا گیا۔"

لیکن باپ کی ڈانٹ سے بے نیاز اللہ ورایو جنرل ایوب کی مخالف فاطمہ جناح کے انتخابی نشان لالٹین کے پوسٹر گاؤں بھر میں لگاتا پھر رہا ہے۔ کیوں بھلا؟ ایسی اس کی پارٹی کی مرضی ہے، جی ہاں، آپ کی جانی پہچانی، ہمیشہ معتوب (ہمیشہ زیرِ زمین) کمیونسٹ پارٹی کی۔

چار کتابیں سندھی، دس بارہ اردو اور ایک دو انگریزی کی پڑھ کر اللہ ورایو انقلابی ہو گئے ہیں۔ گاؤں کے اجتماعات میں وہ سندھی مصلح اور انقلابی حیدر بخش جتوئی کے زرعی سدھار کے حق میں تقریریں کرتا ہے اور گو ان جلسوں میں وہ اپنی گونج دار سُریلی آواز میں سندھ کا مقبول گیت "سندھی بولی قومی بولی" گاتا ہے مگر "قومی سوال" کو لینن کے اس موضوع پر مضمون، جمہوریت، آمریت، فوجی راج مردہ باد اور سامراج وغیرہ کے تانے بانے میں کہیں گندھا ہوا دیکھتا ہے۔

آنے والے برسوں میں پمفلٹ بانٹنے کے معمولی سے جرم پر گرفتار ہونے اور "کمیونسٹ" کا ٹھپا

Scanned with CamScanner

لگ جانے کے بعد اللہ ورایو کی قسمت پر مُہر لگ جائے گی: اسے کہیں نوکری نہیں مل سکے گی۔

برس بعد برس، بچوں کو بھوک سے بلکتا دیکھتے رہنے پر، دھیرے دھیرے انقلابی سے صرف ایک بےروزگار شخص میں تبدیل ہونے اور در در کی ٹھوکریں کھاتے رہنے پر اللہ ورایو نے شہداد کوٹ کے ایک کچے مکان میں گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرلی تھی۔

یہ خبر حیدرآباد اور کراچی پہنچی تو پارٹی کے لوگ سکتے میں آ گئے۔ (کیوں؟ کیا وہ اُس کی بےروزگاری اور بدحالی کی انتہا سے بےخبر تھے؟ ـــــ مگر وہ خود مستقل مار کھاتے رہتے تھے۔ بس وہ یوں ہی سکتے میں آ گئے، کیوں کہ اَور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔) پھر انھوں نے کچھ رقم جمع کر کے اللہ ورایو کی بیوہ اور بچوں کو بھجوائی جو اُن تک کبھی نہیں پہنچی۔ جواں مرگ سندھی انقلابی کی بیوہ اپنے بچوں سمیت اس کچے مکان سے کہیں جا چکی تھی۔ اس کے سختی سے پردہ دار میکے میں اُسے پھر کوئی تلاش نہ کر سکا۔

شہداد کوٹ میں کہیں دفن ہے اللہ ورایو ـــــ سوندھی مٹی سے گھڑا پتلا؛ مٹی کی امانت، مٹی کے حوالے۔

اللہ ورایو جو کبھی کراچی نہیں آیا؛ ایک سندھی نوجوان، اپنے لب پر ایک گیت اور آنکھوں میں ایک خواب لیے؛ ایک بےروزگار سندھی جو زندگی کے آدھے راستے میں ختم ہو گیا ـــــ تو اس کا ذکر اِس داستان میں کیوں کیا جا رہا ہے؟

یہ ذکر تو بس یوں ہی کیا جا رہا ہے؛ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی تھا۔ وقت کے اس برسوں پر محیط دورانیے میں جہاں انسانوں کے سمندر میں تموّج آتا ہے، تحریکوں کی لہریں اٹھتی ہیں، اللہ ورایو، زمین کا فرزند، مٹی اور پانی سے نمو اور آس پاس کی فضا سے رنگ و بو حاصل کرتے پودے کی مانند اٹھا اور کسی ڈپٹی کمشنر کے لاپروائی سے جاری کیے حکم نامے کی جھپیٹ میں آ کر، سزایافتہ اور روزگار سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو کر، مرجھایا اور خاک میں مل گیا۔ اپنی مہک، اپنے گیت اور اپنے خواب سمیت، سپردِ خاک!

نہ مدعی نہ شہادت، حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

***

Scanned with CamScanner

شاعر اور تاریخ

کراچی میں لالوکھیت اور گولی مار کی جھگیوں میں بسے مہاجرین (جو اُس وقت صرف غریب غربا کہلاتے تھے) کے قتلِ عام پر جب فیض صاحب نے یہ نظم لکھی تھی جس میں اس لہو کے بارے میں یہ مصرعے بھی تھے:

نہ رزم گاہ میں برسا کہ معتبر ہوتا
کسی علم پہ رقم ہو کے مشتہر ہوتا

اُس وقت ان کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا کہ آنے والے برسوں میں یہ لہو ایک پرچم ـــــ ایم کیو ایم کے پرچم ـــــ پر رقم ہوگا۔

شاعر تاریخ کو مستقبل میں غیر متوقع موڑ کھاتے سفر میں نہیں دیکھتا۔ وہ تو حال کے ایک لمحے میں آنسو بہاتے ہوئے، کرب کے عالم میں شعر جوڑتا ہے۔

مثلاً وہ مجمعے پر پولیس کی فائرنگ پر نظم لکھ دیتا ہے۔

شاعر تاریخ کے متوازی ایک لکیر کھینچتا ہے، متبادل امکانات کی لکیر۔

وقت کے بے شعور، اندھے ریلے میں شاعر اکیلا ہے۔ شاعر تاریخ نہیں؛ وہ اپنے شعور سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ شاید اسی لیے وہ تاریخ کے لیے بے مصرف نہیں ہو سکتا۔

***

آؤ بھاگ چلیں

جہانگیر روڈ پر ٹیوشن سنٹر کے پاس یوسف کو بس اسٹاپ پر کھڑے، رنگین آنچل لہراتی اور خوشبوئیں لٹاتی سلونی لڑکیوں کو چھیڑتے دیکھ کر سلمانہ پھوپھی اُسے ڈانٹتی ہیں۔

"ارے خوش بخت! کیوں خاندان کے نام میں بٹا لگا رہا ہے!"

کان دبائے ہنس کر بھاگتے یوسف کے کنبے کو سلمانہ پھوپھی آگرے سے جانتی ہیں۔ کئی بہنوں کا اکیلا، اس لیے لاڈلا، بھائی یوسف بہنوئیوں کی زبان میں "آوارہ" ہو گیا ہے۔ یوسف کی اماں ملال سے کہتیں: "نگوڑے کو فلم لائن میں جانے کا شوق چرایا ہے۔" آگرے کے ایک پٹھان خانوادے کا چلبلا نوجوان جو اتنا خوبرو، پُرکشش، تیز طرّار اور منچلا ہے کہ جہانگیر روڈ کی کوئی بھنگن بہشتن اس سے چھوٹی

نہیں ہے، اور نہ کوئی لونڈا۔ وہ چوطرفہ معاشقے لڑاتا ہے اور ان کے قصے یاردوستوں کو ہنس ہنس کر سناتا ہے۔

سب سے زیادہ مشکل اُسے جہانگیر روڈ کے پاس ایک پرانی بلڈنگ کے بالائی فلیٹ میں رہنے والی میمن حسینہ کلثوم سے عشق میں پیش آئی تھی۔ کیسی گدگدی تھی گوری گوری کلثوم ___ ناک میں ہیرے کی کیل، بڑی بڑی بھوری آنکھیں۔ کبھی کبھی سیڑھیوں کی تاریکی میں اُس کے گدرائے بدن کو خوب سا بھینچنے کا موقع ملتا! زیادہ تر تو بچاری خط و کتابت پر گزارا کرتی جو وہ ڈلیا میں رکھ کر سبزی لینے کے بہانے بالکنی سے نیچے اتارتی تھی۔ نیچے کھڑا، جانے کب سے آلو ٹماٹر اٹھائے انتظار کرتا یوسف جھٹ سے خط اٹھالیتا اور آلو یا گوبھی یا بینگن اپنے خط سمیت ڈلیا میں رکھ دیتا۔

ایک دفعہ اُس کا ایک خط پکڑا گیا۔ بھولے سے یوسف نے کلثوم کا خط اسکول کی کاپی میں رکھ دیا تھا۔ یوسف کے بہنوئی نے میز پر رکھی کاپی اٹھائی تو خط فرش پر جا پڑا۔ انھوں نے خط پڑھا تو گھر بھر میں کھلبلی مچ گئی۔ جو کچھ اس خط کی ٹوٹی پھوٹی اردو میں لکھا تھا اس میں کہیں بھاگ چلنے کا بھی ذکر تھا۔

"ابے مردود! لڑکی بھگا رہا ہے!"

یوسف کے بڑے بہنوئی نے اس رات جوان جہان لڑکے کو اٹھا اٹھا کر چھڑی سے اس کی خوب مرمت کی۔ یوسف کے کسرتی، دودھ ملائی پر پلے جوان بدن پر چھڑیوں کا کیا اثر ہوتا۔ بعد میں وہ اپنی بہن کے پیٹ میں منہ گھسیڑ گھسیڑ کر ہنستا رہا۔

"اے چل ہٹ، بے شرم،" یوسف کی بہن نے باریک چھالیا کترتے اور اُسے پرے دھکیلتے ہوئے نہایت دکھ سے کہا۔ "وہ تو وقت پر پتا چل گیا، ورنہ تُو نے تو ہم سب کو تھانے میں بند ہوا ہی دیا تھا۔"

ڈھیٹ یوسف پھر ان کے پیٹ میں منہ گھسیڑ کر ہنسا اور ان کے کوسنے سنتا رہا۔ پھر اس نے بتایا۔

"آپ کے سر کی قسم آپا، میرا کلثوم کو بھگانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بھلا یہ علت میں کیوں پالوں گا؟ اس بچاری نے تو مجھ سے باغ میں ملنے کے لیے لکھا ہے۔ اسے اردو ٹھیک سے نہیں آتی۔ باغ کو باگ کہتی اور لکھتی ہے۔"

یوسف کی آپا نے پہلے تو دم بخود ہو کر سر پیٹ لیا۔ پھر تھوڑی دیر تک مسکراہٹ ضبط کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کر سروتے کی آڑ لیتے ہوئے بہت دیر تک ہنستی رہیں جس کے بعد انھوں نے کہا:

"اے ہے! اردو نہیں آتی اللہ ماری کو!"

زبان کے مسئلے سے پیدا ہونے والی اس چھوٹی سی اُلجھن کے سوا یوسف کی زندگی میں سیاست کا سرمو دخل نہ تھا۔

Scanned with CamScanner

اُس کی بہنوں کی آرزو تھی کہ وہ ڈاکٹر بنے، مگر یوسف نے پڑھ کر نہ دیا۔ عرصے تک رسّیاں تڑانے کی کوشش کرتا یوسف آخر کار لاہور بھاگ گیا تھا۔ وہاں اس کی ہیرو بننے کی خواہش تو پوری نہ ہو پائی تھی مگر اس نے لاہور کی فلمی دنیا میں گھسنے کا ایک دوسرا راستا تلاش کر لیا تھا اور ہدایت کار شوکت حسین رضوی کی ٹیم میں شامل ہو گیا تھا۔ لاہور جا کر اس نے اپنا نام یوسف حسین زیدی رکھ لیا تھا۔ ہوشیاری کے کسی پیچیدہ چکر میں اس نے اپنے آپ کو شیعہ ظاہر کیا تھا؛ یا ہو سکتا ہے کہ اس بات نے بالواسطہ اس خاص گروپ میں شامل ہونے میں اس کی مدد کی ہو کیوں کہ شوکت حسین رضوی شیعہ تھے۔

لاہور میں یوسف کی شادی ہو گئی تھی۔ دراصل شادی اُسے کرنی پڑی تھی۔ لاہور پہنچ کر اس نے اپنے خاندان کے قدیمی ملازم کا پتا لگایا تھا جو وہاں ریلوے میں ملازمت کر رہا تھا اور ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتا تھا۔ یوسف نے اُس کے گھر ڈیرا ڈال دیا جسے اس نے بخوشی قبول کر لیا۔ مگر کچھ عرصے بعد جب یوسف کی سرمستیوں نے اس کی بیٹی کا پاؤں بھاری کر دیا تو رانگڑ بچے نے ایک رات قاضی بلا کر یوسف کی کنپٹی پر پستول رکھی اور چھوہارے تقسیم کیے۔ شادی کی خبر جب کراچی پہنچی تو کنبے میں کہرام مچ گیا۔ "رجب علی خاں کے اکلوتے وارث کی شادی نوکرزادی سے!"

نوکرزادی نے (جو بعد میں شمّو چچی کہلائیں) یوسف کا بڑا ساتھ دیا۔ چند برس بعد یوسف رُلتا کھُلتا اُس وقت کے مشرقی پاکستان میں ڈھاکا چلا گیا تھا۔ ملک کے اس حصّے کی علیحدگی کے بعد یوسف کراچی اس حالت میں پہنچا کہ کسی حادثے میں اس کا چہرہ، جو کبھی نہایت پُرکشش اور وجیہہ تھا، جھلس گیا تھا۔ اس کے ساتھ متعدد بنگالی نژاد اولادیں تھیں۔ ان میں سے دو کی ماں، ایک دلفریب بنگالن، ان کے ساتھ آئی تھی۔ مگر کچھ مہینے بعد اُسے کوئی اور لے اُڑا۔

بنگالن کی رخصتی کے بعد شمّو چچی نے آنسو بہاتے اور پونچھتے ہوئے سب بچوں کو سمیٹ کر کراچی کی ایک نئی بستی میں گھر بسا لیا۔

اس دوران یوسف کے تمام رشتے دار جہانگیر روڈ کے کوارٹروں سے اٹھ کر ناظم آباد اور ہاؤسنگ سوسائٹی منتقل ہو چکے تھے۔ ان کی ایک بھانجی کے ڈاکٹر شوہر نے ممیا سسر کو اپنے دواخانے میں بٹھا دیا۔ چند مہینوں میں دواؤں کی شُدبُد حاصل کرنے اور انجکشن لگانا سیکھنے کے بعد یوسف نے ایک قبضہ کیے ہوئے آدھ بنے مکان میں کلینک کھول کر "ڈاکٹر یوسف علی خاں" کی تختی آویزاں کر دی اور محلّے والوں کو موت کے گھاٹ اتارنے میں مصروف ہو گئے۔

زندگی میں پہلی بار انھیں سیاسی جماعتوں میں شمولیت کے اقتصادی اور سماجی فوائد کا احساس ہوا تھا۔ مگر یوسف — اب ڈاکٹر یوسف علی خاں — کی ایم کیو ایم میں شمولیت پر کسی نے غور تک نہ کیا تھا، کیوں کہ پورا محلہ، پورا ضلع، پورا شہر ایم کیو ایم میں یوں بھی شامل ہو چکا تھا۔

قوم یا قومیت کا تصوّر بھی یوسف میاں کے ذہن میں کچھ الجھا الجھا سا جاتا۔ سخت زندگی گزارنے کے

Scanned with CamScanner

بعد آیا بڑھاپا اُنھیں بار بار بیمار بھی ڈال دیتا۔ وہ چڑچڑاتے؛ پلنگ پر پڑے پڑے بنکارتے۔
"قوموں میں قوم تو پٹھان تھی [یعنی آگرے کے پٹھان]۔ ارے یہ مغل... یہ مغل تو نامرد تھے۔ زوجاؤں کے پاس خود تو پھٹکتے بھی نہ تھے۔ ارے ہم جانتے ہیں! ان کی عورتیں تو... ارے مُوسلوں کے ساتھ جاتی تھیں... بھائی ہاتھیوں کے ساتھ جاتی تھیں... سنتی ہو شمّو؟" وہ چلّاتے۔
دور کھری چارپائی پر پرانے کپڑے پھیلائے، چھوٹے کپڑوں کو بڑا اور بڑوں کو چھوٹا بنانے کی مہم میں غرق شمّو چچی بے خیالی میں قینچی چلاتے ہوئے کہتیں: "اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے... یا مولا مشکل کشا!" اور کترنیں بیونتنے میں مصروف رہتیں۔
جوانی کے اندر مہاراج یوسف میاں پر تیزی سے جھپٹّا مارتا بڑھاپا ان کے قویٰ کو مضمحل کر رہا تھا۔ وہ موسلوں اور ہاتھیوں کا تصوّر کرتے اور بدبخت مغل عورتوں کی متصوّرہ جسارتوں پر دانت پیس پیس کر کچکچاتے یوسف میاں شمّو چچی کی بے خیالی پر اَور بھی جھنجھلاتے۔ "کچھ سنتی تو ہے نہیں، کم عقل!" وہ بڑبڑاتے اور سخت روئی کے تکیے پر دائیں بائیں سر پٹکتے۔ پھر لوٹ پوٹ کر آپ ہی آپ ٹھیک بھی ہو جاتے اور اپنا مطب چلانے لگتے۔

۱۹۸۸ میں یوسف خواجہ اجمیر نگری کے پٹھان مہاجر فسادات کے دوران چھاتی میں گولی لگنے سے ہلاک ہو گئے۔ انھیں عبّاسی شہید اسپتال لایا گیا تھا۔ مرنے سے پہلے یوسف نے آنکھیں کھول کر پاس کھڑے، کسی بنگالن کی کوکھ سے جنمے، جوان بیٹے کو غور سے دیکھا تھا اور ایک لطیف، کُہر آلود راستے سے گزرتے ہوئے، ہنس کر بدلی ہوئی آواز میں کہا تھا:
"آؤ بھاگ چلیں!"

***

اس اسپتال میں احسن نہیں ہے۔ احسن نے کامرس میں گریجویشن کیا تھا اور اُسے ایک بینک میں نوکری بھی مل گئی تھی۔ مگر بینکوں کے قومیائے جانے کے بعد سفارشی بھرتی پر اپنے اوپر تعینات کیے گئے ان پڑھ افسر سے بددل ہو کر اس نے خاموشی سے کمپیوٹر کی مرمّت کا کورس کیا۔ (کسی بھی قسم کی محنت کو وہ یوں بھی بُرا نہیں سمجھتا تھا) اور تین ساتھیوں کے ساتھ مل کر گلشنِ اقبال میں ایک چھوٹا سا ادارہ قائم کر لیا۔ احسن کے ساجھے دار یہاں شام کو کمپیوٹر پروگرامنگ کی کلاسیں لیتے ہیں۔ احسن اور اس کے تینوں ساتھی ایم کیو ایم کے پکّے حامی ہیں اور گو وہ اس کے کسی عہدے دار سے زندگی میں کبھی ملے تک نہیں ہیں مگر وہ ہر بار اسی کو ووٹ دیں گے؛ اس جماعت کو جس نے، ان کے خیال میں، انھیں ایک تشخص، ایک اپنائیت کا احساس دیا ہے، جو انھیں کسی دوسری جماعت سے نہ مل سکا تھا۔

Scanned with CamScanner

اور نعیم، ہماری داستان کا وہ سات آٹھ سالہ بچہ کہاں گیا جو برسوں پہلے ایک ہلچل بھری رات میں پی آئی بی کالونی کا کھمبا بجانا چاہتا تھا؟

نعیم ہمیشہ حیدر آباد میں نہیں رہا۔ ۱۹۶۹ میں شہر سے دور جام شورو منتقل کی جانے والی سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ معاشیات میں داخلے کا فارم بھرنے کی کوشش میں پتلون اتارے جانے کے بعد ___ جب کہ اس کی مقعد میں دو تین گلابی صحت مند عضو ہائے تناسل طاقت ور دھکوں کے ساتھ گھسنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کے سر پر "جیے سندھ" کے نعرے گونج رہے تھے ___ روتے ہوئے اور سر پٹکتے ہوئے اس نے کراچی چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور حیدر آباد کے ان گنت خاندانوں کی طرح اس کا خاندان بھی کراچی آ کر بس گیا تھا۔

کراچی یونیورسٹی سے ایم ایس سی کر کے نعیم ٹورانٹو، یا اوٹاوا، یا واشنگٹن چلا گیا، جہاں وہ خوش حال ہے اور اچھا کھاتا کماتا ہے۔ آپ اس بات پر متعجب نہ ہوں کہ وہ ٹورانٹو یا اوٹاوا یا واشنگٹن ڈی سی میں ایم کیو ایم کا یونٹ صدر ہے۔

برسوں بعد آپ کا وہاں سے گزر ہوگا۔ ایم کیو ایم کے ٹورانٹو، اوٹاوا یا واشنگٹن ڈی سی میں اس جواں سال، بنس مکھ بزنس ایگزیکٹو اور ایم کیو ایم کے یونٹ صدر کے گھر کے گول کمرے میں بالہ کی منقش سندھی پیڑھیاں اور دیوار پر آرائش کے لیے لگائی سندھی اجرک آویزاں دیکھ کر آپ خاموشی سے آنکھیں پھیر لیں گے اور ایک بھی آنسو نہ گرانا چاہیں گے۔ آپ ان آنسوؤں کو واپس اپنے دل میں دھکیل دینا چاہیں گے۔ آپ اس پہیلی کا بھی کوئی حل معلوم نہ کرنا چاہیں گے کہ جبکہ بالائی سطح پر "میرا کلچر" اور "تیرا کلچر" کی گالم گلوچ اور نفرت بھری بحث جاری ہے، نیچے کہیں پاتال میں، ان جانے میں، مہاجروں کے وجود کا تہذیبی پہلو سندھ کے رنگ میں رنگ چکا ہے، اور یہ کہ پردیس میں وطن کی تہذیب کے نام پر ایم کیو ایم کے یونٹ صدر کو صرف بالہ کی منقش پیڑھی اور سندھی اجرک ہی کا خیال آتا ہے۔

***

مہاجر قومی موومنٹ

نچلے اور درمیانہ مہاجر طبقوں کے اس جمِ غفیر نے آخر کار اپنی نمائندہ، نسلی نام رکھنے والی، سیاسی تنظیم بنالی۔ اور ایسے کہ کسی نے کبھی دیکھا نہ سنا۔ شاہراہوں پر رواں انسانوں کا سمندر، گلی کوچوں سے اُبلتا ہوا...

Scanned with CamScanner

یہ کس قسم کی تحریک تھی؟
یہ اپنے طبقے اور ان حالات کی آئینہ دار ہی ہو سکتی تھی جن میں یہ وجود میں آئی۔ اس کی ناخوشگوار خصوصیات کرسی اقتدار کی نگرانی میں پیدا ہوئیں تاکہ وقت ضرورت کام میں لائی جا سکیں۔ اختلاف رائے برداشت کرنا اس کی خصوصیت نہ تھی، مگر اس سے ٹوٹے ہوئے گروہ کو پالنا پوسنا، تاکہ وقت ضرورت (اب کی بار خود اس کے خلاف) استعمال میں لایا جا سکے، اس کے خوف اور احساسِ عدم تحفظ کو صرف بڑھا ہی سکتا تھا۔
اس کے وجود میں آنے کے بعد سے اب تک تمام تر انتخابی عمل ثابت کرتا ہے کہ یہ مہاجروں کی نمائندہ اور اپنے لیے منتخب کی ہوئی تنظیم ہے، جبکہ علیحدہ کیا ہوا گروہ کوئی قابلِ ذکر عوامی حمایت نہیں رکھتا۔ ایم کیو ایم گزشتہ کئی برسوں سے عتاب میں ہے مگر ایسا کوئی عوامی اشاریہ موجود نہیں جس سے اس جماعت کی مقبولیت میں کمی نظر آتی ہو۔

ایم کیو ایم اور نواز شریف کی مسلم لیگ کے اتحاد سے قائم کی ہوئی سابقہ صوبائی حکومت کا دور، جس میں انتقام کی آگ میں جلبلتے ہوئے پیپلز پارٹی کے ایک منحرف (دراصل ٹھکرائے ہوئے) ممبر جام صادق علی کو سندھ کا وزیرِاعلیٰ بنا دیا گیا تھا، سندھ میں شدید بد نظمی اور بدامنی ہی کا دور کہا جا سکتا ہے جس سے کراچی بھی مبرّا نہ تھا۔ سندھ تو اس حد تک ڈاکوؤں کے قبضے میں چلا گیا تھا کہ اس کا زرعی نظام تار تار ہو کر قبائلی بلکہ خانہ بدوش دور کی طرف مراجعت کر رہا تھا۔ ہزار برس سے زراعت کرنے والے معاشرے کے کسانوں نے کھیتی باڑی کرنی چھوڑ دی تھی اور تیزی سے ڈاکوؤں کے گروہوں میں شامل ہو رہے تھے۔ اس قسم کی خبریں عام تھیں کہ مثلاً ایک قبیلے کے گاؤں پر دوسرے قبیلے کے افراد کے ڈاکے کے بعد پہلے قبیلے نے پورے سندھ میں ہر جگہ دوسرے قبیلے کے لوگوں کو قتل کرنے کا اعلان کیا ہے۔ کراچی میں بھی چوری، ڈکیتی، اغوا برائے تاوان کی وارداتیں انتہائی تواتر سے ہو رہی تھیں۔
آخر اسی دور میں دیہی سندھ میں فوجی مداخلت شروع ہوئی اور ابتدائی اکا دکا غلطیوں کے بعد فوج سندھ کے دیہات کی صورت حال سنبھالنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کامیابی نے سندھ کے کسانوں کے دل موہ لیے جنھوں نے ملک کی تاریخ میں پہلی بار مسلح افواج کو اپنا، ہم درد، دوست اور خیر خواہ سمجھا۔
لیکن کراچی میں صورت حال کیوں مختلف رہی؟ آپریشن کلین اپ شہر میں سکون اور اطمینان کی ایک بھی سانس لانے میں کیوں ناکام رہا؟ کس لیے یہ شہر آنسوؤں کا، ہر روز اٹھتے جنازوں کا، شک شبے کا، نفرتوں کا شہر بنا رہا؟
شہر کی ایک بڑی سیاسی تنظیم معتوب ہے۔ اس کی بنائی ہوئی اذیت گاہیں ٹیلی وژن پر دکھائی گئیں۔ انھیں ختم کر دیا گیا۔
شہر کے لوگوں نے خوشیاں نہیں منائیں؛ منہ لٹکائے پھرتے رہے۔

Scanned with CamScanner

ہزاروں نفوس پر مشتمل ایک پوری تنظیم زیرِزمین چلی گئی۔ شہر کی نچلے اور درمیانے طبقے کی آبادیوں نے انہیں اپنے اندر سمو لیا۔

ہزاروں گرفتاریاں ہوئیں۔ شہر میں ہولناک خبریں گشت کرنے لگیں۔ پوچھ گچھ میں لڑکوں کے ہاتھ پیر توڑ دیے گئے ہیں؛ ان کی ٹانگیں چیر کر انہیں نامرد کردیا گیا ہے۔

مہینوں راہ گیروں کو، سڑک پر چلتی موٹر گاڑیوں کو روک روک کر تلاشیاں لی جاتی رہیں، گویا دہشت گرد کار کی سیٹ کے نیچے یا بونیٹ میں بند ہیں۔

کراچی ایک ذلیل کیا ہوا شہر بن گیا۔

جلد ہی یہ خبریں عام ہو گئیں کہ امن و امان قائم کرنے والے ادارے اندھادھند گرفتاریاں کرنے لگے ہیں اور ہزاروں روپے لے کر رہا کرتے ہیں۔ شہر میں جرائم کی وارداتوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ شہر کے کونوں کھدروں میں لاشیں ملنے لگیں، اذیّت دے کر قتل کیے ہوئے لوگوں کی لاشیں۔

آپریشن کلین اپ کے پہلے برس میں شہر سے لڑکے غائب ہونے شروع ہو گئے۔ ان کی عمریں سترہ سے ستائیس برس تک کی بتائی جاتی ہیں۔ کہتے ہیں کراچی سے اٹھارہ ہزار لڑکے غائب ہو گئے۔

شاید اٹھارہ ہزار نہ ہوں؛ شاید یہ مبالغہ ہو۔

شاید نو ہزار ہوں، یا اس سے بھی کم۔

شاید پانچ ہزار ہوں۔

پانچ ہزار جوان لڑکے اپنے گھروں میں نہیں۔ کیا ان کے ماں باپ کو ان کے بارے میں علم ہو گا؟ کیا وہ جانتے ہیں کہ ان کا بیٹا کہاں ہے؟ کب لوٹ سکے گا؟

جس رات نہیں آتا ہوں میں
اس آنگن میں ہوتا ہے کوئی
اس بستر پر سوتا ہے کوئی
اس کمرے کی دہلیز پہ اپنا سر رکھ کر روتا ہے کوئی

(ساقی فاروقی)

محبّت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

(حبیب جالب)

Scanned with CamScanner

پھر محلّے محلّے کی ناکا بندی کر کے ہتھیاروں کے لیے گھر گھر تلاشی لی جانے لگی۔
یہ ہتھیار ـــــ برسوں کی مدّت میں سرکاری نظروں کے عین سامنے پھیلائے ہوئے ہتھیار ـــــ کسی کو نہ مل سکے! ہتھیار دنیا میں آج تک کہیں بھی برآمد نہیں ہو سکے ہیں۔ ہاں، اگر وہ عوامی حمایت ختم ہو جائے جو ان ہتھیاروں کے استعمال کو جائز سمجھتی ہے تو کسی کے لیے بھی ان کا استعمال کرنا مشکل بن جاتا ہے۔ ہتھیاروں کا استعمال اسی طرح ختم ہو سکتا ہے۔
مشرقی پاکستان میں ہم ہتھیار برآمد نہ کر سکے ـــــ ایک بہت بڑا خون خرابہ کر کے بھی نہیں۔

کراچی ـــــ تیسری دنیا کا ایک شہر، سرد جنگ کے اختتام پر، سرد جنگ کا ملبہ جھیلتا۔ اپنے فائدے میں استعمال کرنے کے لیے ان حکمرانوں کی سرپرستی کا شکار جنھوں نے اپنے معاشرے کی دھجیاں اڑا دیں، ایک ایسی سمجھ بوجھ کو جنم دیا جو منظم طور پر شہریوں کی مجرم سازی کو روا گردانتی ہے، ایسی تدبیروں کو تیر بہدف سمجھ سکتی ہے جن میں شہریوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر بھیڑیوں کی طرح شکار کرنے کے لیے چھوڑ دینا کسی مسئلے کا حل سمجھا جاتا ہو۔
اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ کراچی میں شہریوں کو ذمے دار اداروں کی جانب سے دہشت گردوں سے خود نمٹنے کے لیے ہتھیاروں کی پیش کش کی گئی ہے، یہ سوچے بغیر کہ ان کا دیا ہوا ہر ہتھیار ایک نیا قاتل پیدا کرے گا۔
اس شہر میں کسی اسٹیج ڈرامے کی مانند کثیر التعداد قتل کیے گئے ہیں۔ شہر کے خونیں چیستان میں شیعہ سنّی مساجد میں قتل اسی نوعیت کی وارداتیں ہیں، کیوں کہ شہر میں کوئی شیعہ سنّی تضاد موجود نہیں ہے۔ اس سلسلے میں عالمی ذرائع ابلاغ بھی اس حد تک گمراہ ہوئے ہیں کہ مساجد میں قتل کی ان پُراسرار وارداتوں کو "سیکٹیرین کلیش" کا نام دیتے رہے ہیں۔

ایم کیو ایم کی تنظیم جو اپنے طبقاتی مزاج اور اپنے وقت، اور اس پورے (سیاسی، معاشرتی) پس منظر کی عکاس ہے جس میں یہ وجود میں آئی؛ اگر آپ اس کا سر دیوار سے دے ماریں اور زہریلی، پھنکارتی سرگوشی میں کہیں:
"کس کے مشورے پر پارٹی بنائی تھی؟ ایجنسیوں کے مشورے پر؟"
(سٹی کورٹ کے سامنے دبلے پتلے مہاجر لڑکوں کا گروہ بڑبڑایا: "ایجنسیوں سے ملتے ہو؟ ایجنسیوں کے آدمی ہو؟" انھوں نے عظیم طارق کی ٹائی پر، اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔)
تو سننے والے کا چہرہ تمتما سکتا ہے۔ وہ پوچھ سکتا ہے: "انڈین نیشنل کانگریس کس نے بنوائی تھی؟ مسلم لیگ کس نے بنوائی تھی؟ انگریزوں نے؟" بلکہ شاید وہ ہکلاتے ہوئے یہ بھی پوچھ بیٹھے: "پی پی پی کس نے بنوائی تھی؟ امریکنوں نے؟ جنھیں خوش کرنے کے لیے آپ کے بھ... بھ... بھٹو صاحب

نے معاہدۂ تاشقند کی مخالفت کی تھی؟" امریکا کی مرضی تھی کہ اب ایوب خاں کو ہٹایا جائے۔ مگر ان سب سیاسی جماعتوں کی اس وقت ضرورت بھی تھی ــــ عوامی ضرورت ــــ اسی لیے یہ بن کر اس قدر کامیاب رہیں۔

اس تنظیم کو ــــ لاکھوں عام شہریوں کی نمائندہ تنظیم کو ــــ کن قوتوں نے اذیت گاہوں کے قیام سے، قتل سے، خون سے، ہتھیاروں سے داغ دار کیا؟ اور لوگ اب بھی اسے کیوں نہیں چھوڑتے؟

کراچی میں اس جماعت کے قائم کیے ہوئے اذیت خانوں کے دوش بدوش سرکاری، قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اذیت خانے بھی تھے جہاں اُس وقت کی معتوب پیپلز پارٹی کی نوجوان لڑکیوں کو ننگا کر کے ان کے نازک اعضا میں بجلی کے تاروں سے جھٹکے دیے جا رہے تھے۔ اس شہر میں، ایک وقت تھا کہ معتوب پیپلز پارٹی کے لوگ رات بھر سر چھپانے کی جگہ ڈھونڈتے پھرتے تھے۔

پھر یہاں ایم کیو ایم کرسیوں پر بٹھائی گئی، گو اسے فیتے کاٹنے اور لوگوں سے ہاتھ ملانے کے علاوہ شہر یا صوبے یا ملک کے اہم معاملات کو اپنی سمجھ بوجھ سے حل کرنے کا اختیار نہ تھا۔

انھیں جلوس نکالنے کا اختیار تھا، سو انھوں نے فقیدالمثال جلوس نکالے۔ انھیں بدعنوانیوں کا اختیار تھا (یہ اختیار یہاں سب کو دے دیا جاتا ہے) سو ان کے ہتھیار بند، اسکوٹر سوار لڑکے (جنھیں سرکاری نگرانی میں برسوں سے ہتھیار بند بنایا جاتا رہا تھا) بھتا وصول کرنے لگے۔

انھیں قابو میں کرنے کے لیے قانون نافذ کرنے والے ہتھیار بند اداروں کو تعینات کیا گیا۔ نہایت قلیل عرصے میں وہ بھی بھتا وصول کرنے لگے۔

کراچی میں دراصل ہو کیا رہا ہے؟ اور وہ کیا سچ ہے جو لکھا نہیں جا سکتا؟ عورت سوچتی ہے۔

یہ لکھا جاتا رہا ہے اور لکھا جا سکتا ہے کہ برسوں سے ظلم، دھونس اور سیاسی مخالفوں کو کچلنے کے لیے استعمال کیے جانے والے ریاستی ادارے اس قدر کھوکھلے ہو چکے ہیں کہ بحرانی صورت حال میں ان کا اوپری خول تک نظر نہیں آ سکتا۔ مزید بر آں، ان بری طرح ناکارہ، ریاست کے دیمک چاٹے ہوئے اعضائے کار کے ذریعے ظلم، خوں ریزی اور دھونس کا خاتمہ مزید ظلم، خوں ریزی اور دھونس کے ذریعے نہیں کیا جا سکتا، خصوصاً شہر کی اکثریتی آبادی کے تعاون کے بغیر تو ہرگز نہیں۔ یہ حکمت عملی صرف گزشتہ دہشت گردی کو تازہ دہشت گردی سے خلط ملط کر کے جرائم اور خوں ریزی کی گتھی کو اور بھی مضبوط، کھولی نہ جا سکنے والی گرہ میں تبدیل کرنے پر قادر ہے ــــ اور ایسا ہی ہو رہا ہے۔

کراچی میں آپریشن کلین اپ اِسی لیے کامیاب نہیں ہوا۔

***

Scanned with CamScanner

خون کی بوچھار میں

چلچلاتی دھوپ میں اور ایسی گرمی میں کہ چیل گھونسلے میں انڈا چھوڑے، کراچی کے نواح میں مگرمچھوں کے تالاب کے پاس سناٹا ہے۔ سفید آسمان پر دور دور تک کوئی پرندہ اڑتا نظر نہیں آتا۔ کبھی کبھار چلنے والے لُو کے گرم تھپیڑے سے تالاب کے کنارے اُگے سوکھے، خاکستری ببول اور جھاڑجھنکاڑ ایک جانب کو زور سے طمانچہ کھاتے آدمی کی طرح جھک جاتے ہیں۔ دور دور تک نہ آدم ہے نہ آدم زاد؛ نہ کوئی اَور جاندار نظر آرہا ہے۔ حتیٰ کہ مگرمچھ بھی سوکھے پتوں اور گھاس پھوس سے بھرے تالاب کی تہ لینے کے لیے اپنی خاکی سبز تھوتھنیاں پانی سے نکال کر بڑی بڑی نیم خوابیدہ آنکھوں سے چہار سُو پھیلی ویرانی پر نظر ڈالتے ہیں اور سستی سے دوبارہ غڑاپ کی آواز کے ساتھ تھوتھنیاں اندر کرلیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جسے گویا فطرت نے اپنے خاص الخاص مُوقلم سے کراچی کے جاری شب و روز کے پس منظر کے طور پر بنایا ہو۔

تالاب کا سبز کائی پانی بالکل خاموش ہے۔ دفعتاً خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ چادرِ آب عین وسط سے چاک ہوتی ہے اور اس میں سے ایک پیرِ فرتوت برآمد ہوتا ہے۔ آن کی آن میں وہ بالوں سے پانی جھٹکتا، چلچلاتی دھوپ میں تالاب کے کنارے جا بیٹھتا ہے۔

جھاڑیوں کے پیچھے سے ایک بُڑھیا نکلتی ہے۔ اُس کی کمر خمیدہ ہے اور تارتار لباس میلا اور پیوندوں سے بھرا ہوا ہے۔ مچی مچی آنکھوں سے وہ زمین پر کچھ ڈھونڈ رہی ہے۔ دراصل روشنی اتنی زیادہ ہے کہ اُسے کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا۔

معاً تڑختی ہوئی زمین پھٹی اور چار کالے کالے ننھے منے بھتنے پُدک کر باہر آگئے۔ وہ بالکل مٹی کے پتلے لگ رہے ہیں۔ بڑی بڑی کالی آنکھیں چمکاتے وہ ایک گھیرے میں بڑھیا کے اطراف قہقہے لگا لگا کر ناچنے اور گانے لگے:

"بڑھیا ری بڑھیا تو کیا ڈھونڈے، خون کی بوچھار میں؟"

بڑھیا نے کہا:

"بچّو رے بچّو میں سوئی ڈھونڈوں، خون کی بوچھار میں۔"

بھتنے: "سوئی سے کیا کرے گی، خون کی بوچھار میں؟"

بڑھیا: "سوئی سے تھیلی سیوں گی، خون کی بوچھار میں۔"

بھتنے: "تھیلی میں کیا رکھے گی، خون کی بوچھار میں؟"

بڑھیا: "تھیلی میں روپیہ رکھوں گی، خون کی بوچھار میں، خون کی بوچھار میں، خون کی بوچھار میں..."

بھتنے یہ سن کر غائب ہوگئے۔ اب بڑھیا پیرِ فرتوت کی جانب متوجہ ہوئی۔ نہ جانے اُسے سوئی ملی یا

نہیں! شاید ایک زنگ آلود سوئی مل تو گئی تھی جسے اُس نے اپنے لباس میں اُڑس لیا تھا۔ بڑھیا پیرِ فرتوت کے پاس آئی جو اب ایک گلاس سے کوئی مشروب پی رہا تھا۔ بڑھیا نے اپنا بایاں ہاتھ اُسے دکھا کر پوچھا:

"کیوں بڑے میاں، میری تقدیر میں کیا لکھا ہے؟"

بڑے میاں نے کھنکھار کر کہا: "کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ؟"

"پیسہ آئے گا، روکڑا؟" بڑھیا نے مضبوطی سے پوچھا۔

بڑے میاں شرمندگی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کچھ جھجک کر بولے:

"یہ کیا پوچھ رہی ہیں آپ؟ آپ تو... ماشاءاللہ... ادیبہ ہیں... عالم فاضل۔"

یہ سن کر بڑھیا پہلے ہنسی اور پھر روئی ـــ یا شاید وہ پہلے روئی تھی اور پھر ہنسی تھی۔ پھر وہ پیرِ فرتوت کے پاس اپنی گدڑی بچھا کر بیٹھ گئی اور اس نے بڑے میاں سے کہا:

"چلیے جانے دیجیے ـــ یہ میرا ذاتی اور قومی معاملہ ہے... آپ یہ بتائیے کہ یہ کیا ہو رہا ہے... کراچی میں؟"

بوڑھا دیر تک سورج کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے یوں آغاز کیا:

"محترمہ، میں یہ باتیں آپ تک پہنچا دینا چاہتا ہوں۔ خدا معلوم اب میری زندگی اَور کے دن کی رہ گئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ حقیقت کسی ایسے شخص تک پہنچ جائے جو اسے سمجھ سکے اور محفوظ کر لے۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ بے شک... اس تحریک کی داغ بیل مَیں نے ڈالی... اور... حالاں کہ مدت ہوئی میں اس سے جدا ہو چکا ہوں، اور تحریک تباہی کی طرف مائل ہے... پھر بھی میں چند باتوں پر فخر کیوں کرتا ہوں۔"

"بتائیے، بتائیے،" عورت نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ اُس کے دیدوں کے پیچھے پانی خارج کرنے والے غدود کا سماعت کی نسوں کا ایک غیر معمولی رابطہ اس طرح ہو گیا ہے کہ دو تین برس سے لفظ "کراچی" سنتے ہی یہ غدود متحرک ہو جاتے ہیں اور ڈھیلوں سے پانی جاری ہو جاتا ہے۔

بوڑھے نے بتانا شروع کیا:

"محترمہ، میں نے اس ملک کی سیاست کے خارزار کے چپّے چپّے کی دشت نوردی کی ہے۔ برسوں، بلکہ عمر بھر اسی صحرا کی خاک چھانی ہے۔ نیپ میں شامل مَیں رہا، جی ایم سیّد کے ساتھیوں میں مَیں رہا... اور میں دیکھتا رہا کہ مہاجر من حیث القوم رجعت پرست سیاسی جماعتوں کے ہم نوا رہے۔ ترقی پسند نعرے اجتماعی طور پر انھیں کبھی بھی اپنی طرف نہ کھینچ سکے۔ ۱۹۷۷ کے انتخابات میں یہ اُس نو جماعتی متحدہ محاذ کے ساتھ ہو گئے جسے نوستارے کہا جاتا تھا..."

عورت کے ذہن میں ایک تصویر تازہ ہو جاتی ہے۔

یہ کراچی ہے۔ شہر کے مغربی مضافات میں پھیلے سائٹ کے صنعتی علاقے کی ایک بلند و بالا کثیر القومی دواساز فیکٹری کے دفتر میں وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی ہے۔ اس دفتر اور کارخانے کا ایک

ایک فرد جماعت اسلامی کا حامی ہے۔ لیبارٹری کی طرف جاتی ہوئی دو نوجوان فارماسسٹ لڑکیاں ایک دوسرے سے باتیں کر رہی ہیں۔ وہ خوش ہیں اور ہنس رہی ہیں۔ ان میں سے ایک کہتی ہے: "ہم نے اُنھیں ہرا دیا۔ بھائی جان کہہ رہے تھے کہ مہاجروں کے دماغ اور پٹھانوں کی جسمانی قوت نے مل کر کام کیا ہے۔"

"اچھا، آخر آپ بھٹو کے خلاف کیوں ہیں؟" عورت نے ایک نوجوان، خوش پوش اور مستعد سیلز ایگزیکٹو سے پوچھا۔

وہ جلدی جلدی اُسے سمجھانے لگا: "اجی اس وڈیرا گردی سے تنگ ہیں ہم... یہ جو چلے آتے ہیں... بھر گئے ہیں شہروں میں... دیکھیے میڈم، کپڑوں کی دکان پر جا کر دیکھیے... جس کپڑے کا ایک کوٹ سلوانے کی استطاعت حاصل کرنے کے لیے ہم نے عمر بھر محنت کی ہے، اس کے درجنوں سُوٹ یہ کس طرح خریدتے ہیں۔"

ہُوں، تو معاملہ طبقاتی ہے، عورت دل میں سوچتی ہے۔

مگر شہر کے گلی کوچوں میں یہ طبقاتی نفرت لسانی اور نسلی رنگ اختیار کر چکی ہے۔ ولی خاں کی قیادت میں کراچی کے پٹھان پیپلز پارٹی کے شدید مخالف بن چکے ہیں۔ سڑک پر سندھی چادر اجرک اوڑھنے والوں کے لیے کوئی رکشا ٹیکسی نہیں رکتی جسے کوئی پٹھان چلا رہا ہو...

"تو پھر آپ نے کیا کیا؟" عورت پیرِ فرتوت سے پوچھتی ہے۔

"تو انتخابات کے بعد میں نے سوچا... کہ لوگوں میں، عوام میں تحرک اندرونی تضادات کو تیز کرنے ہی سے آتا ہے۔ کٹھ ملاؤں سے مہاجروں کی جان چھڑانے کا ایک ہی طریقہ ہے ـــــ مذہبی جنون کے زہر کو قومی عصبیت کا زہر ہی مار سکتا ہے... لہٰذا میں نے ان نوجوانوں پر توجہ مرکوز کر دی جو کراچی کے گلی کوچوں میں جان ہتھیلی پر رکھ کر جلسے جلوس کرنے، ٹائر جلانے اور پُرجوش تقریریں کرنے کے باعث محلّوں کے ہیرو بن چکے تھے۔"

عورت کو یاد آتا ہے۔

۱۹۷۷ کے انتخابات کے بعد، دھاندلی کے الزام میں چلائی ہوئی تحریک ـــــ جلوس پر فوج کی فائرنگ ـــــ پہیا جام ہڑتال میں ٹرین روکنے کی کوشش ـــــ احمد فراز کی جذباتی نظم:

پٹریوں کی جمی پپڑیاں خون کی
کہہ رہی ہیں کہ منظر قیامت کے ہیں

کراچی کے گھر گھر میں اس نظم کی فوٹو اسٹیٹ نقلیں ـــــ

"خیر، تو میں نے اُن سے کہا کہ نوستارے تمھیں استعمال کر رہے ہیں۔ جماعت اسلامی کی قیادت کسی مہاجر کے پاس کبھی نہیں آئے گی... پس تو آخرِ کار مہاجر طلبا تحریک کا آغاز ہوا۔ اور اس کی رہنمائی میرے ہی محلّے کے ایک لڑکے نے کی...

"میں نے ترقی پسند نوجوانوں کو اِس طرف لانے کی بہت کوشش کی۔ مگر وہ انکار کر دیتے تھے۔ کیا مہاجر مہاجر کر رہے ہیں؟ وہ کہتے۔ ہم تو بین الاقوامی، طبقاتی تحریک پر یقین رکھتے ہیں۔ میں ان کو سمجھاتا ــــ میاں، تحریکیں نیک جذبات پر کامیاب نہیں ہوتیں۔ عوام کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑنا ہوتا ہے، کسی زخم کو کریدنا ہوتا ہے۔ بظاہر چاہے وہ گھٹیا سی بات لگے، مگر اس کی آڑ میں، بلکہ اس کے سہارے، بڑے بڑے کام کیے جاسکتے ہیں..."

بوڑھے کی بات کی نصف سچائی عورت کے دماغ میں پگھلے سیسے کی طرح اترتی ہے...

"مگر کیا!" بوڑھا کہتا ہے۔ "پھر آتی ہے تنظیم... بھئی ہم بیزار تھے پارٹیوں کی بدنظمی سے۔ ہم نے سوچا کہ تنظیم اتنی مضبوط ہونی چاہیے کہ کوئی کارکن اپنی جگہ سے ہل نہ سکے۔ اپنا ہی تصور ــــ منتخب ممبرانِ اسمبلی اپنے گھر نہیں جاسکتے، اب وہ صرف تحریک کے لیے وقف ہو چکے ہیں۔ اُن کے گھروالوں پر بھی نظر رکھی جائے گی۔ اگر منتخب نمائندہ گمراہ ہو جائے تو اُس کے خاندان والوں کی خیر نہیں۔ انا کو توڑا جائے..."

طبقاتی نفرت کا ایک مظہر ــــ جو کسی کی سمجھ میں آنے سے پہلے، زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ مہذب، مہاجر افراد سے بھی نفرت میں تبدیل ہو گیا۔ ایک چھوٹے سے گھر میں مُرغا بنے ہوئے، اُلٹے لٹکے ہوئے لوگ...

"انا کو توڑو؟"

"کیوں؟ کیا چین میں ماؤ نے محنت کش طبقے سے نہیں کہا تھا کہ ان بڈھے رجعتی پروفیسروں کے سر پر جوتے مار مار کر ان کے فلسفے کی ہوا نکالو؟" بوڑھا ہنستا ہے۔ اب وہ دوسرا گلاس بھر رہا ہے۔ "بھول گئیں چین کا ثقافتی انقلاب؟"

مہاجروں کو سب سے زیادہ ناز اس پر تھا کہ وہ پاکستان بھر میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان میں پڑھے لکھوں کی شرح فی الحقیقت دوسری تہذیبی اکائیوں سے بڑھ کر تھی۔

اور تحریک نے ان کی ایک پوری نوجوان نسل کو تعلیم سے بے گانہ کر دیا ــــ وہ جاہل ہو گئے۔ صرف نعرہ بازی، جلسے جلوس میں مشغول، جیسے مہاجر!

بوڑھا گلاس سے چسکی بھرتا ہے۔ "کلچرل ریوولیوشن کے دوران چائنا میں بھی یہی ہوا تھا۔ برسوں قوم کی قوم پڑھنے لکھنے یا کوئی بھی پیداواری کام کرنے کی جگہ ڈنڈے بجاتی گھومتی رہی تھی ــــ اسی لیے بعد میں ملک میں اتنا بڑا قحط پڑا تھا۔"

مہاجروں کو دوسری سیاسی جماعتوں پر اعتراض تھا کہ ان کی قیادت وڈیروں اور پیروں کے ہاتھ میں ہے۔

تحریک کے اپنے قائد وڈیرے تو خیر نہ بن سکے، مگر اس شہری، تعلیم یافتہ، روشن خیال جماعت کے سربراہ سُرعت سے پیر بن گئے۔ پاکستان کے اس جدید ترین شہر کے اندرونی گلی کوچوں میں پشتوں،

پھولوں اور پتھروں میں ان کی مبارک شبیہ نمودار ہونے لگی۔
اور لاکھوں پڑھے لکھے، روشن خیال مہاجر ان باتوں کو یکسوئی کے ساتھ نظر انداز کرتے رہے۔

رنچھوڑ لائن کے ایک شکستہ، تنگ و تاریک مکان کے صحن میں ایک جنازہ تیار رکھا ہے۔ اندر سے آہ و بکا کی آوازیں آرہی ہیں۔ پانچ چھوٹے بچے ڈبڈبائی آنکھوں سے کھڑکیوں کے باہر جھانک رہے ہیں۔ صحن میں عزاداروں کا ہجوم ہے۔ ان میں سے ایک، جو مرنے والے کا دوست ہے، اس کے بڑے بیٹے کو گلے سے لگا کر بھرائی آواز میں کہتا ہے: "صبر کرو میرے بیٹے... اور یہ نہ بھولو کہ اب اس خاندان کے والی وارث تم ہو ___ تم اب میڈیکل کی پڑھائی جاری نہ رکھ سکو گے۔ تم کل ہی میرے پاس آؤ، میں تمہیں نوکری دلا دوں گا۔"
۱۹۵۴ میں ایک سو اسی روپے ماہوار کی نوکری سے بالغ زندگی کا آغاز کرنے والا یہ لڑکا ___ سن نوے یا اکانوے یا چورانوے میں اپنے ادارے کے اعلیٰ ترین افسروں میں شامل، دیس دیس گھوما ہوا ___ اسلام آباد یا لاہور کے بنگلے کے نفاست سے سجے ڈرائنگ روم میں اپنے پائپ کی راکھ ایش ٹرے میں صاف کرتا ہے اور بے پروائی سے کہتا ہے:
"سب چلتا ہے... اس تحریک نے ہمیں ہمارا تشخص دیا ہے۔ مہاجروں نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ انہیں کسی نے پلیٹ میں رکھ کر نہیں دیا ___ یہ ان کی ماہ و سال کی، شب و روز کی محنتِ شاقہ کا حاصل ہے۔ میں اِس مقام پر کسی دبڑ دھونس، کسی کوٹا سسٹم یا سفارش کے ذریعے نہیں آیا ہوں۔"
مگر ___ خدا نہ کرے ___ کہیں وہ کراچی کی اُس چھوٹی سی بستی میں پہنچ جاتا، تو قائد کے روبرو، بلکہ ان کے کمرے سے ملحق راہداری میں، اُسے مرغا بنانا ناممکن نہ تھا...
انا کو توڑو!
اب عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے کی کوشش کر رہی ہے۔ پھر وہ منہ چلا چلا کر کہتی ہے:
"دانش ور... دانش ور... ادیب اور شاعر... اَب یاد آئے ہیں مہاجر ادیب اور دانش ور؟ پہلے کبھی ان کا خیال آیا؟ پہلے کبھی سوچا؟ حسن ناصر بھی مہاجر تھا جس نے لاہور کے قلعے میں اذیتیں جھیلتے ہوئے جان دی۔ کبھی اُس کا نام لیا؟ ابراہیم جلیس بھی مہاجر تھا جس نے ضیا مارشل لا میں فوجیوں کا قہر سہا ___ اور جو اپنے معتوب اخبار کے دفتر میں، فوجی ہیڈ کوارٹر میں، جھڑکیاں اور دھمکیاں سننے کے بعد دل کا دورہ پڑنے سے مر گیا..."
"تحریکیں نیک ارادوں سے نہیں چلتیں،" بوڑھا بڑبڑاتا ہے۔ "جب تک تضادات کو ہوا نہ دی جائے... عوام کے کسی خاص احساسِ محرومی پر فوکس..."
"احساسِ محرومی ___" بڑھیا بڑبڑاتی ہے، "کبھی سندھ کے دیہات میں جا کر دیکھیں جہاں بے شمار لوگوں کو پانی تک نصیب..."

Scanned with CamScanner

بوڑھا ہنستا ہے۔

"اب... ایسا ہوتا ہے کہ..." وہ اب اپنا دوسرا گلاس ختم کر رہا ہے۔ "سماجی اکائیاں اپنی ہی محرومیوں کے نعرے لے کر چلتی ہیں ___ دوسروں کی نہیں۔ اب سندھی قوم پرستوں کو لیجیے۔ جن حقوق کو یہ اپنے قومی بلکہ انسانی حقوق کہتے ہیں، ان کے تصوّر کے کسی دور دراز ترین گوشے میں بھی، کیا یہ حقوق سندھ میں ہزاروں برس سے رہنے والی بھیل اور اوڈھ قوموں کے بھی ہیں؟ سندھ کے دیہات کی محرومیوں کا اپنے تمام زمانۂ طالب علمی میں رونا رونے والے سندھی، اچھے گریڈ کی نوکریاں حاصل کرنے کے بعد، ڈاکٹر یا انجینئر بن جانے کے بعد، ان دیہات میں بھٹکتے بھی نہیں ___ وہ تو کراچی یا اسلام آباد میں رہنا چاہتے ہیں۔ یہ انسانی کمزوریاں ہیں، اور اجتماع کی کمزوریاں بھی ہیں۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر عورت نے پوچھا:

"اتنا اسلحہ ان کے پاس کہاں سے آیا؟"

"اسلحہ کراچی میں عام فروخت ہوا ہے ___ افغان جہاد کا منطقی نتیجہ!"

اب عورت کی آنکھوں والے پانی کے غدود پھر سے متحرک ہو چکے ہیں۔

"مگر یہ بہیمیت... یہ درندگی... مخالفین کے بدنوں میں ڈرل سے سوراخ کرنا..." وہ اٹک اٹک کر بول رہی ہے ___ الّو کی پٹّھی! خود بھی اردو اسپیکنگ ہے نا، اسی لیے... اس کے منہ سے یہ الفاظ اسی لیے بڑی مشکل سے نکل رہے ہیں۔ وہ یقین کرنا چاہتی ہے کہ یہ سب سچ نہیں ہے، مگر دل کی انتہائی تاریک گہرائیوں میں جانتی ہے کہ یہ سچ ہے۔

"ایسا تو کوئی نہیں کرتا تھا!" وہ روتے ہوئے کہتی ہے۔ "آخر دوسری بھی سیاسی جماعتیں ہیں۔ یہ درندگی... ان مہاجر لڑکوں کو کس نے سکھائی؟"

"ایسٹ پاکستان میں!" وہ اچانک چونکی۔ "ایسٹ پاکستان میں سب سے پہلے ایسا ہوا تھا۔ پہلے بنگالیوں نے اردو اسپیکنگ لوگوں کے ساتھ یہ کیا تھا ___ آنکھیں نکال لینا... بدن کا سارا خون نچوڑ لینا..."

بوڑھا ہنسنے لگا۔ کھانس کر بولا: "ارے درندگی سیکھنے کے لیے کسی استاد کی ضرورت نہیں پڑتی!"

"آپ اپنی لکھی ہوئی کتاب دوبارہ خود پڑھیے، کبھی کبھی،" دفتر میں اُس کے ایک دوست نے اس سے کہا تھا۔

کبھی اُس نے فسطائیت کی سماجی بنیادوں پر ایک جرمن نژاد نفسیات داں کی کتاب سے ماخوذ ایک مختصر جائزہ لکھا تھا۔ متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی اخلاقیات میں جس طرح لطف لینے کو گناہ سمجھا جاتا ہے، حصولِ مسرّت کے خلاف جو جذبہ ہے، وہ اسے ایک ایسی روڑھی، روکھی پھیکی زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے جو اس میں سادیّت پیدا کرتا ہے۔ سادیّت کا دوسرا رُخ خود اذیتی ہے۔ یہ دونوں مل کر اس طبقے کو

فسطائیت کے لیے زرخیز میدان کی طرح بنا دیتے ہیں۔ یہ طبقہ ایک حاکم کے حکم پر سختی سے کاربند رہنے میں خود کو محفوظ محسوس کرتا ہے۔ اس کتاب کا ماحصل یہی کچھ تھا۔ وہ اس نے خود لکھی تھی ــــ مگر... مگر اس تھیسس کو کسی غیر مرئی ہیولے کے بارے میں لکھنا ایک بات تھی، اور... اور اسے اپنے پڑوسیوں پر، ان دبلے پتلے انسانوں پر منطبق کرنا بالکل دوسری بات تھی، جو اب خود مار کھا رہے تھے... جن کی مسخ کی ہوئی لاشیں شہر کے گلی کوچوں سے برآمد ہو رہی تھیں... جن کے لیے اُس کا اپنا دل خون ہو رہا تھا... جو طبقہ نہیں، جیتے جاگتے لڑکے تھے: کسی کے بیٹے، کسی بہن کے بھائی، ہنستے ہوئے، گاتے ہوئے، سڑک پر سچ مچ چلتے ہوئے...

اُسے وہ دن یاد آیا جب اچانک شہر میں سفید رنگ کے بے شمار بینر لگا دیے گئے تھے جن پر سُرخ الفاظ میں تحریر تھا: "جو قائد کا غدّار ہے وہ موت کا حقدار ہے۔" تمام گلی کوچے اس خون جما دینے والے نعرے سے اس طرح ڈھک گئے تھے کہ کسی بلند عمارت سے دیکھنے پر شہر کسی زخمی کے مانند نظر آ رہا تھا جس کے تمام جسم پر خون سے رِستی ہوئی پٹیاں باندھ دی گئی ہوں۔

اُس دن شہر میں بے پناہ دہشت تھی۔ ایم کیو ایم کے باغی گروپ کے لوگ، جو بعد میں ایم کیو ایم حقیقی کے نام سے معروف ہوئے، چند دن پہلے ہی شہر سے غائب ہوئے تھے۔ لوگ خاموش تھے۔ شہر اس نعرے کے ہَول سے سنسنا رہا تھا: موت کا... موت کا... موت کا حقدار ہے!

اُس دن موت اپنے سیاہ پَر کھولے ہوئے کراچی پر اپنی تاریک پرچھائیں ڈال رہی تھی۔

یہ فاشزم ہے! شاید اُس دن کچھ لوگوں کے دل چیخے ہوں۔ مگر ایم کیو ایم کی فقید المثال افرادی حمایت کے سامنے لب کشائی کی جرأت کسی کو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ حمایت جو کراچی کے غریب یا نچلے متوسط طبقوں پر مشتمل تھی جو فلسفہ آرائیاں کرنے کی ــــ ان کے خیال میں "عیاشی" کی ــــ متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ طبقے، اور یہ محنت کش نیم خواندہ لڑکے ڈسپلن اور فاشزم میں تمیز نہیں کر سکتے تھے۔

کاریگروں نے بابوؤں کو زیر کر لیا
محنت کی آنچ کاغذی اسناد کھا گئی

مزدور طبقے کے ایک شاعر نے جب جوش اور جذبے میں یہ شعر لکھا تھا، تو کیا وہ سوچ بھی سکتا تھا کہ اس کا عملی مطلب یہ بھی نکل سکتا ہے، یہ بھی؟ جو قائد کا غدّار ہے وہ موت کا حقدار ہے؟

اب بہت دیر ہو چکی تھی اور شام ہو جانی چاہیے تھی۔ اس سفید، جہنّم کی طرح دہکتے ہوئے سورج کو اب تک ٹھنڈا پڑ جانا چاہیے تھا، مگر کسی طلسم کے باعث ایسا نہیں ہو رہا تھا اور سورج مستقل نصف النہار پر تھا۔

کراچی میں اُس روز کا اسکور سولہ تھا: تین لاشوں کے ٹکڑے بوریوں میں بند ملے، دو پولیس کے سپاہی گولی کھا کر ہلاک ہوئے، ایک نالے میں ایسا آدمی ملا جس کی ٹانگیں کاٹ دی گئی تھیں، باقی کے

پولیس مقابلے میں مارے گئے۔

یہ کون کر رہا ہے؟ اُس نے ہواؤں سے، خلاؤں سے، ستاروں سے پوچھا۔

ان سب نے مستعدی سے جواب دیا: اس تنظیم کے دو متحارب گروہ کر رہے ہیں۔

ان میں سے ایک گروہ کو سرکاری پُشت پناہی حاصل ہے؟

جی ہاں، کیوں کہ یہی ان کی مسلح قوت کو گلی کوچوں میں چیلنج کر سکتا ہے۔

پھر اس قوت کا کیا کیا جائے گا؟

یہ تو ابھی پتا نہیں... کچھ نہ کچھ حل سوچ لیں گے!

اگر اس تنظیم سے سیاسی صلح ہو جائے تو پھر اس کی مسلح قوت حرکت میں نہیں آئے گی ـــــ یہ بھی تو ہو سکتا ہے؟

بہرحال... جیسا کہ آپ دیکھ رہی ہیں... یہ مناسب نہیں سمجھا گیا۔

اس تمام عمل سے ایک خاص کمیونٹی کے لیے پورے ملک میں جو نفرت پھیل رہی ہے، اور خود اُس کے اندر جو احساسِ بے گانگی پیدا ہو رہا ہے، اس کے بارے میں کیا کہنا ہے؟

بُرے کام کا بُرا نتیجہ!

پورے پورے محلوں کے افراد کو قمیصیں اتروا کر، آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر تھانوں میں لے جانے سے کیا حاصل ہے؟

تو وہ بتاتے کیوں نہیں کہ اس تنظیم کے مسلح لڑکے کہاں چھپے ہوئے ہیں؟ خوف کے مارے چپ رہتے ہیں۔

صرف خوف کے مارے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کی عوامی حمایت اب بھی موجود ہو؟

ہو سکتا ہے... مگر اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

بلدیاتی انتخابات کروا کر کیوں نہیں دیکھ لیتے؟ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔

اور اگر یہ جیت گئے تب؟ نا بابا نا! ایسی غلطی دوبارہ نہیں کی جا سکتی۔

اگر ـــــ بالفرضِ محال ـــــ یہ عوام میں اب بھی مقبول ہیں، تب لاکھوں شہریوں کی رضا کو جبراً کچلنا... جمہوری اقدام تو نہیں ہو سکتا۔

اگر لاکھوں شہری ایک فسطائی جماعت کے ہم نوا بن جائیں تو ہم کیا کریں!

اسے سیاسی عمل کا راستا فراہم کر کے، اس کے فسطائیت کے رجحان کو ختم کر کے، بحیثیت ایک سیاسی تنظیم کے رہنے دیا جائے ـــــ کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟

خاموشی

خاموشی

خاموشی

Scanned with CamScanner

یہ ہندوستانی ایجنٹ بن چکے ہیں۔
باری باری ـــــ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ـــــ سب ہندوستانی ایجنٹ بنے۔ اقتدار اور وسائل میں شرکت ملنے پر واپس پاکستانی ایجنٹ... معاف کیجیے گا، پاکستانی بن گئے۔ تو کیا ان کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا؟

خاموشی
خاموشی
خاموشی

بہیمیت صرف نچلے متوسط طبقے کی میراث نہیں۔ شاید کسی کو یاد ہو ـــــ چند برس پہلے، سترہ سندھی نوجوان پکڑے گئے تھے۔ کہا جا رہا تھا کہ یہ الذوالفقار کی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے ایما پر مسلح تربیت لینے جا رہے تھے۔ بعد میں اُن میں سے چند کی لاشوں کے ٹکڑے بوریوں میں بند ملے تھے۔ لاشیں کئی دن پرانی تھیں اور بُو چھوڑنے لگی تھیں۔ وہ کام تو مہاجروں کی تنظیم نے نہیں کیا تھا؟ سوال یہ ہے کہ تفتیش کے دوران لاشوں کے ٹکڑے کیوں کر ہو گئے؟

خاموشی
خاموشی
خاموشی

دہشت کے بدلے دہشت ـــــ زہر کو زہر کاٹتا ہے۔ اسلحے کا مقابلہ اسلحے ہی سے کیا جا سکتا ہے!

اس پر عورت نے زور سے قے کی اور منھ پونچھتے ہوئے بوڑھے سے پوچھنے لگی:
"اور آپ کا کارنامہ کیا ہے؟"
"مہاجروں کو تشخص ملا۔ شیعہ سنی فسادات ختم ہو گئے۔ اور میں چاہتا تھا کہ سندھی مہاجر ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہیں..."
"ہوں... تو مہاجر تشخص کو اور اتحاد کو ختم کرنے کے لیے ـــــ زہر کو زہر کاٹتا ہے والے نظریے کے مطابق ـــــ غالباً سنی شیعہ فسادات کرانے کی کوشش کی گئی تھی کراچی میں... مگر کامیاب تو نہیں ہوئی؟"
"اب تو بوتل سے جن باہر آ گیا ہے..."
"رہی یہ آخری بات کہ سندھی مہاجر اتحاد ـــــ سو تو کسی دیوانے کی بڑ معلوم ہو رہی ہے۔ اب تو ان دونوں کی ایک دوسرے سے خاصی واضح دشمنی ہے۔"
"خیر... دس برس تک تو کنٹرول میں رکھا اس جذبے کو..."
"ان دس برسوں کے لیے یہ گلدستہ قبول کیجیے!"

Scanned with CamScanner

عورت نے بڑے میاں کو تازہ سُرخ گلابوں کا ایک گلدستہ پیش کیا۔
پھر دونوں تالاب میں واپس چھلانگ لگا کر غرق ہو گئے۔ تالاب کی سطح برابر ہو گئی۔ سورج اُسی طرح نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ ایک مگرمچھ نے کاہی تھوتھنی نکال کر گرم ہوا میں سانس بھری۔

***

زنا بالجبر ـــ ہوا کہ نہیں؟

شہر میں سناٹا ہے اور ہڑتال ـــ کوئی گھر سے باہر نہیں نکل سکتا، تمام دکانیں بند ہیں۔ اگر دکانیں کھولی جائیں، یا ایک محلے سے دوسرے محلے تک جانے کے لیے کسی سواری پر سفر کیا جائے، تو پتھراو ہو سکتا ہے، گولیاں بھی چلائی جا سکتی ہیں۔
ہو سکتا ہے یہ پتھراو اور فائرنگ وہ تنظیم کرے جس نے ہڑتال کی کال دی ہے۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پتھراو اور فائرنگ اس تنظیم کی رقیب تنظیم یا حکومت کی خفیہ ایجنسیاں کروائیں تاکہ ان کا الزام ہڑتال کروانے والی تنظیم پر رکھا جا سکے۔
ایسا ہو سکتا ہے ـــ کیوں کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔
ممکن ہے کئی دنوں... ہفتوں... مہینوں سے ایسا ہو بھی رہا ہو۔ کیوں کہ یہ شہر ایسا ہے جہاں عرصے سے ہو سکتا ہے کچھ بھی ہوتا رہا ہو۔

ایک شخص ہڑتال، یعنی شہریوں کی گھر میں نظربندی، والے روز وی سی آر پر فلم دیکھ رہا ہے۔ ہندوستانی فلم ہے؛ ایک ڈاکو کی کہانی جس کا ایک بیٹا ڈاکو بنتا ہے اور دوسرا پولیس والا، جب کہ دوسرے بیٹے کو علم نہیں ہوتا کہ وہ ڈاکو کا بیٹا ہے اور ڈاکو بیٹے کو علم نہیں ہوتا کہ پولیس والا اس کا بھائی ہے۔ شخصِ مذکور کو یہ فلم ہزار بار دیکھی ہوئی لگتی ہے۔ پولیس کی نفری میں ایک حسین پولیس والی بھی ہوتی ہے جو کسی نہ کسی بہانے بار بار پولیس یونیفارم اتار کر انگیا اور پنڈلیوں سے اونچا جگمگاتا لہنگا پہن کر ناچتی اور گانا گاتی ہے۔ پولیس والی ڈاکو کے اُس بیٹے سے محبت کرتی ہے جو پولیس والا ہے۔ وہ یونیفارم میں بھی پُرکشش لگتی ہے۔ خاکی پتلون اُس کی رانوں اور جانگھوں پر پھنسی رہتی ہے۔ شخصِ مذکور کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ فلم میں جب ڈاکو باپ، پولیس والا بیٹا، پولیس والی اور ڈاکو بیٹا ایک دوسرے پر گولیاں چلا رہے ہوتے ہیں اور گاڑیوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا رہے ہوتے ہیں، تو انھیں چنداں خبر نہیں ہوتی کہ ان کے آپس میں کیا رشتے ہیں۔ مگر فلم کے انجام تک پہنچتے پہنچتے تمام اُلجھاو دور ہو جاتا ہے،

Scanned with CamScanner

سب کو معلوم ہو جاتا ہے کہ کون کس کا باپ، کس کا بیٹا اور کس کا بھائی ہے۔ باپ دونوں بیٹوں کو گلے سے لگا کر مر جاتا ہے۔

ہڑتال دراصل زنا بالجبر کے ایک واقعے ــــ یا مبینہ واقعے ــــ پر احتجاج کے طور پر کی گئی ہے۔ لڑکی کا بھائی ایک معتوب تنظیم سے تعلق رکھتا ہے اور روپوش ہے۔ چند دن پہلے اخباروں میں ایک پندرہ سولہ برس کی روتی ہوئی لڑکی کی تصویر شائع ہوئی تھی اور ساتھ ہی یہ خبر کہ روپوش تنظیمی کارکن کی بہن کے ساتھ اہلِ خانہ کی موجودگی میں کئی افراد نے زنا بالجبر کیا۔

دوسرے دن سے مخالف تنظیموں کی جانب سے زنا کے الزام کی تردید شائع کی جانے لگی۔ چند ڈاکٹروں نے سرکاری طور پر لڑکی کا معائنہ کیا اور اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اندامِ نہانی یا پستانوں پر اجتماعی زنا بالجبر کے نشانات دکھائی نہیں دے رہے۔ پھر لڑکی کا معائنہ ایک غیر سرکاری اسپتال میں کروایا گیا۔ انھوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اندامِ نہانی کے نچلے دائیں یا بائیں مقامات پر سُرخی اور سُوجن ہے۔

اس سے تنظیم کے سربراہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زنا ہوا ہے، جب کہ مخالف تنظیموں اور سرکاری وزرا نے یہ نتیجہ نکالا کہ زنا نہیں ہوا ہے۔

شخصِ مذکور کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے سوچا کہ جماع یا زنا جیسے کام میں اتنے زیادہ عضلات، ہڈیاں، اعصاب، گوشت کے ریشے وغیرہ کام کرتے ہیں ــــ ایسا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ بہر حال، وثوق سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ زنا ہوا یا نہیں۔ ایک بات جس کا ذکر (غیر سرکاری اسپتال کی) رپورٹ میں تھا، یہ تھی کہ اندامِ نہانی کا اندرونی پردہ پھٹ چکا ہے، لیکن اُسے اتنا عرصہ گزر چکا ہے کہ زخم بھرنے لگا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ تخمینہ لگایا جائے کہ ایک صحت مند، پندرہ سولہ سالہ لڑکی کے بدن میں اس قسم کا زخم بھرنے میں کتنا عرصہ لگتا ہے ــــ ایک دن؟ اس سے زیادہ؟ ــــ جب کہ گوشت اور خون کے ذرات اپنے فطری کام میں مگن ہوں...

چند دن پہلے اخباروں میں شخصِ مذکور نے یہ خبر پڑھی تھی کہ زیرِ عتاب تنظیم کا ایک گرفتار کارکن کسی پوچھ گچھ کے سلسلے میں ایک کئی منزلہ عمارت کے بالائی حصے پر لے جایا گیا تھا جہاں سے اُس نے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔

یہ خبر پڑھ کر شخصِ مذکور کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ ایک نوجوان نے اصول پسندی کے باعث پولیس کا مخبر بننے پر خودکشی کو ترجیح دی۔ مگر بعد میں آنے والی خبروں سے معلوم ہوا کہ اس نوجوان کو بالائی منزل سے نیچے پھینکا گیا تھا۔ اس انکشاف سے معلوم ہوا کہ نوجوان نے اصول پسندی کے باعث خودکشی نہیں کی تھی۔ بائیں، یہ کیا بات ہوئی؟ شخصِ مذکور نے سوچا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے دماغ نے اس انکشاف کو جذب کیا کہ اس گرفتار نوجوان کو کئی منزلہ عمارت کے بالائی حصے پر لے جایا گیا اور وہاں سے نیچے پھینک دیا گیا۔ اب کی بار شخصِ مذکور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور تصور ہی تصور میں ایک مضبوط جال لے کر اُس کئی منزلہ عمارت کے نیچے جا کھڑا ہوا

اور گرنے والے نوجوان کو اس میں جھیل لیا۔ نوجوان اس سے لپٹ گیا۔ مگر اس نے کہا کہ شکریہ اد کرنے میں وقت نہ گنواؤ اور فوراً گھر جاؤ۔ نوجوان آنسو پونچھتا ہوا ننگے پیر ہی گلیوں گلیوں دوڑ گیا۔ جب وہ ہانپتا ہوا گھر پہنچا تو اس کی ماں نے روتے روتے اُسے گلے سے لگایا... اس کے بعد شخصِ مذکور کا تصور کند ہو گیا۔ وہ مزید تصور نہ کر سکا کہ گھر والوں نے اُسے پانی پلایا ہو گا یا دودھ پلایا ہو گا۔

تصور کے ختم ہو جانے پر اس نے حقیقت کا سامنا کرنے کی ٹھانی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ نوجوان بالائی منزل سے گرنے سے ہلاک ہو گیا تھا۔ جال میں زندہ سلامت نوجوان کی جگہ اس کے سامنے ایک ہڈیاں ٹوٹی، کھوپڑی پھوٹی لاش پڑی تھی۔ اب تو وہ اور بھی رویا اور ماتم کرنے لگا اور سینے پر دوہتڑ مار مار کر ہچکیوں میں کہنے لگا: ہائے، نوجوان لڑکے! کیسے تجھے پالا تھا ماں نے سینے سے لگا کر، پل پل تیری بلائیں لے کر۔ دروازے پر منتظر رہتے تھے گھر والے، اگر تو دیر سے آتا تھا۔ تیرے لیے کھانا ڈھانپ کر رکھتے تھے۔ منتیں کر کر کے تجھے کھلاتے تھے اگر تو کبھی کھانے سے انکار کرتا تھا۔ تیرا سر ذرا بھی دُکھنے لگتا تو پیار سے سر میں تیل کھپاتی تھی تیری بہن، یا تیری ماں... یہی سر جو آج زمین پر تڑخا پڑا ہے ___ کھوپڑی کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی، خون میں تر مغز زمین پر بکھرا ہوا اور ان پر مکھیاں بیٹھتی ہوئی۔

بائیں، شخصِ مذکور نے سینہ کوبی بند کر کے، گردن لمبی کر کے، غور سے کھوپڑی کے اندر دیکھا۔ تو یہ ہوتا ہے کھوپڑی کے اندر؟ اس نے نہایت تحیر اور سنسنی کے عالم میں خود سے کہا۔ مگر وہ طبی سائنس داں تو نہ تھا کہ مزید تحقیق کرتا کہ آدمی کی کھوپڑی کے اندر کیا ہوتا ہے۔ وہ تو محض چھٹی یا ہڑتال کے دن وی سی آر پر ہندوستانی فلمیں دیکھنے والا ایک معمولی، عام شہری تھا۔ لہٰذا اس کا تجسس زیادہ دور تک نہ گیا۔ چند لمحے بعد اس نے دوبارہ مرنے والے کے اعزا کی جُون بدلی اور سینہ کوبی کرنے لگا۔

لیکن اسی اخبار میں یہ خبر بھی تھی کہ ایک سر کٹے آدمی کی لاش ملی ہے جس کا عضوِ تناسل بھی کٹا ہوا ہے۔ لاش کی جیب سے یہ پرچی ملی ہے: "ایک مہاجر بہن کی بے حرمتی کرنے والے کا انجام۔"

پہلے بھی چند لاشوں کی جیبوں سے اس مضمون کی پرچیاں برآمد ہوئی تھیں: "مخبری کرنے والے کا انجام۔"

یہ خبریں پڑھ کر شخصِ مذکور مزید حیران اور پریشان ہو گیا۔ وہ کٹے ہوئے سر کو دھڑ سے اور عضوِ تناسل کو رانوں کے بیچ میں جوڑ کر پورا آدمی بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر وہ غور کرنے لگا کہ خوف کے باعث، یا تکلیف کے باعث، یہ عضوِ تناسل پورا تنا ہوا ہے یا کُملایا ہوا اور ایک جانب ڈھلکا ہوا ہے جیسے فوطوں پر آرام کر رہا ہو۔ اس نے لاش کو پلٹا اور دیکھا کہ سر کٹے کی پشت پر کوئی زخم نہیں ہے۔ دونوں سرینوں کے درمیان جہاں کولھے کی ہڈیوں کا جوڑ ہوتا ہے، وہیں سر کٹے کی ریڑھ کی ہڈی کا آخری نچلا سرا تھا۔ اُس نے سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا ریڑھ کی ہڈی پر پھیر کر استخوانی زنجیر کی آخری کڑی کو اچھی طرح محسوس کیا۔ کہتے ہیں (شخصِ مذکور کو خیال آیا) کہ یہاں آدمی کی تمام قوت پوشیدہ اور خفتہ ہوتی ہے۔ پرانے زمانوں میں ہندوستانی ماہروں کا ایسا ہی خیال تھا۔ کہتے تھے کہ تپسیا یا مراقبے کے ذریعے یہ

Scanned with CamScanner

قوت جگانے پر آدمی محیر العقول طاقت کا مالک بن جاتا ہے۔ ایسی صورت میں یا تو وہ ولی بن جاتا ہے یا شیطان ـــــ واللہ اعلم!

دوسری خبریں یہ تھیں کہ بوریوں میں بند کچھ لاشوں کے ٹکڑے ملے ہیں۔ دن بھر بوریوں میں بند رہنے کی وجہ سے لاشیں یا ان کے ٹکڑے کھس کھا گئے تھے۔ گوشت بالکل مُرجھا گیا تھا۔ شخص مذکور ٹکڑے جوڑ جوڑ کر آدمی بنانے لگا۔ کچھ ٹکڑے سانولے اور کچھ گندمی رنگ کے تھے۔ آخر اکتا کر اُس نے گندمی رنگ کے بُریدہ اعضا سیاہی مائل دھڑ کے ساتھ جوڑنے شروع کر دیے۔ پھر اس نے بازوؤں کی جگہ ٹانگیں اور ٹانگوں کی جگہ گردن یا کلائی لگا دی۔ پھر وہ اس کھیل سے اُوب گیا اور لاشوں کے ٹکڑوں کو واپس بوری میں بھر دیا۔

اب وہ پولیس کانسٹیبلوں کی لاشوں کی طرف آیا۔ وہ مونچھ دار پولیس والے اپنی وردیوں میں مرے پڑے تھے۔ دونوں کا سِن تیس پینتیس سے کم تھا۔ اس نے ایک پولیس والے کی وردی اتارنی شروع کی۔ پہلے قمیص پتلون سے کھینچ کر باہر نکالی۔ پھر بٹن کھولے اور لاش کے سرھانے بیٹھ کر قمیص کو کھینچ کر سر سے اتار لیا۔ اندر سے ایک میلی سفید بنیان برآمد ہوئی۔ پسینے میں بھیگی اور خون سے داغدار بنیان اس نے ذرا کراہت سے کھینچ کر اتاری۔ پھر اس نے پتلون کی بیلٹ کھولی۔ اب وہ لاش کی پائنتی کی طرف بیٹھا تھا۔ اس نے جوتوں کے فیتے کھولے، پھر جوتے اتارے۔ پولیس والے کے پیروں میں موزے بھی تھے۔ موزے اتار کر اس نے ایک طرف ڈال دیے اور باری باری دونوں ٹانگوں سے پتلون کے پائنچے کھینچ کر اتار دیے۔ اب لاش صرف ایک جانگیا پہنے پڑی تھی۔ شخص مذکور نے ایک کونے میں جا کر منہ چھپا لیا اور خوب ہنسا ـــــ اس نے طے کیا کہ وہ اس لاش کا جانگیا نہیں اتارے گا۔

اس نے جیب سے استرا نکال کر لاش کی مونچھیں مونڈ دیں۔ اب یہ لاش کسی بھی تیس پینتیس برس کے مرد کی لاش لگ رہی تھی۔ پھر وہ اندھیرے میں لاش کو اپنے کندھے پر ڈال کر تاریک کوٹھری سے نکلا اور ایک پہلی ٹیکسی میں پیچیدہ راستوں سے گزرتا ہوا اُس کئی منزلہ عمارت تک جا پہنچا جہاں پختہ فرش پر ایک نوجوان کی لاش پڑی تھی۔

شخصِ مذکور نے ننگی لاش زمین پر رکھی اور بالائی منزل سے گرنے والے کی لاش کندھوں پر اٹھا لی۔ یہ کام اس نے اتنی پھرتی اور مشاقی سے کیا کہ لاش پر ماتم کرنے والوں کو لاش کے بدل جانے کا پتا بھی نہ چل پایا۔ وہ اسی طرح سر پر خاک ڈالتے، سینے پر دوہتڑ مارتے، روتے اور بَین کرتے رہے۔

شخصِ مذکور ہڈیاں ٹوٹی لاش کاندھے پر ڈالے برق رفتاری سے اندھیری کوٹھری میں پہنچا۔ وہاں کئی دوسرے پولیس والے آ چکے تھے۔ انھوں نے اس سے پوچھا: "کون ہو تم؟"

شخصِ مذکور نے بلاتامّل جواب دیا: "میں یہاں کا چوکیدار ہوں سر!"

"اچھا،" ایک پولیس والا بولا، "تو پھر تم بتاؤ ـــــ یہاں ہم نے دو کانسٹیبلوں کی لاشیں رکھی تھیں، اب صرف ایک ہے۔ دوسری لاش کہاں گئی؟"

Scanned with CamScanner

"یہ رہی سر،" شخصِ مذکور نے کاندھے پر رکھی لاش زمین پر آہستہ سے لٹادی۔
"مگر... اس کے کپڑے؟" انھوں نے اعتراض کیا۔
"آئیے ہم اِسے وردی پہناتے ہیں،" اس نے جلدی سے کہا۔ وہ اس قدر مستعدی اور توجہ سے لاش کو کپڑے پہنانے میں منہمک ہو گیا تھا کہ پولیس والے چوں و چرا نہ کر سکے اور خود بھی وردی پہنانے اور جوتوں کے فیتے باندھنے میں اس کی مدد کرنے لگے۔ بڈھیاں ٹوٹی لاش وردی پہننے کے بعد بالکل پولیس والے کی لاش لگنے لگی۔ دوسرے پولیس والے اسے بڑی تعظیم سے اٹھا کر لے گئے۔
شخصِ مذکور تھوڑی دیر خاموش کھڑا رہا ــــ پھر رانوں پر ہاتھ مار مار کر اس قدر ہنسا کہ ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔ حالاں کہ وہ ڈر رہا تھا اور پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کے ہنسنے کی آواز بلند نہ ہو، مگر یہ خیال کہ اس نے ماتم کرنے والوں میں گھپلا کر دیا ہے، اسے ہنسی سے دیوانہ کیے دے رہا تھا۔ اچانک اُسے خیال آیا کہ کئی منزلہ عمارت سے پھینکا جانے والا نوجوان تو مہاجر ہو گا ــــ اردو اسپیکنگ! ــــ اور یہ دوسری لاش... نہ جانے کس کی تھی۔ کہیں پہچان نہ لی جائے۔ یہ خیال آنے پر وہ چونک گیا اور کچھ بے چین ہو گیا۔ لیکن فوراً ہی وہ اپنے تردّد کی حماقت پر ہنسا اور اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ لاشیں بول نہیں سکتیں، اس لیے مرے ہوئے آدمی کے بارے میں سرِمو اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ یہ پنجابی تھا، سندھی تھا یا ــــ اردو اسپیکنگ۔
شخصِ مذکور اپنے کامیاب کھیل پر خوش ہو کر ہندوستانی فلم ری وائنڈ کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اصل زندگی بالکل ہندوستانی فلم جیسی ہی ہے، بلکہ اسی کی طرح کئی بار کی دیکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

اتنے میں بجلی چلی گئی۔ وی سی آر کھٹاک سے رک گیا اور پنکھا بھی بند ہو گیا۔ شخصِ مذکور اخبار سے پنکھا جھلنے لگا۔ اخبار میں بس اسی طرح کی خبریں تھیں۔ اداریہ بھی اسی موضوع پر تھا کہ "کراچی خون میں نہا رہا ہے۔" اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ بھاڑ میں جائے کراچی ــــ کیا دنیا میں اَور کچھ بھی نہیں ہو رہا؟
وہ دوسرے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پھر اس نے پوری دلجمعی کے ساتھ آہستہ آہستہ یہ الفاظ اپنے منھ سے ادا کیے:
"کھڑکی ــــ کی ــــ جالی ــــ پھٹ ــــ گئی ــــ ہے۔"
"سڑک ــــ پر ــــ ایک ــــ بلّی ــــ جا ــــ رہی ــــ ہے۔"
"پردہ ــــ ہوا ــــ سے ــــ ہل ــــ رہا ــــ ہے۔"
"میری ــــ فاختہ ــــ نے ــــ دو ــــ دن ــــ سے ــــ باجرا ــــ نہیں ــــ کھایا۔"
لیکن وہ زیادہ دیر تک یہ جملے دہرا نہیں سکا۔ وہ واپس سونے کے کمرے میں آ گیا اور کتابوں کے طاق پر نظر دوڑانے لگا۔ اس نے اپنے لیے ہندوستانی تاریخ کی ایک کتاب چھانٹی، کیوں کہ وہ کوئی ایسی کتاب پڑھنا چاہتا تھا جس کا کراچی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اسے یقین تھا کہ کراچی میں جو کچھ ہو رہا ہے، کم از کم تاریخ کا تو

Scanned with CamScanner

اس سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

بستر پر نیم دراز، تکیے کا سہارا لیے، رومال سے پسینا پونچھتے ہوئے وہ کتاب پڑھنے لگا۔ کسی انگریز مورخ کی تحریر تھی۔ اس نے کتاب جہاں سے کھولی تھی، اتفاق سے وہ کتاب کا ساتواں باب "بنگال میں انگریز" تھا۔

"مغلوں کے دور میں" ــــ کتاب میں لکھا تھا ــــ "ہندوستانی کسان اُس زمانے کے یوروپی کسانوں سے بعض اعتبار سے بہتر حالت میں تھے۔" اچھا؟! شخصِ مذکور نے آنکھیں مل کر تعجب سے یہ سطریں دوبارہ پڑھیں۔ آگے لکھا تھا: "ان کے پاس کھانے کے لیے خوراک اُس زمانے کے یوروپی کسانوں سے زیادہ مقدار میں ہوا کرتی تھی۔"

"اٹھارھویں صدی کے آغاز میں بنگال کے ضدّی نواب سراج الدولہ نے کمپنی بہادر کو کلکتے سے نکال دیا۔ کلائیو مدراس سے بھاری فوج لے کر آوارد ہوا اور ۱۷۵۷ میں اس نے کلکتہ دوبارہ فتح کر کے میر جعفر کو تخت پر بٹھا دیا۔"

"اور یہاں" ــــ کتاب میں درج تھا ــــ "ہم کلائیو کی شخصیت کا دوسرا روپ دیکھتے ہیں۔ گریلا جنگ کا قابل رہنما، باصلاحیت سفارت کار، موقع ملنے پر لُٹیرا بھی ثابت ہوا... کلائیو نے اور کمپنی بہادر کے اہلکاروں نے میدان صاف پا کر خوش حال بنگال کا خون نچوڑنا شروع کر دیا۔ وہ صرف خزانہ ہی نہیں خالی کر رہے تھے، وہ دیہات کو بھی لُوٹ رہے تھے۔ چند ہی برسوں میں بنگال برباد ہو چکا تھا اور کمپنی بہادر، اہلکاروں کی بے راہ روی کے باعث، دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچ چکی تھی..."

"تو پھر آئے وارن ہیسٹنگز۔ اب دیکھیے کہ ہیسٹنگز میں بھی نہایت اعلیٰ صلاحیتیں تھیں، مگر کیا ہوا کہ رفتہ رفتہ ان کے مزاج میں تلخی آ گئی۔ وہ نند کمار کے قانونی قتل میں برابر کے شریک رہے، بنارس کے راجا کو بہت تنگ کیا اور اودھ کی بیگمات کو ہراساں کرتے رہے۔ ان شکایتوں پر ان کے حریفوں کی بن آئی اور انھیں برطرف کر دیا گیا..."

پسینا پونچھتے پونچھتے شخصِ مذکور نے شدید غم و غصہ محسوس کیا۔ اس نے دل ہی دل میں کلائیو اور ہیسٹنگز کو گالیاں دیں ــــ "حرام زادے... کتّے کے بچّے... انھیں کیا حق پہنچتا تھا... کیا حق..." لیکن وہ اس گرم کمرے میں رکھی سر کٹی لاش کا کیا کرے، یہ ابھی تک اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔

پسینا بہہ بہہ کر اس کی گردن سے قمیص کے اندر ٹپک رہا تھا۔ اچانک ایک خیال نے اسے چونکا دیا۔ اور پھر وہ بے تحاشا ہنسنے لگا۔ سر کٹے کا عضوِ تناسل بھی کٹا ہوا تھا۔ اس نے بے ساختہ زانو پر ہاتھ مارا: واہ استاد! یہ تو تم نے لاجواب کام کر دیا ــــ سر کٹی اور عضوِ تناسل کٹی لاش! یہ تو سچ مچ کا گھپلا تھا۔ آناً فاناً شخصِ مذکور نے لاش کو کاندھے پر ڈالا اور سرحد کی جانب چل پڑا۔

سرحد پر تعینات افسران نے اس سے پوچھا: "آپ اس سر کٹی لاش کو کہاں لے جا رہے ہیں؟" شخصِ مذکور منھ چھپا کر ہنسنے لگا۔ پھر اس نے کہا: "سرحد پار... لوگوں کو اُلّو بنانے۔ بھئی دیکھیے

وہاں ہندو مسلمان کی پہچان یہی (ہاتھ سے کٹی ہوئی جگہ پر اشارہ کر کے) تو ہوتی ہے۔ پجامے کھول کھول کر دیکھتے ہیں بھئی پجامے کھول کھول کر ـــــ تو اب آپ دیکھیے گا۔ ہندو مسلمان سکھ، تینوں کو الو بناؤں گا۔ ذرا اس لاش کو دیکھیے ـــــ اس کا وہ ہی نہیں ہے! تو اب یہ ہے کیا؟ بس بالوں بھرا ایک سانولا سابق ہندوستانی ـــــ یعنی اب تو ہندوستان پاکستان بنگلادیش ہے نا ـــــ تو ہم... ہم اسے نند کمار کی لاش بھی ثابت کر سکتے ہیں۔ آپ ذرا دیکھتے تو جائیے۔ خدا قسم وہ مزہ آئے گا کہ ہنستے ہنستے ہم پاگل نہ ہو جائیں تو میں مونچھ منڈا دوں گا۔" شخصِ مذکور نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا جو پسینے سے بھیگ کر اس کے ہونٹوں پر چپکی جا رہی تھیں۔

"نند کمار؟" افسران نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ کون ہے؟"

شخصِ مذکور نہیں جانتا تھا کہ نند کمار کون تھا اور وارن ہیسٹنگز اُس کے قانونی قتل میں کیوں شریکِ کار رہا۔ انگریز مورّخ نے یہ تفصیل نہیں لکھی تھی۔

اُس نے اُلجھ کر کہا: "ہوگا کوئی ـــــ آپ کو اس سے کیا؟"

سرحد پر تعینات افسران نے متانت سے کہا:

"آپ سرحد پار کے معاملات میں دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟ یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا۔ آپ کے نیک جذبات بہرحال اپنے وطن، اپنی قومیت، اپنی قوم پرستی کے حق میں تھے۔ لیکن اس طرف قدم رکھتے ہی آپ کی قوم پرستی، حب الوطنی اور قومی وفاداری پر فی الفور آنچ آ جائے گی۔"

اب کی بار شخصِ مذکور ہنسا نہیں ـــــ وہ رونے لگا۔ سر کٹے کے کٹے ہوئے، گم شدہ عضو کی جگہ پر ہاتھ پھیر کر اس نے کہا: "یہ کہاں گم ہو گیا؟"

ایک کھمبے کے سہارے نہ جانے کب سے ایستادہ، قوم، قومیت، قوم پرستی، قوام یا قمقمہ نامی، روئی کی وہ قد آدم گڑیا جس کے منہ پر دھاگے سے نمک پارے جیسی سیاہ آنکھیں اور سُرخ شہوت بھرے ہونٹ کڑھے تھے، جس کی روئی ٹھنسی بے تحاشا اُبھری ہوئی لذت خیز چھاتیوں کی سُرخ بھٹنیوں سے وی سی آروں، فرجوں اور ایئر کنڈیشنروں اور پجیرو گاڑیوں کے دودھیا دھارے بہہ رہے تھے، اور جو کثرتِ استعمال سے سرینوں کے پاس بے طرح پھٹ گئی تھی اور ان چاکوں سے روئی نکل نکل کر زمین پر گر رہی تھی، اچانک شخصِ مذکور پر آ گری۔

شخصِ مذکور اچانک قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اس نے گڑیا کے سیاہ دھاگوں سے بنے اُلجھے بالوں کا گچھا جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا:

"تُو بتا سالی ـــــ زنا بالجبر ہوا تھا کہ نہیں؟"

***

کراچی میں کیا ہو رہا ہے (۱)

پاکستان میں کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہم ایک مسلّح آمرانہ نظام کے غیر مسلّح، عوامی گروہوں کے نمائندہ جمہوری نظام میں تبدیل کیے جانے کی کوشش کے انتہائی تکلیف دہ، پُرپیچ اور ناہموار زمانے کا نظارہ کر رہے ہیں؟ جب کہ پرانے نظام کے ستون لڑکھڑا کر ہمارے سروں پر گر رہے ہیں اور ہم گردن تک اور بڑھا بڑ ملبے میں دفن ہو رہے ہیں۔ جب کہ ماضی حال اور مستقبل کے طاقت ور ہاتھ معاشرے کو بے دردی سے اپنی اپنی طرف کھینچ رہے ہیں، جھنجھوڑ رہے ہیں، جیسے گرجتی ہوئی طوفانی ہوائیں کسی تناور درخت کو جھنجھوڑ کر جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کرتی ہوں۔

اس جان لیوا کش مکش میں جیت کس کی ہو گی؟ کیا ان جمہوری رجحانات کی جو بے حد کمزور ہیں، جو بیک وقت کسی نوزائیدہ بچے کی مانند بے طاقت اور کسی گرم و سرد زمانہ چشیدہ بڈھے کی طرح کرپٹ ہیں؟ یا ماضی کا سربرآوردہ، فربہ عضلات والا آہنی ہاتھ ان پر غالب آ جائے گا؟

خیالوں کی اُڑان میں ایک خاموش، سرد، طویل رات میں بستر میں کروٹیں بدلتی عورت نے سوچا تھا۔ اور اس بحث سے دور، بالکل لاتعلق ایک آدمی —— پوری عمر کا آدمی —— رو رہا تھا۔

"ارے!" وہ حیران رہ گئی تھی۔ "رو کیوں رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں..." اس نے سُرخ آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

"اتنی... اتنی بے روزگاری ہے..."

"کیا؟" اس نے بھونچکا ہو کر کہا تھا۔

اور پھر وہ ایک نیند میں ڈوب گئی تھی، اور اس نے ایک بہت بڑے، گراں ڈیل، تیل کی سیاہ کیچڑ میں لتھڑے، بھاری پہیے کو حرکت کرتے دیکھا تھا جو آہستہ آہستہ نہ جانے کس طرف جا رہا تھا؛ اور جس کے نیچے ان گنت آدمیوں کی ہڈیاں پس رہی تھیں، کھوپڑیاں پھٹ کر مغز اُبل رہے تھے، خون کے فوارے کالی کیچڑ میں ملتے جا رہے تھے؛ بازو، ٹانگیں، دھڑ، کٹ کٹ کر پہیے کے راستے کے اِدھر اُدھر پھسل رہے تھے۔

یہ کون لوگ ہیں؟ اس نے خواب میں کہا تھا، اور سوچا تھا کہ اس کے وطن میں ماضی، حال اور مستقبل کے ہاتھ کیا تین مختلف ہاتھ ہیں؟ یا یہ ایک ہی ہاتھ ہے جو وقت کے تین مقامات سے کسی طلسم کے طور پر نمودار ہو رہا ہے۔

***

Scanned with CamScanner

"کے بے کسور نوں نئیں پھڑ رئے،" چودھری اکرام نے دردمندی سے کہا۔ "اناں دا اپنا دھندا وی ایہوای سی۔ جسم دے نازک حصّاں تے ڈرِل کرنا، اکھاں تے دند کڈھ لینا۔ ایہو سب کم ایہہ کردے سن۔ اناں دی اپنی دوائی دا اکو ڈوز دے رئے آں، ہور کجھ نئیں کر رئے بادشاہو!"

"پر... چودھری صاب... ایہہ تے باقاعدہ سیاسی تنظیم اے... ایس دا ماس بیس... اناں دے نال مذاکرات..."

"اووی کراں گے، خاطر جمع رکھو،" انھوں نے دل جمعی سے تسلّی دی۔

"مذاکرات؟"

"آہو، کیوں نئیں کراں گے؟ او بس کجھ تسلّی تے رکھو!"

"تے ایہہ لوکی..."

"آہو آہو، اپنے ای تے مُنڈے نیں ایہہ سب۔ بس برین واش کر دتا گیا اے۔ تے نالے ہُن انڈیا دے پھندے وچ آگئے نیں۔ ضرور کراں گے مذاکرات اناں دے نال۔ پر ساڈی پوزیشن سٹرانگ ہونی چاہیدی اے ناں۔ اناں دا مِلی ٹینٹ وِنگ ختم ہو جاوے تے فیر مذاکرات وی ہون گے۔"

"بجا!" سوال کرنے والوں نے امید بھری نظریں چودھری صاحب کے چہرے پر لگا دیں۔ پھر کچھ خیال آنے پر وہ روتی دھوتی آواز میں چوں چرا کرنے لگے۔

"پر ویکھو ناں... ایہہ گلّاں تے تُسیں شاید ہمیشہ توں کردے آئے او۔ اوہ جیہڑے ایسٹ پاکستان وچ ہزاراں، لکھاں قتل کیتے گئے سن... اووی تے ساڈے اپنے ای بندے سن۔ بس برین واش ہو گئے سن، تے فیر... فیر انڈیا دے پھندے وچ آگئے سن... فیر بلوچستان وچ پنڈاں اتے بمباری کیتی گئی سی۔ ایس توں پہلے کئی بلوچ لیڈراں نوں پھاہی دے دتی گئی سی... تے فیر ایہہ سب... ایہہ سب..." وہ خرخرائے۔

"ایسٹ پاکستان وچ تے ہندوآں نے وڈی سازش کیتی سی۔ تے بلوچ سرداراں دا وی دماغ خراب کر دتا گیا سی۔ علیحدگی پسند ہو گئے سن سب۔ تے باہروں امداد وی آوندی سی۔"

یہ سن کر وہ سب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ "باہروں امداد؟ آخر دنیا ساڈی دشمن کیوں ہو گئی اے؟ روس ساڈا دشمن۔ انڈیا تے ہے ای دشمن۔ چین تے امریکہ دوست نیں، تے او تاریخ دے زیادہ تر حصّے وچ اک دوجے دے دشمن۔ عرب ساڈا ساتھ نئیں دیندے۔ وقت پوے تے امریکہ مدد نئیں کردا۔ تے اپنے وطن آلے واری واری پاگل بن دا شکار ہو جاندے نیں۔ ساڈے دشمن اناں دی خفیہ امداد کردے نیں۔ آخر کیوں؟ اساں دنیا دا کیہہ بگاڑیا اے؟"

یہ سن کر چودھری صاحب کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ انھوں نے آہ بھر کر کہا: "سچ کہندے او یارو۔ او کنا سوہنا تے بروقت کہیا سی غالب نے: یارب زمانہ مینوں مٹاوندا اے کیس لئی۔ ایس لوحِ جہاں دی میں تکا بوٹی کیوں نہ کر دیاں..."

***

کراچی میں کیا ہو رہا ہے (۲)

لیاقت آباد کی ایک بلند و بالا، کئی منزلہ عمارت کی آڑ سے پیلا ماہتاب نکلا۔ (واہ! اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب! اسرار الحق مجاز یاد آ رہے ہیں۔) یہی ماہتاب، کچے سونے کا سا، بادلوں کے ننھے سفید ٹکڑوں سے آنکھ مچولی کھیلتا، معصوم نگاہوں سے سارے شہر کو دیکھ رہا ہے۔

اس دن اس عمارت میں پانچ (یا چھ، یا سات؟) مسلح افراد نے گھس کر اکٹھے دس قتل کیے تھے۔ یہ قتل کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے اُس شعبے کے دفتر میں ہوئے تھے جو جائیدادوں کی فروخت اور مالکوں کی تبدیلی وغیرہ کا اندراج کرتا ہے اور جائیدادوں کے ٹیکس وصول کرتا ہے۔ شعبۂ ہذا میں دس افراد تڑ تڑ تڑ آناً فاناً مقتول ہو گئے۔

کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا (قوالی)۔

جائیدادیں... مکانات... دکانیں... محل دو محلے... مٹی، گارا، اینٹیں، پتھر... زمین... زمین... زمین کے بیٹے... زمین کے بھائی... زمین کے باپ، معشوق، گاہک... دلّال... زمین کے چچا، بھتیجے... زمین کے ماموں... زمین کے مالک... زمینوں کے مالک... صاحبِ جائیداد...

رات کو قومی ٹیلی وژن پر کہا گیا کہ یہ تو معتوب لسانی تنظیم کی کارستانی ہے۔ بلکہ شام ہی کے اخباروں میں چشم دید گواہوں کی زبانی قاتلوں میں سے چند کے نام بھی شائع ہو گئے جنھیں اخباروں میں شائع شدہ (داخل شدہ؟) خبر کے مطابق علاقے کے دکان داروں نے پہچان لیا تھا۔

بہتے ہوئے آنسو تھم نہ سکے، کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا (قوالی)۔

یہ قتل کس نے کیے؟

کیا قومی ٹیلی وژن کی خبر درست ہے؟ کیا علاقے میں تنظیمِ ہذا کے لڑکوں نے بھتا وصول نہ ہونے کے باعث یہ قتل کیے؟

ایسا ہونا عین ممکن ہے۔ حالاں کہ مورچوں میں آنے کے بعد سے تنظیم ہذا کے لڑکے زیادہ تر دفاعی لڑائی لڑے ہیں۔ مگر اس طویل عرصے میں غیر حل شدہ مسئلے کی معروضی صورت حال ایک کایا کلپ سے بھی گزر چکی ہے۔ شہر کے علاقوں کے خالص مقامی گروہی مفادات، اور قتل در قتل کے باعث ذاتی انتقامی جذبات بھی پیدا ہو چکے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ قتل بھتا نہ دینے کی سزا ہوں۔

عین ممکن اور بھی بہت کچھ ہے۔ جیسا کہ سڑک پر ایک سنکی ادھڑوٹ نے اول فول بکتے ہوئے کہا

Scanned with CamScanner

کہ "اماں ہوش کی دوا کرو! اگر وہ قاتل ایسے ہی زور آور ہیں تو دہشت نہیں ہو گی ان کی؟ اسی علاقے کے دکانداروں نے موقعے پر نام بھی بتلا دیے؟ اور وہ... کیا کہتے ہیں کہ... اخباروں میں بھی آ گئے؟ شام کی شام؟ آئیں؟ میاں یہ گولیاں کسی اَور کو دینا... ہم بھی گندم کھاتے ہیں..."

تو پھر یہ قتل کس نے کیے ہو سکتے ہیں؟

اُس دن کراچی میں کل اٹھارہ قتل ہوئے تھے۔

***

آسمان کتنا حسین ہے، اور چاند کس قدر خوب صورت! لہٰذا فٹ پاتھ پر ایک پاگل، یا نیم پاگل، یا پاگل ہوتے ہوئے آدمی نے چاند کو بڑی دیر تک بہت غور سے دیکھا۔ نظر اٹھا کر ہر طرف دیکھیں تو کراچی آپ کو ایک پاگل، جنونی عورت سا نظر آئے گا جس کے بال منہ پر بکھرے ہوئے ہیں اور جس نے منہ پر خون مَل لیا ہے اور جو چاند کی طرف منہ اٹھائے کسی مادہ بھیڑیے کی طرح چنگھاڑ رہی ہے۔ مگر اس پاگل، یا نیم پاگل، یا پاگل ہوتے ہوئے بوڑھے نے نظر اٹھا کر چار طرف نہ دیکھا بلکہ اپنی نظریں مضبوطی سے چاند پر جمائے رکھیں۔ سنہرا ماہتاب آسمان کی گھری نیلی، دوات میں بھری روشنائی کے رنگ کی وسعتوں میں تیر رہا تھا۔ اتنے خطرناک حالات میں بھی، چاند کے بلند ہوتے سے، جب رات بھیگ چلی، بوڑھا فٹ پاتھ پر کیوں؟ دراصل اس کے پاس جانے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ یعنی یہ رہتے ہی یہاں ہیں۔ آپ انہیں نہیں جانتے، مگر میں جانتی ہوں۔ ان کا نام رئیس میاں ہے۔ طارق روڈ کے بالکل عقب میں جو پنساری بازار ہے، جہاں سوئی سے لے کر بکرے تک فروخت ہوتے ہیں، وہیں یہ ایک ریڑھی پر پلاسٹک کے برتن اور کھلونے بیچتے ہیں۔ صبح کے وقت یہیں سجاد پہلوان کی دکان پر ناشتہ کر لیتے ہیں۔ ایک جمعے کی پُرفراغت صبح، سجاد پہلوان کی دکان سے بچوں کے لیے حلوہ پوری بندھواتے ہوئے میری ان سے بات چیت ہوئی تھی۔

پتا چلا کہ رئیس میاں سابق مشرقی پاکستان سے آئے ہیں (جہاں وہ گورکھ پور، مشرقی یوپی سے گئے تھے)۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ان کے تمام رشتےدار، بیوی، بیٹے، بہو، پوتے پوتیاں، وہیں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ (کیوں؟ کیسے؟ یہ سب پوچھنے کا تو موقع نہ تھا۔) سو وہ سر پر میلی دو پلی ٹوپی منڈھے اور کھلے پائنچوں کا پجامہ کُرتا پہنے، ایک اکیلی جان ہی کراچی وارد ہوئے، اور اب اپنی ریڑھی ہی پر رہتے ہیں۔

لہٰذا اس رات بھی سنسان گلی میں، جب تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں اور کتے بلّیاں بھی مٹھائی کے دونے چاٹ کر ادھر اُدھر سو چکے تھے اور بازار میں تبدیل ہو جانے والے اس سابقہ رہائشی علاقے کی، تجاوزات کی بھرمار سے نہایت تنگ اور پُرپیچ گلیوں میں باقی بچے بالائی منزل کے مکانوں کی بتیاں نہ جانے کب کی گل ہو چکی تھیں، بوڑھا اپنی ریڑھی پر پیر پسار کر لیٹ گیا اور میلے بازار پر کندن کے تھال

سے دیکھتے بڑی ماہتاب کو دیکھتا رہا، یہاں تک کہ سنہری چاندنی اس کی بوڑھی آنکھوں میں تحلیل ہو گئی اور وہ گہری نیند سو گیا۔

تب اسے علم ہوا کہ دراصل چاندنی اس کی آنکھوں میں نہیں گھلی بلکہ وہ خود چاندنی میں تحلیل ہو گیا ہے اور ایک ایسے مقام پر ہے جہاں ہر طرف ٹھنڈی، دلکش سنہری روشنی پھیلی ہے۔ وہ ایک بہت بڑے لق و دق میدان میں کھڑا ہے۔ دور دور تک سنہری زمین پھیلی ہے۔

"کیا یہ کراچی ہے؟" رئیس میاں نے مدھم سانسیں لیتے ہوئے پوچھا۔

فضا میں پروں کی ہلکی پھڑپھڑاہٹ نے ان کو جواب دیا: "ہاں، یہ کراچی ہے ــــ آج کا کراچی، جو کل کا کراچی بنے گا۔"

بوڑھے نے آنکھوں پر زور ڈال کر پہچاننے کی کوشش کی، لیکن طویل و عریض میدان دوسرے میدانوں میں پگھلنے لگے۔ رئیس میاں کو محسوس ہوا کہ وہ کسی آواز سے تیز رفتار برقی سواری میں فاصلوں پر سے گزر رہے ہیں اور کہیں کہیں پہچان پا رہے ہیں کہ وہ ضلع ملیر سے لانڈھی، کورنگی، سُرجانی ٹاؤن جا پہنچے ہیں یا نیو کراچی، منگھوپیر، سبزی منڈی سے گزر رہے ہیں جہاں چاندنی کے میدان در میدان خالی پڑے ہیں۔ آخر ایک سنہرے میدان میں اُن کا راکب رک گیا۔ سفید براق سے اسپ تازی کو رئیس میاں نے ایک آہنی میخ سے باندھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ میدان کے ہر دو کناروں پر چند جھونپڑیاں بنی ہوئی ہیں۔

رئیس میاں نے پاس جا کر دیکھا۔ یہاں طبقۂ اناث میں سے کوئی نہ تھا۔ صرف مسلح مرد تھے۔

"آپ کون ہیں؟" رئیس میاں نے لجاجت سے استفسار کیا۔ ان میں سے ایک نے سرخ آنکھوں سے انھیں گھورا اور بیٹھی ہوئی آواز میں کہا: "تم سے مطلب؟" پھر اُس نے دھمکایا: "اپنا راستا لے بڈھے!"

تبھی پولیس کی ایک جیپ وہاں آ کر رکی۔ جیپ میں سوار پولیس افسر نے شتر مرغ کی طرح گردن لمبی کر کے جھانکا اور شفقت سے جھونپڑی کے مکینوں سے مخاطب ہو کر کہا: "کیوں بھئی، ٹھیک ٹھاک تو ہو نا؟"

"جی ساب، بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ آپ کا کرم ہے جناب!" جواب ملا۔

"ٹھیک ہے... تو پھر ہم چلتے ہیں۔ کوئی پریشان کرنے کی کوشش کرے تو ہمیں بتانا۔" اس کے بعد جیپ دھول اڑاتی اسٹارٹ ہوئی اور فراٹے بھرتی شہر کے بارونق علاقوں میں جا پہنچی۔ پھر وہ کئی جیپوں میں بدل گئی اور کئی پُر تمکین عمارتوں کے سامنے رُکی جہاں باوقار تعمیراتی اور دیگر کاروباری اداروں کے بورڈ لگے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی پر بھی "قبضہ گروپ" یا "لینڈ گریبرز ایسوسی ایٹس" کے نام کی تختی آویزاں نہیں تھی، مگر نام میں کیا رکھا ہے! تھانوں کو ماہانہ تو یہ ادارے کسی بھی مد میں دے سکتے ہیں۔

زمینوں پر قبضہ اس طرح بھی کیا جا رہا ہے۔ زمین کے ٹکڑے کی آؤٹ پوسٹ پر مسلح افراد کی

Scanned with CamScanner

جھونپڑیاں بنوا دی جاتی ہیں۔ قبضہ کرنے والے مالدار اور طاقت ور افراد ہیں جو تنخواہ دار مسلح افراد تعینات کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

"کون لوگ زمینوں پر قبضہ کر رہے ہیں؟" عورت نے اُلٹی سانسوں کے ساتھ آہستہ سے پوچھا۔

اُس رات پہلے ماہتاب کو تکتے ہوئے وہ پھر ہوائی جہاز میں جا بیٹھی تھی جہاں اُس نے ایک الوہی انٹرویو دیا تھا اور اس سوال کو ہذیان کی طرح دُہرایا تھا کہ "کراچی میں ہو کیا رہا ہے؟" لیکن اب یہ جہاز لندن جانے کے بجائے چاند کی طرف اُڑا جا رہا تھا، اور چاند پر پہنچ چکا تھا۔

اُسے سینے سے لگا کر جواب دینے والے بوڑھے نے، جو شاید خدا تھا، اس سے کہا:

"قبضہ کرنے کے لیے قوتِ بازو استعمال کرنے والے ہتھیار بند معمولی حیثیت کے لوگ ہیں۔ یہ قتل کرنے اور قتل ہو جانے پر آمادہ ہیں۔ یہ کروڑوں روپے نہیں کماتے، مگر رقم ان کو بھی خاصی ملتی ہے۔"

"کیا یہ کراچی کے لوگ ہیں؟" عورت نے پوچھا۔

"اب تو کراچی کے ہیں،" بوڑھے نے آنکھیں مچمچاتے ہوئے کہا۔ "الگ الگ علاقوں میں الگ الگ قبضہ گروپ کام کر رہے ہیں —— باکس بے میں بلوچ ہیں، کورنگی اور مہاجر کیمپ میں (حیران نہ ہونا) بنگالی یہ کام کر رہے ہیں۔ جہاں جہاں ان کا تسلط ہے وہاں ایم کیو ایم حقیقی یا الطاف بھائی کا نام لینے والے مصروفِ کار ہیں۔"

"ہُوں..." عورت نے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولی: "سندھی نہیں ہیں قبضہ گروپ میں؟"

بوڑھا ہنسا۔ (کیا وہ خدا تھا؟) "ہیں تو سہی..." اس نے کہا۔ "گلشنِ اقبال سے گلستانِ جوہر تک قبضہ گروپوں میں مخلوط لوگ ہیں: پنجابی ہیں، پٹھان ہیں، اور ان میں سندھی بھی ہیں۔ وہ اس دھندے میں آہستہ آہستہ شامل ہو رہے ہیں۔" وہ پھر ہولے سے ہنسا۔

"تو کراچی میں یہ بھی ہو رہا ہے؟" عورت نے چاند پر استقامت سے نظریں جما کر کہا۔

"ہاں، یہ بھی،" کسی نے جواب دیا۔ "کہیں زیادہ سفاکی کے ساتھ... کیوں کہ افراتفری اور سیاسی بدامنی کے زمانے میں ہر واردات سیاسی مخالف گروہ کے سر آسانی سے تھوپی جا سکتی ہے..."

"پھر ڈرگ مافیا ہے... جو عرصۂ دراز سے ہتھیاروں کی فروخت کا کام بھی کر رہا ہے،" بڑے میاں نے کہا۔

"ہُوں..." عورت اب پھر ایک دوسرے زمانے میں جا پہنچی۔

خواجہ اجمیر نگری اور قصبہ کالونی میں پٹھان مہاجر فسادات سے کراچی خون میں نہا گیا ہے۔ یہ ٹکراؤ لسانی صرف دکھائی دے رہا ہے۔ اس میں کوئی دوسرا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈرگ مافیا

Scanned with CamScanner

نے پورے شہر کو یرغمال بنالیا ہو، کیوں کہ بعض واقعات اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

اس طرح کی تین رپورٹیں وہ اُس انگریزی اخبار کو بھیج چکی ہے جس میں ان دنوں وہ کام کر رہی ہے۔ چوتھے دن ٹیلی فون پر دور، بہت دور سے اخبار کے ایڈیٹر کی آواز...

"بی بی، آپ یہ لفظ ڈرگ مافیا اب نہ لکھیے۔"

"کیوں کیوں ایڈیٹر صاحب؟" اس کی حیرت...

"بھئی یہ پشاور ہے... ڈرگ مافیا سے لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ پٹھانوں کو قصوروار ٹھہرا رہی ہیں۔"

خاموشی... اس کے ہاتھ میں ٹیلی فون کا پلاسٹک کا ٹھنڈا ریسیور...

"سمجھ گئیں نا بی بی؟"

ہتھیار اور منشیات... شہر کی شہ رگ میں رواں... پیسا، بہت زیادہ پیسا... کروڑ؟ دس کروڑ؟ یہ تو معمولی رقمیں ہیں۔ اس سے بہت زیادہ۔ راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو کچلنے کے لیے ہتھیار... جو فروخت بھی ہوتے ہیں۔

کیسی رکاوٹ؟ جب کہ یہ روزِ محشر ہے اور عالم نفسا نفسی۔ اور جب کہ کل سورج کے طلوع ہونے کا کسی کو یقین نہیں اور آج جتنا پیسا بنایا جا سکتا ہے وہ بنانا لازمی ہے۔ ہتھیاروں سے لدے ہوئے ٹرک علاقہ غیر سے سفر کی ابتدا کرتے اور چاندی کی چھتر چھایا میں پورے صوبۂ سرحد، پورے صوبۂ پنجاب اور پورے صوبۂ سندھ سے گزر کر کراچی میں ہتھیار مطلوبہ مقام تک پہنچاتے رہے ہیں۔ ان کو کہیں نہیں روکا گیا ہے۔ کہتے ہیں ساڑھے تین لاکھ میں ہتھیاروں سے لدا ٹرک بہ حفاظت گھر تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ توڑے دار بندوقیں نہیں، جدید ترین ماوزر، ٹی ٹی، کلاشنکوف، بم، حتیٰ کہ دور مار میزائل بھی۔

آپ کو یقین نہیں آتا؟

کراچی میں لڑکوں نے میزائلوں سے نشانوں پر گولے برسائے ہیں۔ نشانہ لگانا ابھی انھیں نہیں آتا۔ پھینکتے کہیں تھے اور گولا کہیں جا گرتا تھا۔ زیادہ تر ان کا نشانہ رینجرز اور پولیس تھانے تھے، مگر گولے انھوں نے کہیں اَور برسائے۔

"کیوں کہ کراچی میں یہ بھی ہوتا رہا ہے..." بوڑھے نے کلام جاری رکھا۔ "مبینہ طور پر..."

"مبینہ یہ ہے کہ حقیقی کے لڑکے ایم کیو ایم کے لڑکوں کو قتل کر رہے ہیں۔ باقی سب بھی مبینہ ہے۔

"اس جھپیٹ میں وہ ذاتی دشمنوں یا جن سے کبھی تُو تکار ہوئی ہو اُن کو بھی قتل کر رہے ہیں۔ کیوں کہ جب ہتھیار اٹھارہ انیس برس کے لڑکے کے ہاتھ میں ہے تو وہ بادشاہ ہے اور اپنی مرضی سے کسی کو بھی قتل کر سکتا ہے۔ وہ بھتا وصول کر رہے ہیں اور بھتا نہ دینے پر بھی قتل کر رہے ہیں۔

"رینجرز اور پولیس (یہ بھی مبینہ ہے) ایم کیو ایم کے لڑکوں کو اذیت پہنچا کر قتل کر رہی ہے۔ ان کے علاوہ اَور بھی کسی کو مار دیں تو پوچھنے والا کون ہے؟ مبینہ طور پر یہ بھی بھتا وصول کر رہے ہیں۔ گھروں

Scanned with CamScanner

میں گھس کر لوٹ مار کر رہے ہیں۔ بڑے پیمانے پر گرفتاریاں کر رہے ہیں۔ اتنے چھوٹے لڑکوں کو بھی گرفتار کیا گیا ہے جو چودہ پندرہ برس کے تھے۔ یہ "نامعلوم مقامات" پر رکھے گئے ہیں۔ (مبیّنہ طور پر) رہا کرنے کی رقم پچیس ہزار روپے سے شروع ہوتی ہے۔

"ذرا صبر سے سنو... یہ اکتا دینے والی طویل فہرست ہے..." بوڑھے نے کہا۔ "ایم کیو ایم الطاف گروپ کے لڑکے (مبیّنہ طور پر) حقیقی کے لڑکوں اور پولیس اور رینجرز کو قتل کر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بھتّا وصول کر رہے ہیں اور بھتّا نہ دینے پر قتل بھی کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ذاتی دشمنوں یا جن سے کوئی تُوتکار ہوئی ہو اُنھیں بھی قتل کیا جا سکتا ہے۔

"اور یہ سب، یعنی پولیس۔ رینجرز، ایم کیو ایم حقیقی اور مجازی، اپنے ان ایجنٹوں اور کارکنوں کو بھی قتل کر رہے ہیں جو اب ان کے کام کے نہ رہے ہوں یا خطرناک بن چکے ہوں۔ ان کے نام پتے یہ ایک دوسرے کو فراہم بھی کر دیتے ہیں۔ قتل کرنے والے متحاربوں میں رفتہ رفتہ ایک طرح کا رازدارانہ تعاون پیدا ہو گیا ہے۔ کیوں کہ بھتّے ــــ موٹی موٹی رقمیں ــــ اس گھومتے چکر کا مرکز ہیں۔ لہذا کچھ تمھارا کچھ ہمارا کی بنیاد پر، جو کہ گروہی مفادات کے تعاون کی بنیاد ہے اور جس کی اپنی اخلاقیات ہوتی ہیں..."

اس پر ایک آدمی ہذیان میں چلّایا: "کیا بک رہے ہو... کیا بکواس کر رہے ہو؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے ... یہ جھوٹ ہے... جھوٹ... جھوٹ... جھوٹ..." منھ سے جھاگ اگلتا وہ اپنے بال نوچنے لگا۔

"کیا جھوٹ ہے؟" بوڑھے نے تھکاوٹ سے پوچھا۔ "یہ کہ اس شہر کے ساتھ، اس کے باسیوں کے ساتھ، اس قدر گھناؤنا، پرت در پرت خون سے تر، سازش اور سفّاکی سے غلیظ، مکروہ جرم مہینوں، برسوں سے کیا جا رہا ہے؟"

"ہاں!"

"اور کوئی کچھ نہیں کہتا؟"

"ہاں!"

اس پر انگریزی کے ایک صحافی نے انگریزی میں نہایت تیز رفتاری سے کہا: "اور یہ سب کچھ اس لیے آسانی سے ہو رہا ہے کہ ایم کیو ایم، پی پی پی اور اسٹیبلشمنٹ میں سمجھوتا نہیں ہو رہا۔"

اس پر اس کے رخساروں پر تین چار چانٹے مارے گئے۔ "چُپ سالا سمجھوتے کا پُتر۔ ہمارا دھندا مندا کرنے آ گیا۔ چلے آتے ہیں ٹھیکے دار۔ نہ کھیڈساں نہ کھیڈن دے ساں کے مصداق..."

بھئی ایک دریا ہے جو بہہ رہا ہے ــــ اس سے فیض یاب کیوں نہ ہوا جائے؟ اور یہ دریا ہمیشہ، یا کم از کم چند برس اَور، کیوں نہ بہتا رہے؟

اسی دریا کے کنارے کھڑے ہیں سندھی بھی۔ نئے نئے جوان یہ بھی ہوئے ہیں۔ لٹھے کی کلف قمیصیں پہنے، کاندھوں پر اجرک ڈالے، اپنی دھرتی کی مٹی اور مکھن کی مہک سے سوندھے، حیرت سے

Scanned with CamScanner

تمول کے اس بہتے دریا کو دیکھ رہے ہیں۔ اتنا پیسا؟ اس میں ان کا حصہ کہاں ہے؟ ہتھیار تو وہ بھی چلاسکتے ہیں... وہ کسی سے کم تو نہیں... مرد کے بچے ہیں!

مگر کراچی میں وہ کیسے بھتا وصول کر سکتے ہیں؟ بھتے کا بھی ایک "حلال" جواز تراشا جاتا ہے ___ اسے "پروٹیکشن منی" کہا جاتا ہے۔ تو یہاں وہ کسی کو "پروٹیکٹ" کرنے کا سوانگ کیسے رچائیں؟ لیکن حیدر آباد میں، جہاں سندھی بھی ۵۰ فیصد ہیں، انھوں نے بے ہتھیار سندھیوں کو "پروٹیکٹ" کرنا شروع کر دیا ہے اور وافر مقدار میں سندھیوں سے بھتا وصول کر رہے ہیں۔

رات گئے ایک اکیلی، سنسان گلی میں ایک لیمپ پوسٹ کے نیچے، بیمار زرد روشنی میں ایک چھریرا پولیس والا، جس کی پتلی کمر کسی ہوئی پیٹی میں بل کھا رہی ہے، کلّے میں گلوری دبا کر نزاکت سے سگریٹ سلگاتا ہے اور مخمور نگاہیں آہستہ آہستہ اٹھاتے ہوئے ماچس پھونک کر گنگناتا ہے:

"ہم کو دعائیں دو... ارے ہم کو... دعائیں دو تمھیں... قاتل بنا دیا... آ آ... ہم کو..."

***

خون بالیدہ چہرے والی عورت چاند کی طرف دیکھتے ہوئے مادہ بھیڑیے کی مانند زور سے چنگھاڑی اور سنسان گلی گونجی۔

"کراچی میں ہو کیا رہا ہے؟"

کراچی میں کل کے طبقات کی بنیاد رکھی جا رہی ہے، جو موجودہ اُتھل پُتھل میں تمھاری نظروں سے اوجھل ہے۔ اس دھکم پیل میں، اس گھمسان میں جو دردِزہ کی طرح ایک لاوارث شہر کو جھنجھوڑ رہا ہے، کل کا طبقۂ اشرافیہ جنم لے رہا ہے۔ وہ لوگ جو آج داؤں مار لیں گے اُنھیں کے خاندان کل صاحبِ حیثیت ہوں گے۔ اشرافیہ میں نئے نام اور ذاتیں شامل ہوں گی... نیا نکور بالائی طبقہ پیدا ہو گا۔

کراچی میں کوئی نئی بات نہیں ہو رہی، انسانی معاشرے کے طبقات بننے کی کہانی دُہرائی جا رہی ہے۔ پرانے اشرافیہ نے جاگیریں اور ملیں اخلاقیات پر مضامین لکھ کر حاصل نہیں کی تھیں۔ یہ کھیل خوں ریزی کے کل بھی تھے اور آج بھی ہیں۔

کراچی سہما ہوا... کراچی خون میں نہایا ہوا... شام کے اخباروں میں مقتولوں کی تصویر... کرسی سے لڑھکتا ہوا کوئی آدمی... جیسے مکر کر رہا ہو، اداکاری کرتا ہو مرنے کی، قتل ہونے کی...

بوڑھے نے اسے اپنے سینے سے لگا کر سختی سے بھینچا اور کہا: "سنو..."

وہ سُن سی لیٹی رہی، چاند کو گھورتی۔ پھر بوڑھے نے کہا:

Scanned with CamScanner

"انسان میں اور دوسرے جانوروں میں فرق یہ ہے کہ ایک دوسرے کا گوشت بھنبھوڑنے سے پہلے اور بعد میں آدمی واویلا بہت کرتا ہے، ندامت کے آنسو بہاتا ہے۔ آئے ہائے! یہ ہم نے کیا کیا! (اکثر کہتا ہے: یہ تم نے کیا کیا!) انسانیت کا خون کر دیا! ننھے ننھے بچوں کو آگ کے شعلوں میں پھینک دیا! (اپنے دہن سے خون پونچھتے ہوئے) عورتوں کے اندام نہانی میں سنگینیں اتار دیں۔ بھوں بھوں... رونا... سسکیاں... جب کہ اس کا آدھا دماغ زمان و مکاں کے کسی بھی منطقے میں ٹھہرائے گئے حریف کو نیچا دکھانے کا تازہ تکڑم سوچ رہا ہوتا ہے: سالے تیری مُنڈیا نہ جب تک رگڑ دوں خاک میں...

"پھر متعدد قتل کرنے کے بعد چھینی ہوئی اپنے حصے کی روٹی ــــ یا ایسی روٹی جس پر اس کے خیال میں دراصل اس کا حق تھا ــــ کھانا اسے اچھا بھی نہیں لگتا۔ یہ ابھی تک خون میں تر ہوتی ہے۔ وہ اسے اگل اگل کر کھائے گا۔ زمین پر لوٹیں لگائے گا۔ درختوں پر جھولا ڈال کر جھولے گا۔ بارش میں نہائے گا۔ پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہے گا: آہ! دھنک کس قدر حسین ہوتی ہے! اس پر کچھ شعر لکھے گا..."

"ہم..." عورت نے کہانی سنتے سنتے ہُنکارا بھرا اور ایک لمبی، ٹھٹھری سانس لی۔ اُسے دارالسلطنت میں کی گئی اپنے دوست سے گفتگو یاد آئی۔

وہ کرسی میں منجمد بیٹھا تھا۔ اس نے کہا: "صرف کراچی ہی کیوں؟ پوری دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ بوسنیا کو دیکھیے۔ یہ نام نہاد اکیسویں صدی نسلی تنازعات، خوں ریزی اور تعصب سے عبارت ہو گی۔" پھر اس نے کچھ سوچ کر اضافہ کیا:

"کراچی کے لیے روتی کیوں ہیں بزدلوں کی طرح؟ اس کے بدلے... ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں؟ کیا وہ بالکل برباد نہیں ہو جائیں گے؟"

"کیا وہ بالکل برباد ہو جائیں گے؟" عورت نے مسحور ہو کر دُہرایا۔

"یقیناً!" اس کے دوست نے کہا۔ پھر وہ خاموش ہو گیا۔

عورت سوچ میں پڑ گئی۔ آیا اسے بزدلوں کی طرح کراچی پر رونے کے بدلے (بہادروں کی طرح) ہندوستان کے مسلمانوں پر رونا چاہیے؟ مضبوطی سے نظریں اُس طرف جمائے رکھنی چاہییں؟ یقیناً یہ زیادہ محفوظ بات تو ہے۔ اُس نے کرسی پر دیر سے خاموش بیٹھے، بہت تنہا لگتے اپنے عزیز ہار کسی دوست پر نظر ڈال کر سوچا۔ ملکی متحارب لوگوں کے عتاب سے اسی طرح بچا جا سکتا ہے۔ اسٹیبلشمنٹ کی بھی یہی رضا ہے کہ لکھنے لکھانے والے کراچی کی گندی بحث میں اُلجھنے کے بجائے ملک اور مسلمانوں کے خلاف بیرونِ ملک کی جانے والی نت نئی سازشوں پر خامہ فرسائی کریں۔

مگر عورت کو تو کراچی واپس آنا تھا اور ایک مادہ بھیڑیے کی چنگھاڑ سننی تھی۔

لہٰذا اس نے اپنی نظریں اس رات کے پہلے ماہتاب پر گھا دیں جہاں رئیس میاں چرخا کات رہے تھے۔

Scanned with CamScanner

"پنجابی... سندھی... مہاجر..."

وہ اپنی سانسوں میں بڑبڑائی۔ اور اچانک وہ کسی دوسرے زمانے میں جا پہنچی۔ غالباً ۱۹۶۸ یا ۱۹۶۹ کی ایک کالی گھپ، اماوس کی رات... ایک ریل گاڑی پوری آواز سے رات کی بھیانک تاریکی میں داخل ہوئی اور دھڑدھڑاتی ہوئی اندھیرے میں سے گزرنے لگی۔ اس کے ایک ڈبے میں دو نوجوان لڑکیاں خوف سے لرز رہی ہیں۔ انھیں حیدر آباد سندھ کے قریب، سندھو ندی کے کنارے، بنی بستی جام شورو جانا ہے۔ یہ لڑکیاں کس قوم یا قومیت کی ہیں؟ آپ انھیں کچھ بھی کہہ سکتے ہیں — ماں مہاجر اور باپ پنجابی۔ یہ یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں۔ سندھ یونیورسٹی میں سندھی قوم پرست طلبا تحریک کا زور ہے۔ چند دن پہلے یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں میں سندھی قوم پرستوں نے اشتعال میں آ کر ایک پنجابی آبادکار کے گھر پر حملہ کر دیا تھا۔ خبر تھی کہ اس گھر کی جوان لڑکی کے ساتھ زنا کر کے اس کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش لٹکا دی گئی تھی، اس طرح کہ اس کے پوشیدہ عضو میں ایک کھردری لکڑی ٹھنسی ہوئی تھی۔

لڑکیوں کے ساتھ اس ڈبے میں اتفاقاً ایک فوجی جوان بھی ہے۔ اس نے لڑکیوں کو بہ حفاظت ان کے گھر تک پہنچانے کا وعدہ کیا ہے۔ اندھیرے کو چیرتی جاتی، دھڑدھڑاتی اس ریل گاڑی کی اندرونی روشنی کی لکیر میں ان دو نصف پنجابی نصف مہاجر نوجوان لڑکیوں کے لیے ایک فرشتے سے کم نہ تھا پاک فوج کا جوان، جس نے انھیں بہ حفاظت گھر تک پہنچایا۔

پھر وہ ریل بھی گزر گئی اور کراچی میں ایک دن طلوع ہوا۔ بھٹو حکومت کے خلاف پی این اے کی تحریک کے زمانے کا ایک دن۔ اس دن کی روشنی میں کراچی کے ایک علاقے بہادر آباد میں بھٹو مخالف مقامیوں نے ایک بوڑھے سندھی کو ہلاک کر کے اس کی لاش چوراہے پر لٹکا دی تھی۔ بہت دیر تک وہ لاش جھولتی رہی۔

پھر اُس نے انسانی اعضا دیکھے جن پر جلتے سگریٹوں سے جیسے مہاجر یا جیسے سندھ لکھا تھا۔

اُسے کراچی کے سندھی مخالف لسانی فسادات یاد آئے۔ سندھ کی اسمبلی میں لسانی بل پاس ہوا تھا اور کراچی میں ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا لیاقت آباد کے ایک چھوٹے سے مکان کی بالائی منزل پر ایک بڑے میاں باورچی خانے میں گھسے بڑی سی دیگ میں پانی اُبال رہے ہیں۔

"ارے اتنے پانی کا کیا کیجیے گا؟" اس نے پیار سے پوچھا۔

بڑے میاں اتنے ضعیف ہیں — کمر دوہری، تن کا ایک ایک بال سفید — سفید جھک کرتا پہنے۔

"ارے بھئی یہ پانی..." وہ پوپلے منہ سے بولے، "پھینکیں گے کھولتا ہوا پانی... کیا نام کہ پولیس پر... اور یہ۔" انھوں نے پاس رکھا پسی مرچوں کا بڑا سا ڈبا دکھایا۔

Scanned with CamScanner

عورت ہنسنے لگی۔ چاندنی میں اُسے اپنی ہنسی کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ اس کے گھر کی نچلی منزل سے چمپا اور چنبیلی کی مہک تیرتی ہوئی اوپر آنے لگی۔

***

کراچی میں کیا ہو رہا ہے (۳)

جب معتوب سیاسی تنظیم کے رکن، سابق بلدیاتی کاؤنسلر کو کراچی کے ایک بھرے پرے محلّے سے گرفتار کیا گیا تھا تو یہ متوقع نہ تھا کہ اس کی لاش دوسرے ہی دن اسپتال پہنچا دی جائے گی۔ (کئی مہینوں سے اس عمل میں دو تین دن کا وقفہ پڑنے کا معمول تھا۔) پولیس رپورٹ میں درج تھا کہ متوفی پر حراست میں دل کا دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ دل کا دورہ ایک وبا کی طرح گرفتار شدگان میں پھیل چکا تھا اور نوجوان لڑکے حراست میں دل کے دوروں کا شکار ہو رہے تھے۔

پوسٹ مارٹم کے بعد فوراً لاش واپس لے گئی۔ مگر اسپتال میں موجود عینی شاہدوں اور چند ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ متوفی کے پورے جسم پر تشدّد کے نشان تھے۔ اخباروں میں آنے والی دیگر رپورٹوں میں درج تھا کہ اس کی ایک آنکھ بھی غائب تھی۔

یہ پڑھ کر کراچی میں رہنے والا ایک دردمند شخص سر تھام کر بیٹھ گیا کیوں کہ اسے متلی ہونے لگی تھی اور اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ "آنکھ نکال لی! آنکھ نکال لی!" یہ الفاظ اس کے دماغ میں گردش کرنے لگے۔ اس کے ذہن میں یہ عجیب سا خیال بھی آیا کہ اُس رات جب لوگ اپنے گھروں میں آرام سے سو رہے تھے، ایک شخص کی آنکھ نکالی جا رہی تھی۔ اس خیال سے وہ پوری رات سو نہ سکا۔

دوسرے دن کے اخبار میں پولیس کی جانب سے متوفی پر اذیّت کرنے کی تردید شائع ہوئی۔ پولیس نے بیان دیا کہ لاش پر اذیّت کے نشان پہلے سے موجود تھے۔ وہ معتوب سیاسی تنظیم کے عقوبت خانے میں خود اُنھیں کے ہاتھوں اذیّت کا شکار ہوا تھا۔ اپنے اوپر تشدد کروا کے وہ گرتا پڑتا لڑکھڑاتا سڑک پر جا رہا تھا کہ گرفتار ہو گیا، اور تب حراست میں اس پر دل کا دورہ پڑا اور وہ مر گیا۔

یہ تردید پڑھ کر دردمند شخص کی خاک تسلّی نہ ہو سکی۔ بار بار ایک ہی خیال اس کے دل کو کچوکے دیتا رہا، کہ جب اس پر اتنا تشدد ہو چکا تھا تو وہ کم بخت عقوبت خانے سے نکلا ہی کیوں، اور اس حالت میں پیدل آخر کہاں کے لیے چل پڑا، رکشا ٹیکسی ہی کر لی ہوتی۔ لہٰذا پھر وہ پوری رات نہ سو سکا، اور رات بھر اس کے ذہن میں ایک شخص بھیبت سے منہ پھاڑے، گھٹی گھٹی آواز میں کربناک چیخوں کے ٹکڑے حلق سے

نکالتا رہا۔ ایک نشتر اُس کی آنکھ کا ڈھیلا نکالتا رہا اور وہ آنکھ نکلنے کے ساتھ کرسی سے ٹیڑھا ہو کر اوپر اٹھتا چلا گیا۔

بہرحال، تیسرے دن کے اخباروں میں آیا کہ لاش پہلے ایک رفاہی ادارے کے حوالے کی گئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ جب لاش ان کے پاس لائی گئی تو اس پر تشدد کے نشان تھے اور آنکھ میں گولی ماری گئی تھی جو کھوپڑی کی پُشت سے پار ہو گئی تھی۔

یہ پڑھ کر دردمند شخص پُرسکون ہوا۔ اس نے سوچا کہ لاحول ولاقوۃ! میں تو سمجھا تھا کہ آنکھ نکالی گئی ہے۔ اب پتا چلا کہ اس میں تو گولی ماری گئی تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا، اور اس رات وہ آرام سے سویا۔

***

جس سہ پہر آمنہ بیگم کے گھر ٹیلی فون آیا تھا کہ ان کی بہن کو فیڈرل بی ایریا کے کسی اسپتال میں داخل کیا گیا ہے، ان کا دل ڈوبنے لگا۔ فون پر بمشکل اسپتال کا پتا لے کر انھوں نے بٹوا سنبھالا اور گھبرائی ہوئی پڑوسن کے گھر جا پہنچیں۔ دستک دی تو عمران نے دروازہ کھولا۔ وہ انھیں اسپتال لے جانے کو تیار ہو گیا۔ دُسراہت کی خاطر اس کی ماں بھی آمنہ بیگم کے ساتھ ہولیں۔

آمنہ بیگم کا پڑوسی، چوبیس پچیس سالہ جوان انھیں گھر کی کار میں اسپتال لے چلا۔ اس نے پہلا ہی موڑ کاٹا ہو گا کہ سپاہیوں کا ایک ٹرک سامنے آ گیا۔ عمران نے ایکسلریٹر سے پیر ہٹا کر وہیل کو تیزی سے بائیں جانب گھمایا۔ پہیوں کی چیخ کے ساتھ گاڑی لہرائی اور سڑک کے وسط میں آ گئی۔ مگر عمران زیادہ دور نہ جا سکا۔ سپاہیوں کے ٹرک نے تیزی سے پلٹ کر اس کا راستا روک دیا۔

پھر انھوں نے عمران کو گاڑی سے گھسیٹ کر باہر نکالا اور غلیظ گالیوں کی بوچھاڑ کے ساتھ اُسے بری طرح مارنا شروع کر دیا۔ ''خنزیر کے تخم! اگر ٹکرا جاتی تو؟''

پچھلی سیٹ پر بیٹھی دونوں عورتوں کی بائیں بائیں اور چیخ پکار چند لمحوں کے بعد ختم ہو گئی۔ وہ خاموش بیٹھی تھر تھر کانپتی رہیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو خاموشی سے بہتے، ان کی ناک اور ٹھوڑی اور تھرتھراتے ہونٹوں سے نیچے ٹپکتے رہے۔

سڑک پر خوانچے والا بیٹھا تھا۔ عمران کو بری طرح مار کھاتا دیکھ کر اس نے منھ پھیر لیا اور خوانچے کو مضبوطی سے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ تپڑ کی اور ٹھوکر کی ہر آواز کے ساتھ اس کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی گئی اور ہاتھوں کی موٹی، بوڑھی رگیں اُبھرتی گئیں۔

پاس سے گزرنے والی کسی شہری کی کار نے لمحہ بھر کو رفتار دھیمی کی، پھر تیزی سے گلی سے چلی گئی۔

Scanned with CamScanner

مار کھانے کے بعد عمران گاڑی میں بیٹھا۔ ہوش حواس مجتمع کر کے وہ گلی سے باہر نکلا۔ بڑی سڑک پر آ کر اس نے محلے کی کریانے کی دکان کے سامنے گاڑی روکی۔ دکان دار اُسے پہچان کر اس کی طرف بڑھا۔ "ارے، تمھاری یہ حالت!" واقعے کی نوعیت اُسے سمجھائی گئی۔ دکان دار کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ خاموشی سے اندر جا کر پانی کا گلاس لایا۔ عمران نے ہاتھ کی آڑ لے کر دانتوں سے نکلنے والے خون کی کلّی کی اور ٹشو پیپر سے منہ صاف کیا۔ بال ٹھیک کر کے تھوڑی دیر بعد وہ ماں اور پڑوس کی منہ بولی خالہ کو لے کر اسپتال روانہ ہو گیا۔

پھر عمران بھی کہیں چلا گیا ــــ کہاں؟ کون جانے!

**

اختر حمید خاں

انگریزی سے ترجمہ اور تدوین: اجمل کمال

جینے کا ہُنر

مجھے اپنے گناہوں کی یہ سزا ملی ہے کہ لمبی عمر پاؤں اور ہولناک واقعات ہوتے ہوئے دیکھوں۔ ایک نوجوان آئی سی ایس آفیسر کی حیثیت سے میں نے بنگال کے خوفناک قحط اور انگریز سرکار کی انتظامیہ کے زوال کا مشاہدہ کیا۔ ۱۹۴۷ میں جامعہ ملیہ دہلی میں ایک استاد کی حیثیت سے مجھے مغل ثقافت کے وارث مسلمانوں کو شکست و ریخت سے دوچار ہوتے دیکھنا پڑا۔ تقسیم کے نتیجے میں دہلی سے پانچ لاکھ مسلمانوں نے ہجرت کی اور دس لاکھ ہندو اور سکھ شہر میں آ گئے؛ چند ہفتوں میں شہر بالکل بدل کر رہ گیا۔ ۱۹۵۰ میں میں ہجرت کر کے کومیلا، مشرقی پاکستان، گیا اور وہاں بیس برس کے عرصے میں پاکستان کے شیدائیوں اور بانیوں کی اکثریت کو، بنگالی مسلمانوں کو، دشمنوں میں تبدیل ہوتے دیکھا۔ میں نے اُن تمام دہشت ناک واقعات کا، مشرقی پاکستان کے ختم ہونے کا اور "بہاریوں" کے قتلِ عام کا مشاہدہ کیا۔ اور میری سزا اب بھی جاری ہے۔ کبھی کبھی میں شیخ سعدی کا ایک شعر دُہراتا ہوں، جنھوں نے سو برس کی عمر پائی اور بہت سے المناک واقعات دیکھے جن میں ہلاکو خاں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی بھی شامل تھی:

بسے نادیدنی با دیدہ ام من
مرا اے کاشکے مادر نہ زادے

لیکن یہ تمام المناک واقعات شیخ سعدی کو قنوطیت یا کلبیت کا شکار نہیں بنا سکے۔ بلکہ ان کی توجہ اور نصیحت کا رخ زندوں کی طرف رہا جو تمام المیوں کے باوجود اپنی زندگی کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ مجھے امید ہے کہ میں نے بھی یہی سبق سیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ایک بہت بڑی تبدیلی کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ بہت سی پرانی چیزیں مر رہی ہیں؛ چاروں طرف تنزل اور موت کے آثار ہیں۔ لیکن مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ بہت سی نئی چیزیں پیدا بھی ہو رہی ہیں: زندگی اور ترقی کے نشانات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

۲

تقریباً ساٹھ سال پہلے، ۱۹۳۶ میں، میں انڈین سول سروس میں شامل ہوا اور نو سال تک ایک فرض شناس افسر کے طور پر کام کرتا رہا۔ پھر میں نے اپنے فکر پسند مزاج کو دیکھتے ہوئے افسر کے بجائے استاد بننے کا فیصلہ کیا۔ چند سال میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کے جامعہ ملیہ میں، جو ایک گاندھیائی ادارہ تھا، کام کیا۔ ۱۹۵۰ میں کومیلا جانے کے بعد میں آٹھ سال کومیلا کالج کا پرنسپل رہا۔ ۱۹۶۰ اور ۱۹۷۰ کے عشروں میں مجھے امریکی استادوں سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ مجھے اپنے انگریز، گاندھیائی اور امریکی استادوں کے احسان کا ہمیشہ پاس رہا ہے۔ اس کے بعد میں خوش قسمتی سے کچھ تجرباتی (پائلٹ) پروجیکٹوں میں شریک رہا، جہاں ایک محقق کے طور پر میں نے اپنے استادوں کے سکھائے ہوئے سبق سے کچھ آگے جانے کی کوشش کی۔

حکومت پاکستان نے فورڈ فاؤنڈیشن کی مدد سے دیہی ترقی کی دو اکیڈمیاں قائم کی تھیں، ایک پشاور میں اور دوسری کومیلا میں۔ ۱۹۵۸ میں مجھے کومیلا اکیڈمی کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔ اکیڈمی نے ۱۹۵۹ میں کام شروع کیا۔ اکیڈمی کو کومیلا تھانے کے ۱۰۰ مربع میل کے علاقے اور اس کی حدود میں آنے والے ۳۰۰ گاؤوں کو تحقیق اور تجربے کے لیے ایک طرح کی لیبارٹری بنانے کی اجازت دی گئی تھی۔ تحقیق سے پتا چلا کہ آبپاشی، دریا کے بندوں اور سڑکوں کے نظام کی نئے سرے سے تعمیر سب سے اہم ضرورت ہے۔ کھال (آبپاشی کے نالے) ریت سے اٹ گئے تھے اور بند ٹوٹ رہے تھے، جس کی وجہ سے سیلاب میں زبردست تباہی ہوتی تھی۔ لارڈ کارنوالس کا متعارف کرایا ہوا زمینداری نظام، جو کسی حد تک ان کھالوں اور بندوں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا، پاکستان بننے کے بعد ختم ہو گیا تھا۔ سرکاری محکمے یہ کام کرنے کے اہل نہ تھے۔ اس لیے نئے ادارے قائم کرنے اور تعمیر نو کے "نئے طریقے وضع کرنے کی ضرورت تھی۔ کومیلا تھانے میں سال بھر کی تحقیق کے بعد دیہی تعمیر کا پروگرام وضع کیا گیا:

(۱) تھانا کاؤنسل اور یونین کاؤنسلوں کو کھال، بند اور سڑکیں تعمیر کرنے کے لیے پانچ سالہ منصوبے تیار کرنے کی تربیت دی گئی۔

(۲) کاؤنسلوں کو ہر سال ان منصوبوں اور اسکیموں پر عمل کرنے کے لیے مالی گرانٹ دی جاتی۔

(۳) انجنیئروں اور اکاؤنٹنٹوں کو مقرر کیا گیا کہ مقامی پروجیکٹ کمیٹیوں کو تربیت دیں، اور یہ کمیٹیاں کسی ٹھیکے دار کے بغیر عام لاگت سے چوتھائی خرچ پر اور بہت تیز رفتاری سے تعمیر کا کام مکمل کرتیں۔

(۴) دیہی تعمیر کے اس کام سے نہ صرف تھانے کا انفرااسٹرکچر بہت تیزی سے بحال ہو گیا بلکہ بہت سے بے زمین مزدوروں کو روزگار بھی ملا۔

Scanned with CamScanner

(۵) زمین کی سطح پر اور زیرِ زمین پانی کی کثیر مقدار کو استعمال کرنے کے لیے روایتی آبپاشی کے طریقے کے ساتھ ساتھ پمپ اور ٹیوب ویل بھی نصب کیے گئے۔ تاہم، ان کا انتظام یونین کاؤنسلوں کے بجائے ان کا پانی استعمال کرنے والوں کے سپرد کیا گیا تاکہ وہ خود ان کی دیکھ بھال کریں اور ان کے اخراجات برداشت کریں۔

تحقیق کے نتیجے میں سامنے آنے والا دوسرا اہم ترین مسئلہ چھوٹے کسانوں کی بدحالی کا تھا۔ ان میں سے نوے فیصد کسان پانچ ایکڑ سے کم زمین کے مالک تھے۔ زمین کی پیداوار کم تھی اور سیلاب اور فصل کے کیڑوں سے ہونے والا نقصان بہت زیادہ تھا؛ اس کے علاوہ تاجر اور مہاجن ان کا بے پناہ استحصال کرتے تھے۔ چھوٹے کسانوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے دو سطحی کوآپریٹوز کا نظام تیار کیا گیا۔ گاؤں میں کسانوں کے چھوٹے کوآپریٹوز بنائے گئے اور تھانے کی سطح پر ایک مرکزی ایسوسی ایشن اور بینک قائم کیا گیا۔ یہ مرکزی نظام نہ صرف کسانوں کو ضروری قرض دیتا بلکہ انھیں بچت کرکے حصص خریدنے، زراعت کے نئے طریقے سیکھنے اور اپنانے اور آبپاشی کا بندوبست سنبھالنے کی تربیت بھی فراہم کرتا۔ تھانا ایسوسی ایشن پیداوار کی فروخت اور زرعی صنعتوں کے فروغ کے لیے بھی کوشش کرتی۔

پہلا مسئلہ ـــــ یعنی کھال، بند اور سڑکیں تعمیر کرنے کا مسئلہ ـــــ مقامی کاؤنسلوں نے دیہی تعمیر کے ذریعے بہت خوبی سے حل کیا۔ دوسرا مسئلہ ـــــ یعنی چھوٹے کسانوں کی حالت بہتر بنانے کا مسئلہ ـــــ کوآپریٹوز نے اتنی ہی خوبی سے حل کیا۔ ان دونوں اداروں کو ملا کر تھانا ٹریننگ اینڈ ڈویلپمنٹ سنٹر (TTDC) کی شکل دی گئی اور اسے سرکاری محکموں کے پہلو بہ پہلو قائم کر دیا گیا۔ اس کی عمارت میں تھانا کوآپریٹوز ایسوسی ایشن کے علاوہ زراعت، جانوروں کے علاج، ماہی گیری اور صحت عامہ کی تربیت کا مرکز بھی تھا۔ ہر ہفتے گاؤوں کے نمائندے ـــــ کاؤنسلر، کوآپریٹوز کے منتظم، کسان، استاد، مسجدوں کے امام، منتظم عورتیں، دائیاں ـــــ بڑی تعداد میں یہاں آکر تربیت حاصل کرتے۔ یہ مرکز "ہمہ گیر دیہی ترقی" کی علامت بن گیا۔

اس تجرباتی پروجیکٹ میں چار سادہ اصول مدِ نظر رکھے گئے:

(۱) سب سے پہلے تحقیق کے ذریعے صورتِ حال کا مکمل تجزیہ کیا گیا۔

(۲) پھر دو عوامی اداروں ـــــ یونین کاؤنسل اور کوآپریٹو ـــــ کو فعال کیا گیا، انھیں ذمے داریاں سونپی گئیں اور تعاون فراہم کیا گیا۔

(۳) پروجیکٹ کے سرکاری افسروں کو استاد، تربیت دینے والے اور تعاون کرنے والے کا کردار دیا گیا۔

(۴) گاؤں کے فعال افراد کو مکمل تکنیکی رہنمائی فراہم کی گئی۔

بہت کم عرصے میں کومیلا تھانے میں حیرت انگیز نتائج کا مشاہدہ کیا گیا۔ وہاں ہونے والا عملی تجربہ تربیت کی ایک عمدہ بنیاد بنا۔ ۱۹۶۰ میں اسی قسم کے مراکز ۲۱۷ تھانوں میں قائم کیے گئے۔

Scanned with CamScanner

۱۹۷۰ تک ان میں سے ۲۵۰ میں قائم کیے ہوئے مراکز مضبوط بنیادوں پر مستحکم ہو چکے تھے۔ ہارورڈ کے مشیروں اور ورلڈ بینک کے شراکت کے باعث "ہمہ گیر دیہی ترقی" کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ ورلڈ بینک کے مشیروں نے یہ پروگرام انڈونیشیا میں متعارف کرایا جہاں ۱۹۶۴ سے اس پر مسلسل عمل ہونے کی بدولت دیہی منظر بالکل بدل چکا ہے۔

۳

اپریل ۱۹۷۱ میں مجھے کومیلا سے اکھڑ کر موجودہ پاکستان میں آنا پڑا۔ پہلے دو سال میں نے فیصل آباد اور کراچی یونیورسٹی میں پڑھایا، اور اس کے بعد دو سال پشاور کی دیہی اکیڈمی میں کام کیا جہاں میرے دوست شعیب سلطان خاں نے کومیلا کے خطوط پر داؤدزئی پروجیکٹ شروع کیا تھا۔ مگر مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ نئے پاکستان میں دیہی ترقی کا یہ طریقہ بے مصرف قرار دے کر مسترد کر دیا جاتا ہے۔ اب، ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ جانے پر، مجھے خود کو بے کار شے کے طور پر کونے میں پھینک دیے جانے کا کوئی ملال نہ ہوا۔ مجھے اس کونے میں سے امریکا کی مشی گن اسٹیٹ یونیورسٹی نے اٹھایا اور ڈویلپمنٹ کا استاد بنا دیا۔

چند سال بعد میں تدریس سے تنگ کر کراچی لوٹ آیا تاکہ اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن مطالعے اور غور و فکر میں بسر کروں۔ لیکن جب بی سی سی آئی فاؤنڈیشن کے آغا حسن عابدی نے مجھے اورنگی میں ایک اور پائلٹ پروجیکٹ شروع کرنے کی ترغیب دی تو میں مزاحمت نہ کر سکا۔ اورنگی پائلٹ پروجیکٹ (OPP) ایک اعتبار سے کومیلا اکیڈمی سے بالکل مختلف تھا۔ یہ ایک غیر سرکاری ادارہ تھا جس کا انحصار ایک اَور غیر سرکاری تنظیم کی جانب سے ملنے والی قلیل مالی امداد پر تھا، جبکہ کومیلا اکیڈمی کو حکومت، ہارورڈ کے مشیروں، مشی گن یونیورسٹی اور فورڈ فاؤنڈیشن کا تعاون اور مالی اعانت حاصل رہی تھی۔ شروع شروع میں اورنگی پروجیکٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے کسی عملے، دفتر، رابطوں اور ذریعوں کے بغیر، اور محض ایک ٹوٹی پھوٹی جیپ کے ساتھ، مَیں کومیلا اکیڈمی کے سربراہ کی نسبت رابنسن کروسو سے زیادہ مشابہ تھا۔ لیکن ایک اَور اعتبار سے اورنگی پروجیکٹ اور کومیلا اکیڈمی میں گہری مماثلت بھی تھی؛ دونوں ایک ہی اصول پر عمل کرتے تھے: پہلے سیکھنا اور پھر سکھانا۔

سب سے پہلے میں نے پروجیکٹ کی غیر سرکاری حیثیت کی محدودات کو اپنے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کی۔ او پی پی (OPP) کے پاس کسی قسم کا اختیار نہیں تھا۔ یہ ادارہ مشاہدہ اور تحقیق کر سکتا تھا لیکن اسے مشورہ دینے یا کوئی چیز نافذ کرنے کا اختیار حاصل نہیں تھا۔ یہ صرف رضاکارانہ بنیاد پر لوگوں کو منظم کر سکتا تھا۔ یہ نہ تو سرکاری محکموں کی جانب سے دی جانے والی سہولتوں کا متبادل پیش کر سکتا تھا اور نہ عوامی نمائندگی کا اختیار کاؤنسلروں سے اپنے ہاتھ میں منتقل کر سکتا تھا۔

Scanned with CamScanner

پھر میں نے اپنی مکمل ناواقفیت کو تسلیم کیا۔ میں کراچی میں کبھی نہیں رہا تھا؛ میں یہاں ایک اجنبی تھا۔ یہ مہانگر کومیلا کے چھوٹے سے شہر سے بہت مختلف تھا۔ چناں چہ سب سے پہلے میں نے خود کو تعلیم دینے کا فیصلہ کیا۔ کئی مہینوں تک میں اپنی ٹوٹی پھوٹی جیپ میں اورنگی بھر میں گھومتا پھرا؛ گلیوں کو دیکھا اور لوگوں، سرکاری افسروں، کاؤنسلروں، لابیوں کے نمائندوں، انجمنوں کے سربراہوں سے باتیں کیں۔ خوش قسمتی سے میں اپنے کام میں بالکل آزاد تھا؛ مجھے اپنے کسی اعلیٰ افسر کو جواب دہی نہیں کرنی تھی۔ رفتہ رفتہ میں نے جانا کہ اورنگی میں کس قسم کے لوگ رہتے ہیں، ان کے مسائل کیا ہیں، وہ خود ان مسائل کے بارے میں کیا سوچتے ہیں، ان کے لیے کیا کیا جارہا ہے اور وہ خود اپنے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں۔

اورنگی کراچی کی سب سے بڑی کچی آبادی ہے۔ یہ شہر کے وسط میں واقع کوئی پس ماندہ محلہ (slum) نہیں ہے بلکہ شہر کے مضافات میں ۲۵ سال پہلے نئی قائم ہونے والی بستی ہے۔ اس کی آبادی کا تخمینہ دس لاکھ لگایا جاتا ہے جس میں ہندوستان سے آنے والے مہاجر، بنگلادیش سے آنے والے بہاری، شمالی علاقوں سے آنے والے پٹھان، پنجابی، سندھی اور بلوچ شامل ہیں۔ ان کی اکثریت مزدور طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ ۱۹۸۹ میں کیے جانے والے ایک سروے کے مطابق یہاں ۱۱۰ محلے یا سیکٹر، ۶۳۴۷ گلیاں اور ۹۴۱۲۲ مکانات ہیں۔ ہر سال مزید لوگ یہاں آکر نئے مکان بنا رہے ہیں۔ یہاں کے لوگ اپنی ووٹ کی طاقت اور سڑکوں کی طاقت کا پورا احساس رکھتے ہیں۔ جگہ جگہ انجمنیں اور تنظیمیں قائم ہیں، لوگوں میں دباؤ ڈال کر سہولتیں حاصل کرنے کا طریقہ بہت مقبول ہے؛ مطالبات زور شور سے کیے جاتے ہیں اور محرومیوں کی شکایت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

سرکاری محکموں کے پاس نہ اتنے وسائل ہیں اور نہ اہلیت کہ ان مطالبوں کو پورا کرسکیں۔ ان کی فراہم کی ہوئی سہولتیں نہایت نامناسب ہیں۔ ایک غیر سرکاری تنظیم، اوپی پی، سرکاری اہلکاروں کی اہلیت یا صلاحیت بہتر بنانے کا کام اپنے ذمے نہیں لے سکتی تھی اور سرکاری محکموں پر دباؤ ڈالنے کے لیے ایک اور تنظیم کی کوئی ضرورت نہ تھی کیوں کہ ایسی بے شمار انجمنیں اور تنظیمیں پہلے سے اس کام میں مشغول تھیں۔ چناں چہ اوپی پی نے اپنے لیے ایک نیا کردار دریافت کیا۔

تحقیق سے معلوم ہوا کہ اورنگی کے لوگ اپنی حالت بہتر بنانے کے لیے زیادہ تر کام خود ہی کر رہے ہیں۔ اورنگی کے تمام مکان — تقریباً ۹۵ ہزار مکان — کسی ڈویلپمنٹ اتھارٹی یا بلڈنگ فنانس کارپوریشن کی مدد کے بغیر تعمیر کیے گئے ہیں۔ ۵۰۹ پرائیویٹ اسکول اور سیکڑوں علاج کے مراکز لوگوں نے خود قائم کیے ہیں، جبکہ ۷۵ اسکول اور دو اسپتال حکومت نے بنائے ہیں۔ ٹرانسپورٹ کا تقریباً تمام انتظام پرائیویٹ طور پر کیا گیا ہے۔ گھروں میں بنے ہوئے ہزاروں کارخانے اور چھوٹے کاروبار لوگوں کو روزگار فراہم کر رہے ہیں۔

اوپی پی نے لوگوں کی ان کوششوں کو بہتر بنانے اور وسعت دینے کی غرض سے ایک معاون

ادارے کا کردار اپنانے کا فیصلہ کیا۔ تکنیکی ماہروں اور سماجی تنظیم کے کارکنوں پر مشتمل ایک مختصر سا عملہ بھرتی کیا گیا جس کا کام لوگوں کو سماجی اور تکنیکی رہنمائی فراہم کرنا تھا۔ بعد میں چھوٹے کاروبار کے لیے قرضے فراہم کرنے کے لیے ایک ٹرسٹ بھی قائم کیا گیا۔

اورنگی کے لوگوں کا ردِعمل اتنا ہی بھرپور تھا جتنا کومیلا کے لوگوں کا۔ تین پروگرام شروع کیے گئے: گندے پانی کے نکاس کا کم لاگت کا نظام تعمیر کرنا، صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کی تعلیم دینا اور گھریلو کاروبار کو فروغ دینا۔ پہلے دو پروگراموں میں اوپی پی کی طرف سے صرف تکنیکی اور سماجی رہنمائی کی گئی، جبکہ تیسرے پروگرام میں چھوٹے کاروبار کے لیے قرضے بھی فراہم کیے گئے۔

۱۹۸۹ میں، جب اوپی پی نے اپنی تحقیق شروع کی، دوسری کچی آبادیوں کی طرح اورنگی بھی گندے پانی کا نکاس نہ ہونے کے باعث نہایت بری حالت میں تھا۔ اس صورتِ حال سے لوگوں کی صحت اور مکانوں کی مضبوطی کو سخت خطرہ لاحق تھا۔ اوپی پی کے انجینیروں نے سب سے پہلے کام کی لاگت کم کرنے کے طریقے دریافت کیے۔ اگلے مرحلے میں سماجی کارکنوں نے لوگوں کو آمادہ کیا کہ جس طرح انھوں نے اپنے مکان خود بنائے ہیں، اسی طرح نکاس کا نظام بھی خود ہی تعمیر کریں اور گلیوں میں نکاس کی لائنوں کو اپنے مکان ہی کی توسیع سمجھیں۔ اس سماجی اور تکنیکی رہنمائی کے ذریعے اورنگی کے باشندوں نے، کسی مالی امداد یا قرضے کی سہولت کے بغیر، ۱۹۸۱ سے ۱۹۹۳ تک نکاس کا پورا نظام اپنے خرچ پر اور اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا اور خود ہی اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی جیب سے ۵ کروڑ ۵۴ لاکھ ۱۴ ہزار ۱۷ روپے خرچ کر کے ۴۸۵۰ گلیوں میں نکاس کی زیرِزمین لائنیں، ۳۸۳ سیکنڈری ڈرین اور ۴۷ ہزار ۸۸ فلش لیٹرین تعمیر کیے۔ اس کام کے نتیجے میں گندے پانی سے پیدا ہونے والی بیماریاں بہت کم ہو گئیں اور مکانوں کو ہونے والا نقصان رک گیا۔

اس کامیاب پروگرام کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر لوگوں کو تکنیکی اور سماجی رہنمائی فراہم کی جائے تو وہ نکاس کے پورے نظام کا ۸۰ فیصد حصہ خود بنانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ سرکاری محکمے کے ذمے باقی ۲۰ فیصد کام ــــ یعنی مین ڈرین اور واٹر ٹریٹمنٹ پلانٹ ــــ تعمیر کرنے کا کام رہ جاتا ہے۔ عوام اور حکومت کے درمیان اس شراکت سے نکاس کا جدید نظام قائم کرنے کی لاگت بہت کم ہو جاتی ہے۔ اس طرح کچی آبادیوں کا ایک نہایت سنگین مسئلہ آسانی سے اور کم وقت میں حل کیا جا سکتا ہے۔

اوپی پی کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ اورنگی میں بیماریوں کی کثرت کی دو بڑی وجہیں ہیں: نکاس کے نظام کا نہ ہونا اور لوگوں میں حفظانِ صحت کے جدید اصولوں سے ناواقفیت۔ چناں چہ ۱۹۸۵ میں صحت کا پروگرام شروع کیا گیا جس میں ناخواندہ اور نیم خواندہ گھریلو عورتوں کو صحت کے اصولوں اور بیماریوں کی روک تھام کی تربیت دی جاتی تھی۔ ایک لیڈی ڈاکٹر کی نگرانی میں چار لیڈی ہیلتھ وزٹروں نے اورنگی کی عام بیماریوں کی روک تھام کے لیے چھ مہینے کے ایک کورس کا بندوبست کیا، بچوں کو حفاظتی ٹیکے

لگائے، خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے متعارف کرائے اور غذا، بچوں کی دیکھ بھال اور گھروں میں سبزیاں اگانے کی تربیت فراہم کی۔ کورس کے سلسلے میں ہر چھ مہینے بعد گلیوں سے ۸۰ کارکن عورتیں منتخب کی جاتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے گھر پر ہونے والے اجتماع میں پڑوس کے گھروں کی دس سے بیس تک عورتیں شریک ہوتی ہیں۔ اس پروگرام پر بھی لوگوں کا ردعمل اتنا ہی پرجوش رہا ہے جتنا نکاس کے پروگرام پر۔ اس کے نتائج سے اندازہ ہوتا ہے کہ اورنگی میں بیماریوں کی صورتِ حال خاصی بہتر ہوئی ہے۔

ہمارا یقین ہے کہ کچی آبادیوں میں صحت کی تعلیم بھی اتنی ہی موثر ثابت ہوتی ہے جتنا نکاس کے نظام کی تعمیر۔ اس تعلیم کا خرچ بھی بہت کم ہے: ۴ موبائل ٹیمیں سال بھر میں چار ہزار خاندانوں کو بیماریوں کی روک تھام، خاندانی منصوبہ بندی، بچوں کی دیکھ بھال اور گھر میں سبزیوں کی کاشت کی تربیت دے سکتی ہیں، اور فی خاندان صرف ۱۲۵ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ یہ پروگرام نہایت مقبول ہے۔ عورتیں ان ٹیموں کا گرمجوشی سے خیر مقدم کرتی اور دھیان سے ان کی باتیں سنتی ہیں۔ اس کے اثرات بھی بہت دیرپا ہوتے ہیں۔

تحقیق سے ایک اور اہم شعبے ـــــ یعنی مہنگائی اور بے روزگاری کا مقابلہ کرنے ـــــ میں لوگوں کی خود انحصاری کی زبردست صلاحیت کا انکشاف ہوا: گلی گلی کھلے ہوئے ہزاروں گھریلو کارخانے اور کاروبار، گھروں کو ورکشاپوں میں تبدیل کر لینے کا عمل، معاشی سرگرمی میں عورتوں کی عملی شراکت۔ محتاط مشاہدے کے بعد او پی پی کی تحقیق اس نتیجے پر پہنچی کہ گھریلو کاروبار کی توسیع روزگار اور پیداوار میں اضافے کا سب سے تیز رفتار اور کم خرچ طریقہ ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے غیر رسمی کاروباری اداروں کی پیداوار اور خدمات کی مانگ لامحدود تھی، اور ان کے لیے سستی لیبر کثیر تعداد میں موجود تھی۔ صرف سرمائے کی قلت تھی، اور باقاعدہ بینک انہیں قرضے کی سہولت دینے کو تیار نہ تھے۔

اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ستمبر ۱۹۸۷ میں ایک ٹرسٹ قائم کیا گیا۔ ٹرسٹ نے بینکوں سے، کسی رعایت کے بغیر، اور بینکوں کی مروجہ شرائط اور شرحِ سود پر قرض حاصل کیا۔ لیکن گھریلو کاروباری یونٹوں کو قرض دیتے وقت رہن وغیرہ کی شرط عائد نہیں کی گئی؛ صرف دو افراد کی شخصی ضمانت طلب کی گئی۔ ٹرسٹ کو احساس تھا کہ آج کل دیانت داری کا معیار خاصا گر چکا ہے، مگر پھر بھی اسے امید تھی کہ قرض داروں کے محتاط انتخاب اور نگرانی کے ذریعے ڈوبنے والے قرضوں کا تناسب کم رکھا جا سکے گا اور یوں رفتہ رفتہ قابلِ اعتماد قرض داروں کا ایک حلقہ وجود میں آ جائے گا۔ چوں کہ ٹرسٹ کو اپنے مالکان کو منافع ادا نہیں کرنا تھا، اور نہ لوگوں کے ڈپازٹوں کی دیکھ بھال کرنی تھی، اس لیے وہ اپنے روپے [illegible] نسبتاً [illegible] کہ کر بینکوں کی نسبت زیادہ خطرہ مول لے سکتا تھا۔

ٹرسٹ نے محتاط انداز میں اپنا کام شروع کیا اور اپنی غلطیوں سے سیکھا؛ اس نے قرض داروں کی پوری نگرانی کی اور اپنے حسابات کمپیوٹر کے ذریعے مرتب کیے۔ اس نے پہلے سال ۱۱ لاکھ ۷۰ ہزار

روپے، دوسرے سال ۱۱ لاکھ دس ہزار روپے، تیسرے سال ۱۹ لاکھ ۷۰ ہزار روپے، چوتھے سال ۴۲ لاکھ ۸۰ ہزار روپے، پانچویں سال ۶۱ لاکھ ۷۰ ہزار روپے اور چھٹے سال ۹۴ لاکھ ۸۰ ہزار روپے کے قرضے جاری کیے۔ اس چھ سال کی مدّت میں ۱۷۶۴ گھریلو یونٹوں کو ۲ کروڑ ۴۲ لاکھ ۱۰ ہزار روپے کے قرضے دیے گئے جن کا تعلق ۳۹ مختلف پیشوں سے تھا اور جن میں تقریباً پندرہ ہزار لوگ کام کرتے تھے۔ ڈوبنے والے قرضوں کی مالیت ۵ لاکھ ۹۲ ہزار روپے (یعنی کل قرضوں کا تقریباً ڈھائی فیصد) رہی۔ ایک کروڑ ۴۰ لاکھ ۶۰ ہزار روپے کی قسطیں وصول ہوئیں، جس میں سود کی رقم ۱۵ لاکھ ۶۰ ہزار روپے تھی۔ ٹرسٹ نیشنل بینک، حبیب بینک اور فرسٹ ویمن بینک سے لیے ہوئے قرضے مکمل طور پر ادا کرچکا ہے اور اب اس کے ذمے کسی بینک کی رقم واجب الادا نہیں ہے۔ عطیات کے طور پر وصول ہونے والے ایک کروڑ ۴۵ لاکھ ۵۰ ہزار روپے ٹرسٹ کے فنڈ میں شامل کردیے گئے ہیں۔

چوں کہ قرضوں کے اس پائلٹ پروجیکٹ کا مقصد چھوٹے گھریلو یونٹوں کے لیے قرض کا ایک خود کفیل نظام دریافت کرنا تھا، اس لیے ٹرسٹ ڈوبے ہوئے قرضوں کی نوعیت اور مالیت کی بہت غور سے نگرانی کرتا ہے اور اس کی روشنی میں قرض داروں کے انتخاب اور قرضوں کے استعمال کی نگرانی کے طریق کار کو بہتر بناتا رہتا ہے۔ چھ سال پہلے جب یہ سلسلہ شروع کیا گیا، خیال یہ تھا کہ وفاداری اور دیانت داری کی روایات معدوم ہو چکی ہیں۔ پہلے سال بہت سی غلطیاں بھی سرزد ہوئیں۔ اب ڈوبنے والے قرضوں کی ممکنہ مالیت کی پیش گوئی کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ تقریباً ۳۰۰ وفادار قرض داروں کا ایک حلقہ بھی بنتا جا رہا ہے جو قرض کی واپسی میں سستی دکھانے والوں پر زور ڈالتے ہیں۔ تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ قرضوں کے ڈوبنے کی تین وجوہ ہوتی ہیں: بے ایمانی، نااہلی اور بد قسمتی۔ واپس نہ آنے والے قرضوں کا ہر تین مہینے بعد جائزہ لیا جاتا ہے اور انھیں حساب سے خارج (write off) کرنے میں غیر ضروری تاخیر نہیں کی جاتی۔ قرض ادا نہ کرنے والے ۱۱۰ یونٹوں میں ۴۰ بے ایمان اور ۴۲ نااہل نکلے جبکہ ۲۹ کسی بد قسمتی (موت، شدید بیماری وغیرہ) کے باعث قرض ادا نہیں کرسکے۔

میں نے مختلف خطّوں سے اورنگی میں آ کر بسنے والوں کو محنت اور جوش سے اُسی طرح بھرا ہوا پایا جیسے معاشی بہتری کی تلاش میں نئے علاقوں میں جانے والے تمام لوگ ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے چار بنیادی مسائل ــــ مکان (اور نکاس)، صحت، تعلیم اور روزگار ــــ نہایت بہادری سے اپنے بل پر، اور کسی سرکاری امداد کے بغیر، حل کیے ہیں۔ شہروں کے یہ آباد کار صرف پُرجوش اور محنتی ہی نہیں، باوسیلہ بھی ہیں۔ ان کی کفایت شعاری انھیں بچت کرنے اور منافع بخش کاروبار میں لگانے کی ایک حیران کن صلاحیت بخشتی ہے۔ وہ اپنی استعمال کی ہوئی ہر چیز ــــ زمین، مکان اور سہولتوں ــــ کی قیمت ادا کرتے ہیں؛ یہ الگ بات ہے کہ ان کی ادا کی ہوئی رقم سرکاری خزانے میں نہیں پہنچتی بلکہ رشوت لینے والے سرکاری اہلکاروں کے دلالوں کے ہاتھ میں جاتی ہے۔ اگر کراچی کی مختلف بستیوں میں رہنے والوں

سے سرکاری افسروں، سیاسی مجرموں، دلالوں اور علاقے کے غنڈوں کی زبردستی وصول کی ہوئی رشوت اور بھتّے کی رقم کا صرف دس فیصد بھی عوامی خزانے میں جائے تو ہماری حکومت کو آئی ایم ایف سے اتنے قرضے نہ لینے پڑیں۔ اوپی پی کے پروگراموں کی کامیابی سے ظاہر ہے کہ اورنگی والوں میں انتظامی صلاحیت کی بھی کمی نہیں ہے۔ معاشی ترقی اور سماجی استحکام دونوں کی بنیاد مفید روزگار پر ہوتی ہے۔ کیا مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ غنڈا گردی اور لوٹ مار میں اضافہ بڑی حد تک بے روزگاری کا نتیجہ ہے؟ جن توانائیوں کا رخ تعمیری سرگرمی کی طرف نہ موڑا جا سکے وہ کینسر کے خلیوں کی طرح سماج میں تباہی پیدا کرنے لگتی ہیں۔

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ بستی کے رہنے والے، دیہات سے شہروں میں آنے والے، اکیسویں صدی کے پرامید شہری، خود کو تباہ نہیں کرنا چاہتے؛ اس کے برعکس وہ زندہ رہنا اور پھلنا پھولنا چاہتے ہیں۔ وہ کفایت شعار، محنتی، ہوشیار اور باوسیلہ ہیں۔ وہ محنت کش اور پیداوار کرنے والے لوگ ہیں، طفیلی اور بیٹھ کر کھانے والے نہیں۔ وہ بھیک اور رعایتوں، محفوظ ملازمتوں اور مفت کے مکانوں کے طلب گار نہیں؛ وہ بھکاری اور سماج کا بوجھ نہیں۔ انھیں صرف تکنیکی اور سماجی رہنمائی درکار ہے، انھیں صرف رشوتوں اور بھتّوں کی وصولی سے تحفظ اور تھوڑا سا امن چاہیے۔

۴

۱۹۸۷ میں اورنگی میں زبردست لسانی فسادات پھوٹ پڑے اور مہاجروں اور پٹھانوں نے ایک دوسرے کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ پولیس کا کردار اس معاملے میں کہیں غیر جانبدار تماشائی کا اور کہیں خوف زدہ ثالث کا رہا۔ میں صاف کہتا ہوں کہ میں دونوں فریقوں کے خوفناک نعرے سن کر دہشت زدہ رہ گیا: "یہ (علیگڑھ کالونی کا قتلِ عام) تو صرف ٹریلر تھا!" ــــ "ہم ہرگز ساتھ نہیں رہ سکتے!" ــــ "وی سی آر بیچو، کلاشنکوف خریدو!" گلیوں اور محلّوں میں مورچے بننے لگے اور مسلح گشت کیے جانے لگے۔ میں لوگوں کی جنگی صلاحیت دیکھ کر حیران ہو گیا۔ لیکن جب میں نے لڑنے والوں سے بات چیت کی تو مجھے پتا چلا کہ یہ لوگ اپنے مِنی پاکستان کو بیروت بنانے کی درحقیقت کوئی خواہش نہیں رکھتے۔ انھوں نے ہمارے امن کے نعرے پر فوراً لبیک کہا، جو شیراز کے خواجہ حافظ کے شعر پر مبنی تھا جنھوں نے خود تشدد کی ہولناکی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا:

درختِ دوستی بنشاں کہ کامِ دل بہ بار آرد
نہالِ دشمنی بر کن کہ رنجِ بے شمار آرد

ایک فرض شناس اور ہمدرد اسپیشل ریلیف کمشنر منظور الحسن نے جلے ہوئے مکانوں کو تیزی سے دوبارہ تعمیر کرا کے اور لُٹی ہوئی دکانوں کا فوری معاوضہ ادا کر کے دونوں طرف کے زخموں پر مرہم رکھا۔ بہت جلد لوگوں کی توجہ کا رخ انتقام سے تعمیرِ نو کی طرف مڑ گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں لڑنے والی دونوں برادریاں دوبارہ شیر و شکر ہو چکی تھیں۔

۵

اورنگی میں اپنا کام مستحکم کرنے کے بعد او پی پی اپنی سرگرمیوں کا دائرہ آس پاس کے گوٹھوں تک پھیلانا چاہتی تھی، لیکن ہمارے محدود وسائل مانع تھے۔ پھر اچانک فسادات اور تشدد کے واقعات نے ہمیں دھکیل کر دلدار گوٹھ میں پہنچا دیا۔ ۱۹۹۰ میں حیدر آباد میں پیش آنے والے کسی واقعے کے جنونی رد عمل میں اورنگی میں واقع ایک بلوچ کالونی پر حملہ کیا گیا اور ۶۸ مکان جلا دیے گئے۔ بلوچوں نے جان بچا کر دلدار گوٹھ میں اپنے عزیزوں کے پاس پناہ لی۔ او پی پی نے اپنا وہی کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا جو ۱۹۸۷ کے مہاجر پٹھان فسادات کے دوران اختیار کیا تھا۔ کمشنر کراچی کے تعاون سے او پی پی نے تباہ شدہ مکانوں کی مرمت کی اور بلوچوں کو واپس لا کر ان کے مکانوں میں آباد کیا۔ ریلیف کے اس کام کے سلسلے میں ہمارا دلدار گوٹھ جانا ہوا جہاں وڈیرا اللہ بخش اور اس کے عم زاد محمد حسین سے میری دوستی ہو گئی۔

وڈیرا اللہ بخش نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ اخبار نویسوں کی تحریروں نے مجھے بتایا تھا کہ وڈیرے بے تحاشا دولت اور جبر و ظلم کی بھیانک علامت ہوتے ہیں۔ مجھے اللہ بخش میں ایسی کوئی خصوصیت دکھائی نہ دی۔ وہ اپنی دولت یا طور طریقوں کے اعتبار سے گوٹھ کے دوسرے معمر لوگوں سے کسی بھی طرح مختلف نہ تھا۔ اسے قبائلی رواج کے مطابق گوٹھ کا سربراہ چنا گیا تھا۔ اس میں اپنے گوٹھ والوں کی حالت کے بارے میں حقیقی فکرمندی محسوس ہوتی تھی، اور وہ سب اس کا مشورہ مانتے تھے۔ بعد کے معاملات میں ہم نے اسے مکمل طور پر قابلِ اعتماد پایا۔

میری تمام زندگی دیہی ترقی کے کام میں گزری ہے۔ میں کومیلا، داؤدزئی اور گلگت کے دیہات میں کام کر چکا ہوں۔ چناں چہ جب میں دلدار گوٹھ پہنچا تو قدرتی طور پر میں نے ماہرانہ تجسس کے ساتھ ارد گرد نظر دوڑائی۔ مجھے بتایا گیا کہ دو سو سال پہلے رند بلوچ قبیلے کے لوگ پانی کے چشموں کے پاس آٹھ گوٹھوں میں آباد ہوئے تھے۔ دلدار گوٹھ انھیں آٹھ میں سے ایک ہے اور اورنگی سے مغرب کی سمت دس کلومیٹر دور واقع ہے۔ علاقے کی زمین بنجر ہے، بارش بہت کم ہوتی ہے، اور مکئی اور باجرے کی غیر یقینی کاشت ہوتی ہے۔ مویشی پالنا لوگوں کا بنیادی ذریعۂ معاش ہے۔ لیکن درخت کم ہیں اور چرائی زیادہ ہونے کی وجہ

سے سبزہ بھی تقریباً غائب ہے۔ گوٹھ کے بہت سے لوگ اورنگی جا کر روزی کماتے ہیں اور دودھ یا چارا بیچتے یا گدھا گاڑی چلاتے ہیں یا مزدوری کرتے ہیں۔ اس طرح کے کاموں سے وہ بھوکے مرنے سے تو بچ جاتے ہیں لیکن غربت کے جال سے نہیں بچ پاتے۔

جب میں نے گوٹھ والوں سے پوچھا کہ اُن کی حالت کیوں کر بہتر ہو سکتی ہے تو انھوں نے فوراً جواب دیا کہ انھیں تنخواہ دار ملازمت اور پانی کی نہر کی ضرورت ہے۔ یہ بات بالکل چاند کی فرمائش کرنے کے مترادف تھی۔ انھیں کوئی بھی کافی تعداد میں تنخواہ دار ملازمتیں یا پانی کی نہر فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن میری بوڑھی آنکھیں ان کی بنجر زمین میں ایسی عظیم صلاحیت دیکھ رہی تھیں جسے وہ خود نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنا دیکھا ہوا منظر ان تک پہنچانے کی کوشش کی۔

"دیکھو، تمھارے گوٹھ کے ستر خاندانوں کے پاس سات سو ایکڑ زمین ہے۔ کراچی کی عظیم مارکیٹ تمھارے بالکل قریب واقع ہے جہاں عمارتی لکڑی، پھلوں، سبزیوں اور دودھ کی لامحدود مقدار کھپ سکتی ہے۔ تمھارے مرد اور عورتیں اس زمین سے یہ سب کچھ پیدا کر سکتے ہیں، اچھا منافع کما سکتے ہیں اور دولت مند ہو سکتے ہیں۔ کیوں نہیں ہو سکتے؟"

انھوں نے کہا، "کچھ اگانے کے لیے پانی کہاں ہے؟"

میں نے کہا، "یہ تو سچ ہے کہ تم یہاں نواب شاہ کی طرح گنا یا چاول نہیں اگا سکتے۔ لیکن چشموں کا پانی تو موجود ہے؛ اور اگر تم اسے کفایت شعاری سے استعمال کرو تو درخت اور چارا اگایا جا سکتا ہے۔"

"کفایت شعاری سے استعمال کرنے کا کیا مطلب ہوا؟"

"اس کا مطلب ہے پاس کے چشمے سے گدھا گاڑی کے ذریعے پانی لانا اور ہر پودے کو پیالی بھر پانی دینا، جیسے چھوٹے بچوں کو دودھ دیا جاتا ہے۔ چھوٹے پودوں کو بس اپنی جڑیں نم رکھنے کے لیے ذرا سا پانی درکار ہوتا ہے۔ جوں جوں پیڑ بڑے ہوتے جاتے ہیں، وہ اپنی ضرورت خود پوری کر لیتے ہیں، تمھاری زمین کو زرخیز کرتے ہیں، تمھارے جانوروں کو خوراک دیتے ہیں اور تمھیں دولت مند بنا دیتے ہیں۔"

یہ سن کر اللہ بخش اور محمد حسین پہلے تو حیرت میں پڑ گئے۔ لیکن بہت دیر کی گرما گرم بحث کے بعد محمد حسین گدھا گاڑی میں پانی لا کر پودوں میں ڈالنے کا طریقہ آزمانے کو تیار ہو گیا۔

"ٹھیک ہے، پانی تو ہم چشمے سے لا سکتے ہیں۔ لیکن جب تک زمین ہموار نہ کی جائے اور اس کے گرد باڑ لگا کر بکریوں کو روکا نہ جائے، یہاں کوئی پودا یا سبزی کیسے اگائی جا سکتی ہے۔ اور ان کاموں کے لیے ہمارے پاس پیسہ نہیں ہے۔ اور نہ اچھی گائیں خریدنے کے لیے پیسہ ہے۔"

اورنگی چیریٹیبل ٹرسٹ اس مسئلے کو اُسی طرح حل کر سکتا تھا جیسے اس نے اورنگی کے گھریلو کاروبار کرنے والوں کو قرض دے کر اُن کا مسئلہ حل کیا تھا۔ میں نے کہا، "ٹرسٹ تمھیں باڑ لگانے اور گائیں خریدنے کے لیے قرض دے دے گا، بشرطے کہ تم ماہانہ قسطیں ادا کرنے کا وعدہ کرو۔"

"لیکن،" اس نے قطعی لہجے میں کہا، "ہم اپنی زمینیں رہن نہیں رکھیں گے۔"

Scanned with CamScanner

"ٹرسٹ ایسی کوئی شرط نہیں لگاتا۔ اگر اللہ بخش اور ایک اور معمر آدمی تمہاری ضمانت دینے کو تیار ہوں تو تمہیں قرضہ مل سکتا ہے۔"

میں نے محمد حسین کو او پی پی کی نرسری میں آ کر ۱۶ قسم کے جنگلی درختوں، ۱۴ قسم کے پھل دار درختوں، آٹھ طرح کی بنجر زمین میں اگنے والی جھاڑیوں اور گھاسوں کو دیکھنے کی دعوت دی جن سے اس کی بنجر زمین سونے کی کان میں تبدیل ہو سکتی تھی۔ اس نے نرسری آ کر یہ پیڑ پودے دیکھے۔ ہمارے سماجی کارکنوں حفیظ آرائیں اور اکرام چوہان سے بھی اس کی اطمینان بخش بات چیت ہوئی۔ فروری ۱۹۹۱ میں اس نے ۲۵ ہزار روپے قرضہ لیا۔ پھر تو اُسے، جیسا کہ وہ خود کہتا ہے، دھُن سوار ہو گئی۔ اس نے مجھے بتایا، "آپ نے تو مجھے جیسے ہیروئن پلا دی ہے۔ دن رات میرے دماغ پر اپنے باغ ہی کا خیال سوار رہتا ہے۔" اس کی بیوی نے حفیظ آرائیں سے شکایت کی، "تم لوگوں نے میرے آدمی پر کیا جادو کر دیا ہے؟ وہ گھر پر رہتا ہی نہیں۔ اس نے اپنا پلنگ بھی اپنے پودوں کے پاس بچھا لیا ہے۔"

قرض کی رقم اور اپنی بچت کو ملا کر اس نے چار ایکڑ زمین کے گرد باڑ لگائی اور درخت اور چارا اگانے لگا۔ اس نے گائیں بھی اور خریدیں۔ پہلے پہل چھوٹے چھوٹے پودوں پر اس کی پیار بھری دیکھ بھال کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ ان میں سے کئی مُرجھا کر ختم ہو گئے۔ پھر ایک خاندانی جھگڑے نے اسے تقریباً تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس کے ایک بھتیجے نے دوسرے بھتیجے کو قتل کر دیا اور معاملے کو دبانے کے لیے محمد حسین کو کافی پیسہ خرچ کرنا پڑا۔ لیکن وہ اپنے کام پر ڈٹا رہا۔ اب اس کا باغ بڑھ رہا ہے۔ اب اس کے پاس ۸۰ ناریل، ۵۰ چیکو، ۴۰ کھجور، ۱۵ انار اور بہت سے جنگلی درخت ہیں۔ اس نے چارا بھی اگایا ہے اور ڈھائی من دودھ روزانہ بیچ رہا ہے۔ اس نے، اپنے خاندانی سانحوں کے باوجود، قرض میں سے پندرہ ہزار روپے واپس کر دیے ہیں۔ وہ ایک چھوٹا پمپ بھی لگانا چاہتا ہے، لیکن ٹرسٹ اس وقت تک نیا قرضہ نہیں دیتا جب تک پچھلا قرضہ ادا نہ ہو جائے۔

بہت جلد دوسرے لوگوں نے بھی محمد حسین کی مثال پر عمل شروع کر دیا۔ ان میں پہلا دودا خاں تھا۔ اس کے پاس مویشیوں کا سب سے بڑا گلہ پہلے سے موجود تھا۔ اب اس نے درخت، چارا اور سبزیاں اگانے کا فیصلہ کیا۔ دودا خاں نہایت عمدہ انتظامی صلاحیت کا مالک ہے۔ اس نے زیرزمین چشمے تک پائپ اتارا اور پمپ لگا کر اپنی ضرورت کا پانی حاصل کر لیا۔ اس نے چار ایکڑ کے گرد اپنے لیے اور چار ایکڑ کے گرد اپنے بھائی کے لیے حد بندی کی؛ لیکن وہ اپنے منفرد طریقے سے کام کرنے کا قائل ہے، اس نے باڑ لگانے کے بجائے پتھروں کی چہار دیواری تعمیر کی اور مویشیوں کے لیے صاف ستھری ناندیں بنائیں۔ دودا خاں نے مارچ ۱۹۹۲ میں ۵۰ ہزار روپے قرض لیے اور انھیں اپنی بچت میں ملا کر اپنا باغ اور باڑا تیار کرنے پر صرف کیا۔ اپنی دیہقانی ہوشیاری اور محنت کے بل پر اب وہ خوش حال ہے۔ مئی ۱۹۹۳ تک، صرف ۱۴ مہینے کے عرصے میں، وہ ۵۱ ہزار روپے کی قسطیں ادا کر چکا ہے۔ ایک اور قسط کے ساتھ اس کا سود بھی ادا ہو جائے گا۔ اس کے باغ میں ۱۱۷ ناریل، ۱۰۰ کھجور، ۵۰ چیکو اور ۲۱ انار کے

پیڑوں کے علاوہ بہت سے کیکر، سفیدے، بیر اور املی کے درخت ہیں۔ وہ ہر روز پانچ من دودھ شہر بھیجتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ پچھلے موسم میں اس نے اپنی مرچیں بیچ کر گیارہ ہزار روپے کمائے۔

ٹرسٹ سے جوکھیو گوٹھ کے رسول بخش اور عبدالغنی، رئیس گوٹھ کے رحیم بخش اور بہت سے دوسرے لوگوں نے قرضہ حاصل کیا اور اسے اپنی زرعی اور تجارتی سرگرمیوں میں اضافے کے لیے استعمال کیا۔ قرض نے کسانوں کو اپنی پیداوار اور تجارت بڑھانے کا حوصلہ دیا۔ بقرعید کے موقعے پر گوٹھوں کے کسان اندرونِ سندھ سے جانور لاکر انھیں کچھ ہفتے کھلاتے پلاتے اور پھر شہر میں بیچتے ہیں۔ ان موسمی تاجروں کو سودخوروں سے قرض لینا پڑتا تھا اور اس کے عوض بھاری سود کے علاوہ آدھا منافع بھی ان کے حوالے کرنا پڑتا تھا۔ مئی ۱۹۹۳ میں ۲۲ بلوچوں نے اس کام کے لیے ٹرسٹ سے کل ۵۶ لاکھ پانچ ہزار روپے کا قرضہ لیا اور جون ۱۹۹۳ کے پہلے ہفتے میں پوری رقم، مع ۹۶۸۵ روپے (۱۰٫۷ فیصد) سود کے، ادا کردی۔ وہ اپنے منافعے کی پوری رقم بتانے میں آنا کانی کررہے تھے، لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ ان کا خالص منافع ۲۰ فیصد سے کم نہیں رہا ہوگا۔ کسی بینک کو ان بلوچوں سے بہتر قرض دار نہیں مل سکتے۔

او پی پی نے اپنے تجربے کا دائرہ اورنگی کے آس پاس واقع گوٹھوں تک ۱۹۹۰ میں وسیع کیا۔ پہلے دو برس یہ تجربہ صرف دو گوٹھوں ـــ بلوچوں کے دلدار گوٹھ اور سندھیوں کے سہراب جوکھیو گوٹھ ـــ تک محدود رہا، مگر ۱۹۹۲ میں نیشنل رورل سپورٹ پروگرام کے تعاون سے اسے ۲۲ گوٹھوں تک پھیلادیا گیا ہے۔ اس تین سالہ تجربے سے گوٹھوں کی یہ صورتِ حال ظاہر ہوئی:

کراچی میں ایک بے حد وسیع صارفوں کی مارکیٹ موجود ہے، اور گوٹھ اب سڑکوں، ٹرانسپورٹ اور مواصلات کے ذریعے شہر سے منسلک ہیں۔ گوٹھوں کے اردگرد کی زمین میں جنگل اور پھلوں کے درخت اور گائے بھینسوں کے لیے چارا اگانے کی صلاحیت موجود ہے۔ ہر گوٹھ میں ہوشیار اور جسمانی لحاظ سے مضبوط کسان موجود ہیں جو ان امکانات کو عمل میں لا سکتے ہیں۔ انھیں تھوڑی سی مالی اور تکنیکی امداد درکار ہے، اور کنزیومر مارکیٹ اور گوٹھوں کی زمین کی پیداواری صلاحیت کے درست علم کی ضرورت ہے۔ سب سے زیادہ ضرورت ان کسان تاجروں کو قرضے کی ہے جو یہ بینکوں سے مروجہ شرحِ سود پر، مگر سرخ فیتے اور رشوت کی مداخلتوں کے بغیر، حاصل کرسکیں۔ انھیں رہنمائی یا قرض فراہم کرنے کے لیے نہ تو بیرونی امداد کی ضرورت ہے نہ رعایتوں کی، نہ مختص کی ہوئی رقموں کی اور نہ افسروں کی فوج کی۔ رہنمائی دراصل دوطرفہ تعلیم کا ایک ارزاں طریقہ ہے اور قرض فراہم کرنے کا سلسلہ خود کفیل ہوسکتا ہے۔ کراچی کے اردگرد کے بنجر علاقے کے لیے جنگلی درخت اگانے اور مویشی پالنے کا ایک منصوبہ، جس کا بندوبست کسان تاجروں کے ہاتھ میں ہو، اس علاقے کی ترقی کا سب سے تیزرفتار اور کم خرچ نسخہ ہے۔

اس سلسلے میں پروجیکٹ کی پہلی ترجیح کسانوں کے گروپ قائم کرنا نہیں بلکہ باصلاحیت کسانوں کو

Scanned with CamScanner

منتخب کرکے انھیں رہنمائی فراہم کرنا ہے تاکہ وہ خود کو باوسیلہ تاجروں میں اور اپنی زمین کو کراچی کی مارکیٹ کے لیے عمارتی لکڑی، پھلوں اور دودھ کے فراہم کنندہ علاقے میں تبدیل کرسکیں۔ پروجیکٹ مالی امداد یا رعایتیں نہیں بلکہ تکنیکی رہنمائی اور قرض فراہم کرتا ہے۔ پروجیکٹ کا انتظامی بوجھ بہت کم ہے؛ صرف تین کارکن، اپنے دیگر فرائض کے ساتھ ساتھ، دیہی ترقی کے اس پروگرام پر بھی کام کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ایک برس کی مدت میں یہ کام ۲ گوٹھوں سے ۲۲ گوٹھوں تک پھیل گیا ہے اور اس سلسلے میں کسانوں کے اجتماع منعقد کرانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ آس پاس کے گوٹھوں کے باشندوں نے اس نئے کام کو ہوتے ہوئے غور سے دیکھا اور اپنے بل پر یہی کام خود بھی شروع کردیا۔ انھیں قائل اور آمادہ کرنے کی کوشش نہیں کرنی پڑی۔ آج قرضے کی بہت سی درخواستیں غور کے لیے موجود ہیں۔ پروجیکٹ کی پالیسی احتیاط سے آگے بڑھنے اور نئے قرضے جاری کرنے سے پہلے پچھلے قرضوں کی واپسی کی صورتِ حال کو غور سے جانچنے کی ہے تاکہ وفادار قرض داروں کا حلقہ قائم ہوجائے اور وہ نئے قرض داروں کے لیے ضمانت فراہم کرسکیں۔

۳۱ مئی ۱۹۹۳ تک کل ۱۴۱ دیہی قرضے جاری کیے گئے: ۱۹ زمین اور پانی کے وسائل کی ترقی کے لیے، ۸۷ دودھ دینے والے جانوروں کی پرورش کے لیے، اور ۳۵ تجارت کے لیے۔ قرضوں کی تیزرفتار واپسی ہوشیار، محنتی اور کفایت شعار کسانوں کی حالت میں بہتری کا واضح ثبوت ہے۔ ۷ ۲ لاکھ ۷ ۲ ہزار پانچ سو روپے کے قرضوں میں سے ۱۴ لاکھ ۶۴ ہزار نو سو روپے لوٹائے جا چکے ہیں جس میں ایک لاکھ ۶ ۷ ہزار دو سو ۷ ۳ روپے کا سود شامل ہے۔ اب تک ڈوبنے والے قرض کی کوئی مثال سامنے نہیں آئی ہے۔ قرض کی قسط وصول کرنے کے لیے پروجیکٹ کے کسی کارکن کو گوٹھ میں جانا نہیں پڑتا، بلکہ قرض دار خود دفتر میں آکر قسط جمع کرا جاتے ہیں۔ نگرانی سے معلوم ہوا ہے کہ زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے، تجارتی سرگرمیاں پھیلی ہیں اور کسانوں نے منافع کمایا ہے۔ پانچ گوٹھوں میں، جہاں درخت اگانے کے لیے قرضے جاری کیے گئے تھے، عمارتی لکڑی کے ۱۳۲۸ ۱ اور پھلوں کے ۱۰۰۶۶ درخت لگائے گئے۔

اپنے گوٹھوں کی زرخیز زمین کو دیکھتے ہوئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کراچی کے لوگ دودھ اور مکھن بیرونی ملکوں سے منگوائیں، جبکہ یہ زرخیز زمین پیڑوں اور گھاس کی، اور گایوں بھینسوں کی پرورش کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے اور ہوشیار اور محنتی کسان تاجر ہماری ضروریات پوری کرنے کو تیار ہیں؛ انھیں صرف تھوڑی سی رہنمائی اور تھوڑا سا قرض چاہیے۔ جانور پالنے کے سلسلے میں ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ سات ہزار سال پہلے دنیا میں پہلی بار ہاتھی، بیل اور بھینس کو وادیِ سندھ ہی میں سدھایا گیا تھا۔ اور جنگل اگانے کے سلسلے میں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بابر نے اپنی تزک میں اٹک کے قریب گینڈوں کے شکار کا حال بیان کیا ہے۔

Scanned with CamScanner

٦

بہت عرصہ پہلے میں نے یہ ضرب المثل سنی تھی کہ یقین کے زور پر پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل جاتے ہیں۔ معاشیات کے میدان میں یہ یقین کوئی کام شروع کرنے، خطرہ مول لینے، دقتیں اٹھانے، نقصان برداشت کرنے اور منافع کمانے کی صلاحیت کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ عام لوگوں کے درمیان کام کرنے کے عمل میں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ یہ صلاحیت کیسے کرشمے دکھا سکتی ہے۔ اس کی ایک مثال لیجیے ـــــ پاکستان کے جو محنتی لوگ ملک سے باہر گئے ہیں، انھوں نے کس طرح خود کو اور اپنے ملک کو خوش حال کیا ہے؛ اگر ان کی بھیجی ہوئی رقمیں نہ ہوتیں تو ہمارا ادائیگیوں کا توازن، جو خاصا خراب ہے، بالکل تباہ ہو چکا ہوتا، اور ان کے کثیر سرمائے کے بغیر ہمارے شہر اتنی ترقی نہ کر پاتے۔ اس صلاحیت کی ایک اور مثال اُن لوگوں کی ہے جو اپنے دیہات میں پڑے سڑتے رہنے کے بجائے جاگیرداری سماج کی زنجیریں توڑ کر شہروں کا رخ کرتے ہیں، مضافاتی بستیاں تعمیر کرتے ہیں، غیر رسمی سیکٹر کو وسعت دیتے ہیں اور درحقیقت ایک نئے عوام دوست سماجی نظام کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ملک سے باہر یا دیہات سے شہروں کی طرف آنے والوں کی انفرادی کوششوں کی کامیابیوں کا موازنہ ہمارے قومی منصوبوں کی ناکامیوں سے کیجیے۔ اس واضح فرق کا سبب کیا ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سرکاری اہلکار ہمارے عام لوگوں کی نسبت کمزور یقین کے مالک ہیں؟

ہمارے حکمراں آئے دن بے گھر غریبوں کے لیے مکانات تعمیر کرنے کے وعدے کرتے ہیں۔ ترقیاتی ادارے بڑے بڑے منصوبوں اور بھاری بجٹوں کے اعلانات کرتے ہیں۔ پھر تین باتیں لازماً پیش آتی ہیں: اوّل، مکانوں کی تعمیر دس دس بیس بیس سال تک چلتی رہتی ہے؛ دوم، غریب لوگ ان مکانوں کی قیمت ادا نہیں کر پاتے؛ اور سوم، یہ مکان خوش حال لوگوں اور سٹے بازوں کے قبضے میں چلے جاتے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف کچی آبادیوں میں ہزاروں محنت کش لوگ اس دوران، کسی سرکاری محکمے کی مدد کے بغیر، اپنے لیے خود مکان تعمیر کر لیتے ہیں؛ اس سلسلے میں انھیں دلالوں کی قانونی یا غیر قانونی امداد اور ٹھلے والوں کی تکنیکی اور مالی اعانت حاصل ہوتی ہے۔ صرف اورنگی میں، پچھلے پچیس برسوں میں ایک لاکھ کے قریب مکان اسی طرح تعمیر کیے گئے ہیں اور ان مکانوں میں مزدور، کاریگر، چھوٹے تاجر، کلرک، دکاندار اور ٹھیلے والے رہتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے حکمراں ہر روز بے روزگاروں کو روزگار دینے کے وعدے کرتے ہیں اور اس سلسلے میں عظیم منصوبوں کا اعلان کرتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ایک ایسا وعدہ ہے جس کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ ایک طرف تو بدعنوانی اور بدانتظامی کے باعث ہماری معیشت تباہ ہوتی چلی جا رہی ہے؛ اور ہمارا رسمی سیکٹر اگر سکڑ نہیں رہا تو تیزی سے ترقی بھی نہیں کر رہا۔ دوسری جانب بے تحاشا بڑھتی ہوئی آبادی کے باعث روزگار کے طلبگاروں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے۔ سفارشیوں کو

Scanned with CamScanner

ملازمتیں دینے کے باعث عجیب و غریب مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ سرکاری محکموں، کارپوریشنوں، بلدیاتی اداروں، بینکوں اور فیکٹریوں میں اہلکاروں کی تعداد کا بوجھ لغویت کی حد تک بڑھ چکا ہے اور ان کے لیے منافع بخش کاروبار کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ ہر طرف کام کیے بغیر تنخواہ لینے کی ذہنیت کا دور دورہ ہے۔ تناسب اور توازن کا شعور غائب ہے کیوں کہ وزیر کی کوتاہ بیں توجہ مکمل طور پر پڑھے لکھے بے روزگاروں پر مرکوز رہتی ہے، اور وہ اس نہایت چھوٹی سی اقلیت کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز قرار دیے رہتا ہے۔ سرکاری بیانات اور اخباروں کے شور و غوغا سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ لاکھوں نئے مزدوروں کو روزگار فراہم کرنا نہیں بلکہ چند ہزار کالج گریجویٹوں کو تنخواہ دار ملازمتیں دلوانا ہے، چاہے کسی بھی طریقے سے کیوں نہ ہو۔

محنت کش طبقے کے لوگوں نے جس طرح سرکاری مکانوں کی تعمیر کا انتظار کیے بغیر اپنے مکان خود بنا لیے ہیں، اُسی طرح وہ سرکاری روزگار کا بھی انتظار نہیں کرتے بلکہ اپنا روزگار خود پیدا کرتے ہیں۔ اورنگی میں میں نے مشاہدہ کیا کہ مہنگائی اور بے روزگاری کا مقابلہ کرنے کے لیے محنت کشوں کے خاندان چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتیں اور کاروبار قائم کر لیتے ہیں، اپنے گھروں کو ورکشاپوں میں تبدیل کر لیتے ہیں اور عورتیں مردوں کے ساتھ مل کر گھر کا روزگار پیدا کرنے میں برابر کا حصہ لیتی ہیں۔ یہ گھریلو کاروبار کراچی کی وسیع مارکیٹ سے پوری طرح پیوست ہیں۔ سستی لیبر اور اوپر کے اخراجات نہایت کم ہونے کی بدولت وہ کاروبار میں کامیابی سے مسابقت کرتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر ہمیں ان کی بے پناہ انتظامی صلاحیت نے متاثر کیا۔ اورنگی ٹرسٹ کی طرف سے قرضے دے کر ہمیں ان کی دیانت داری پر بھی کوئی شک نہ رہا۔ اگرچہ ہم نے اورنگی میں قائم گھریلو یونٹوں کی تعداد کا سروے نہیں کیا ہے، ہمارا اندازہ ہے کہ اس طرح کے دس ہزار یونٹ کام کر رہے ہیں۔ ٹرسٹ ابھی ان میں سے ۲۰ فیصد تک بھی نہیں پہنچ سکا ہے۔ ٹرسٹ کے قرض دار یونٹوں میں سے ۳۵۵ یونٹ مکمل طور پر عورتوں کے زیرِ انتظام ہیں۔

اس میں کسی شبے کی گنجائش نہیں کہ محنت کش طبقے کے لوگ محنت کی عادت اور کاروبار کی صلاحیت کی تربیت زندگی کے سخت گیر مدرسے میں حاصل کرتے ہیں۔ دوسری طرف ہم گریجویٹوں کو (جن میں میں بھی شامل ہوں) کالج کی تعلیم نازک مزاج بنا دیتی ہے۔ ہم محفوظ، مراعات یافتہ اور آرام دہ ملازمتوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ہم سختیاں اٹھانے اور خطرہ مول لینے سے ڈرتے ہیں۔ ہم مفت کی روٹی کھانے کے دلدادہ ہیں۔ مفت کی روٹی کی رغبت ہی ہماری بدعنوانی اور بدانتظامی کی بنیادی وجہ ہے۔

ہمارے تجربے اور تحقیق کی بنیاد پر اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے محنت کش خاندانوں میں کاروباری صلاحیت اور امنگ وافر مقدار میں موجود ہے۔ لیکن ہمیں مزید خوشگوار حیرت اس بات پر ہوئی کہ ہمارے قرض داروں میں کالج کے گریجویٹ بھی تھے جو وقت اٹھانے، محنت کرنے اور خطرہ مول لے کر گھریلو کاروبار قائم کرنے کو تیار تھے۔ میں ان میں سے چند کے مختصر خاکے پیش کرتا ہوں۔

محمد جمیل گلشنِ بہار، سیکٹر ۱۶، اورنگی میں رہتا ہے۔ وہ "بہاری" یعنی بنگلادیش سے آیا ہوا اردو

بولنے والا مہاجر ہے۔ اس نے ۱۹۷۶ میں بی اے پاس کیا اور ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر اسے ملازمت نہ ملی۔ اسے اپنے گھر کے آٹھ افراد کا پیٹ پالنا تھا۔ اس نے چند سو روپے حاصل کیے اور سبزیاں بیچنے لگا۔ وہ ہر صبح چار بجے سبزی منڈی جا کر مال لاتا ہے۔ اس کے گھر کی عورتیں سبزیوں کو دھوتی اور چھانٹ کر الگ الگ کرتی ہیں۔ ۱۹۹۱ میں جمیل نے اورنگی ٹرسٹ سے چھ ہزار روپے قرض لیے تاکہ اپنا کاروبار بڑھا سکے۔ اب اس کی روزانہ آمدنی دو سو روپے ہے۔ جولائی ۱۹۹۳ تک جمیل اپنے قرض کی اصل رقم میں سے چار ہزار روپے اور سود کے سات سو روپے ادا کر چکا تھا۔

محمد طفیل سیکٹر ۱۴ ای اورنگی میں رہتا ہے۔ اس نے ۱۹۸۹ میں بی اے اور اس کے بعد ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ اسے کوئی ملازمت نہ ملی۔ اس نے پہلے تین مشینوں پر پلاسٹک کی مصنوعات بنانے کا کام شروع کیا لیکن یہ کام چل نہ سکا۔ فروری ۱۹۹۱ میں اس نے ٹرسٹ سے ۱۰ ہزار روپے قرض لے کر گیس کے سلنڈر بیچنے کا کام شروع کیا جو خاصا منافع بخش ثابت ہوا۔ دوپہر تک وہ وکیل کے طور پر کام کرتا ہے اور دوپہر کے بعد اپنی دکان چلاتا ہے۔ اس نے اصل رقم کے پانچ ہزار روپے اور سود کے ۱۶۰۰ روپے ادا کر دیے ہیں۔

محمد عالم سہراب جو کھیو گوٹھ، گڈاپ، میں رہتا ہے۔ اس نے ۱۹۹۰ میں بی اے کیا اور تنخواہ دار ملازمت تلاش کرنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ اس کے باپ نے، جس کے پاس ایک ہوٹل اور دو ٹرک ہیں، اسے اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی مگر محمد عالم کو یہ کام گھٹیا معلوم ہوتا تھا۔ تاہم بعد میں اس کے خیالات بدل گئے۔ اس نے ہوٹل کے گاہکوں کو چاے اور کھانا دینا اور ٹرک چلانا سیکھ لیا۔ ۱۹۹۳ میں محمد عالم نے اپنے ایک ٹرک کی ری کنڈیشننگ کے لیے ۵۰ ہزار روپے کا قرضہ لیا۔ اب وہ ٹرانسپورٹر اور ہوٹل مینیجر کا کام خوشی سے کر رہا ہے۔ اس کی آمدنی بڑھ چکی ہے۔ چھ مہینے میں اس نے ۱۷ ہزار روپے اصل رقم اور ۳ ہزار روپے سود ادا کر دیا تھا۔

برنیس سلیمان بہاری مارکیٹ میں رہتی ہے۔ وہ ہندوستان سے آنے والے مہاجروں میں سے ہے۔ اس نے ۱۹۷۶ میں ایم اے کیا اور شادی کر کے پاکستان آ گئی۔ اس کا شوہر بے روزگار تھا۔ برنیس نے بیوٹیشین اور ٹیلرنگ کی تربیت حاصل کی اور اپنے گھر میں بہت چھوٹے پیمانے پر کام شروع کر دیا۔ نومبر ۱۹۹۲ میں اس نے اورنگی ٹرسٹ سے زگ زیگ سلائی مشین اور بیوٹی پارلر کے لیے قرضہ لیا۔ اب اس کے پاس آرڈروں اور گاہکوں کی بڑی تعداد ہے۔ وہ ایک اسکول کی صبح کی شفٹ میں استانی کے طور پر بھی کام کرتی ہے۔ اس کے شوہر نے فوٹو گرافی کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس نے اپنے قرض کے تین ہزار چار سو روپے اور سود کے پانچ سو روپے ادا کر دیے ہیں۔

بدر جمال نے ۱۹۸۹ میں بی اے کیا۔ اس کے کچھ ہی دن بعد اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ وہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی اس لیے اپنی ماں اور پانچ بہن بھائیوں کا خیال رکھنے کی ذمے داری اسی پر آئی۔ اسے ملازمت نہ ملی، چناں چہ اس نے بیوٹیشین کی ٹریننگ لی اور جون ۱۹۹۱ میں ٹرسٹ سے

Scanned with CamScanner

۱۵ ہزار پانچ سو روپے قرض لے کر گھر ہی میں بیوٹی پارلر کھول لیا۔ اس کی دو چھوٹی بہنیں بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگیں۔ اب اس کا بیوٹی پارلر خوب چل نکلا ہے۔ اس کی آمدنی سے اس نے اپنی دو بہنوں کی شادی کردی ہے۔ وہ اپنے قرض میں سے ۱۴ ہزار ۳ سو روپے اور سود کے دو ہزار آٹھ سو روپے ادا کر چکی ہے۔

رضوان میر سیکٹر ۷ ای اورنگی میں رہتا ہے۔ ۱۹۸۳ میں اس کے باپ کے انتقال کے بعد اس کا خاندان غریب ہو گیا۔ اس کی حوصلہ مند ماں سلائی کر کے کسی طرح گھر کا خرچ چلاتی رہی۔ بعد میں اس کی سب سے بڑی بہن سلمہ ایم اے کر کے لیڈی ہیلتھ ورکر بن گئی۔ رضوان نے ۱۹۸۹ میں بی ایس سی کیا اور کوئی اچھی ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ چناں چہ اس نے اپنے ایک اور گریجویٹ دوست کے ساتھ مل کر اپنے گھر میں چمڑے کے بے کار ٹکڑے جوڑ کر شیٹیں بنانے کا چھوٹا سا کارخانہ کھول لیا۔ جولائی ۱۹۹۱ میں رضوان نے ٹرسٹ سے ۳۵ ہزار روپے قرض لے کر ایک کمرہ بنوایا اور کچھ اور مشینیں خریدیں۔ اس کا کاروبار خوب پھیل گیا اور اب دس کل وقتی مزدوروں اور محلے کی آٹھ جزوقتی کارکن عورتوں کو روزگار فراہم کر رہا ہے۔ اس کے کارخانے میں ہینڈ بیگ اور پرس تیار ہوتے ہیں۔ رضوان کے دو چھوٹے بھائی کالج میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ سلائی کا بھی کام کرتے ہیں۔ رضوان قرض کے ۱۱ ہزار ۸ سو ۵۰ روپے اور سود کے ۴ ہزار پانچ سو بیس روپے ادا کر چکا ہے۔

محمد امجد اورنگی کے سیکٹر ۵ ای میں رہتا ہے۔ اس کی ماں ایک ہوشیار عورت ہے جس نے او پی پی کی درخواست پر ۱۹۸۴ میں عورتوں کا پہلا ورک سنٹر قائم کیا۔ پہلے پہل اسے اپنے قدامت پرست ہمسایوں کی طرف سے لعن طعن اور طنز و استہزا کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس کے عزم کی بدولت یہ سنٹر نہ صرف تجارتی طور پر کامیاب رہا بلکہ اس نے دوسری سفید پوش گھریلو عورتوں کے لیے مثال بھی قائم کی۔ نو برس کے عرصے میں اورنگی بھر میں سلائی کے سیکڑوں مرکز کھل گئے۔ زاہدہ بیگم کا سنٹر ایک دو منزلہ مکان میں قائم ہے اور تقریباً سو عورتیں وہاں کام کرتی ہیں۔ اس کا منجھلا بیٹا امجد اسکول اور کالج کی تعلیم کے دوران بھی اس کاروبار میں سرگرمی سے شریک رہا۔ بی اے کرنے کے بعد اس نے کل وقتی طور پر سنٹر کا انتظام سنبھالنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایک ہوشیار ماں کا ہوشیار بیٹا ہے۔ زاہدہ بیگم کو سنٹر کی سلائی مشینیں خریدنے کے لیے ۷۵ ہزار روپے کا قرضہ دیا گیا تھا۔ وہ ۲۳ ہزار روپے لوٹا چکی ہے۔ پھر اس نے مکان کی دوسری منزل بنوانے کے لیے ۶۵ ہزار روپے کا قرضہ لیا جس میں سے ۴۴ ہزار روپے کی اصل رقم اور ۵ ہزار روپے سود ادا کر چکی ہے۔

جوں جوں ہمارا کام آس پاس کے گوٹھوں میں پھیل رہا ہے، وہاں بھی ہمیں باہمت گریجویٹ نوجوان ملتے جا رہے ہیں۔ سہراب جوکھیو گوٹھ کے محمد عالم کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں عبدالغنی جوکھیو بھی ملا۔ وہ گریجویٹ ہے اور کراچی کے ایک دفتر میں پی آر او کے طور پر ملازم ہے، لیکن اب بھی گوٹھ ہی میں رہتا ہے۔ ستمبر ۱۹۹۱ میں اس نے اورنگی ٹرسٹ سے ۲۰ ہزار روپے قرض لیے اور اپنی بچت کے ۲۵ ہزار روپے ملا کر اپنے کنوئیں کو گہرا کیا اور اس پر ایک پمپ لگا لیا۔ پہلے اسے اور

اس کے گوٹھ والوں کو پینے کا پانی خریدنا پڑتا تھا؛ اب وہ پانی کنویں سے حاصل کرتے ہیں۔ عبدالغنی نے عمارتی لکڑی کے درخت، پھل دار پیڑ اور سبزیاں اگانی شروع کر دی ہیں۔ اس سے اسے خاصی آمدنی ہوتی ہے جو پیڑوں کے بڑا ہونے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائے گی۔ اس نے اپنا پورا قرض، مع ۳ ہزار ۱۲ سو روپے سود کے، چکا دیا ہے۔

آخر میں میں ایک بزرگ سماجی کارکن، فقیر جو کھیو گوٹھ کے پینڈی فقیر، کے دو بیٹوں کا ذکر کروں گا۔ یوسف کو ایم بی بی ایس کرنے کی آرزو تھی، جو پوری نہ ہو سکی۔ وہ صرف بی اے کی ڈگری حاصل کر سکا۔ چناں چہ اس نے ہومیو پیتھی سیکھی اور ایک میڈیکل اسٹور کھول لیا۔ مارچ ۱۹۹۱ میں اس نے ٹرسٹ سے دس ہزار روپے قرض لے کر اپنی دکان کو وسیع کیا۔ وہ پورا قرض، ۱۶۲۵ روپے سود سمیت، لوٹا چکا ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی رسول بخش بھی گریجویٹ ہے۔ وہ بھی گوٹھ ہی میں رہتا ہے۔ اس نے عمارتی لکڑی اور پھلوں کے درخت لگائے ہیں اور سبزیاں اور پان اگا رہا ہے۔

زندگی کا سخت گیر مدرسہ ہمارے محنت کش طبقے کے لوگوں کو محنت، ہوشیاری اور کفایت شعاری سکھاتا ہے۔ دوسری طرف ہماری کالج کی تعلیم ہمیں آرام پسند اور مفت کی روٹی کا شوقین بنا رہی ہے۔ افسوس کہ یہ نجات کا راستا نہیں ہے۔ ہمیں اپنے محنت کشوں کی پیروی کرنی چاہیے، کیوں کہ ان کا اختیار کیا ہوا محنت، ہوشیاری اور کفایت شعاری کا راستا ہی نجات کا راستا ہے۔ یہ اچھا شگون ہے کہ کچھ گریجویٹوں نے بھی ان کی پیروی کی ہے؛ ہمیں امید کرنی چاہیے کہ اور لوگ بھی یہی راستا اختیار کریں گے۔

۷

اخبار پڑھنے کی لت کے شکار دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی روایت اور جدیدیت کی روزمرہ خوراک لیتا ہوں جس کے منطقی نتیجے میں مجھے بھی مروجہ ذہنی انتشار ـــــ یعنی شناخت کا بحران ـــــ حاصل ہوتا ہے۔ تب مجھے خیال ہوتا ہے کہ میں یا تو احمق ہوں یا بندر بن چکا ہوں۔ تاہم اپنی ہوش مندی کو برقرار رکھنے کے لیے میں ہر روز اورنگی کے محنت کشوں کے پاس جاتا ہوں۔ ہمارے اونچے طبقے کی طرح، ہمارے چرب زبان نظریہ پسندوں کی طرح، وہ لوگ بھی ایک عظیم تبدیلی کے عمل سے گزر رہے ہیں، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کے ذہنوں میں کسی انتشار کا گزر نہیں ہے۔

میں پندرہ برس سے ان لوگوں کا مشاہدہ کر رہا ہوں، اور ان کے لیے میری تحسین بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ زندہ رہنے کے فن میں زبردست مہارت رکھتے ہیں۔ وہ خواب آلود آنکھوں والے نظریہ بازوں سے نہیں بلکہ اپنی انسانی جبلتوں سے رہنمائی حاصل کر کے ماضی اور حال کا ایک ہم آہنگ امتزاج پیدا کر رہے ہیں۔ انھیں کسی بیرونی کلچر سے نگل لیے جانے یا اپنی شناخت کے گم ہو جانے کا کوئی خطرہ محسوس

Scanned with CamScanner

نہیں ہوتا۔ کسی مضبوط پیڑ کی طرح ان کی جڑیں مٹی سے پیوست ہیں اور ان کی شاخیں مغربی ہواؤں کو خوش آمدید کہتی ہیں۔

اورنگی کے لوگوں نے ورثے میں تین بنیادی روایتیں پائی ہیں: مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی۔ دراصل یہ ایک ہی کلچر کے تین مختلف رخ ہیں۔ اس وقت یہ پرانا کلچر ایک جدید شہر کے زبردست دباو میں زندہ رہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لوگوں کا جبلّی ردعمل اپنی پرانی اقدار کو بیک وقت باقی رکھنے اور ان کی شکل تبدیل کرنے کا ہے تاکہ ماضی اور حال دونوں سے ان کا رشتہ برقرار رہے، تاکہ وہ مروجہ معنوں میں قدامت پرست یا جدیدیت پرست بننے سے محفوظ رہ سکیں، تاکہ وہ احمق بننے یا بندروں میں تبدیل ہو جانے سے بچ سکیں۔

مذہبی روایت لوگوں کا رشتہ کائنات کے خالق سے، مابعدالطبیعیاتی قوتوں سے اور اپنے ساتھی انسانوں سے جوڑتی ہے۔ ان لوگوں کے لیے مسجد روحانی اور سماجی قوت کے مرکز کے طور پر آج بھی اتنی ہی زندہ ہے جتنی ماضی میں تھی۔ ہر نئے قائم ہونے والے سیکٹر میں ایک مسجد بنائی جاتی ہے اور اس میں ایک امام کو مقرر کیا جاتا ہے۔ ۱۹۸۲ کے ایک سروے سے معلوم ہوا تھا کہ گزشتہ تیرہ سال کے عرصے میں مقامی کمیٹیوں نے ۱۶۸ مسجدیں تعمیر کیں، لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ان سب کے امام علاقے کے باہر سے بلوائے گئے تھے۔ بظاہر اورنگی کے لوگوں کو یہ متبرک پیشہ اختیار کرنے میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی۔ اماموں کا روحانی رہنماؤں کی حیثیت سے احترام کیا جاتا ہے لیکن سیاسی رہنماؤں کے طور پر انھیں ووٹ نہیں ملتے۔ مدرسوں کو ثواب کی خاطر خوب چندے دیے جاتے ہیں، لیکن خود اپنے بچوں کو لوگ اسکول ہی بھیجنا پسند کرتے ہیں۔

اپنے آباواجداد کی طرح اورنگی کے لوگوں نے روحانی قوتوں سے اپنا رشتہ برقرار رکھا ہے اور کسی مشکل کا سامنا ہونے پر وہ انھیں سے رجوع کرتے ہیں۔ جب کسی بچے کو ٹائیفائڈ ہوتا ہے تو اس کی ماں اس کی صحت یابی کے لیے دعا مانگتی ہے۔ لیکن ایک نازک سا فرق محسوس کیا جا سکتا ہے: ماں دعا بھی مانگتی ہے اور بچے کو ڈاکٹر کے پاس بھی لے جاتی ہے۔ ہماری لیڈی ہیلتھ وزیٹر بتاتی ہیں کہ ناخواندہ پٹھان عورتیں تک ہماری ہیلتھ ٹیموں سے بیماریوں کی روک تھام اور بچوں کی پیدائش کے درمیان وقفہ بڑھانے کے طریقے بہت شوق سے سیکھتی ہیں۔ روحانی قوتوں اور دعاؤں سے ان کا رشتہ جدید حفظانِ صحت اور ضبطِ تولید سیکھنے میں قطعی مانع نہیں ہوتا۔ اورنگی میں روحانی رشتہ لوگوں کو ان مشکلات کا سامنا کرنے کی قوت اب بھی فراہم کرتا ہے جو انسانی زندگی کا حصہ ہیں۔ سماجی رشتے، جو احسان اور بھائی چارے کے مذہبی تصورات کی پیداوار ہیں، اب بھی خاندانوں، گلیوں اور محلّوں کو جوڑے رکھتے ہیں۔ لیکن یہ روحانی یا سماجی رشتے بنیادی طور پر مذہبی نوعیت کے ہونے کے باوجود اورنگی کے لوگوں کے جدید زندگی کے طور طریقے اپنانے کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالتے۔ اس کے برعکس، ان رشتوں کی بدولت ان کی زندگیوں میں نئے حالات کا سامنا کرنے کے لیے زیادہ لچک آ جاتی ہے۔

Scanned with CamScanner

خاندان کے رشتے اورنگی میں ہمیشہ کی طرح مضبوط ہیں۔ دوسرے طبقوں اور برادریوں کے برعکس، ابھی ان میں شکست و ریخت کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ متحد خاندان کسی بھی برادری کے لیے ایک بڑا اثاثہ ہوتے ہیں۔ اورنگی میں خاندانوں کے اندرونی اتحاد نے نئی بستیاں آباد کرنے اور انھیں رفتہ رفتہ بہتر بنانے کے عمل میں بہت اہم حصہ لیا ہے۔ اورنگی کی گلیوں میں گاؤں کی اجتماعی روح نئے سرے سے زندہ ہو گئی ہے۔ اسی اجتماعی روح کے بل بوتے پر اورنگی کی ہزاروں گلیوں کے رہنے والوں نے نکاس کا ایک پورا نظام اپنے خرچ پر اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا ہے اور اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جب تعمیر کے اس عظیم کام کے دوران لوگوں نے اپنے کم مایہ ہمسایوں کی مالی امداد کی۔ اس طرح مذہبی روایت کے پیدا کیے ہوئے خاندانی اور سماجی رشتوں نے نکاس کا جدید نظام اپنانے میں اورنگی کے لوگوں کی مدد کی۔

کوئی بھی مشاہدہ کرنے والا ذرا سی توجہ سے دیکھ سکتا ہے کہ مذہبی روایت سے برآمد ہونے والے چار اخلاقی اصولوں ــــ محنت، کفایت شعاری، احسان اور انکسار ــــ کی اورنگی میں (ظاہر ہے کہ عمومی طور پر) اب بھی پابندی کی جاتی ہے۔ ہماری روایت کاہلی پر جفاکشی کو، شان و شوکت پر سادگی کو، خودغرضی پر احسان کو اور تکبر پر انکسار کو ترجیح دیتی ہے۔ اور اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ اورنگی کے لوگ سخت محنت کرتے ہیں، سادہ زندگی گزارتے ہیں، اپنے ساتھی انسانوں سے حسنِ سلوک کرتے ہیں اور عیاشی اور بدمعاشی سے دور رہتے ہیں۔ ان خوبیوں نے انھیں اس قابل کیا ہے کہ انھوں نے کفایت شعاری سے کام لے کر اپنے مکان، اپنا نکاس کا نظام، اپنے اسکول، اپنے اسپتال خود بنائے ہیں اور اپنی ٹرانسپورٹ کا خود بندوبست کیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ، میکس ویبر کی پروٹسٹنٹ اخلاقیات کے اصولوں کی طرح، اورنگی کے لوگوں کے مذہبی اخلاقی اصولوں نے ان کے مضبوط خاندانی رشتوں سے تقویت حاصل کر کے ان ہزاروں گھریلو صنعتوں اور تجارتوں کو جنم دیا ہے جن کے ذریعے سے وہ مہنگائی اور بےروزگاری کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

بڑے شہر کی صنعتی تہذیب کے دباو نے، جسے اورنگی کے باشندوں نے ہنسی خوشی اپنایا ہے، اور ہماری بدانتظامی کی شکار معیشت کی پیدا کردہ بےپناہ مہنگائی نے اورنگی کے معاشرے میں عورت کے کردار کو ڈرامائی طور پر بدل دیا ہے۔ پرانے پدرپرست طریقے سے زندگی گزارنا اب ناممکن ہو گیا ہے۔ ان لوگوں نے پردہ نشیں محتاجوں کے بجائے آزاد معاشی کارکن بننے کے عمل میں اپنے گھر کی عورتوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اورنگی کی گھریلو صنعتوں میں عورتیں اکثریت نہیں تو ایک بہت بڑی اقلیت کے طور پر حصہ لے رہی ہیں۔ یہ عورتیں صرف کارکن یا مزدور ہی نہیں، اپنے کاروبار کی خود مالک بھی ہیں۔ اس کے علاوہ لڑکیاں پہلے سے کہیں زیادہ بڑی تعداد میں اسکول میں پڑھ رہی ہیں۔ ۱۹۸۹ میں کیے گئے ایک سروے سے معلوم ہوا کہ اسکول کے ۸۰ ہزار طلبا میں ۳۶ ہزار (یعنی ۴۵ فیصد) لڑکیاں ہیں۔ اسکول کے ۲۳۸۹ استادوں میں سے ۱۶۲۶ (یعنی ۶۸ فیصد) استانیاں ہیں۔ مزید یہ کہ اورنگی کے

۸۷ فیصد اسکولوں میں مخلوط تعلیم رائج ہے۔

میں نے ان باروزگار عورتوں، ان استانیوں، ان طالبات کا بڑی احتیاط سے مشاہدہ کیا ہے۔ بلاشبہ یہ عورتیں ہمارے معاشرے کا ایک بالکل نیا مظہر ہیں۔ وہ میری ماں کی طرح پردہ نشیں نہیں ہیں۔ عملی زندگی میں بھرپور حصّہ لینے کے باوجود انھوں نے پرانی تہذیب کے نسوانی وقار کو قائم رکھا ہے۔ وہ میری ماں کے برعکس نہ چادر اوڑھتی ہیں نہ چاردیواری میں قید رہتی ہیں؛ اس کے باوجود بنیادی طور پر ان کے طور طریقوں میں اُتنی ہی حیاداری موجود ہے جتنی میری ماں کے طور طریقوں میں تھی۔

میں ان باروزگار عورتوں، ان استانیوں اور ان طالبات کے وجود کو اورنگی کے لوگوں کی سب سے نفیس کامیابی سمجھتا ہوں۔ یہ عورتیں ماضی اور حال کے درمیان ایک زندہ رشتے کی سب سے نمایاں مثال ہیں، اور اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی ہماری تیاری کی بہترین علامت ہیں۔

**

اختر حمید خاں کراچی شہر کی محترم ترین شخصیات میں سے ہیں۔ کراچی کے شہری اُنھیں اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے روح و رواں کے طور پر جانتے ہیں۔ یہ سماجی تنظیم اپنے بنیادی فلسفے کے اعتبار سے دوسری غیر سرکاری سماجی انجمنوں سے مختلف ہے، اور اس کی پُشت پر اختر حمید خاں کی وہ دانش کارفرما ہے جو ان کی زندگی کے قیمتی تجربات کا حاصل ہے۔

اس انتخاب میں شامل مضمون کا متن اُن کی کئی انگریزی تحریروں کا ترجمہ اور تدوین کر کے تیار کیا گیا ہے۔ ان تحریروں کی تفصیل یہ ہے:

1. "What I learnt in Comilla and Orangi",
2. "Personal Reminiscences of Change",
3. "The Good Earth of Dildar Goth",
4. "Learning lessons from Orangi",
5. "Graduate Entrepreneurs".

ان پانچوں مضامین کو یونیسیف کے زیرِاہتمام مارچ ۱۹۹۴ میں اسلام آباد سے ایک مجموعے کی صورت میں *Personal Reminiscences of Change* کے نام سے شائع کیا گیا۔ ان مضامین کے علاوہ اردو متن کی تیاری میں اختر حمید خاں کی اس تقریر سے بھی مدد لی گئی ہے جو انھوں نے ۱۶ نومبر ۱۹۹۵ کو Megacities: Crisis and Challenges کے موضوع پر آغا خان یونیورسٹی کے بین الاقوامی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کی تھی۔ اُن کے مضامین کا ایک انگریزی مجموعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، کے زیرِاہتمام شائع ہونے والا ہے۔

Scanned with CamScanner

آصف فرخی

اس شہر میں رہنا

لوگ اپنے شہروں کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہی آئے ہیں۔ ایسے شہروں کو، انگریزی محاورے کے مطابق، میں چٹکی بھر نمک کے ساتھ لیتا ہوں۔

نہ جانے کب سے یہی سنتا آیا تھا: آسمان کی کیا مجال کہ ہم سے چھڑائے لکھنؤ۔ میں نے اس لکھنؤ کے بارے میں پڑھا تھا جہاں میرے ابا پیدا ہوئے تھے۔

دلّی جو اک شہر تھا عالم میں انتخاب، اور دلّی کے کوچے نہ تھے اوراقِ مصوّر تھے وغیرہ، اس شہر کے بارے میں جہاں میری امی پیدا ہوئی تھیں اور جس کی نسبت سے میرے ننھیال والے اپنے نام کے آگے اس شہر کا نام لکھا کرتے تھے۔

یہ اور ایسی اَور بھی باتیں میرے ذہنی پس منظر کا حصّہ ہیں۔ جس شہر میں مَیں نے آنکھیں کھولیں، اس شہر کے لیے میں ایسی باتیں نہیں کر سکتا۔

جن دنوں میں بڑا ہو رہا تھا، اُن دنوں کا کوئی احساس مجھے یاد نہیں کہ ہم کراچی میں رہ رہے ہیں، ارے، اوہو، ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا! پانی پینے اور سانس لینے کی طرح ایک بے رنگ و بو اور ہمہ وقت جاری لازمی کیفیت تھی کراچی میں رہنے کی۔ اب کہیں نہ کہیں تو رہنا ہے، کراچی ہی سہی۔ نہ یہ کہ اس شہر میں رہنا کوئی اہم یا معنی خیز بات ہے۔ اگر یہ کوئی خاص کیفیت تھی تو اس کا کوئی نام بھی نہیں تھا۔ ہم ایسے لوگوں کا بھی کوئی نام نہیں تھا۔ "کراچی والے" میں اصطلاحی عصبیت کا ٹیکا تو کافی دنوں بعد لگا تھا۔ ممتاز مفتی نے نام وضع کیا: "کراچیے"، جسے سن کر مجھے املی کی چیاں یاد آجاتی ہیں۔ میری نانی انھیں سکھا کر رکھ لیتی تھیں اور خاندان میں کسی موت کے بعد فاتحہ کے وقت کام آتی تھیں یہ چیاں۔ جو لوگ سیپارہ نہیں پڑھ سکتے تھے، ان پر کلمہ پڑھ کر گنتی کرتے تھے۔ کراچی کے ناموں کا اب شاید یہی مقصد رہ گیا ہے ـــــ مرنے والوں کی گنتی۔

مگر میں اُن دنوں کی بات کر رہا ہوں جب ہمیں کوئی بھی "کراچی والے" نہیں کہتا تھا۔ "دلّی والے ہیں،" میری نانی کہیں محفل میں جاتی تھیں تو لوگ ان کے پیٹھ پیچھے کہتے تھے۔ وہ سن لیتی تھیں تو برا مان جایا کرتی تھیں۔ "تم لوگ سمجھتے ہو دلّی والے بس وہی ہوتے ہیں تیز مرچیں کھانے والے اور آریاؤں، جا

ریاؤں والے؟ ہم وہ نہیں ہیں!"
اس کے علاوہ کبھی یہ سننے کو ملتا کہ "ہندوستانی ہیں"۔ اب جو سننے کو ملتا ہے اُس میں فردِ جرم کی سی قطعیت ہے۔ "ابو، آپ جھوٹ بولتے ہیں، ہم سندھی نہیں ہیں،" میری چھ سالہ بیٹی نے اپنے اسکول کے ساتھیوں سے سن کر طے کر لیا ہے۔ "سارے مہاجر دہشت گرد نہیں ہوتے،" روزنامہ اخبار میں کوئی نہ کوئی صاحبِ اقتدار تسلی دیتا ہے۔ ہم اپنی شناخت کسی نہ کسی منفی تعریف سے حاصل کرتے ہیں۔ ہم یہ ہیں جو وہ نہیں ہے۔ ہم اردو بولنے والے ہیں ــــ جو سارے کے سارے دہشت گرد نہیں ہوتے۔ ہم کراچی والے ہیں ــــ اس لیے کہ ہم اَور کہیں کے نہیں ہیں۔ (ہم کہیں کے بھی نہیں رہے ــــ ہم یہاں کے ہی نہیں رہے!)
اور نام کے نہ ہونے پر مجھے اُس وقت بھی حیرت ہوتی تھی۔ میں چھوٹا سا ہی تھا جب میرے ابا مجھے پہلی بار مشاعرے میں لے گئے۔ تخلص کیا ہوتا ہے اور نام کی نسبت کے ساتھ ڈوئی بنتی ہے، یہ سب مجھے انھوں نے ہی بتایا تھا۔ ملیح آبادی، لکھنوی، دہلوی، امروہوی، بدایونی... ہونقوں کی طرح منھ پھاڑے میں سب کو سنتا رہا۔
اسٹیج پر جگمگاتی ہوئی، مائیکروفون پر ترنم بکھراتی ہوئی، وہ ایک مختلف، علیحدہ اور واضح دنیا تھی؛ جب کہ میں کچا کچا آدھ بنا سا تھا۔
یہ سارے اچھے لوگ دور کیوں تھے، پاس کیوں نہیں آتے تھے؟
"ان میں کوئی کراچوی کیوں نہیں ہوتا؟" میں نے ابا سے پوچھا تھا۔
"کیوں نہیں لکھا جاتا ہے؟" میں نے پھر پوچھا تھا، جب انھوں نے کہا تھا کہ اس طرح کراچی کا نام تخلص کے ساتھ نہیں لکھا جاتا۔ "تو پھر تم لکھ لینا،" انھوں نے نیم تمسخر کے ساتھ کہا ہو گا۔
بس میں ہی لکھ لوں گا، میں نے فیصلہ کیا تھا۔ تخلص بھی رکھنا تھا، کیوں کہ شاعری تو کرنی ہی تھی ــــ یہ طے ہو چکا تھا۔ بس تخلص کے مسئلے پر گڑبڑ ہو گئی اور شاعری کی بارات واپس ہو گئی۔ میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ جس تخلص پر ذرا جی ٹھہرتا، ساتھ ہی یہ خیال بھی آتا کہ یہ تو صرف ایک کیفیت ہے، اس سے الگ کیفیت ہوئی تو کیا ہو گا۔ اور تخلص کے بغیر کسی نے "کراچوی" مان کر ہی نہیں دیا؛ ابو تک نے نہیں، جو اچھا بھلا "صدیقی" چھوڑ کر "فرخی" لکھنے لگے تھے۔ میری سالگرہ پر ساحر لدھیانوی کی "تلخیاں" اور "پرچھائیاں" تحفے میں دیں تو بہت اصرار کے باوجود میرے نام کے ساتھ "کراچوی" لکھ کر نہیں دیا۔ "تم خود ہی لکھ لو، ہم نہیں لکھتے ایسے واہی تباہی نام،" انھوں نے حسبِ عادت ٹکڑا توڑ کر رکھ دیا۔ تخلص طے نہ ہو سکا، اس لیے شہر بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ بغیر مقطعے کی چھ غزلیں بیاض میں لیے منھ دیکھتا رہ گیا ــــ میں، undecided کراچوی، جس کے نام پر ڈوئی نہیں لگائی جا سکتی۔
اس سے کون سا ایسا بھاری نقصان ہو گیا، اگر نام کی نسبت ظاہر نہیں ہوئی؟ انبساط و افتخار کی قسم کا جذبہ نہیں محسوس ہوتا اس شہر کے حوالے سے، جس طرح "جنگ" اخبار میں احمد ندیم قاسمی صاحب کا

کالم، مع ان کی چھوٹی سی تصویر کے، چھپتا تھا: "لاہور لاہور ہے"، (اور جس کے عنوان سے آگے نہیں بڑھا جاتا تھا کہ اگر لاہور یہ نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟) یا وہ دلی جو شاہد احمد دہلوی اور اشرف صبوحی کی کتابوں میں زندہ تھی۔ بلکہ وہ چھوٹا سا قصبہ فتح گڈھ بھی نہیں، جس کے جیتے جاگتے کرداروں سے میرے دادا کے سنائے ہوئے قصّے آباد تھے۔ قصّہ مختصر، "جہاں ہے اور جیسا ہے" کی بنیادوں پر ہم ایک شہر کے رہنے والے تھے۔ اور یہیں اس کی ہونی کے احساس نے ہم پر اپنا آپ منکشف کیا۔ یہ بھی نہیں کہ اس پر بیتا پڑی ہو اور اس سے دور جا کر اس کا کھٹکا اٹھا ہو۔ اس شہر سے دور رہنے کا باضابطہ طور پر اتفاق ہوا اور بوسٹن میں مَیں نے ایک مدّت گزاری، مگر اس میں شہر والوں کو زیادہ اور شہر کو کم کم یاد کیا۔ اس کے بعد جب بھی تلوا کھجلایا، شہر چھوڑنے کا ملال دامن گیر نہیں ہوا۔ کالے کوسوں دور، جہاں گشت کے دوران مومباسا کی ایک سڑک تھی جس کے دونوں طرف گھاس کے قطعوں میں کچھ اس طرح کے مکانات تھے کہ کراچی کے بعض علاقوں کا باوقار سناٹا بے طرح یاد آیا۔ ۱۹۵۰ کی دہائی میں ایسے مکان اعلیٰ درجے کے سمجھے جاتے ہوں گے؛ اب ان کی لونی لگی دیواروں پر جا بجا چونا جھڑنے لگا ہے، گول برآمدے اور آگے کو نکلی ہوئی کھڑکیاں "پیریڈ" معلوم ہوتی ہیں۔ سمندری ہواؤں کے راستے میں بسے ہوئے شہر کیا ایک ہی طرح سال خوردہ اور عمر رسیدہ ہوتے ہیں؟ مجھے نہیں معلوم۔ دوسرے شہروں کے ایسے ہی کونے کھدروں میں کراچی کی جھلکیاں مجھے یاد آتی رہیں۔ ایک تصویر کھینچنے کے بعد کیمرے کی ریل آگے نہ بڑھی ہو تو ایک تصویر کے اوپر دوسری تصویر کھنچ جاتی ہے؛ پھر فلم کا اتنا حصّہ صحیح طور پر ڈویلپ نہیں ہو پاتا اور نگیٹو دیکھو تو ایک منظر یا چہرے کے خدوخال میں سے پچھلی تصویر کے ادھورے، دھندلے نقوش جھانکنے لگتے ہیں۔ دوسرے شہروں کی جو امیجز میرے ذہن میں محفوظ رہ گئی ہیں، ان میں سے بھی کراچی کے دھندلے، آوٹ آف فوکس مناظر جھلکتے ہیں کہ ان کو نظر میں اتارتے وقت آنکھ پوری طرح آگے نہیں بڑھی تھی۔

جگہوں کے احساس کی طرف بعد میں آیا۔ میرا پہلا اور دیرپا احساس وقت کا تھا۔ زندگیاں وقت میں بڑھتی اور سفر کرتی ہیں، میں یہ سمجھ رہا تھا۔ اس گزرنے میں جگہیں ضروری ہوتی ہیں، ہر لمحے ہر قدم پر ہم کہیں نہ کہیں موجود ہوتے ہیں، اس احساس نے بہت بعد میں اپنی دریافت کروائی۔ یہ جگہیں بدلتی رہتی ہیں — کہیں ہم پر حاوی و غالب آجاتی ہیں اور کہیں پس منظر کا حصّہ بن کر، اس دھیمے پن کے ساتھ کہ کچھ محسوس ہی نہیں ہوتا۔ وقت اگر خطِ مستقیم میں آگے بڑھ رہا ہے تو زندگی کے گراف میں اپنی موجودگی کا نقطہ لگانے (plot کرنے) کے لیے متوازی خط (axis) پر مقام کی نشان دہی کرنا ہوگی، کہ زندگی ایک سیدھی لکیر کی طرح آگے نہیں بڑھتی۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو زندگی کو بیشتر وقت کے پیمانے سے دیکھنے کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ اس پختہ ذہنی عادت کی وجہ سے ماضی کو میں نے اکثر گزرا ہوا لمحہ سمجھا، چھوڑی ہوئی منزل کم سمجھا۔ جس شہر میں یہ دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ بساط ہی نہ اٹھ جائے کہیں، میں اس شہر کو یاد کرتا ہوں کہ اس شہر میں اپنے وقت کو یاد کرتا ہوں؟ میں جن مکانوں میں رہا ہوں

اور جن گلیوں میں گھوما ہوں، وہ جگہیں بعض دفعہ یوں ہی بیٹھے بٹھائے یاد آتی ہیں اور آئے چلی جاتی ہیں۔ اگر میں اپنے وقت کو کاغذ پر اتارنا شروع کروں تو کراچی کا نقشہ بننے لگتا ہے۔ میری کل کہانی کا "پلاٹ" یہی ہے۔

وہ پہلی جگہ جس کا میں نے ہونا چاہا اور جو مجھ سے کترا کر نکل گئی، وہ لالوکھیت تھی۔ بس دو چار ہاتھ لب بام رہ گیا، چند ایک گلیوں کا فاصلہ۔ میں "لالوکھیتنا" ہو جاؤں، میری شدید خواہش تھی۔ ناظم آباد نمبر ۴ اور لالوکھیت کے کسی درمیانی حصے میں، جس کی حدبندی بہت واضح نہیں تھی، پیدا ہوا تھا میں۔ (مدت ہوئی کہ وہ لیڈی ڈاکٹر فوت ہو گئی، اور اس کا میٹرنٹی ہوم منہدم کر دیا گیا۔ بلدیہ عظمیٰ کراچی کے جاری کردہ سرٹیفکیٹ پر مقام پیدائش کراچی درج ہے۔) "روشن سراج" کی چھت پر چڑھ کر میں جہاں تک دیکھ سکتا تھا وہ میرے بچپن کی مانوس دنیا تھی۔ اس سے آگے کہیں لالوکھیت تھا ــــ مجھے پتا تھا۔ امی اور چھوٹی خالہ وہاں سے سامان خریدنے جاتی تھیں، خاص طور پر کپڑے۔ امی ایک دفعہ بڑے بڑے پھولوں والا کپڑا خرید کر لائی تھیں جس کو دیکھ کر چھوٹی خالہ نے ناک بھوں چڑھائی تھی۔ "بالکل لالوکھیتنا لگتا ہے،" انھوں نے کہا تھا۔ میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔ یہ کیسی جگہ ہے کہ ایک تو اس کھیت میں کپڑا ہوتا ہے، پھر دیکھنے ہی سے پتا چل جاتا ہے! یہی اُن بالوں کو دیکھ کر کہا گیا تھا جو مجھ سے بڑے لڑکے سائیکلوں پر آتے جاتے، ماتھے پر گپھے بنا کر خوب جمی ہوئی مانگ نکالے نظر آتے تو مجھے بہت قابل رشک معلوم ہوتے۔ چھوٹی خالہ کا اعتراض سن کر میرا رشک اَور بڑھ گیا ــــ بہت واضح اور دور سے پہچانے جانے والے لوگ ہوتے ہوں گے، شناخت کے باقی سارے مسائل سے مبرّا! کسی علاقے سے اس طرح کا بھی تعلق ہو سکتا ہے کہ آدمی وہیں کا معلوم ہو؟ میں اَور بھی حیران ہوا تھا۔ میں اس سے دور پیدا ہو گیا، شاید اسی لیے اب تعلق کے مسئلوں میں اُلجھتا رہتا ہوں۔ اس کے بعد لالوکھیت سے تعلق نہیں، آگ نظر آئی تھی۔ اُس دن سارے وقت گھر میں عجیب طرح کی باتیں ہوئی تھیں جن کی تفصیل مجھ سے چھپائی گئی؛ لیکن پھر بھی اتنا سمجھ میں آ گیا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے اور اس گڑبڑ کے بیچوں بیچ لالوکھیت ہے۔ جب ایسا ہوتا تھا تو میں سمجھ جاتا تھا کہ مجھ سے کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے؛ لیکن اُس دن شام ہو گئی اور سب چھت پر جا کر کچھ دیکھنے لگے۔ جس طرف مجھے بتایا گیا تھا کہ اُدھر لالوکھیت ہے، وہاں جابجا آگ لگی ہوئی تھی۔ آسمان دھواں دھواں تھا۔ ادھر کی خاموشی میں دور کا شور گھلا ہوا تھا۔ "لالوکھیت پر حملہ ہو گیا ہے،" چھوٹی خالہ نے مجھے چپکے سے بتایا۔ "ایوب خاں کے آدمی، یہاں کے لوگوں سے مس فاطمہ جناح کو ووٹ دینے کا بدلہ لے رہے ہیں۔" لالٹین اور گلاب کا پھول... میں کچھ سمجھا، کچھ نہیں۔ "دعا مانگو!" مجھ سے کہا گیا۔ "دعا مانگو کہ وہ لوگ لوٹ مار کرتے ہوئے، آگ لگاتے ہوئے لالوکھیت سے نکل کر یہاں نہ آ جائیں۔" لالوکھیت کی سرحد بہت واضح ہو چکی تھی۔ میں سرحد کے اِس پار پیدا ہوا تھا۔

Scanned with CamScanner

اس سے بھی زیادہ واضح وہ سرحد تھی جس کے پار سے میرے لوگ آئے تھے۔ لکھنؤ، فتح گڑھ، آگرہ، بمبئی — میرے ابا کے شہر یہ رہے ہیں۔ ستمبر ۱۹۴۷ میں وہ بمبئی میں تھے۔ اپنے ایک دوست کو کراچی کے لیے رخصت کرنے پانی کے جہاز پر آئے تو رش کے مارے اتر نہ سکے اور عرشے پر رہ گئے۔ چونکے تو جہاز سمندر میں تھا اور آگے کراچی۔ وہ ایک نئے شہر میں نئے سرے سے زندگی شروع کر سکتے تھے۔ میرے دادا نے بہت برہم ہو کر انھیں خط لکھا: "ہماری طرف سے تم پاکستان نہیں انگلستان چلے جاؤ، لیکن کم از کم اطلاع تو کرو۔" ابا کے پاکستان چلے جانے کی اڑتی اور فتح گڈھ کے آبائی مکان پر کسٹوڈین نے تالا لگا دیا تو سارے خاندان کو سمیٹ کر میرے دادا نے بھی پاکستان کا رخ کیا۔ "ہم لکھنؤ جا رہے ہیں،" کرائے کے مکان سے رخصت ہوتے وقت انھوں نے محلّے والوں کو یہی بتایا تھا۔ انھیں جاتا ہوا دیکھنے کے لیے جو لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے، انھیں بھی یقین تھا کہ کیسا لکھنؤ اور کہاں کا کان پور، اب یہ کھوکھراپار سے پہلے رکنے والے نہیں۔ کھوکھراپار، جس کے آگے سیدھا کراچی... غیر قانونی تارکین وطن کو اس آنے والے شہر میں پرمٹ بنوا کر آئے تھے وہ، شاید اسی لیے یہاں کچھ اکھڑے سے رہے۔ یہ اور طرح کا شہر تھا، وہ اور طرح کے آدمی۔

پاکستان چوک ناگزیر تھا۔ کراچی آنے کے بعد میرے ابا پاکستان چوک میں رہے تھے۔ دکھنی مسجد سے آگے، آؤٹرام روڈ پر دو کمروں کے ایک فلیٹ میں۔ اب وہ "پہلوان والی گلی" کے نام سے مشہور ہے۔ پہلے کبھی کچھ اور نام ہو گا، اور شاید اس سے پہلے بھی، کون جانے۔ میری پھپھی اور پھپھا آئے۔ پھر دادا اور دادی بھی وہاں آ گئے۔ فلیٹ چھوٹا، لوگ بہت۔ ماچس کی تیلیوں کی طرح، رات کے وقت سونے کا انتظام سن کر ہم محظوظ ہوا کرتے تھے۔ یہاں سے نکل کر وہ لوگ پاپوش نگر میں بھی رہے اور عزیز آباد میں بھی؛ لیکن زیادہ مدت پیر الٰہی بخش کالونی میں گزاری، جہاں میرے دادا کا انتقال ہوا اور اس کے تقریباً دس برس بعد دادی کا۔ مجھے معلوم ہے کہ شہر یا گلی کوچے مرحوم کیسے ہو جاتے ہیں۔ دوسرے ہاتھ پر، میری ننھیال کا یہاں آنا تو "دلّی کی چتا" ہے۔ میرے نانا نانی لاہور سے یہاں آ کر پرانی نمائش پر رہے۔ میری امی اور ان کی بہنوں نے جیکب لائنز کے اسکول میں پڑھا — جہاں کے سرخ کھپریل والی چھتوں کے پیلے پیلے مکان ڈھا دیے گئے — اور اس کے بعد ویمنز کالج فریئر روڈ میں، جس کی پرانی عمارت پر اکھڑتے ہوئے رنگ کے نیچے پتھر کے حروف سے اب بھی پڑھا جا سکتا ہے: "کنیا مہاودیا پاٹھ شالا" — ماضی کی تہ میں ایک اور ماضی، جیسے تصویر کے نیچے پینٹی مینٹو (pentimento) — ناخن سے کھرچتے ہوئے بھی دل ڈرتا ہے۔ اس اکھڑے ہوئے رنگ کے اندر ایک نقشہ — میرے نانا نے زمین خرید کر مکان بنوایا اور اس پر جلی حروف میں اپنا اور میری نانی کا نام لکھوایا: "روشن سراج"۔ کئی لوگوں نے انھیں اس کے خلاف مشورہ دیا۔ "ناظم آباد؟ غیر آباد، اجاڑ جگہ ہے، بالکل اللہ میاں کے پچھواڑے... چھجن میاں کہاں جا کر پھنس گئے؟" لوگ کہتے ہیں کہ اس وقت لالوکھیت کی سڑک سے یہ لکھا ہوا نظر آتا تھا: روشن سراج۔ اب یہ سوچنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ درمیان کا علاقہ کبھی اس قدر ویران رہا ہو گا۔

ایک محلّہ ناظم آباد چار نمبر سے بھی دور تھا: پاپوش نگر۔ ہمیں اس بات پر بہت ہنسی آتی تھی۔ کھانے کی میز پر کوئی اگر ایک سرے پر بیٹھا ہوتا کہ سالن اور روٹی کا وہاں تک پہنچنا مشکل ہوتا تو کوئی نہ کوئی ہانک لگاتا: "بھئی ادھر بھی کچھ دے دو، ہم پاپوش نگر میں بیٹھے ہیں۔" وہ علاقہ تو کب کا شہر کے گنجان حصّوں میں آ گیا، ہمارے یہاں یہ مذاق اب بھی چلتا ہے۔ شہر کا نقشہ ایک گھر کے مذاق سے زیادہ تیزی سے بدلتا ہے۔

اس طرف گھر تھا جہاں وہی دیکھی بھالی روز کی مانوس چیزیں تھیں، اور دوسری طرف لالوکھیت جہاں بازار کا "سامان" تھا، جہاں "واقعات" پیش آتے تھے۔ مجھے شروع ہی میں اندازہ ہو گیا تھا۔ ایک آدمی نے دو بچوں کو چڑیا بنا کر لالوکھیت کے چڑیا بازار میں بیچ دیا، روزنامہ "جنگ" میں خبر چھپی تھی۔ (صبح کے وقت برآمدے میں بیٹھ کر میرے نانا چاے میں پاپا ڈبو کر کھاتے اور میں ایک فرماں بردار طوطے کی طرح انھیں اخبار پڑھ کر سنایا کرتا۔ میں اخبار پڑھنا سیکھ رہا تھا۔) امی بتاتی ہیں کہ اس خبر سے مجھے اتنا ڈر لگا کہ میں کمرے سے باہر نہیں نکلا، مجھے بخار چڑھ گیا۔ بخار کی حالت میں کھڑکی کی سلاخوں میں سے املی کے پیڑ میں اٹکے ہوئے بجلی کے تار اور خاک آلود آسمان کی اجنبیت مجھے یاد ہے ___ ڈر کا رنگ ایسا ہوتا ہے۔ ایسے عجیب و غریب لوگ شہر میں ہوتے ہیں، میں نے سوچا ہوگا؛ کیوں کہ ان دنوں اخبار کی سرخی سے زیادہ اعتبار کس کا ہو سکتا تھا؟ "شہر گردن توڑ بخار کی زد میں"، ان دنوں کی ایک اور سرخی مجھے یاد ہے۔ اب کی بار کوئی بلا ایسی آئی ہوگی جو بچوں کی گردن کچی لکڑیوں کی طرح چٹاچٹ توڑ ڈالتی ہوگی۔ "وبا کے حملے سے مختلف علاقوں میں کئی بچے ہلاک"، ایسی خبریں ایک اوائلی خوف کو جنم دیتی تھیں اور بہت دنوں تک باتوں کا موضوع بنی رہتیں۔ اُن دنوں شہر میں ایسے ہی موضوع تھے۔ پھر کسی اخبار رسالے میں (لیکن اس کے بہت دن بعد) اس لڑکی کا حال بھی یقین و گمان کی کیفیت میں پڑھا تھا جو رات گئے بارش میں اکیلے گاڑی چلانے والے کو رکنے اور مدد کرنے کا اشارہ کرتی ہے؛ اپنے سرخ جوڑے اور سنگھار کے بارے میں بتاتی ہے کہ شادی کے فوراً بعد ٹریفک کے حادثے میں دولھا زخمی ہو گیا۔ وہ مدد مانگتی ہے، التجا کرتی ہے۔ وہ جو سراپا ترغیب ہے، ہوش و حواس پر بجلی گراتی ہے، ڈرگ روڈ پر پی ای سی ایچ ایس کے قبرستان کے پاس گاڑی رکواتی ہے جہاں سڑک کراچی کی مخصوص ہلکی بارش میں ویران پڑی ہے، اور گاڑی سے اتر کر اندھیرے میں غائب ہو جاتی ہے، اپنے پیچھے ایک خلش چھوڑ جاتی ہے۔ چند برس پہلے ان ہی تاریخوں میں یہ حادثہ ہوا تھا اور دولھا ہلاک ہو گیا تھا، اس کے بعد دلہن بھی، اخباروں نے قیاس آرائی کی تھی۔ اب تو کوئی اس کا ذکر بھی نہیں کرتا، لیکن کئی برس تک اس کے دیکھے جانے کے واقعات اخباروں میں اس طرح چھپتے رہے جیسے امریکا میں اڑن تشتریوں کی عینی شہادت (sightings) کے واقعات چھپا کرتے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ برسوں پرانے ان اخبار رسالوں کی گرد جھاڑوں، ان واقعات کو ڈھونڈوں جو کراچی کی "شہری لوک روایات" (urban folk-lore) ہیں۔ اس روٹی کا احوال بھی مجھے

یاد ہے جو کسی بزرگ نے ایک مایوس عورت کو عنایت کی تھی اور ساتھ ہی ہدایت کہ یہ روٹی پانی کے برتن میں رکھی جائے اور جوں جوں روٹی بڑھ کر ایک سے دو ہو جائے، دوسری روٹی کسی اور مستحق کو دے کر اس کا پانی پیا جائے صبح نہار منھ، اور تکلیف کی جگہوں پر لگایا جائے تاکہ مجبوروں کی حاجت پوری ہو، بیماروں کو شفا ملے۔ میری بڑی خالہ کو، جنہیں ہم "اماں" کہتے تھے اور جو بحری حیاتیات کی پروفیسر تھیں، بہت جستجو تھی کہ یہ یقیناً جیلی فش کی کوئی قسم ہو گی، کیوں کہ بقول ان کے، "کراچی کے ساحل اور سمندر مختلف اور متنوع حیاتیاتی وسائل سے مالامال ہیں۔" روٹی کے معجزات ایک آدھ بار پھر سننے میں آئے۔ اس وقت تک اوزون لیئر میں سوراخ کی خبر عام نہیں ہوئی تھی، ماحولیاتی تحفظ کا کوئی نام بھی نہیں جانتا تھا اور میرے شہر کے لوگ معجزوں پر اعتبار کر لیا کرتے تھے۔ ایک زمانے میں وہ خط بھی چلا تھا کہ مقامات مقدسہ سے آواز آئی ہے: بہت جلد کچھ رونما ہونے والا ہے، جو شخص اس کا اعتبار کرے گا اور اس خط کی سات نقلیں بنوا کر دوسرے تک پہنچائے گا اسے خوشی دیکھنے کو ملے گی اور جو یقین نہیں کرے گا، نقصان اٹھائے گا۔ یہ روٹی اور یہ خط کئی برس بعد یاد آئے جب ایک افسانہ بحران کے نقطے پر پہنچا ہوا تھا۔ میں ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن کوئی غیر متوقع خوشی حاصل نہیں ہوئی، افسانہ بھی رہ گیا۔ میں ان کو اپنی تحریر میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کراچی کے ان روایتی واقعات اور کرداروں کی Book of Grotesques ترتیب دے سکوں، ایک شہر کے خوف اور خواب کی کتاب جس کا راوی میں ہوں۔

خواب اور خوف کی عمارتیں جو انہدام کے لیے نشان زد کی جا چکی ہیں، ان عمارتوں کے شہر کے لیے کوئی Baedeker نہیں... ٹی ایس ایلیٹ کی نظم Burbank with a Baedeker کی وہ سطریں...

کیا وقت بھی شمع کی طرح بجھتا ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے؟ کیا میں بربینک کی مماثلت میں ہوں؟ یہ دھواں کیا اس نقشے میں سے اٹھ رہا ہے؟ میرے نانا کے انتقال کے بعد "روشن سراج" بک گیا۔ سب کے اپنے اپنے گھر ہیں، لیکن کوئی خاندانی گھر نہیں۔ بچپن کی یادیں خانماں برباد پھرتی ہیں۔ مجھ سے اب دیکھا نہیں جائے گا، لیکن سنا ہے کہ اس مکان کی پیشانی پر سے وہ نام مٹا دیا گیا ہے۔ نہیں معلوم اس گلی کو لوگ اب کس پہچان سے پکارتے ہوں گے؟

یا شاید اس مکان کو بھی ڈھا کر اس کی جگہ کچھ اور بنا دیا گیا ہو ___ نیا مکان اور نئے مکین۔ پرانے نقشے مگر اس طرح بھلائے نہیں جاتے۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ ان مکانوں کے گرد و پیش، دیواریں، کمرے، کھڑکیاں، ان میں دھوپ چھاؤں کے بنتے بگڑتے روپ سروپ بھی اسی طرح یاد آتے ہیں جیسے ان میں ہونے والی باتیں اور ان میں بسنے والے لوگ۔ اور پھر لوگ وہی رہتے ہیں، مکان بدل جاتا ہے۔ جیسے آنکھ وہی رہتی ہے، منظر بدل جاتا ہے۔ ایک محلے سے دوسرے محلے میں منتقلی ___ مکانوں کی تبدیلی کے اس عمل میں ایک خاندان کے بڑھنے، آگے چلنے کی پوری تاریخ سمٹی ہوئی ہے۔ میرے چچا نے پیر

الٰہی بخش کالونی کو چھوڑ کر سوسائٹی میں مکان بنوایا تو میرے دادا کا اس پر رواں تبصرہ تھا: "انھوں نے بنگلہ بنوالیا ہے، اب اس کے لیے تو ان کو خان ساماں بھی رکھنا پڑے گا، بیرے بھی اور مالی بھی..." لیکن باجی آپا کا اعتراض بنیادی نوعیت کا تھا: "اتنا بڑا گھر بنوالیا اور پیک تھوکنے کی کوئی جگہ نہیں..." واقعی مسئلہ شدید تھا۔ ایسے گھروں میں پان کی پیک کہاں تھوکی جائے؟

مکانوں کے ساتھ رہن سہن بدل رہا تھا، ہم بدل رہے تھے۔ نشانیاں واضح تھیں۔ تبدیلی کا اندازہ اس وقت اور بھی زیادہ ہوتا جب ان رشتے داروں سے ملاقات ہو جاتی جن کا ملنا شادی غمی کی خصوصی تقریبات تک سمٹ کر رہ گیا تھا۔ یہ سارے رشتے دار شہر کی نہیں، ذہن کے مضافات میں آباد تھے۔ ان کی موقع بے موقع یاد مضحک امکانات کو جنم دیتی۔ کوئی خاندانی اجتماع ہوتا تو دبے دبے سوال مسکراہٹ میں سے دبے دبے نکلتے: "اب تو دوسروں کے گھر میں باتھ روم بھی ناک پر دوپٹہ رکھ کر جاتی ہیں۔ دن لگ گئے ہیں! وہ وقت بھول گئیں جب برسات کے دنوں میں کھڈیوں، قدمچوں پر جانا پڑتا تھا..." —— "ان کو بڑا اعتراض ہے کہ غسل خانہ پیخانہ ساتھ ساتھ ہیں، ان کے ہاں کا تو پرانا دستور ہے کہ صحن میں پلنگ کھڑا کر کے نہالیے..." —— "ارے، تم اس نام سے نہیں پہچانے؟ یہاں آ کر بدل لیا، ورنہ اصل میں تو یہ ہُرمزی تھیں..." "فرخ آباد میں کوئی مُنّے آزاد قوال نہیں تھے، وہ تو ہم فلاں صاحب کو کہتے تھے ... ارے وہی جن کی ایک بیٹی بکھیاں بھنکی تھی اور اس سے چھوٹی خوب کلّے نکلی..." —— "ارے وہی فلانی کے نکھٹوسیاں، نام ہے جن کا من مالی دھیاں دھیاں، کھاتے ہیں کباب اور سویّاں..." —— "پھر گئے بلوتے بکنے؟ وہ کالا بورڈ پر نہیں، سعود آباد میں رہتے ہیں..." "مزاحیہ نظموں کی پوری لین ڈوری لگا دی تھی انور پھپانے، جن کو فرمائش کے ساتھ سنا جاتا تھا: "پھر ہمیں لے چل دلِ مضطر سعود آباد میں، پھر دکھا ہم کو وہی منظر سعود آباد میں"، اور آگے بڑھ کر قوالی کی طرز میں: "دل سعود آباد میں دل بر سعود آباد ہیں۔"

سعود آباد ہی میں کیوں؟

شاید اس لیے کہ اتنی دور ہو گیا تھا کہ وہاں جانے کے لیے دوسرے شہر کے سفر کی طرح تیاری کرنا پڑتی تھی جب سے ہم یونیورسٹی منتقل ہو گئے تھے۔

اب شہر کے بچوں کے کھیلنے کے لیے "پلے لینڈ" اور "فن پارک" بن گئے ہیں۔ ہمارے بچپن میں کھیلنے کی جگہیں گلیاں اور مکان تھے۔ کسی کے گھر ملنے یا رہنے کے لیے جانا، چھٹیاں، عید بقر عید، سالگرہیں ... اور سب سے بڑھ کر روزمرہ کے روٹین سے آزادی دلانے والی شادی کی تقریبات —— یہ تھی ہمارے لیے بہت بڑی تفریح۔ پارے کی شادی مجھے یاد ہے جس کا ارمان میری نانی اور خالاؤں کو نہ جانے کب سے تھا۔ ایلو، سانچق ہو رہی ہے اور دوسرے بدن کی بیگم رحمت اللہ دروازے سے پکارتی ہوئی، صدقے واری

ہوتی ہوئی چلی آ رہی ہیں۔ ("ارے ان کے باپ فلاں تھے۔ آدھی بمبئی ان کی تھی!" وہ آتی نہیں تو لوگ محفل میں سرگوشی کرتے تھے۔ پھر وہ ایک اور طرح کی خبر بن گئیں۔ کراچی کا اجتماعی حافظہ انھیں یاد بھی رکھے گا تو قتل کی اُس لرزہ خیز واردات کے طور پر جس میں دن دہاڑے گھر کا اسباب اور زیور لُوٹ لیا گیا تھا۔ کیسے لوگ اور کیا انجام!) اور دلّی کی وہ خاندانی ڈومنی فرمائشی گالیاں گا رہی ہے جس کی پوپلے منہ والی آواز کو سُن کر مردوں کے پیٹ میں بل پڑ رہے ہیں اور عورتیں دوپٹے سے منہ چھپا رہی ہیں۔ وہ ڈومنی جانے کب کی مر کھپ گئی۔ اُس کا گھرانا تتربتر ہوا تو ہوا، وہ سلسلہ ہی ختم ہو گیا اور اب کسی شادی میں یہ رسم نہیں ہو سکتی۔ اب تو شادی بیاہ کے گوتوں کی جگہ فلمی گانے چلنے لگے ہیں اور موقع بے موقع لڑکیوں کو کچھ اور یاد نہ آئے تو دمادم مست قلندر بھی۔

پھر انور چچا کی شادی یاد ہے جس میں پڑوس کا مکان بھی لیا گیا تھا۔ (تب کراچی میں شادی ہال نہیں بنے تھے اور شادیاں سڑک پر شامیانہ لگا کر کر لینا معمول تھا۔) اس مکان میں کھیلتے ہوئے اس کے روشن دان یاد ہیں جو اوپر کی منزل کے کمروں سے نیچی نیچی کھڑکیاں معلوم ہوتے تھے۔ اور بتی جلنے کے بعد جیسے کسی کھوپڑی کے چمکتے ہوئے دانت... پھر وہ پڑوس والے اطہر بھائی مر گئے اور مکان بک گیا۔ جن لوگوں نے مکان خریدا انھوں نے "اکبری منزل" کی تختی اکھڑوا کر اپنے نام کی نئی تختی نصب کروا کے مکان کو ایک نئی شناخت دے دی۔ مکان کے در و دیوار تو نئے ہو گئے، اس میں جو لوگ گزرے اور جو وقت گزرا اُس کا حساب کہاں گیا؟

شہر کا جو علاقہ سب سے طویل مدّت تک میرا رہا، وہ یونیورسٹی کیمپس ہے۔ میں وہاں گیا تو نو سال کا لڑکا تھا اور واپس آیا تو زمانہ بدلا ہوا تھا ــــ اٹھارہ سال کی مدّت۔ "شہر سے بارہ میل پرے،" اس زمانے میں کراچی یونیورسٹی کا ذکر اس طرح کیا جاتا تھا۔ کیمپس سے باہر جانا ہوتا تو ہم بھی یہ کہتے تھے: "شہر جا رہا ہوں۔" کہیں بھی جانے کے لیے خاص اہتمام سے "شہر" جانا پڑتا تھا۔ شاید اس لیے میرے اندر کراچی کے حوالے سے شہر سے تھوڑا سا الگ تھلگ ہونے کا احساس ہے ــــ مجھے ہر بار شہر جانا پڑتا ہے۔

سبزی منڈی سے آگے سڑک کے ساتھ کوئی آبادی نہیں تھی، رات بِرات دوا بھی چاہیے ہوتی تو اس کی فراہمی جیل روڈ سے پہلے ممکن نہیں تھی۔ جب ہم ۱۹۶۸ میں وہاں منتقل ہوئے ہیں تو یہ سڑک (جو اب یونیورسٹی روڈ ہے) کنٹری کلب روڈ کہلاتی تھی اور اس کی واحد نشانی ایرو کلب تھا جہاں ہم نے ایک آدھ گلائیڈر بھی اُڑتے دیکھا۔ اندھیرا ہو جانے کے بعد لوگ وہاں سے گزرنے سے کتراتے تھے۔ (آج اسی جگہ رات گئے ٹریفک کا اژدحام رہتا ہے۔) آمدورفت کا ذریعہ (اس وقت موٹر گاڑی امارت کی نشانی تھی) ایک بس تھی جو وقتوں کی پابندی سے چلتی تھی۔ جیل روڈ، گرومندر، صدر، اس کے تین اسٹاپ تھے اور ایک مدّت تک کسی بھی جگہ جانے کا فیصلہ اس بات پر منحصر ہوتا تھا کہ وہ ان سے کس

Scanned with CamScanner

سمت میں اور کتنی دور ہے۔ ہمارا "شہر" آنا جانا اسی کے حساب سے تھا۔ شہر سے نہیں، اس وقت میری ملاقات اس الگ تھلگ بستی کے گھنیرے درختوں، چڑیوں، پُروقار سناٹے اور مودّب تنہائی سے تھی۔ آج وہاں داخل ہونے کے لیے رینجرز کی اجازت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ میں اب وہ بستی چھوڑ چکا ورنہ ان ہرے بھرے سناٹوں کی جستجو سے بھی جاتا جس میں اپنی آواز سنائی پڑتی ہے۔ درختوں کے سائے میں چہل قدمی اور خود کلامی کے وہ انداز شہر میں مجھے اب اَور کہاں میسر ہیں۔

صبح ٹھیک پونے سات بجے ایک بس یونیورسٹی کیمپس کے اسٹاف ٹاؤن سے چلتی اور ہمیں اسکول لے جاتی، جو ظاہر ہے کہ "شہر" میں واقع تھا۔ پہلے پہل شہر کا مطلب ہی تھا اسکول اور اس کے گردو نواح۔ یہاں سے شہر کی دیدودریافت کا مرحلہ شروع ہوا، ورنہ اس سے پہلے تو یہ جامد پس منظر تھا، بھدے رنگ دار چھپے ہوئے پردے کی طرح، جس کے سامنے کھڑا کر کے فٹ پاتھیے فوٹو گرافر تصویر کھینچ لیتے تھے جس کو واپس اپنے گاؤں جا کر آپ فخریہ دکھا سکتے ہیں کہ ہاں دیکھ لیا کراچی۔ پھر اس تصویر کی سطح ٹوٹی اور اس نے اپنے اندر شمولیت کی دعوت دی۔ میں نے شہر گردی اختیار کی۔
سینٹ پیٹرکس اسکول صدر میں ہے اور ڈی جے سائنس کالج برنس روڈ سے آگے۔ گھر سے اسکول کالج تک، میں شہر کے نقشے میں ان ہی نقطوں کے درمیان حرکت کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس نقشے میں وسعت آئی اور نئے مقام بھی آئے۔ اس ایک سڑک کی سیدھ اور پھر اس کے آس پاس تک محدود تھا کراچی کا جو ذہنی نقشہ (mental map) میں نے بنا رکھا تھا۔ تجربے بڑھے تو اس میں مختلف ادراکی مقامات (perceptual spaces) شامل ہوتے گئے، ایک دوسرے سے منسلک ہوتے رہے۔ ذہنی نقشے میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ میں خود بھی اس سے ملتے جلتے عمل سے گزرتا رہا، اسی لیے میں اپنی زندگی کے ادوار یا تجربات کو شہر کے بعض علاقوں کے حوالے سے جانتا ہوں۔ اس بات کو اگر سنیما کی اصطلاح میں دہراؤں تو اپنے آپ کو یوں سمجھا سکتا ہوں کہ زندگی کی بھی locations ہوتی ہیں جس کی مناسبت (relativity) سے ہمارے واسطے اور وسیلے، رہائش کا طور طریقہ، رہن سہن کا اسلوب، وقت گزاری کے مشاغل، دیگر دل چسپیاں اور مواقعے، ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے، حلقۂ عمل اور دائرہ کار کا انتخاب اور تعین ہوتا ہے۔ یہ بات میرے دھیان میں آئی پیٹر گولڈ اور روڈنی وائٹ کے "جغرافیۂ ادراک" کے تجزیاتی مطالعے سے، کہ ہم مختلف جگہوں کی ذہنی امیج کیوں کر بنا لیتے ہیں (چناں چہ نیویارک والوں کے لیے ریاست ہائے متحدہ امریکا کا ذہنی نقشہ ان لوگوں کے ذہنی نقشے سے مختلف ہو گا جو کیلی فورنیا میں رہتے ہیں، اور امریکا کو نیویارک کے بجائے کیلی فورنیا کی طرف سے شروع کرنے اور کھولنے کے عادی ہیں۔ لندن والوں کے لیے انگلستان کا محور ان کا اپنا شہر ہے، جس سے جتنا دور ہٹتے جائیے، ان کی واقفیت کا نقشہ محدود ہوتا چلا جائے گا۔) یہ امیجز دراصل معلوماتِ عامّہ کی selective channeling کا نتیجہ ہوتی ہیں اور اسی کے زیرِ اثر ہم شہر کے مختلف حصوں کے بارے میں تاثراتی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ کون کس علاقے کو

کس طرح دیکھتا ہے، اس بے حد دل چسپ مطالعے کا مقصد فقط تجسّس کی تسکین نہیں ہے، بلکہ مجھے اس کا یہ جملہ کلیدی معلوم ہوتا ہے:

"We are slowly realizing that people's perception of places is one of the things we must consider as we try to understand the pattern of man's work on the face of the earth."

میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ کراچی کا جو ذہنی نقشہ میں نے قائم کر رکھا ہے، اس میں میرے وقت کے ساتھ ساتھ بڑی معنی خیز تبدیلیاں آئی ہیں اور وہ امیز محض عمارتوں، راستوں، گلی کوچوں کی واقفیت پر مبنی نہیں ـــ ان میں میرے تجربے کا لہو دوڑ رہا ہے۔ یہاں لہو سنسناتا ہے، رگوں میں چلتا ہے، یہاں شعور کو جلا ملتی ہے، وہاں جبلّت محض کی تسکین ہوتی ہے، اس راہ سے پیغام کی ترسیل ہوتی ہے اور نظر خبر بنتی ہے، قلب وجاں میں اترتی ہے۔ کراچی کا نقشہ میرے لیے کچھ اس طرح کا ہو گیا:

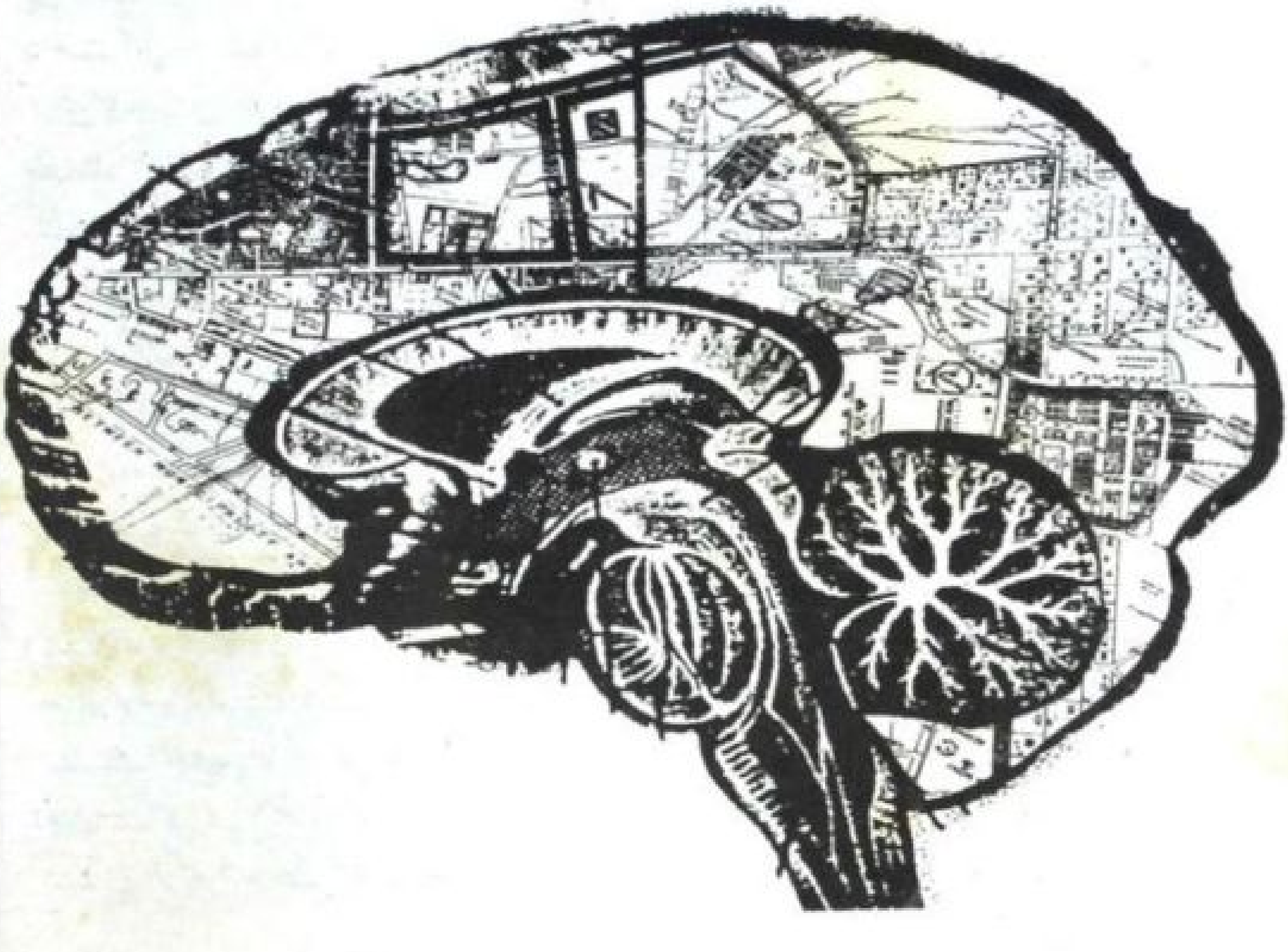

Scanned with CamScanner

نادر جہاں بیگم نے اپنی عمر کا خاصا بڑا حصّہ کراچی میں گزارا، لیکن میری دادی کو اس شہر کی گلیوں محلوں کا کوئی خاص اندازہ نہیں تھا۔ انھیں پاکستان چوک بھی معلوم تھا اور پیر الٰہی بخش کالونی بھی، لیکن ایک سے دوسری جگہ کیسے جاتے ہیں، اس سفر کا طے کرنا ان کے لیے کسی مدد کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ آخر عمر میں جب نسیان مرض کی سی شدت اختیار کر گیا تو وہ "گھر" جانے کی ضد کرنے لگیں ــــ لکھنؤ، ان کی جائے پیدائش، ان کا میکا، جہاں ان کے خیال میں، گاڑی میں بیٹھا کر بس تھوڑی سی دور لے جانے کی بات تھی۔ انھیں دکھ تھا کہ کوئی اتنا سا بھی نہیں کر سکتا۔ کم و بیش یہی حال جمیلہ خاتون کا بھی تھا جو جگت "باجی آپا" تھیں۔ قائم گنج کے قیصے کے ساتھ عمر کا بڑا حصّہ انھوں نے کراچی میں مختلف گھروں میں مسافر طریق، تقریباً پا در رکاب، گزارا۔ انھیں جگھوں کا بہت دھندلا سا اندازہ تھا۔ ایک مرتبہ کسی جگہ سے جاتے ہوئے وہ غلط بس اسٹاپ پر اتر گئیں۔ برقعہ اور بغل میں گٹھریاں، پوٹلیاں سنبھالتی خدا معلوم کہاں کی کہاں چل دیں۔ وہ تو بس کے مردانہ حصّے میں سے بڑے میاں نے دیکھ لیا اور شور مچا کر بس رکوالی ورنہ وہ تو کھوئی گئی تھیں ــــ کراچی میں گم شدہ، جو شاید ہم سب ہیں۔ چھٹپن میں گھر کا پتا اور ٹیلی فون نمبر ہمیں رٹوا دیا گیا تھا کہ اگر کھوئے جائیں تو کوئی ہمیں ہمارے گھر پہنچا دے، اور پھر "پکڑنے والوں" سے بہت ڈرایا بھی گیا تھا۔ پھر بھی میں شہر کے بہت سے حصّوں میں گم ہو سکتا ہوں۔ دراصل مجھے وہی علاقے یاد رہتے ہیں جن سے میرا کوئی نہ کوئی تعلق بن گیا ہے۔ اس شہر کے نقشے میں ہم سب اپنے اپنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں گھومتے رہتے ہیں ــــ اس دماغ کی طرح جس کا بیش تر حصّہ عالمِ امکان ہی میں رہتا ہے۔ میرے مانوس علاقے مخصوص ہیں۔ امی گلشن اقبال سے نارتھ ناظم آباد جاتے ہوئے کئی بار راستا بھول چکی ہیں۔ ابا کو ڈیفنس سوسائٹی میں خیابان اور اسٹریٹ نمبر میں دھوکا ہو جاتا ہے اور اکثر غلط گلی میں گاڑی مڑوا لیا کرتے ہیں۔ میں غلط بس میں بیٹھ کر ناظم آباد کے بجائے ملیر پہنچ گیا اور خاصی دیر بعد چونکا۔ شہر کے نقشے میں اپنے اپنے مقام پر رہتے ہوئے ہم اپنے نقشے خود بنا لیا کرتے ہیں۔ ایک خاتون نے جو کوئی ابلی گھلی، گھر کی پابند نہیں تھیں، کسی حوالے سے پوچھا کہ وہاں کیا حال ہے، ارے بھئی وہیں اورنگی کورنگی جہاں تم جایا کرتے ہو۔ پھر میری ہنسی کا سبب بھی ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دونوں میں فرق کیا ہے۔ اور اگر ہے بھی تو کیا ہوا؟ ایک معروف انگریزی رسالے سے وابستہ صحافی خاتون سے، جن کے بے باک تجزیے پر اربابِ اختیار کو پسینے چھوٹ سکتے ہیں، کراچی کی آبادی کے حوالے سے بات ہو رہی تھی کہ اک معمّا ہے نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا، تو آبادی کا تخمینہ سن کر انھیں خاصی حیرت ہوئی۔ "یہ سارا کراچی ہے؟ اور اس میں وہ سب بھی شامل ہیں، ناظم آباد، نارتھ ناظم آباد، نیو کراچی؟ اور اس سے آگے سپر ہائی وے پر جو پولٹری فارم ہیں؟" ان پولٹری فارموں سے آگے جہاں اور بھی ہیں! میرے دادا کہیں جانے کا سبب یہ بتایا کرتے تھے کہ ہم گھر سے نکلے تو فلاں نمبر کی بس کھڑی تھی، ہم نے سوچا لاؤ فلاں کے ہاں ہوتے آئیں۔ وہ راستا تو نہیں بھولتے تھے لیکن پتا ڈھونڈنے میں دشواری ہوتی تھی۔ وہ لینڈ مارک کے سہارے چلنے کے عادی تھے۔ ایک مرتبہ کسی کا گھر ڈھونڈنا تھا، باقی لوگ ٹیکسی میں ساتھ تھے اور وہ بار

Scanned with CamScanner

بار ٹیکسی رکوا کر راہ گیروں سے ایک ہی سوال پوچھے جا رہے تھے جس کا جواب لاعلمی میں ملتا تھا: "کیوں صاحب، یہ رائل سویٹ میٹ مارٹ کس طرف ہے؟" یہ سوال کچھ مابعدالطبیعاتی نوعیت کا معلوم ہوتا ہے۔ واقعی، کہاں ہے، کس طرف کو ہے، کدھر ہے؟ یہ کس کو خبر ہے؟

وہ جس طرف بھی ہو، اس شہر کے ذائقے مختلف ہیں ___ مختلف ذائقے، مختلف تجربے۔ کسی بڑے شہر میں رہنے کے تجربے کو آڈن نے بڑی عمر کی عورت کے ساتھ ملوث ہونے سے مشابہ قرار دیا ہے۔ متنوع اور پختہ کار احساسات اس طرح جلد ہی حاصل ہو جاتے ہیں ___ یعنی شہر سے رہ و رسم آشنائی۔ کراچی میرے لیے بھی وہ رہا ہے جسے فیض کی زبان میں کوچۂ دلدار کہیں گے ("اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا") اور ہنری ملر کے مطابق "دی لینڈ آف فک" کہلائے گا۔ جسم وجاں میں ہلچل... شہر میں چہروں کا ہجوم... جھلکیاں... تسکین کا وہ پہلا سبق کہ احساسِ تشکر سے آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں۔ میری ناآسودہ خواہشوں اور محرومیوں کی یورش اور وفور کا شہر۔ میری آنکھوں سے چیونٹیوں کی ایک قطار نکلتی ہے اور شہر کی گلیوں سڑکوں پر دانہ دانہ چنتی ہے ___ اس کھڑکی میں بھی دو آنکھیں، اس راہ پر کھلتے ہوئے ہونٹوں کا اجالا، کالج الیکشن کے نتائج کے دن اس عمارت کی چھت پر سے گلاب کی پتیاں برساتے ہوئے دو ہاتھ۔ ایک جلسے کی کارروائی کے دوران کسی کونے میں ایک ادھوری جھلک سے یہ اندازہ لگانا کہ یہ بال اور یہ گردن کیا اسی کے ہیں، اور کیا کسی ایک نقش سے اسے پہچان لینے کی منزل آ گئی؟ شہر کی عمارتوں پر میرے لیے تختی نصب کرنا تو ممکن نہیں، نقشے میں حساب رکھنا ممکن ہے کہ یہاں اپنا دل خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا۔ اب میں بھی اسی راضی بہ رضا اطمینان کے ساتھ اس شہر کے بارے میں کہہ سکتا ہوں جس طرح سندھ کے غریب ہاری اپنے آبائی قبرستان کے بارے میں کہتے ہیں: ھی اساں جو مقام آھے۔

ترغیبات سے پورا شہر بھرا پڑا تھا۔ وہ بڑے مزے لے لے کر اس دنیا کے قصے سناتا تھا اور ہم منھ پھاڑے سنتے تھے گویا وہ کسی نئی دنیا کا سیاح ہے۔ میرے اسکول کے اس ساتھی کا نام بلبلان فرہنگ تھا۔ سب اسے پیار میں بُلبل اور غصے میں بُل کہتے تھے۔ وہ ایک مرتبہ اپنے والد کے ہوٹل میں چائے پلانے لے گیا۔ سفید ٹائلوں والی دیوار پر شہنشاہ آریامہر اور شاہ بانو کی تصاویر نمایاں تھیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ تصویریں غائب ہو گئیں؛ پھر بلبلان اور اس کے والد بھی۔

وہ بہائی تھے اور زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ "ایرانی ہوٹل" کراچی کے مخصوص کلچراسکیپ کا حصہ ہوا کرتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی پیسٹری اور چائے میں ایسی کوئی ناقابلِ فراموش بات نہیں تھی کہ ان پر شاہد احمد دہلوی کے سے انداز کا خاکہ لکھا جائے۔

شاہد احمد دہلوی کے چھوٹے بھائی میرے نانا تھے، جنھیں ہم بچے "اباجی" کہا کرتے تھے۔ ان کو

پکانے، کھلانے، دعوتیں کرنے اور طرح طرح کے لوگوں کو اپنے اردگرد جمع رکھنے کا شوق تھا۔ چھٹی کے دن ان کی خواہش ہوتی تھی کہ سب اکٹھا ہوں، مل جل کر بیٹھیں، باتیں ہوں اور اہتمام سے پکی ہوئی چیزیں کھائیں۔ بے تحاشا بڑھتے ہوئے ٹریفک نے روزروز کے دیکھے بھالے راستوں پر مشکل سے گاڑی چلانا ناممکن بنا دیا تب انھوں نے چھوڑا، ورنہ ان کا معمول تھا کہ سارے کنبے کو بھر کر چل پڑے سب کو جمع کرنے کے لیے۔ گاڑی کی ڈگی تک میں لوگوں کو بھر لیتے تھے۔ "چھجن بھائی کے بیٹی داماد!" دوسرے لوگ رشک اور طنز سے کہتے۔ کسی نے تنوری روٹی کی فرمائش کردی تو یونیورسٹی آتے ہوئے انھوں نے گاڑی روکی (ان کے لیے کھانا قطعاً گھریلو عمل تھا اور بازار سے خرید کر سڑک پر کھانے کو بدتمیزی یا "ہبوڑاپن" قرار دیا جاتا تھا) اور نہاری سے بھری ہوئی پتیلی اٹھائے مسکراتے ہوئے واپس آئے۔ "بدرو بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے بیٹے نے تنور کے ساتھ ہوٹل کھول لیا ہے،" انھوں نے میری نانی کو بتایا جن کے چہرے پر خفگی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ "بدرو کے بیٹے کے ہوٹل" سے ضرورت بلاضرورت نہاری روٹی خرید کر لانے لگے تو ہم سب کن انکھیوں سے اشارہ کرکے پوچھتے: "بدرو؟ اس کے بیٹے کا ہوٹل؟" اباجی کا رعب اتنا تھا کہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ پھر انھوں نے خود ہی بتایا۔ "یہ بدرو دلی میں فلاں نہاری والے کے ہاں کام کرتا تھا۔ شدّو بھائی نے اس دکان کی نہاری کا ذکر اپنی کتاب میں بھی کیا ہے۔ کباب بھی لگاتا تھا۔ خوب مصالحہ لگاتا تھا۔ یہاں کراچی میں تو لوگ ہر وقت نہاری کھا لیتے ہیں، اس لیے دکان لگالی۔" اس نہاری روٹی کا ذائقہ مجھے اب بھی دھندلا سا یاد ہے، حالاں کہ وہ دسترخوان مدّت ہوئی سمٹ گیا۔ اباجی نہیں رہے تو پھر شیرازہ بندی بھی نہیں رہی، اور یہ بھی ممکن نہیں رہا کہ سارے لوگ شام کو یوں ہی اکٹھا ہو کر بیٹھیں اور کھانا ساتھ کھائیں۔ چٹخارے دار نہاری والا بدرو بھی غتربود ہو گیا۔ زیادہ دن نہیں ہوئے کہ میں کسی اتفاق سے اُس طرف سے گزرا تھا جہاں اس کے بیٹے نے دکان کھولی ہوئی تھی۔ وہاں اب فاسٹ فوڈ کی بڑی سی دکان کھل گئی ہے جس میں دن کے وقت بھی بجلی کی روشنیاں جلتی رہتی ہیں۔

"سب رشتے دار ہمارے، چھوٹی آنکھوں کے تارے" ـــــ انور چچا کی ایک اور خاندانی، تقریباتی نظم میں ٹیپ کا مصرعہ کچھ اس طرح کا تھا۔ ان ہی میں "میم شین" کا نام بھی لیا جا سکتا ہے جنھوں نے کتنے ہی کاموں میں ہاتھ ڈالا لیکن مٹی مٹی ہی رہی۔ سب ہی کی چھوٹی بڑی رقمیں ان کی طرف نکلتی تھیں اور ایک مرتبہ قرض خواہوں کو کسی عزیز کا مکان "اپنا ہی گھر ہے" سمجھ کر دکھا بھی گئے تھے جنھوں نے بعد میں ان شریف آدمیوں کا گھر سے نکلنا بھی دوبھر کردیا۔ سب کو اندازہ تھا کہ یہ اپنے کسی نہ کسی آڑ پھانس میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن ان کا بھی کمال تھا کہ اب کی بار ایسی ہوا باندھی کہ جن جن کو چونا لگا کر جا چکے تھے، وہی ان کی باتوں میں آ گئے۔ "کوڑیوں کے مول زمین مل رہی ہے،" انھوں نے اطلاع دی اور فوراً ہی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے طریقے باور کرانے لگے۔ سوائے ایک کے، سبھی کے اپنے مکان تھے ـــــ اور ان مکانوں کی اپنی انفرادی، سماجی تاریخ ـــــ کسی کو سر چھپانے کے لیے جگہ کی اشد ضرورت نہیں

Scanned with CamScanner

تھی۔ پھر بھی میم شین نے نقشہ ایسا باندھا کہ سبھی تیار ہو گئے: "ابھی وہ جگہ بسی نہیں ہے۔ میرا ایک جاننے والا ہے۔ سرکاری پارٹی کا آدمی ہے۔ اور ان دنوں ان کی رتی چڑھی ہوئی ہے۔ اتنے پیسے لے گا۔ زمین مل جائے گی۔ بعد میں لکھا پڑھی بھی ہوتی رہے گی۔ کچھ کچا پکا تعمیر کر لو۔ خود نہیں رہنا تو کیا ہوا؟ ہاتھ کے ہاتھ دام کھرے کرا لو۔" ایک مہم جو پارٹی تشکیل دی گئی اور وہ سب اس جگہ کو دیکھ بھی آئے۔ ایک سنسان سی زمین پر کچھ حرکت کے سے آثار تھے۔ کراچی میں سرکاری املاک دو تین واسطوں سے کس طرح فروخت ہوتی ہے، حکومت کے اہل کار ایک چہرے پر دوسرا چہرہ لگا کر کس طرح دلالی کرتے ہیں، "زمین گیری" (land grabbing) کس طرح اقتداری سیاست (power politics) کے زیرسایہ فروغ پاتی ہے ـــــ ان باتوں کا کسی کو پوری طرح اندازہ نہیں تھا۔ کراچی کے بیش تر شہریوں کی طرح ـــــ جو یہ سنتے ہیں لیکن جانتے نہیں کہ ان کا شہر سونے کی چڑیا کیوں ہے اور کس کے لیے ـــــ ایک آدھ دوست، کچھ سسرالی رشتےدار بھی اس میں رقم لگا بیٹھے۔ سب کو اطمینان تھا کہ مشہور سیاسی راہ نما کے نام پر نام رکھا گیا ہے، بستی بن جائے گی، رقم نہیں ڈوبے گی، اور زمین تو کہیں گئی نہیں۔ زمین تو واقعی کہیں نہیں گئی لیکن اس پر قبضہ کرنے والے دوسرے تھے۔ وہ بیچ کا آدمی، وہی جو اپنے آپ کو سرکاری پارٹی کا کارکن بتایا کرتا تھا، وہ پھر ہاتھ نہیں آیا۔ میم شین بھی اپنے پرانے طریقۂ واردات کے مطابق غائب ہو گئے۔

اس واقعے میں انھیں "شک کی بنیاد پر بری" کیا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے انھوں نے الاٹمنٹ حاصل کرنے کی واقعی کوشش کی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں ان کی حیثیت اور اختیار سے زیادہ بڑے لوگ شامل ہوں۔ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

دوبارہ نمودار ہوئے تو میم شین خلیجی ممالک کے لیے ریکروٹمنٹ کا کام کر رہے تھے۔ اور بقول شخصے، یہ دوسری کہانی ہے۔

اسکول کی پڑھائی سے الگ ہٹے ہوئے دو دن مجھے شاید کبھی نہ بھولیں۔ ایوب خاں کی حکومت ڈانواں ڈول تھی اور ذوالفقار علی بھٹو جیل سے چھوٹ کر کراچی آ رہے تھے۔ ان کے استقبال کے لیے کینٹ اسٹیشن جانے والا بپھرا ہوا ہجوم ہمارے اسکول کے آہنی گیٹ تک پہنچ گیا۔ شہر بھر کے تعلیمی ادارے بند کروائے جا رہے تھے۔ سڑکوں پر ایک والہانہ پن کا اظہار ہو رہا تھا، جیسے شہر فیصلے کی گھڑی پر آن پہنچا ہے۔ (انھی دنوں ابو نے غزل کہی تھی: لڑکوں نے کچھ ایسا داؤں کیا / ایوب نے گھٹنے ٹیک دیے) اسکول بند کرنے کے بارے میں فادر پنٹو کسی نتیجے پر ابھی پہنچے بھی نہیں ہوں گے کہ کلاس فائیو اے کا مانیٹر رئیس عالمگیر تیر کی طرح اپنی بینچ پر سے اٹھا اور موگری لے کر اسکول کی ڈیڑھ سو سالہ پرانی گھنٹی کو پیٹنے لگا۔ جب تک جلوس اسکول سے گزر نہیں گیا کوئی لڑکا اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ اور پھر وہ دن جب ۱۹۷۱ میں جنگی ہسٹیریا کے دوران کلاس کے کسی لڑکے کے ہاتھوں میں "کرش انڈیا" کا اسٹیکر دیکھ کر

Scanned with CamScanner

بوڑھی مسز ایملی سالڈانا نے، جو لائبریری کی نگرانی کے ساتھ ساتھ ہمیں انگلش پڑھایا کرتی تھیں، تاسف بھرے لہجے میں سرزنش کی تھی کہ جنگ سبھی کو تباہ کرتی ہے، اور ہم سب جیسے بُرا مان گئے تھے۔ فادر پنٹو اور فادر ریمنڈ کے موقع بے موقع نصیحت بھرے لیکچر، مسٹر او بی نیزر تھ کے قصّے، کیر کٹر بلڈنگ کی خصوصی کلاسیں، کلاسوں کے دوران اردو بولنے پر پابندی، اسکول کے بارے میں احساسِ تفاخر اور دسویں جماعت کی انگریزی کی ناقابل فراموش مسز چندرا گیانی، جو مجھے اور امیر داؤد علی کو الگ سے بلوا کر اعلیٰ درجے کے ناول دیا کرتی تھیں کہ کورس کی کتاب معمولی ہے، تم یہ ضرور پڑھو، اور گرومندر کے آگے عامل کالونی میں ان کے گھر دیوالی کی مبارک باد کے لیے جانا مجھے اب بھی ایک خواب کی طرح یاد ہے... پھر سنا کہ وہ اور ان کی بیٹی پُشپا بمبئی چلی گئی ہیں۔ خدا معلوم اب کہاں ہیں... گرومندر میں ایک مکان خالی کھڑا ہے۔

اسکول سے نکل کر کالج جانا میرے لیے ایک کلچرل شاک بھی تھا جس کی ٹیس اب بھی اٹھتی ہے۔ ڈی جے کالج، پھر ڈاؤ میڈیکل کالج، یہاں میری ملاقات ایک اور قسم کے ہجوم سے ہوئی۔ اپنے ساتھیوں کا ہجوم۔ اسکول میں پرانے برطانوی کولونیل انداز کے "مینرز" اور "گڈ بریڈنگ" پر زور تھا، لیکن کالج میں دھکم پیل تھی اور کہنی مار کر آگے راستا بنانا پڑتا تھا۔ سیڑھیوں پر دھکیلے جانے کا خوف تب سے بیٹھا ہوا ہے میرے اندر۔ ڈی جے کالج میں پڑھائی کے بوجھ کے ساتھ یہ احساس بھی تھا کہ اس نفیس اور شان دار عمارت کو سب استعمال کر رہے ہیں، لیکن اس پر فخر یا اس کے لیے اپنائیت نہیں۔ ہم صرف دو سال کے لیے اس کالج میں آئے ہیں۔ ساڈا چڑیاں دا چنبا، بابل اساں اڑ جانا... ہمیں اصل میں تو میڈیکل کالج میں داخلہ چاہیے، بس وہ مل جائے۔ ایسے ادارے اصل میں زندگی کی درس گاہیں ہوتے ہیں۔ لیکن میرے نصیب میں لمبی اُڈاری نہیں۔

ہاں اہل طلب کون سنے طعنۂ نایافت۔ اس شہر کے کوسموپولیٹن کردار کا ذکر مثبت انداز میں کرتے ہوئے دل ڈرتا ہے کہ اب کوئی طعنہ مارے گا کہ یہ جڑ سے اکھڑے ہوئے لوگوں کا یوٹوپیائی خواب ہے۔ ایسا خواب جس کی آرزومندی میں اس کو پانے کا نہیں، اپنے ہی کو کھو آنے کا احتمال ہے۔ "وہ ایک کثیر اللسانی، کثیر النسلی اور کثیر العقیدہ معاشرے کا خواب دیکھتی ہیں،" ایک اہم شاعرہ کے نثری مجموعے پر دیباچہ لکھتے ہوئے قابلِ احترام ناقد نے انھیں گویا رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے۔ اور اس خواب کو نکن، بقول بھلیاں میں گُم شدگی کا نتیجہ قرار دے کر اس کے ڈانڈے اکھنڈ بھارت کے سپنے سے ملا دیے ہیں۔ اکھنڈ بھارت — میں فوراً ڈر جاتا ہوں۔ کراچی میں پیدا ہونے اور پلنے بڑھنے کے بعد یہ الفاظ مجھے ماں کی گالی معلوم ہوتے ہیں۔ اس گالی سے بچنے کے لیے میں کثیر اللسانیت، کثیر النسلیت اور کثیر العقیدگی پر تین حرف بھیجنے کے لیے تیار ہو جاتا ہوں، یہ یکسر فراموش کرتے ہوئے کہ اس شہر کی جن درس گاہوں نے مجھے تعلیم دینے کی کوشش کی، وہاں یہ خواب ناممکن یا غیر منطقی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ

Scanned with CamScanner

درس گاہیں رواداری کے معبد تھیں ___ ایسا کیسے ہو سکتا تھا؟ وہ اسی معاشرے کا حصہ تھیں ___ لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ اُکتا دینے والی بے رنگ یکسانیت سے مغلوب ہو کر اُون مُنڈھی بھیڑیں دن رات ورد کیے جائیں: "دو ٹانگیں اچھی، چار ٹانگیں بہتر!" بھانت بھانت کے لوگ جمع تھے میرے ساتھ ڈاؤ میڈیکل کالج میں۔ ایک دوسرے سے مختلف ہونے کا احساس بھی تھا اور اسے باقی لاٹ بھی کیا جاتا تھا کہ کلاس پکنک، اسپورٹس ڈے اور دوسری تقریبات میں اس کی مضحک نقل فوری توجہ حاصل کرنے کا آسان ذریعہ تھی۔

مختلف ہونے اور اس بنیاد پر تقسیم ہونے کا احساس بھی تھا ہمیں۔ یہ احساس اسی وقت سے ہو جاتا جب فرسٹ ایئر کی کلاسیں شروع ہونے کے بعد گروپ بنتے اور ڈیڈ باڈیز الاٹ ہو جاتیں۔ طویل اور ایرکنڈیشنڈ ڈائی سیکشن ہال میں ایک ترتیب سے رکھی ہوئی پتھر کی سفید میزوں پر وہ مُردے قطار میں نظر آتے ___ سخت اور سیاہ پڑے ہوئے، انفرادیت سے عاری، محض گوشت پوست کے مجموعے؛ کیمیائی محلول میں نہائے ہوئے، جس کی تیز بُو ہال کا دروازہ کھولتے ہی حواس پر حملہ آور ہو جاتی۔ کوئی ایک مردہ ہمارا ہے۔ گروپ رول نمبر کے حساب سے بنائے گئے تھے اور چار چار پانچ پانچ لڑکوں کو جسم کا ایک حصہ الاٹ کر دیا جاتا: ٹانگیں ان کی، ہاتھ تمہارے۔ ان مردہ جسموں کی دیکھ بھال کے لیے ہال میں ایک بدروح کی طرح وہاں کا اٹینڈنٹ شہاب الدین گھومتا رہتا، جسے "ڈاؤآئٹس" (Dowites) کی نہ جانے کتنی کلاسوں نے "شابو" بنا دیا تھا۔ ڈاؤ کے فوک لور کے اس اہم کردار کے حوالے سے نہ جانے کتنی داستانیں مشہور تھیں ___ وہ لاشیں بیچ دیتا ہے، ان کی بے حرمتی کرتا ہے؛ نہیں نہیں، اس نے تو وصیت کر رکھی ہے کہ مرنے کے بعد اس کی لاش بھی یہاں رکھ دی جائے۔ اور اسی ڈائی سکشن کے دوران بننے والی "couple list" کہ کس کا جوڑا کس کے ساتھ صحیح بیٹھ رہا ہے اور دھیرے دھیرے بڑھنے والی پینگیں جو یہاں کی سالہاسال پرانی روایات تھیں۔ میرا رول نمبر پہلا تھا۔ مجھے اپر لمب (upper limb) الاٹ کیا گیا تھا۔ ہاتھ کی تقطیع مکمل کرنے کے بعد مجھے اور میرے ڈائی سکشن پارٹنر (اب ڈاکٹر) حسنات شریف کو دوسرے حصوں کا ڈائی سکشن کرنا تھا۔ جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ مردہ جسموں کے ان علیحدہ علیحدہ حصّوں نے ہمارے طبقے متعین کر دیے ہیں۔

"تم اپر لمب والے ہو یا لوَر لمب والے؟" پہلی بار جن لڑکوں سے ملاقات ہوتی تھی ان سے یہی سوال پوچھا جاتا تھا۔ اور یہ سوال انتہائی مناسب بھی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن پھر یہ طبقے کچھ مستقل سے ہو گئے۔ "اپر لمب والے ان دنوں تھوریکس (Thorax) کر رہے ہیں،" یہ اس کا اگلا اسٹیج تھا۔

بہت برسوں بعد مجھے اس کی یاد آئی۔ ہم سب اپنے اپنے راستوں پر لگ چکے تھے۔ کیا ڈائی سکشن ہال اور کیا شابو، خود ڈاؤ میڈیکل کالج بھی ایک دھندلی یاد بننے لگا ہے۔ ہمارے اس وقت کے فائنل ایئر کے "سی آر" (Class Representative) اسلم المعروف بہ "گولی" نے کلاس ری یونین کا اہتمام کیا۔ میز پر سے کھانا لینے کے بعد، پلیٹ ہاتھ میں لیے ہوئے، میں اپنے برابر کھڑے دو چار لڑکوں سے یہ کہہ رہا تھا کہ ہماری کئی سو کی کلاس کے زیادہ تر ساتھی اب امریکا یا انگلستان میں پریکٹس کر رہے ہیں، یہاں

مٹھی بھر نفوس باقی بچے ہیں، کہ اتنے میں میرے پیچھے سے ناصر نے، جو اُن دنوں الی نوئے میں ریزیڈینسی سے چھٹی پر آیا ہوا تھا، زور سے ہانک لگائی: "یہ تم اپر لمب والے کیا مسکوٹ کر رہے ہو؟"

اب تو اُن دنوں کا سادہ بیان بھی افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ قابلِ احترام نقاد نے مجھے پھر سے ڈائی سکشن ہال پہنچا دیا۔ ان دنوں ہم ڈائی سکشن کر رہے تھے لیکن کٹے پھٹے اعضا، مسخ شدہ لاشیں دیکھنے کے عادی نہیں ہوئے تھے ـــــ ایسی لاشیں جن کی اہم ترین بات ان کی لسانی شناخت ہو۔ ان دنوں ہم بٹے ہوئے تو تھے لیکن کٹے نہیں تھے۔ وہ دن بھی گزر گئے۔

گزرے ہوئے دنوں کو لوگ یاد کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ فلم کی ریل سی چل پڑتی ہے ـــــ لیکن اگر ایسا ہو کہ جن سنیماؤں میں وہ فلم دیکھی گئی، ایک ایک کر کے منہدم کیے جانے لگیں؟ ان کو بیتے ہوئے اتنا زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا مگر اُن دنوں کی علامتیں اس تیزی سے غائب ہوتی جارہی ہیں جیسے کبھی ان کا نام و نشان بھی نہیں رہا ہو گا۔ اور آخر میں وہی "سر ریگ رواں شہر بابل"۔ جہاں سے میں نے کتابیں خریدیں وہ بک اسٹال دکان اپنی بڑھا گئے اور جہاں فلمیں دیکھیں وہ سینما ہال توسیع شہر کی زد میں آگئے کہ ان کی جگہ شاپنگ مال بنا دیے جائیں۔ وہ دن دور نہیں جب میں پوری طرح اپنے ابا کی طرح ہو جاؤں گا جو پرانے فلمی گانے (بلکہ مارکیٹ کی اصطلاح میں "کینسل" گانے) سن کر ساز بجنے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتے ہیں: "یہ گانا؟ ہاں، یہ فلم سن ٦ ٤ میں لکھنؤ میں دیکھا تھا، الفنسٹن سینما میں..." فلم دیکھنے جانا ایک ایسی تقریب تھی جس کا اندازہ "وڈیو جنریشن" کے لوگ نہیں کر سکتے۔ بچپن میں والٹ ڈزنی پروڈکشنز کی فلمیں اور سرکس کی فلمیں، سارے کزنز کو ایک ساتھ اور اسی پابندی کے ساتھ دکھائی جاتی تھیں جس طرح سال کے سال چیچک کے ٹیکے لگا کرتے تھے۔ اردو فلموں کے دیکھنے پر پابندی تھی۔ گھر والوں کے بغیر پہلی فلم میں نے میڈیکل کالج میں آنے کے بعد دیکھی۔ اداکارہ شبنم کے ابتدائی دور کی فلم تھی "تلاش"، جس کا re-run ہو رہا تھا (اُن دنوں ایسی باتیں اخباروں کے مطابق "پبلک کے بے حد اصرار پر" ہوا کرتی تھیں) اور سرور کے کہنے پر اس کا ساتھ دینے کی خاطر جانا پڑا۔ اس قسم کی کئی فلمیں سرور نے مجھے دکھوائیں۔ فلم سے زیادہ مجھے اس کے دوران چلنے والا سرور کا رواں تبصرہ یاد ہے۔ "دیکھو یہ ڈھاکا ہے،" اس نے اسکرین پر نظر آنے والی عمارتوں کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے اور آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔

اکتا دینے والی بے مصرف کلاسوں سے "ٹلا مار کر" سینما ہال میں رنگ برنگی تصویری تتلیاں پکڑنے کا عمل میلون (Melvyn) نے سکھایا۔ اس کے ساتھ پیلیس میں "ڈاکٹر ژواگو" دیکھی، ریکس میں "اے لائن ان ونٹر" دیکھی، ریو میں "اے مین فار آل سیزنز" دیکھی ـــــ اب ان میں سے کوئی سینما ہال باقی نہیں۔ ابھی پچھلے سال ہی تو وڈیو فلمیں دیکھ دیکھ کر گھبرا جانے کے بعد، پرانے وقتوں کی یاد تازہ کرنے کے لیے، انعام اور افتخار کے ساتھ ناز سینما میں کوئی فضول سی فلم دیکھی تھی ـــــ "ڈاکٹر صاحب،

جلدی چلیے، فلم شروع ہونے والی ہے!" کسی نے ہم سے کہا تھا اور ہم جھینپ گئے تھے کہ لو بھئی، پہچانے گئے — اب وہ سینما ڈھایا جا رہا ہے اور تھوڑے دنوں میں لوگوں کو یہ بھی یاد نہیں رہے گا کہ "ناز و نشاط" والے بس اسٹاپ کا آخر یہ نام کیوں ہے۔ اب اگر افتخار یا میلون میں سے کوئی کراچی آیا تو کسی سنیما ہال کے سابقہ مقام پر یا افسانوی ساخت کے برسٹل ہوٹل کی مدّت سے بند پڑی ہوئی ڈھنڈار عمارت کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر کارلوس ڈرمنڈ ڈی آنڈراڈے کی نظم To a Hotel Scheduled for Demolition کے یہ مصرعے پڑھوں گا:

You were Time itself and presided
Over the fevered recognition of fingers
Love without any real place in the city
Over collusion of swindlers, over the expectancy
Of employment, over stagnation of governments
Over the life of the nation in terms of the individual
And over mass movements that came spilling their ways
Into the monastic arcade that houses your streetcars

کوئی آ بھی گیا تو یہ نظم کتنی بار اور کس کس جگہ پڑھیں گے ہم؟

In the heart of Rio de Janeiro
Absence
In the wail of evening papers
Absence
Worm consuming apple
Worm consuming worm
Worm worms worm

یہاں سے یہ غائب۔ وہاں سے وہ غائب — شہر کے نقشے میں خالی جگہیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ایسی ہی ایک خالی جگہ کا نام میلون ہے۔ گیارھویں جماعت سے لے کر میڈیکل کالج، ہاؤس جاب اور ایک ہی شعبے میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے کیریئر کا آغاز، پھر ساتھ ساتھ ملازمت — ہماری "متوازی زندگیاں" (parallel lives) رہی ہیں اور طویل رفاقت، جس میں اُس وقت ایک خلیج بن گئی جب اس نے امیگریشن حاصل کر لیا۔ پچھلے کرسمس پر ہر سال کی طرح دوپہر کے کھانے کے دوران جب میز پر اس کی ممی کے پکائے ہوئے لذیذ گوانی کھانے سجے ہوئے تھے، انھوں نے کہا کہ یہ مکان چھوڑنا ہی نہ پڑ جائے۔ زمین بیچنے کی مجبوری تو نہیں ہے اور اب تک وہ دلالوں کا دباؤ، اسٹیٹ ایجنٹس کے آفرز برداشت کرتے آئے ہیں، لیکن کراچی کے مخصوص پرانے انداز میں بنے ہوئے "ویریڈین کاٹیج" کے دونوں طرف فلیٹ

بن گئے ہیں جن کی وجہ سے جینا دوبھر ہو گیا ہے۔ تیر تھ داس اسٹریٹ میں تھوڑے دنوں کے بعد کوئی مکان نہیں رہے گا اور وہ کنکریٹ جنگل کا حصّہ بن جائے گی۔ "میں کراچی میں پیدا ہوئی تھی۔ نوجوان لوگ تو امریکا جا رہے ہیں، اس لیے کہ وہ جا سکتے ہیں۔ میں کہاں جاؤں؟ اب گھر سے باہر نکلتی ہوں تو لگتا ہے آس پڑوس کے لوگ میرے کپڑوں اور بول چال کا مذاق اڑا رہے ہیں۔" میں نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب بھی کیا دیتا؟ پرانے پیانو کو دیکھنے گیا جس پر میلون پریکٹس کرتا تھا۔ "اس بار تمھارے کوئر گروپ نے کرسمس کونسرٹ کہاں پر کیا؟" میں نے بات بدلنے کے لیے پوچھا۔

میلون کچھ کہتے کہتے میری طرف دیکھ کر چپ ہو گیا۔ آنٹی افی جینیا نے جواب دیا کہ کونسرٹ کا اشتہار نہیں دیا نہ زیادہ لوگوں کو بلایا۔ "اس بار فلاں پیرش میں کرسمس کی دعائے نیم شب (Midnight Mass) نہیں ہوئی کیوں کہ ایک مذہبی تنظیم نے دھمکی دی تھی کہ اگر گرجا میں روشنی ہوئی تو تمھاری عورتوں کو اٹھا کر لے جائیں گے۔

کچھ کہتے کہتے چپ ہو جانے کی اب میری باری تھی۔ بات بےڈھب ہو گئی ہے، دونوں کو احساس تھا۔ اس وقت وہ اور ہم اقلیت اور اکثریت بن کر الگ ہو گئے تھے۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ میرا بھی آخری کرسمس ہے۔ انکل اسکروج (Uncle Scrooge) ڈکنز کے صفحات سے نکل کر میرے شہر پر حاوی ہو گئے ہیں اور بیمار و منمنی سی یہ آواز بہت جلد خاموش ہو جائے گی:

"It's Christmas time. God bless us all!"

سوچ رہا ہوں اب سے ۲۵ دسمبر کو Merry Quaid-e-Azam کہا کروں گا۔ آخر کو نام میں کیا رکھا ہے۔

"الفت کلفت رکھے گا..." ابو کو بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا خیال آتا کہ وہ ٹیلی فون اٹھا کر نمبر ملاتے اور دوسری طرف کسی مخصوص آواز کا اطمینان کر لینے کے بعد یہ الفاظ ادا کرتے۔

ان الفاظ اور ان میں پنہاں پُراسرار اشارے سے ایک گفتگو شروع ہو جاتی جو دوسرے لوگوں کے لیے معنویت نہیں رکھتی تھی۔ بہت بعد میں پتا چلا کہ اس کی مخاطب بڑی پھپھو ہیں۔ "الفت کلفت رکھے گا.." ان الفاظ کی طرح ان کا جواب بھی طے تھا، اور مکالمے کا اگلا حصّہ بھی۔

"کلفت عیوض رکھے گا..." ادھر سے جواب ملتا۔

"عیوض نبی رکھے گا..." وہ کہتے۔

"نبی پھر الفت رکھے گا..." جواب پھر گھوم جاتا۔

یہ سلسلہ اس طرح بہت دیر تک اور دور تک چل سکتا تھا۔

وہ اسپتال میں تھیں، تب بھی اپنی خیریت کے جواب میں ابو کو یہی کہلوایا تھا: "ہم ٹھیک ہو رہے ہیں۔ الفت کلفت رکھے گا..." اس وقت تک میں اس راز سے واقف ہو چکا تھا۔ برسوں پہلے فتح گڑھ

Scanned with CamScanner

میں جو گوالا دودھ گھر لے کر آتا تھا اس کا نام الفت رسول خاں تھا۔ اس نے ایک دن اطلاع دی کہ اس کے گھر لڑکا ہوا ہے۔ یہ سن کر اوپر تلے کے ان بہن بھائیوں نے ایک کھیل سا بنا لیا کہ وہ بچے کا نام کیا رکھے گا، اور بچے کے بچے کا...

دوسروں کا نام تجویز کرنے والی میری پھپھو کا اپنا نام سمٹ کر صرف "ن خاتون" ہو گیا جب وہ ریڈیو پاکستان سے خواتین کے پروگرام کرنے لگیں۔ کسی پرانے معبد کی طرح لگتی تھی براڈکاسٹنگ ہاؤس کی وہ گنبد والی عمارت جس سے گزرتے ہوئے شعر و نغمہ سے مملو آوازوں کی لرزش کا احساس اب بھی ہوتا ہے۔ شاید آواز کی بھی پرچھائیں ہوتی ہے۔ اور میں نے ان آوازوں کو دیکھا بھی ہے۔

ریڈیو پاکستان، پاکستان چوک... اور پھر سبزی منڈی کا قبرستان ـــــ میری پھپھو کا پتا بدل گیا۔

اس شہر میں اپنے خاندان کے ٹھکانے بتاتے ہوئے یہ پتا کیسے رہ گیا ـــــ اس کا حوالہ تو بڑھتا جا رہا ہے۔ شاید یہی ٹھکانا حاصل کیا ہے ان سب لوگوں نے کراچی میں۔

سکون کی تلاش میں بعض دفعہ وہاں جاتا ہوں اور آڑھی ترچھی، ایک کے اوپر چڑھی قبروں کے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں۔ کتنے بہت سے نام پتے درج ہیں ان کتبوں میں۔ میرے لوگ پڑوسیوں، محلّے والوں سے تعلقات نبھانے کو بہت اہم سمجھتے تھے؛ اب کیا سوچتے ہوں گے؟ لیکن ان کتبوں کو کون پڑھے۔ میرے ذہن میں تو ایک ہی سوال رہ رہ کے گونجتا ہے، وہ کس سے پوچھوں: اب الفت کیا رکھے گا؟

میرے لوگوں میں سے کئی ایک تعلیم کے شعبے سے وابستہ رہے ہیں اور داخلے، کلاسیں، امتحانات کا سالانہ چکر جیسے ہمارے گھروں کے معمول کا حصہ رہا ہے اور آپس کی باتوں کا بھی۔ "ارے فلاں صاحب لڑکوں کو پڑھا رہے تھے کہ گرگِ باراں دیدہ کا مطلب بارہ آنکھوں والا بھیڑیا ہوتا ہے۔" ـــــ "اس سال جو صاحب کاپیاں جانچ رہے ہیں وہی ہیں جنھوں نے پہلے دن کلاس میں داخل ہو کر پوچھا تھا: یہاں بیٹھنے کا برتن نہیں ہے؟" ـــــ "سنیے صاحب، اس مرتبہ طالب علموں نے کاپیوں میں کیسے کیسے کوڑھ جواب لکھے ہیں۔" ـــــ "وہ چودھری اظہار والا فارمولا ٹھیک ہے کہ ہر ممتحن کو ایک جیپ اور بھیگا ہوا بید دیا جائے۔ کاپی جانچتے ہوئے اٹھے، جیپ دوڑاتا ہوا جائے اور طالب علم کے پتے پر پہنچ کر سڑاسڑ بید مارے کہ ارے کم بخت، یہ پڑھا لکھا ہے تم نے؟"

اب یہ گفتگو بدل گئی ہے۔ طالب علموں کے مہمل، مزاحیہ (در حقیقت الم ناک) جوابات کے بجائے یہ بات ہونے لگی کہ امتحانوں میں "پھرّے" اور "کارتوس" آ گئے، طالب علموں میں نقل کا رجحان بڑھ گیا۔ پھر یہ دھن بھی بدل گئی۔ چاقو، پستول، رائفل، تنظیمی عہدے داروں کی دھونس ـــــ امتحانوں کا ذکر ان حوالوں سے ہونے لگا۔ جس دن انھوں نے لڑکوں کو نقل کرنے سے روکنے کی کوشش کی تھی، ان کی گاڑی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا؛ کرچیاں دور تک بکھری ہوئی تھیں اور کوئی مدد کرنے، روکنے نہیں آیا۔ شہر کا محاورہ بدل گیا ہے۔

گلابی رنگ کے weeping plaster میں قلعہ بند نظر آنے والا مرکز اعلیٰ کارکردگی ـــ آغا خان یونیورسٹی- میں نے یہاں بھی پڑاؤ ڈالا تھا- ڈاؤ میڈیکل کالج سے نکل کر "عملی" زندگی کے آغاز پر میں ایک اور اعلیٰ تر درس گاہ سے وابستہ ہو گیا، لیکن زندگی کی اس درس گاہ سے جو سبق سیکھے ان کا رنگ ڈھنگ اور تھا- زندگی کا جو رخ یہاں انتہائی قریب سے دیکھنے کو ملا، ہمارے ایسے متوسط طبقے کے لوگ اس سے دامن بچا کر ہی گزر جاتے ہیں ـــ وہ ہے کچی آبادیوں کی زندگی-

سول اسپتال میں نفسیاتی امراض کے شعبے میں کام کرنے کے دوران (میری ایک اور مدّت) عادی نشے بازوں کی دیکھ بھال اور علاج بھی میرے ذمے تھا- مجھے لیاری کا وہ نوجوان یاد ہے جو نشے کے "توڑ" کی حالت میں اپنا خون بیچنے کے لیے چیخ رہا تھا- لیاری کی گلیوں میں عادی نشے بازوں کا سروے کرنے کے لیے ہم "اسنوبال میتھڈ" استعمال کر رہے تھے، یعنی ایک نشے باز سے دوسرے کا پتا پوچھنا، پھر اس سے کسی دوسرے کا، یہاں تک کہ مطلوبہ تعداد پوری ہو جائے- اس تلاش کے دوران یہ دھندلا سا خیال تھا کہ گولیاں دے کر علامات مرض ختم کر دینا کوئی حل نہیں ہے؛ مسئلے کو جڑ سے پکڑنا چاہیے، کچھ اور کرنا چاہیے- اس کچھ اور کی تلاش نے آغا خان یونیورسٹی کے ابھرتے ہوئے شعبۂ علومِ صحت عامّہ میں پہنچا دیا، جہاں ڈاکٹر جان برائنٹ نے بتایا کہ اس قسم کے کام کمیونٹی کی سطح پر سود مند ہوتے ہیں اور شہری علاقوں میں صحت کی کیفیات مختلف حکمت عملی کا مطالبہ کرتی ہیں-

گلابی قلعے کے اندر کام چلاؤ قسم کی چھوٹی سی جگہ ہے جسے "بلیک آفس" کا نام دیا گیا ہے- سوا آٹھ، ساڑھے آٹھ بجے صبح یہاں گہما گہمی شروع ہو جاتی- میڈیکل اسٹوڈنٹ اور ڈاکٹر نکلنے کی تیاری کر رہے ہیں، کتابیں اور کاغذ اکٹھا کیے جا رہے ہیں، بچوں کے گروتھ چارٹ اور حفاظتی ٹیکوں کے فلاسک سنبھالے جا رہے ہیں، نرسیں گھڑی دیکھ رہی ہیں، کسی نہ کسی کو آخری لمحے پر انتہائی ضروری کام یاد آ رہا ہے، گاڑیاں تیار کھڑی ہیں، "فیلڈ سائٹ" جانا ہے ـــ اورنگی، گریکس ویلیج، چنیسر گوٹھ، عیسیٰ نگری، اعظم بستی، بابا جزیرہ ـــ کراچی کی چھ پسماندہ بستیاں جہاں آغا خان یونیورسٹی نے ان علاقوں کے باشندوں کے تعاون سے "پرائمری ہیلتھ کیئر" کے "پروٹوٹائپ" ماڈل تیار کیے ہیں- ہر علاقے کی منتخب خواتین کو اپنی مدد آپ کے تحت بنیادی صحت کی ضروریات لوگوں تک پہنچانے کی عملی تربیت دی گئی ہے- ہر علاقے میں ایک چھوٹے سے سنٹر میں محلّے کا نقشہ لگا ہوا ہے جس پر سرخ، سبز، زرد پنوں سے "at risk" گھرانوں کی نشان دہی کی گئی ہے کہ یہ نیم خواندہ خواتین انھیں شناخت کر سکیں-

ان گلیوں کی خاک چھاننا، ورکرز کے ساتھ "ہوم وزٹ"، لوگوں کے ساتھ "لین میٹنگ"، بستی کے سربرآوردہ افراد سے ملاقاتیں اور ان سے sustainability اور empowerment کے تصورات پر مغزماری کرنا، ہیلتھ ورکرز کو چن چن کر پروگرام میں شامل کرنا، پھر ان کی ٹریننگ اور روزمرہ کام کی جانچ پڑتال، ان کے کام کے نتیجے میں ان علاقوں میں بہتری کا ایک رجحان، ان رجحانات کی پیمائش کے لیے

Scanned with CamScanner

انفارمیشن سسٹم اور اس کے مینجمنٹ ٹولز۔ پھر ان ورکرز کا لیبر یونین بنانا اور ہڑتال کرنا، طالب علموں اور ڈاکٹروں کی پوری ایک جماعت کا صحت کی حالت کو بہتر کرنے کے لیے ڈویلپمنٹ اور مینجمنٹ کے مسائل سے الجھنا... ذہنی افق بھی بدلے اور میرا ذہنی نقشہ بھی اس دوران بدلا۔ ان کمیونٹیز کی زندگی کو قریب سے دیکھا تو تفصیل سے جانا کہ کراچی جیسے شہر میں ساری دنیا کے اپنے سامنے سمٹ کر ایک عالم گیر بستی بن جانے (globalisation) کے جس تجربے سے ہم گزر رہے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اسی شہر کی آبادی کا ایک حصہ معاشرے کے عمل سے marginalisation کا شکار ہے۔ کسی سیارے کی طرح، روشنیوں کے اس شہر کا دوسرا رخ بھی ہے جو تاریک ہے۔

کچی گلیاں، تنگ مکان، بہتی نالیاں، کوڑے کے ڈھیر پر کھیلتے ہوئے بچے ___ باہر سے دیکھنے والوں کو ان بستیوں میں یہی نظر آتا ہے۔ لیکن اندر قدم دھرا تو جیسے شہد کی مکھیوں کا چھتا اپنی چہل پہل اور سرگرمی سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں کے مختلف codes اور body language کا ایک دفعہ اندازہ ہو جائے تو پھر یہ اپنے اندر کتنے عالم سمیٹے ہوئے ہیں... چنیسر گوٹھ کے کوہستانی محلّے میں ڈاکٹر اشرف لاسی کے ساتھ ہیلتھ ایجوکیشن سیشن، پھر ہیلتھ ورکرز کا چناؤ: بھابی اماں اور ڈورو تھی خالہ، جو غربت اور بیماری کے ان مٹ چکّر کو ختم کرنے کے لیے گھروں کے اندر رویّے تبدیل کرنے کی کوشش میں جُٹ جاتی ہیں۔ کشتی میں بیٹھ کر بابا جزیرے جانا جہاں نوجوانوں کی پوری پلٹن کام کے لیے تیار ہے لیکن لڑکے لڑکیوں کا ساتھ کام کرنا ان کے لیے نئی بات ہے۔ پھر اس کام کو جڑ پکڑتے ہوئے دیکھنا... سمندر کے راستے میں پرانی بستی گریکس جس کے ساتھ ساتھ سمندر سے نمک بنانے کی جگہیں بے کار پڑی ہیں۔ ایک ہی بستی میں چند قدم کے فاصلے پر کتنے الگ الگ گروہ ہیں: لکڑی کے مکانوں میں رہنے والے ذکری بلوچ، پکّے مکانوں میں پنجابی کرسچین اور مدنی محلّے کے پٹھان، پھر میشوری محلّے کے ہندو جن کی عورتوں نے یہاں پیدا ہونے کے بعد سڑک پار کر کے اس بستی کا باقی حصہ نہیں دیکھا تھا جس کو یہاں کے رہنے والے "منی پاکستان" کہتے ہیں۔ اعتماد قائم کرنے کے لیے اسی محلّے کی پرانی دائی کھیت بائی کو ہیلتھ ورکر رکھنا اور چند دن بعد اس کا دوپہر میں سامان سمیٹ لینا کہ "تم کراچی والے ایسا نہیں کرتے ہو گے، مجھے تو ساری زندگی کی دوپہر میں سونے کی عادت ہے۔" اس پر ڈاکٹر فرید مدحت اور میں سر پکڑے بیٹھے ہیں کہ اس مینیجمنٹ پرابلم کا حل کیا ہے! اور پرابلم بھی ایسی ویسی! ہیلتھ ورکرز کی اسٹرائیک، اور کمیونٹی کی توقعات... ڈاکٹر کمال اسلام کے بنگلادیش واپس چلے جانے کے بعد یہ پروگرام مجھے سنبھالنا پڑا تو ترقیاتی کاموں کے عملی مسائل کا طوفانی پانی گلے گلے آ گیا۔ یہ سارا سسٹم بہت جلد تاش کے پتّوں کے گھر کی طرح بکھر جائے گا، اُس وقت کسے یہ اندازہ تھا! شہر کی ہواؤں کا رخ بدل رہا تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی ہوا کی تحریر نہیں پڑھ سکتا۔

"آج اورنگی کی ٹیم فیلڈ سائٹ نہیں جائے گی،" گڑبڑ کی کوئی نہ کوئی اطلاع آنے لگی تھی اور اسٹاف بھیجنے نہ بھیجنے کا فیصلہ میرے سر آن پڑتا۔ یہ وہاں کے معمول کا حصہ بن گیا تھا۔ لیکن اُس دن تو

Scanned with CamScanner

جیسے موجِ خوں سر سے گزر گئی جب ہمیں خبر ملی کہ ہمارے سنٹر سے تھوڑی دور علی گڑھ کالونی میں نامعلوم افراد نے راتوں رات گھس کر گھر لُوٹ لیے ہیں، آبادی پر حملہ کیا ہے، کتنوں کو مار ڈالا ہے۔ یہ محض خبر تھی، تفصیل معلوم نہیں کہ اورنگی سارے شہر سے کٹا ہوا تھا۔ پھر ہماری ایک ورکر نے جانے کس جتن سے ٹیلی فون کروایا کہ ہم تو جیسے کنوئیں میں بند بیٹھے ہیں، سبزی ترکاری آئی ہے نہ بجلی پانی ہے، بچے دودھ کے بغیر تڑپ رہے ہیں۔ حکام بالا سے خصوصی اجازت حاصل کی گئی اور سائرن بجاتی ایمبولینس میں دوائیں اور کھانے پینے کی چیزیں لے کر ہم روانہ ہوئے ــــ ڈاکٹر برانٹ، ڈاکٹر فوزیہ، ڈاکٹر فریال، ڈاکٹر فرید، کوثر اور ہم سم ہیں۔ بنارس چوک سے ذرا آگے فوجی راستا روکے کھڑے تھے۔ ان کو اپنی شناخت اور اپنی آمد کا مقصد سمجھانے میں بہت وقت لگا، اور اتنی دیر میں لوگ جمع ہو گئے۔ "ہمیں موقع مل جائے تو ہم ان کو مزہ چکھا دیں،" ان کے افسرِ اعلیٰ نے کہا، اور اشارہ ان لوگوں کی طرف کیا جو رو رو کر اپنا حال بتا رہے تھے۔ جلا ہوا گھر، لٹا ہوا سامان... زاروقطار روتی ہوئی ایک برقع پوش عورت ہمیں اندر لے جا کر دکھانے پر مصر تھی۔ تباہ شدہ گھر کی کھڑکی میں سلاخوں پر ایک دھجی سی چپکی ہوئی تھی۔ "میرے بیٹے کو مارنے کے لیے گھسیٹ کر لے جا رہے تھے تو اس نے یہ سلاخ پکڑ لی تھی،" وہ عورت بتا رہی تھی۔ "کاٹ کر الگ کر دیں۔ یہ اس کی انگلیاں ہیں۔"

اس دن کا سبھی کو بے چینی سے انتظار تھا۔ خوب رونق رہے گی فرناز کی شادی پر۔ ارمان نکالنے کا پھر کون سا موقع ملے گا کہ سگے بہن بھائیوں کی اولاد میں سمجھ لیں کہ بس اب یہی لڑکی ہے جس کی شادی ہونی ہے۔ پھر اکرم چچا کب سے اہتمام میں بھی لگے ہوئے ہیں۔ مہندی پر رت جگا ہوگا، رات بھر بھجڑ رہے گی، یہ طے کیا گیا تھا۔ وسیم نے دوستوں سے کہہ دیا ہے، گانے کی پارٹی جمے گی۔ دن بھر تو وسیم ایک معزز افسر بنے رہتے ہیں؛ اس محفل کے لیے خاص تیاری کر رہے ہیں کہ سوانگ بھریں گے، مادھوری دیکشت کی نقل اتاریں گے اور عین بین اُسی کے انداز میں "چنے کے کھیت میں" دکھائیں گے۔ ڈر تھا تو بس یہی کہ تقریبات میں ہڑتال، ہنگامے کی وجہ سے رنگ میں بھنگ نہ پڑ جائے۔ لیکن اس وقت تک سارے کام بخیروخوبی ہو رہے تھے۔ محفل بھی رات بھر جمی۔ میں تو گھر چلا آیا کہ اگلی صبح مجھے اسلام آباد روانہ ہونا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی طارق بتاتا ہے کہ فجر کی اذان سن کر گانا بجانا بند کیا ہے اور اسپیکرز کے تار نکالے ہیں۔ وہ گھر آنے کے لیے اٹھا اور گیٹ تک پہنچا ہی ہوگا کہ تڑاتڑ فائرنگ کی آواز سے ساری گلی لرز اٹھی۔ وہ اُلٹے پیروں لوٹ آیا۔ صبح کا شانت سناٹا گولیوں کی باڑھ سے گونج اٹھا۔ بے حد نزدیک سے آرہی تھی آواز۔ ایسا لگتا تھا کہ ابھی سامنے سے سنسناتی ہوئی گولیاں گزرنے لگیں گی، کراس فائر ہوگا، میدان جنگ یہیں بن جائے گا۔ اس آواز نے پسپا کر دیا سب کو اور نوبت یہاں تک آگئی کہ ایک کمرے میں بند ہو کر قفل لگا لیے۔ چھوٹے بچوں کو پلنگوں، صوفوں کے نیچے لٹا دیا گیا۔ گھبراہٹ کے مارے ایک خاتون کی چیخیں نکل گئیں۔ جو لوگ اوپر کی منزل پر تھے، وہ نیچے نہیں آسکے۔ انھوں نے

دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ موبائل ٹیم کی گاڑی فائرنگ کرتی ہوئی گزری۔ اس کے بعد ایک سفید گاڑی آئی، جیسی ایمبولینس ہوا کرتی ہے۔ اس میں سے دو لڑکوں کو نکالا گیا ـــــ آنکھوں پر پٹی، ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے۔ ان کو دیوار کی طرف منھ کر کے کھڑا کر دیا گیا اور پھر گولیوں کی وہ بوچھار کہ خون کے فواروں کے ساتھ اعضا کے بھی چیتھڑے اڑ گئے۔ لاشوں کو یوں ہی چھوڑ کر سفید گاڑی چلی گئی۔ اس کے بعد موبائل ٹیم کی گاڑی پھر واپس آئی اور دیر تک فائرنگ کرتی رہی۔ تفصیلات تو میں نے بعد میں سنی ہیں؛ ٹی وی کے خبرنامے پر سنا کہ اس محلے کا نام لیا گیا ہے اور یہ کہ پولیس مقابلے میں دو دہشت گرد مارے گئے۔

اخباروں میں بھی کوئی خاص تفصیل نہیں آئی لیکن مہندی کی تقریب کے اختتام کے اس رنگ کو گھر والے شاید بھلا نہیں پائیں گے۔

میں نے دفتر سے واپس آ کر بچوں کے کمرے میں جھانکا۔ وہ شیلف بالکل خالی پڑا تھا جس پر چار سالہ انوشا اپنی گڑیاں اور اسٹفڈ کھلونے رکھتی ہے۔ میں چونکا اور ذہن میں پہلا جو خیال آیا وہ چوری ڈکیتی کا تھا۔ سامان صدقے گیا، میرے بچے خیریت سے رہیں! میں نے گھبرا کر زور سے آواز دی۔ انوشا ہنستی ہوئی آئی۔ "میں نے گڑیاں چھپا دی ہیں۔ اس لیے کہ ان کو گولی نہ لگ جائے،" اس نے مجھے بتایا۔ ساری گڑیاں اور اسٹفڈ کھلونے پلنگ کے نیچے ٹھنسے ہوئے تھے۔

ان صاحب سے میرا ملنا جلنا دفتری کام کے حوالے سے تھا، اس لیے صبح سات بجے انھیں دروازے پر دستک دیتے ہوئے دیکھ کر تعجب ہونا فطری تھا، اور وہ بھی ورکنگ ڈے پر۔ لیکن وہ اپنی آمد کا مقصد بھی نہیں بتا رہے۔ کچھ گم سم سے، روٹھے سے بیٹھے ہیں۔ پھر آہستہ سے بولے: "چھوٹا بھائی دو دن سے بند ہے۔ وہی جو میرے ساتھ کام کرتا تھا۔ آپ نے بھی کئی بار دیکھا ہوگا۔"

"ارے کیا ہوا؟" میں چونک گیا۔

"محلے کے لڑکوں کو لے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ وہ بھی..." ان کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔ اور پھر وہی مانوس تفصیلات ـــــ گھر والوں کی پریشانی، ماں کی بے خوابی، مختلف دروازے کھٹکھٹانا، تعلقات کے ذریعے کوشش ـــــ بے سود۔ "پتا تو چل گیا ہے کہ کہاں ہے۔ لیکن..."

"لیکن کیا... وہ آخر کیا چاہتے ہیں؟" مجھے شاید یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔

وہ کانپتی ہوئی تین انگلیاں اٹھا دیتے ہیں۔

میں نظریں جھکا لیتا ہوں۔ ہمارے ایسے لوگوں میں اتنی رقم گھر میں رکھی ہوئی نہیں ہوتی۔ عمر بھر کی کمائی سمجھی جاتی ہے۔

"جہاں جہاں سے کچھ بھی مل سکے، کوشش کر رہا ہوں۔ رشتے داروں نے بھی آنکھیں چرا لی ہیں کہ الٹا ہمارے پیچھے نہ پڑ جائیں وہ لوگ۔ سامان بیچ رہا ہوں۔" ان کے لیے یہ ساری باتیں کہنا بے حد تکلیف دہ

Scanned with CamScanner

ثابت ہو رہا تھا۔ "کچھ نہ کچھ کر کے باہر بھی بھجوا دوں گا۔ کاروبار جائے جہنم میں۔ جان تو بچی رہے گی۔ دوسرے بھائی کو بھی بھجوا دوں گا..."

مجھے تذبذب میں دیکھ کر وہ حرفِ مطلب زبان پر لے آئے۔ "آپ میری مشین خرید لیجیے۔ تکلف نہ کریں۔ یہ مت سمجھیے کہ آپ میری مجبوری سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ بس یہ سوچ لیں کہ جتنی دیر لگے گی اتنی دیر میں کہیں میرے بھائی کو اذیت نہ پہنچانے لگیں..."

اچھے بھائی کو فیصلے تک پہنچنے میں منے سے مدد ملی۔

یہ تو ان کو بعد میں پتا چلا کہ یہ سڑک تین گروہوں کے درمیان حد بندی ہے (جن میں سے ایک فریق وہ ہے جسے قانون نافذ کرنے والا ادارہ کہا جاتا ہے)، اور یہاں اس گڑھے کی وجہ سے گاڑی کی رفتار کم ہوئی تو کسی نے ڈرائیور کی کنپٹی پر پستول رکھ دیا۔ "نیچے اتر آؤ!" آواز کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

ڈرائیور اور گاڑی وہیں روک لیے گئے۔ اچھے بھائی سے کہا گیا کہ گھنٹے بھر میں اتنی رقم لے کر آ جائیں۔ "اور زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کریں کیوں کہ ہمیں سب معلوم ہے۔ آپ کا یہ پتا ہے۔ آپ یہاں رہتے ہیں اور اس دفتر میں کام کرتے ہیں۔"

اچھے بھائی شاید زیادہ گھبرا گئے ہوں گے کیوں کہ وہ ان کو تسلی دینے لگا۔ "گاڑی بھی مل جائے گی اور ڈرائیور کو بھی کچھ نہیں ہوگا۔ بس یہ خیال رکھنا کہ کوئی آدمی آ کر پوچھے کہ ہم سے کیا باتیں ہو رہی تھیں تو کہہ دینا دوا کے لیے پیسے چاہییں۔"

انھوں نے یہی کہا جب ایک شخص نے آ کر درشت لہجے میں سوال کیا اور بتایا کہ اس علاقے کا چیف تو میں ہوں، یہ لڑکے مجھے بتائے بغیر واردات تو نہیں کر رہے۔

کہاں سے رقم کا بندوبست کیا گیا، کس طرح مطلوبہ جگہ رقم پہنچا کر گاڑی اور ڈرائیور دوبارہ ملے، ان سب تفصیلات کے بجائے اچھے بھائی کو وہ گفتگو یاد ہے جو وہ لڑکے آپس میں کر رہے تھے۔

"کیسے جانے دوں؟ اتنی مشکل سے چڑیا پکڑی ہے۔"

"عیش کر منے۔ بارہ بجے پھر ملیں گے۔"

کئی دن تک کوئی آدمی آ کر ان کے گھر کی چیکنگ کرتا رہا۔ اچھے بھائی احتیاط اور خوف کی وجہ سے گھر نہیں گئے۔ اب یہ بھی کر لوں تو جاؤں گا، یہ بھی کر لوں، ذرا اور ٹھہر جاؤں ___ وہ کسی نہ کسی حیلے بہانے سے امریکا منتقلی کا فیصلہ ٹال رہے تھے۔ منے نے انھیں فیصلہ کن موڑ تک پہنچا دیا۔

چھوڑ کر چلے جانے کے لیے اب کراچی بہت مناسب شہر ہے۔

"آپ وہاں سے گزرے ہی کیوں؟ آپ کو نہیں معلوم تھا کہ اس علاقے کی آج کل کیا پوزیشن ہے؟" جو سنتا ہے وہ اچھے بھائی سے یہی پوچھنے لگتا ہے۔ ہر ایک کے پاس سنانے کے لیے اپنے قصے ہیں۔

Scanned with CamScanner

وہ علاقہ تو بٹا ہوا ہے، کوئی انھیں بتاتا ہے۔ سڑک کے ایک طرف حقیقی والے ہیں، دوسری طرف "مجازی" والے۔ بیچ میں رینجرز۔ لوگ وہاں سے گزرتے ہوئے کترانے لگے ہیں۔ ایک سے بچ گئے تو دوسرا...

گوٹ اس خانے پر پہنچ گئی تو سانپ نگل لے گا۔ اس پر پہنچ گئی تو آگے سیڑھی ہے۔ اس طرف سے بچ کر نکلنا۔ ادھر سے جاؤ۔ سانپ اور سیڑھی کا کھیل بن گیا ہے یہ شہر۔

نقشے، عمارتیں، لوگ، سماجی نشانیاں... ملبے کا ایک ڈھیر ہے میں جس کے اندر پھنس کر رہ گیا ہوں۔ شہر کا شہر ایک بند گلی میں ہے۔ راستا کیسے ملے؟ سر پھوڑوں کہ دیوار؟ عماد اندر آیا تو میں یوں ہی بیٹھے بیٹھے کافکا کی Description of a Struggle ایک بار پھر پڑھ رہا تھا اور اسی جملے پر اٹک گیا تھا جس کی نشان دہی ایک حالیہ کتاب نے بھی کی ہے:

"You're incapable of loving, only fear excites you."

"آپ کے خیال میں اب کیا ہوگا؟" عماد پوچھتا ہے۔ میں چونک پڑتا ہوں۔ وہ اوکلاہوما سے چھٹیاں گزارنے یہاں آیا ہوا ہے اور حیران پریشان ہے کہ جس کراچی میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا وہاں نہ گھوم سکتا ہے نہ دیر تک گھر سے باہر رہ سکتا ہے۔ میں اس کو سیدھا جواب نہیں دے سکتا۔ "وحشیوں کی آمد کا انتظار"، میں اسے کوافی کی نظم سنانے لگتا ہوں کہ عہدِ زوال میں رومۃ الکبریٰ کے شہریوں کے پاس بس یہی مشغلہ رہ گیا تھا۔ اور جب وسطی یوروپ کے وحشی قبائل فصیلِ شہر پر آکر حملہ آور نہیں ہوئے تو لوگوں کو مایوسی ہوئی "کہ وحشی ایک طرح سے شہر کے مسئلے کا حل تھے۔

مگر عماد قائل نہیں ہوتا۔ "آپ بھی کہاں کی باتیں کرتے ہیں!" وہ تمسخر سے ہونٹ سکیڑ لیتا ہے۔ "یہ فضول کتابیں چھوڑیے، آج کی آوازیں سنیے۔" وہ پتلون کی پچھلی جیب سے کیسٹ نکال کر لگا دیتا ہے۔ "یہ ایلس کوپر ہے،" وہ مجھے بتاتا ہے اور ایک تیز بے ہنگم آواز میرے سر پر ہتھوڑے برسانے لگتی ہے:

From the start of life
To my dying day
In the dark of night
And the burning light of day
It's a bloody fight
But I can't walk away
I'm prime for the front line.

Unholy war, unholy war,
I'll try, I'll fight until I die
Unholy, unholy war, unholy war
I see, I know, you'll always be
Unholy.

Scanned with CamScanner

You see my burning fuse
From a mile away
I took your cruel abuse
Lord took away my shame
I learned to bite the hand
That used to pull my chain.
We'll fight 'cause we ain't on the same side
We're in an unholy war, unholy war
I'll try, yeah I'll fight until I die
Unholy.

When I'm all alone, unholy
With your thoughts of pain, unholy
I can break on through, unholy
With just an ounce of faith, unholy
Unholy.

You're shaking in your boots
Because it's judgment day
I'll get my just rewards
And you'll have your hell to pay
There's no time to throw out the lifeline.

Unholy war, unholy war
I'll try, I'll fight until I die
Unholy, unholy war, unholy war
I see, I know, you'll always be
Unholy.

اس تیز آواز سے میرا ذہن جھنجھنا اٹھتا ہے۔ نہ مجھے ایسی موسیقی پسند ہے نہ یہ آواز۔ لیکن میں ہاتھ بڑھا کر اسے بند نہیں کر سکتا، جیسے وہ آواز میرے دل اور دماغ کو تپتے ہوئے گرم لہو کی طرح داغ رہی ہو...

کسی اور بات کا ہوں نہ ہوں، میں وزیر اعظم پاکستان صاحبہ کی فصاحت بیان کا بہت معترف ہوں۔ ایک حالیہ ناقابلِ فراموش بیان میں انھوں نے کراچی کو "دہشت گردی کا تھیئٹر" قرار دیا ہے۔ میں اس بیان سے تردد میں پڑ گیا کہ کہیں عجلت میں ان سے rhetoric کے پرانے اصول کی خلاف ورزی تو نہیں ہو گئی۔ دہشت گردی کے تھیئٹر میں ایبسرڈ ڈراما قولِ محال نہیں تو اور کیا ہے؟ میں ڈرتا ہوں کہ ان کا فقرہ خلطِ مبحث کا شکار ہو کر ان کی اعجاز بیانی پر حرف آنے کا سبب نہ بن جائے۔ یوں بھی ڈراما میری

صنف نہیں۔ پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس جاری وساری ناٹک میں میرا کردار کیا ہے؟ میں نایک ہوں، کھل نایک ہوں یا سوتردھار؟ شاید میں اور میرے ہم شہر اس وقت "active victims" بننے کے مرحلے میں ہیں۔ ہم کٹھ پتلیاں بن گئے ہیں، اس کا احساس اس دن ہوا جب بچوں کو ڈبے کے دودھ کے بجائے ماں کا دودھ پلانے پر راغب کرنے کی غرض سے عالمی ہفتے کے سلسلے میں عباسی شہید اسپتال میں منعقدہ اجلاس کے دوران کٹھ پتلیوں کا تماشا دیکھا جو تعلیم صحت کے مقصد سے کیا گیا تھا۔ کٹھ پتلی تماشا دکھانے والا شروع میں کسی قدر گھبرایا ہوا تھا (وہ اس شعبے کا پیشہ ور نہیں، ایک مشہور اسپتال میں ڈاکٹر ہے) اور اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لیے مذاق کر رہا تھا: "یہ عباسی شہید اسپتال ہے۔ میں یہاں آیا تو گاڑی پر ہوں۔ ایسا نہ ہو واپسی کے لیے بوری میں بند کر کے بھجوا دیں۔" اس فقرے پر زوردار تالیاں اور بے ساختہ قہقہے۔ میں حیران ہو کر دیکھتا ہوں۔ ایک آدمی اندر آتا ہے، کان میں کچھ کہتا ہے، پھر چلا جاتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد، پھر تھوڑی دیر کے بعد... میں اس مستقل مداخلت پر چڑ کر پوچھتا ہوں: "کیا مسئلہ ہے؟" بارہ، مجھے جواب ملتا ہے، اب تک بارہ۔ اس ہال سے ملحقہ مردہ خانے میں اب تک بارہ لاشیں لائی جا چکی ہیں۔ اورنگی میں اجتماعی قتل، دہشت گردی کی ایک اور واردات۔ باقی تفصیلات قہقہوں کے شور میں دب جاتی ہیں۔ کٹھ پتلی تماشا بے حد پسند کیا جا رہا ہے۔ اسپتال کا عملہ کھانے میں مشغول ہو جاتا ہے تو میں اجازت لے کر باہر آنے لگتا ہوں۔ "تم بھی جلدی سے اس علاقے سے نکل جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس واردات کا ردِ عمل ہونے لگے،" میں شاہ محمد سے کہتا ہوں۔ "ارے چکن تو آپ نے چکھا تک نہیں۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ جو مارے گئے وہ سندھی نہیں ہیں، پٹھان ہیں!" اسپتال کی ایک لیڈی ڈاکٹر صاحبہ فرائضِ میزبانی نبھاتے ہوئے مجھ سے کہتی ہیں۔

ان کی اتنی محنت سے تیار کی ہوئی تقریب غارت نہ ہو جائے ___ چند نوالے بھی میرے حلق سے اتر نہیں سکے۔

واپس جاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ کر میں اس کو rationalize کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ دماغ کی سوئی جیسے ایک ہی نقطے پر اٹک گئی ہے۔ میرے ذہن کا اسکرین یکسر خالی ہے۔ پھر کچھ دیر بعد کسی رسالے میں پڑھا ہوا فقرہ یاد آتا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر جرمنی کی شکست خوردہ فوج کے ایک سپاہی نے، جس کی عمر سولہ سال تھی، گھر واپسی کا سفر شروع کرتے ہوئے کہا تھا:

Behind us was madness, before us nothingness.

اس سے زیادہ مجھے کچھ یاد نہیں آیا۔ میرا دماغ اس نقشے کی طرح خالی ہو گیا جس پر پانی گر گیا ہو، اس رگ کی طرح مفلوج جس میں خون کا ذرہ پھنس گیا ہو۔ میں سیٹ کے ہتھے کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہوں۔ اس علاقے سے جلد از جلد باہر نکلنے کے لیے ڈرائیور نامعلوم راستوں پر تیزی سے گاڑی چلا رہا ہے اور مجھے نہیں معلوم کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ مجھے بس اتنا اندازہ ہے کہ میری کھڑکی کے باہر کراچی ہے، ابھی تک کراچی...

Scanned with CamScanner

لیکن کب تک؟ اور کس حال میں؟ ناسٹراڈیمس اور شاہ نعمت اللہ کی پیشنگوئیاں مجھے میسر نہیں ہیں کہ اس شہر کے مستقبل کا حال بتادیں جہاں آدھا شہر یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ باقی آدھا کس طرح ہلاک ہو گا۔

یا پھر شاید یہ شہر ایسا نہیں ہے۔ میں نے اب تک جو کچھ دہرایا ہے وہ "کٹم بیتی" ہے، "شہر بیتی" نہیں۔ میرے پاس اُس کا کوئی حل بھی نہیں ہے جسے "کراچی کا مسئلہ" کہا جانے لگا ہے۔ من وسلویٰ کی طرح روزانہ ہمارے برقیاتی ذرائع ابلاغ سے "کراچی کے واقعات" پر افسوس کا اظہار اور "کراچی کے مسئلے" کے حل کے لیے نیک خواہشات اترتی ہیں، جس پر اپنی ممنونیت کے اظہار سے بھی میں قاصرولاچار ہوں۔ اس لاچاری کے سوا میرے پاس کوئی انجام نہیں — "ایک کہانی جس کا کوئی خاتمہ نہیں،" جس طرح زاسیٹسکی (Zasetsky) نے کہا تھا۔ میں اب اسی طرح محسوس کررہا ہوں۔

اس اجمال کی تفصیل کے لیے مجھے پروفیسر اے آر لوریا (A R Luria) کا حوالہ دینا ہوگا کہ اس عہد ساز روسی نیوروسائیکولوجسٹ کی کتابیں خدا معلوم کہاں کہاں سے حاصل کر کے سول اسپتال میں کام کرنے کے دوران نائٹ ڈیوٹی اور ایمرجنسی ڈیوٹی کے دوران فرصت کے چند ایک لمحوں میں گھونٹ لینا چاہتا تھا۔ ممکن ہے یہ کتابیں جدید تر تحقیق کے سامنے ازکاررفتہ ہو گئی ہوں، لیکن آج کے کراچی کے حوالے سے مجھے *The Man with a Shattered World* بہت معنی خیز معلوم ہوتی ہے۔

ایک مریض کے اپنے تحریر کردہ شذرات سے لوریا نے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ ۱۹۴۳ میں جنگ کے دوران ایک نوجوان روسی سپاہی، جس کا نام زاسیٹسکی ہے، گولی لگنے سے زخمی ہوجاتا ہے۔ گولی اس کے دماغ میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے ذہنی امراض کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس کی بصارت متاثر ہو جاتی ہے اور یادداشت گم ہو جاتی ہے۔ وہ لکھنا پڑھنا بھول جاتا ہے۔ اس کے حافظے سے الفاظ محو ہو جاتے ہیں اور وہ دیر تک ایک ایک لفظ کو ٹٹولتا اور یاد کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک جانے میں راستا بھول جاتا ہے۔ بالٹی اٹھاتے اٹھاتے اسے یاد نہیں رہتا کہ وہ کیا کررہا تھا۔ اسے پوری طرح اپنے جسم اور اس کے طبیعی وجود کا احساس ہے نہ اردگرد رکھی ہوئی چیزوں کے مقام کا۔ اس چوٹ سے صرف اس کی قوتِ متخیلہ متاثر نہیں ہوئی اور اسے اس زندگی میں، جو اس کے لیے بڑی حد تک ناقابلِ فہم ہو گئی ہے، کسی قدر لمحاتی تسکین فراہم کرتی ہے۔ لوریا کی تشخیص میں شبے کی گنجائش نہیں:

> His mind had nothing to work with except undeciphered images and unrelated ideas.

اُس کا زخم پچیس سال پہلے بھر گیا لیکن کھرنڈ scar tissues پڑ جانے کا نتیجہ دورے کی شکل میں ظاہر ہوتا رہا۔ اس کے cerebral cortex کے نقصان زدہ حصے اصلی حالت پر واپس نہیں آسکتے۔ لہٰذا وہ جب بھی سوچنے کی کوشش کرتا، اس کے ذہن کو اُن جھلسے ہوئے حصّوں کے گرد گھوم کر کام کرنا پڑتا کہ ان کے توسط سے دوبارہ سیکھے اور گم شدہ ہنر کو کسی حد تک بازیاب کرسکے۔

Scanned with CamScanner

وہ پوری شدت کے ساتھ چاہتا تھا کہ اس بھیانک خواب سے بیدار ہو جائے، ذہنی انجماد کی مایوس کن حالت کو توڑ کر باہر نکل سکے، دنیا کو واضح اور قابلِ فہم پائے، بجائے اس کے کہ اپنی زبان سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ کو ٹٹولتا رہے۔ لیکن یہ ناممکن تھا۔

اُس نے لکھا: "وقت اُڑا جا رہا ہے۔ دو دہائیاں گزر گئیں اور میں اس ہولناک چکر میں پھنسا ہوا ہوں۔ میں اس سے باہر نہیں نکل سکتا کہ صحت مند آدمی بن جاؤں جس کا حافظہ اور ذہن صاف ہوں۔

"عام آدمی کبھی بھی میری بیماری کو نہیں سمجھ پائے گا، کبھی نہیں جان سکے گا حتیٰ کہ وہ خود اس تجربے سے گزرے۔"

اور یوں وہ ماضی کی طرف پلٹتا تھا کیوں کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ دنیا ایسی عجیب و غریب کیوں کر ہو گئی تھی، جنگ کیوں لازم ہو گئی تھی، اور اس کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا کیا کوئی جواز تھا۔ پچیس سال پہلے وہ باصلاحیت نوجوان تھا جس کا مستقبل روشن تھا۔ آخر ایسا کیوں ہوا کہ اسے اپنا حافظہ گنوانا پڑا۔ جو علم اس نے حاصل کیا تھا وہ بھولنا پڑا اور ایک بے یار و مددگار اپاہج بن کر رہ گیا جسے ساری عمر کش مکش ("struggle") میں مبتلا رہنے کی سزا دی گئی۔

دھیرے دھیرے اس نے لکھنا پڑھنا دوبارہ سیکھا اور اپنا احوال درج کیا۔ "میری کہانی کا کوئی خاتمہ نہیں ہے،" اس نے لکھا۔ وہ اس بھیانک خواب سے جاگ جانا چاہتا تھا لیکن ذہنی انجماد کی ناامیدی سے مفر نہیں تھا۔

"خاتمہ کتاب" کے بجائے اس کے چند جملے لوریا نے درج کیے ہیں۔ جیسے لکھنے والے نے کاغذ پر کلیجا نکال کے رکھ دیا ہو:

"اگر جنگ نہ ہوتی تو دنیا زندہ رہنے کے لیے بہت پہلے بڑی عمدہ جگہ بن چکی ہوتی۔ اس دور میں ہمیں موقع ملا ہے کہ ایک نئی اور حسین تر دنیا کی تعمیر کریں، تمام تر انسانیت کو پیٹ بھرنے کے لیے غذا، تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا، سر پر چھت فراہم کریں؛ صرف موجودہ نسل کے لیے نہیں بلکہ ان کے لیے بھی جو آنے والے ہیں۔

"اس دنیا کی مٹی اور پانی میں خام مواد اور طاقت کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ موجود ہے، ان میں کسی کمی سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں۔ جلد ہی خلا کا سفر بھی شروع ہو جائے گا ــــ پہلے چاند، پھر دوسرے سیاروں کی طرف۔ اس سے ہمیں اور بھی موقع مل جائے گا کہ زندگی کو اور بھی پُرمایہ بنالیں، ان نادر عناصر اور مادّوں سے جو دنیا کے مقابلے میں دوسری جگہوں پر وافر مقدار میں موجود ہیں۔ ہم یہ سب کر سکتے ہیں، اگر جنگ نہ ہو..."

ہم بھی یہ کر سکتے ہیں۔ اگر گولیاں نہ چل رہی ہوں اور دنیا کا نقشہ ٹوٹ کر پارہ پارہ نہ ہو رہا ہوے چلا جا رہا ہو تو ہم اس شہر میں رہ بھی سکتے ہیں جس شہر میں مَیں رہتا ہوں۔

**

Scanned with CamScanner

محمد حنیف

ایک اخبار نویس کا کراچی

کراچی کے بارے میں پہلی خبر مجھے شہر میں پہنچتے ہی ایرپورٹ کے ایک باتھ روم کی دیوار پر لکھی ہوئی ملی۔ یہ جناح ٹرمینل بننے سے بہت پہلے اور قصبہ کالونی کے سانحے کے چند دن بعد کی بات ہے۔ باتھ روم کے تعفن سے ماورا ہو کر کسی نے اطمینان سے اپنی خوش خطی کے جوہر دکھاتے ہوئے لکھا تھا: "پنجابیو! اپنے گاؤں واپس جاؤ۔ وہاں تمھاری بہنیں ننگی پھر رہی ہیں۔" اس سے ذرا نیچے کسی پنجابی نے بال پوائنٹ پین سے اپنی بھدی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا: "ہم بھی یہاں پہ اُن کا بدلہ لینے آئے ہیں۔" ادبی زبان میں شاید اسے مصرعے پہ مصرع لگانا کہتے ہیں۔

کراچی ابھی ایک سویا ہوا جن تھا جس نے سہراب گوٹھ کے آپریشن کے بعد کروٹ لی تھی۔ سرکار اور اخبار ایک دم منشیات فروشوں کے بے رحم اثر و رسوخ سے آشنا ہوئے تھے اور، جیسا کہ عام طور پر ہوتا آیا ہے، دونوں کو یہ خبر بہت تاخیر سے ملی تھی۔ شہر میں رہنے والا کوئی بھی عام سا نوجوان برسوں سے منشیات کے اڈوں، اُن کے مالکان کے کوائف اور اُن کے سودوں کی کوالٹی سے باخبر تھا۔ تازہ خبریں، بلکہ آنے والے مستقبل کی خبریں، جیسا کہ اکثر ہوتا آیا ہے، پبلک باتھ روموں، ہسپتالوں کی دیواروں اور تعلیمی اداروں کی بین شدہ یونینوں کے پمفلٹوں میں تھیں۔ رات گئے نشے میں دُھت نوجوان کسی اکیلے پولیس والے کے پاس سے گزرتے ہوئے "جیے مہاجر" کا نعرہ لگاتے۔ پانچویں قومیت، قائدِ تحریک اور حقوق یا موت جیسے الفاظ کراچی کے باہر سے آنے والوں کے لیے ثقافتی اظہار تھے۔ سیاست کی زبان میں بات کرنے والے یا تو مہاجروں کو اُن کے قدوں سے ناپ رہے تھے یا دوسری طرف سندھ میں ایک نئی صبح کے طلوع کی بشارت دے رہے تھے۔ اندرونِ سندھ میں قوم پرستی کا عروج اور شہری علاقوں میں مہاجر قومیت کے نعرے ترقی پسند لبرل مبصرین کے لیے ایک ہی سکّے کے دو رُخ تھے۔ اسی [illegible]نے میں حیدرآباد کے قریب ہونے والی ایک سیاسی تقریب میں قادر مگسی نامی ایک نوجوان نے الطاف حسین نامی ایک نوجوان کو ایک اجرک اور ایک کلاشنکوف تحفے میں پیش کی۔ کیا اس سے بڑی ضمانت متحدہ سندھ کے مستقبل کے لیے دی جاسکتی تھی؟

Scanned with CamScanner

میری پہلی سیاسی اسائنمنٹ الطاف حسین کا ایک طویل انٹرویو تھا۔ یہ ایک ایسے انگریزی رسالے کے لیے کیا گیا جس کا نام "گلیمر" تھا اور ہم نے اپنے سبجیکٹ کو اُسی طرح اپروچ کیا جیسے ہم اُن فیشن ماڈلز کو کیا کرتے جو رسالے کی مختصر زندگی میں اس کی وجہِ شہرت بنیں۔ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت سرکائے گئے گریبان، سمندر کے پانی میں بھیگی ساڑیاں اور ذو معنی عنوانات۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ چھ مہینے کی مختصر زندگی میں "گلیمر" نے آزادیِ اظہار اور ملبوسات کی حدوں کو کافی پیچھے دھکیل دیا تھا۔

پہلی نظر میں الطاف حسین ہمیں ویسے کے دن والا دولہا نظر آئے۔ سر سرا تا ریشمی کُرتا اور پاجامہ، زری والا جوتا اور نگوں والی انگوٹھیاں جو روحانی تاثیر رکھتی ہیں۔ اُن کے بال بہت احتیاط سے بلو ڈرائی (blow dry) کیے گئے تھے اور ان کے پیچھے ایک نوجوان مستعد لڑکا گولڈلیف کے پیکٹ اور لائٹر سے مسلح کھڑا تھا جو وہ وقفے وقفے سے قائد کو پیش کرتا۔ عزیز آباد میں ۲۴۰ مربع گز پر بنے اس چھوٹے سے گھر کے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں ایک بڑا سا ایکویریم ایک کونے میں رکھا تھا جو کسی کارکن نے تحفے میں دیا تھا اور جس میں تیرتی مچھلیاں شیشے کی دیوار سے، جس پر بڑے بڑے حرفوں میں MQM لکھا تھا، سر مار رہی تھیں۔ سب سے زیادہ جس بات نے مجھے حیران کیا وہ الطاف حسین کا رے بان (Ray Ban) کا سیاہ چشمہ تھا جو انھوں نے چار گھنٹوں میں ایک بار بھی نہیں اتارا۔ میری ایڈیٹر نے، جن کا سیاست کا علم مجھ سے کچھ زیادہ نہیں تھا، ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کے لیے ایکویریم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "کیا یہ مچھلیاں بھی مہاجر ہیں؟" الطاف حسین نے ایک انگلی سے اپنے چشمے کو پیچھے کی طرف دبا کر ایک قہقہہ لگایا اور گولڈلیف والے نوجوان کو سگریٹ پیش کرنے کا اشارہ کیا۔

الطاف حسین کو سیاست سے زیادہ فوج میں جانے کا شوق تھا۔ وہ رضاکار کے طور پر بھرتی بھی ہوئے لیکن وہاں اُجڈ پنجابی حوالداروں نے بجائے اُن کے جذبۂ جہاد کی توقیر کرنے کے اُنھیں کٹڑ اور بھیا کہہ کر اُن کا مذاق اڑایا۔ اُس بے عزتی کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک گالی الطاف حسین نے اپنے انٹرویو میں دُہرائی۔ دراصل یہ انٹرویو سے زیادہ وعظ تھا کیوں کہ انھوں نے سوالوں کی زیادہ پروا نہیں کی؛ جو کچھ کہنا تھا وہ کہا۔ میری شُستہ اردو، جس کا اعتراف کئی اہلِ زبان دوست بھی کرتے تھے، میری زیادہ مددگار ثابت نہیں ہوئی۔ جب میں اُن کی تقریر کو کاٹ کر ایک سوال کرنے کی کوشش کر رہا تھا، الطاف حسین نے مہاجر فلسفے کے تاریخی پس منظر کا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا: "اب دیکھیں، آپ بھی پنجابی ہیں، آپ سے ہماری کوئی دشمنی نہیں۔" اس کے بعد میں نے یہ پروا کرنا چھوڑ دی کہ میرے قاف کا مخرج حلق میں ہے یا پیٹ میں۔

یہ ثابت کرنے کے بعد کہ علامہ اقبال کو اس لیے بڑا شاعر مانا جاتا ہے کہ وہ پنجابی ہیں، الطاف حسین نے اپنی موٹرسائیکل کا قصہ اتنے مزے لے لے کر سنایا کہ اگر کالا چشمہ نہ ہوتا تو ہم یقیناً اُن کی چمکتی آنکھوں کا بیان کرتے۔ یہ موٹرسائیکل جو تحریک کے آغاز کے دنوں میں بڑی کارآمد ثابت ہوئی تھی، رفتہ رفتہ پارٹی کے تبرکات میں شامل ہو گئی۔ "ساری اے پی ایم ایس او نے ڈرائیونگ اِسی پہ

سیکھی۔ آپ یوں سمجھیں کہ اُن دنوں میں تحریک ہم نے اِسی موٹر سائیکل پہ چلائی۔ لیکن اب اللہ کا ایسا کرم ہے کہ دو دو پجیرو ہمارے دروازے پہ کھڑی رہتی ہیں۔ وہ لوگ جو اس ڈ سے ہمیں گیٹ سے لوٹا دیا کرتے تھے کہ ہم چندہ مانگ لیں گے، آج ہم سے ملاقات کا وقت مانگتے ہیں،" الطاف حسین نے اُس دکان دار کی سی تسلی سے کہا جس کا کاروبار نیا نیا چل نکلا ہو۔

سیلف سنسر شپ کا پہلا تجربہ بھی مجھے اس انٹرویو کے چھپنے کے وقت ہوا۔ میں نے سوال و جواب کے ساتھ ایک تعارف لکھا جو ذاتی مشاہدات پر مبنی تھا۔ مچھلیوں والا مذاق چھپ گیا لیکن کالا چشمہ، جو میرے غیر سیاسی تجزیے کی بنیاد تھا، تحریر میں سے بالکل غائب کر دیا گیا۔

اس بات کو چھ سال گزر جانے کے بعد میرے لیے اب بھی یہ ایک معمّا ہے کہ ذمے دار مدیران کا ذہن کیسے کام کرتا ہے۔ قصبہ کالونی کے قتلِ عام کے بعد چند نوجوانوں نے شہر کے مضافات میں لکڑی کی ایک ٹال پر سوئے ہوئے ایک پٹھان کا سر ایک بڑے پتھر سے کچل ڈالا۔ ایک نوجوان نے، جو اس گروہ میں شامل تھا، بعد میں قصہ سناتے ہوئے مجھے بتایا کہ تمام لڑکے "جیے مہاجر" کے نعرے لگا رہے تھے۔ پٹھان کی کہانی چھپ گئی لیکن نعروں کا ذکر کاٹ دیا گیا۔ پھر تاج محل ہوٹل کے سامنے ایک گاڑی میں سے ایک زخمی نوجوان کو پھینکا گیا۔ اسے اغوا کرنے والوں نے اس کے بازو پر خنجر سے "جیے سندھ" کھود دیا تھا۔ زخمی نوجوان کا قصہ چھپ گیا لیکن "جیے سندھ" پر لکیر پھیر دی گئی۔ اپنی ناتجربہ کاری میں مجھے یوں لگا جیسے میں نے کوئی چھوٹی سی فلم بنائی ہو اور سنسر بورڈ نے اس کا تمام ساؤنڈ ٹریک اور بیک گراؤنڈ میوزک نکال دیا ہو۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ ایڈیٹر کو صرف اپنی جان کا خوف نہیں تھا؛ اُن کو اس بے احتیاطی سے ڈر لگتا تھا جس کے باعث نفرت کی چنگاریاں آگ بن سکتی ہیں۔ اپنی سُرخ پنسلوں سے نفرت کے لاوے کو روکنے والے یہ صحافی گو کم تھے لیکن تھے، اور اب بھی ہیں۔ لیکن اُن کی یہ سادہ لوح کوششیں آج کل کے حالات میں عجیب لگتی ہیں۔ آج کوئی باہر سے آنے والا اگر سٹی بیٹ پر کام کرتے کسی رپورٹر کو دیکھے تو یہ سمجھے کہ وہ اسٹاک ایکسچینج کے ریٹ چیک کر رہا ہے یا ومبلڈن کے اسکور اَپ ڈیٹ کر رہا ہے۔ "کتنے ہوئے؟" "تمھارے پاس کتنے ہیں؟" "یہ دو کدھر سے آ گئے؟" "عثمان آباد میں ایک بوری سے ملے ہیں۔" اُن کی زندگی مختلف وقفوں میں بٹی ہوئی ہے: ایدھی انفارمیشن کو فون، پولیس کنٹرول سے چیک، تینوں ہسپتالوں کو فون، ان سب سے ملنے والے اعداد کو جمع کرنا، پھر کسی ہم پیشہ کو فون کر کے پوچھنا: "کل کتنے ہوئے؟"

اُس دن سڑک پر ہزاروں لوگ تھے۔ ۱۹۸۸ کے الیکشن کے بعد پی پی اور ایم کیو ایم دونوں کراچی کی سڑکوں پر جشنِ فتح منانے نکلے تھے۔ وہ خواتین جنھیں گیارہ سال تک چادر اور چار دیواری میں ڈھانپنے کی کوشش کی گئی تھی، گاڑیوں کی کھڑکیوں میں سے باہر لٹک کر ناچ رہی تھیں اور لڑکے فٹ پاتھ

Scanned with CamScanner

پر کھڑے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دیکھ رہے تھے۔ یہ مناظر دیکھ کر ٹریفک کے سپاہیوں کی ہوا میں اٹھی بانہیں اپنے تربیت یافتہ اشارے بھول گئیں اور ٹریفک کا نظام لڑکوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اسی جشن کے دوران آنے والے دنوں کی ایک جھلک بھی نظر پڑی۔ ایک سڑک پر مڑتے ہی وکٹری سائنز بناتے اور جھنڈے لہراتے ایک گروہ نے ہمارا راستہ روکا اور مطالبہ کیا کہ چندہ دو اور جیے مہاجر کا نعرہ لگاؤ۔ اُن کی آنکھوں میں جیتنے والوں کی بے رحمی تھی۔ ہم نے مطالبے کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔ ایک پھنکارتے ہوئے لونڈے نے آگے بڑھ کر گاڑی کی چابی اچک لی اور چیخ کر کہا: "بولو جیے مہاجر!" میرے گلے سے جو آواز نکلی اُس نے خود مجھے حیران کر دیا۔ چاروں طرف لوگوں کا اُمڈتا سمندر جو چند لمحے پہلے تک تحفظ اور آزادی کا احساس دلا رہا تھا، بیک وقت بے بس، متلاطم اور خطرناک نظر آنے لگا۔

کراچی سے شائع ہونے والے محدود اشاعت کے ایک انگریزی رسالے کے لیے لکھنا، بقول ہمارے ایک مدیر کے، مومنوں کو تبلیغ کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن محدود اشاعت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ وہ تمام باتیں جو کبھی بھی "جنگ" یا "ڈان" میں نہیں چھپ سکتیں، ہم "نیوزلائن" میں بڑی بڑی سُرخیوں کے ساتھ چھاپ سکتے ہیں۔ مگر اپنے آپ کو چھوٹا جان کر محفوظ سمجھنا بھی ایک غلطی ہو سکتی ہے۔ کلفٹن میں ہونے والے ایک انتخابی جلسے کے دوران الطاف حسین نے ہمارے رسالے کا نام لے کر تقریر شروع کی۔ "یہ کٹے ہوئے بالوں والی عورتیں، یہ فرانس کا پانی پینے والیاں،" انھوں نے ہمارے رسالے کی خاتون مدیروں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا، "یہ وہ صحافی ہیں جو ایک بوتل کے بدلے اپنا قلم بیچ دیتے ہیں۔" یہ سب کہہ چکنے کے بعد انھوں نے فرمایا کہ ابھی تک انھوں نے مہذب زبان استعمال کی ہے اور اب وہ اپنے خیالات کا اظہار بازاری زبان میں کریں گے۔ اس کے بعد جو کہا گیا وہ کچھ ایسا تھا جسے ادبی زبان میں ناقابلِ اشاعت کہا جاتا ہے۔

جلسے میں یقیناً ہمارے پڑھنے والے بھی موجود تھے مگر کسی صدائے احتجاج کی توقع رکھنا عبث تھا۔ شہر کے حالات سے سب سے زیادہ خوف زدہ یہ لوگ ہیں، حالاں کہ واحد وائلنس جو ان لوگوں کی زندگیوں تک پہنچ پاتا ہے وہ ناشتے کی میز پر صبح کا اخبار ہے۔ ان کے دل رحم سے اور پیٹ لوفیٹ (low fat) خوراک سے بھرے ہیں۔ یہ اپنے نوکروں سے اُن کے مرنے والے عزیزوں کا حال احوال پوچھتے ہیں، اسٹیٹ ایجنٹوں سے رابطہ رکھتے ہیں کہ پراپرٹی بیچنے کا بہترین موقع کب ہے، اور دوسرے شہروں میں رہنے والے اپنے عزیزوں کو بتاتے ہیں کہ وہ وار زون (war zone) میں رہ رہے ہیں۔ جب ہڑتال کی وجہ سے ان کی صفائی کرنے والی ماسی ان کے گھر نہیں پہنچ پاتی تو یہ اپنے غصّے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب ان کا بیوروکریٹ دوست پارٹی میں نظر آتا ہے تو اُس کے ساتھ مل کر سیاست دانوں کو گالیاں دیتے ہیں، اور جب واقف کار سیاست داں سے ملتے ہیں تو اپنی بندوق کا رُخ بیوروکریسی کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ سکیورٹی ایجنسیوں کی ویٹنگ لِسٹ میں ان کے نام ٹاپ پر ہیں۔ انھیں حکومت

Scanned with CamScanner

اور اپوزیشن سے یکساں نفرت ہے۔ جب مشین گنوں کے پیچھے کھڑے بور ہوتے ہوئے رینجرز کا ٹرک ان کے گھر کے پاس سے گزرتا ہے تو ان کا بلڈ پریشر ذرا نیچے آتا ہے۔ کھنے والے کھتے ہیں کہ کلفٹن میں اصل بدامنی اُس وقت پیدا ہوئی جب آغا سُپر مارکیٹ حادثاتی طور پر جل کر راکھ ہو گئی اور کچھ دنوں کے لیے انھیں تازہ مشروم ملنا بند ہو گئے۔

آپریشن کلین اَپ شروع ہونے کے کچھ عرصے بعد فوج کے ایک کرنل نے، جو فیلڈ انویسٹی گیشن ٹیم کے کرتا دھرتا تھے، ایک آف دی ریکارڈ بریفنگ میں نظریۂ پاکستان، ملک کو درپیش علاقائی خطروں اور اپنے خفیہ کیمروں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ٹیلی وژن کی اسکرین پر ایک کے بعد ایک نوجوان خالی نظروں کے ساتھ بتاتا کہ اس نے کتنے قتل کیے، کہاں سے اسلحہ لیا، کس کے حکم پر ٹرگر دبایا۔ ان نوجوانوں کے نام ہندی فلموں کے کرداروں کا چربہ لگتے اور یوں محسوس ہوتا جیسے انھیں خود بھی اپنے کارناموں پر یقین نہ آرہا ہو۔ "ہم نے ہاتھ تک نہیں لگایا،" کرنل بار بار دعویٰ کرتا۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنی کرسی کے ساتھ ٹکی جی تھری رائفل کو اٹھاتا اور نظریں ہم پر مرکوز کیے ہوئے، سدھے ہاتھوں سے مسلسل لوڈ اور آن لوڈ کرتا جاتا۔ "میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن جب کوئی بھارت کا نام لیتا ہے تو میرا خون کھولنے لگتا ہے،" اس نے ٹی وی پر ایک نوجوان کی تصویر کو اسٹل کر کے کہا جو اعتراف کر رہا تھا کہ وہ بھارت سے تربیت لے کر آیا ہے۔

"جب ۱۹۸۸ میں حیدر آباد کا قتلِ عام ہوا تو میں وہیں ڈیوٹی پر تھا۔ میرے ذمے سارے دن کی کارروائیوں کی رپورٹ تیار کرنا تھا۔ رات کو لاشیں گنتے گنتے تھک کر میں نے ایک پنجابی گانا گانا شروع کر دیا: بُرے نصیب مرے ویری ہویا پیار مرا۔ میرے کمانڈر نے کہا، شہر میں لوگ مر رہے ہیں اور تم گا رہے ہو۔ میں نے کہا، میں فوجی ہوں اس لیے رو نہیں سکتا۔"

پھر اُس نے آپریشن کے آغاز میں اپنے کارنامے سنائے۔ "میں نے اس ایم این اے کو اٹھایا اور یہیں لے آیا۔ میں نے کہا دیکھو، میں تمھیں ہاتھ تک نہیں لگاؤں گا۔ مجھ سے بحث کرو۔ مجھے بتاؤ یہ مہاجر قوم کیا ہوتی ہے۔ دلیلیں دیں اُس کو۔ صبح پانچ بجے وہ مجھے کہنے لگا، چلو مجھے حقیقی والوں کے پاس لے چلو، پریس کو بلاؤ۔"

"اس کمرے میں کچھ آف دی ریکارڈ نہیں ہوتا۔" کرنل نے جی تھری کو کرسی کے ساتھ ٹکاتے ہوئے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر کچھ بٹن دبائے اور ٹی وی اسکرین پر میں نے اپنے آپ کو دیکھا۔ میرے اس کمرے میں داخل ہونے سے لے کر بریفنگ کا ایک ایک لمحہ اسکرین پر فاسٹ فارورڈ میں دوڑنے لگا۔ کرنل نے بیگانہ مسکراہٹ کے ساتھ دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھا دیے اور ہمیں چیلنج کیا کہ اُس کے الیکٹرانک کھلونے کا سراغ لگائیں۔ میں نے ریکارڈنگ کے زاویے کو نظر میں رکھتے ہوئے خفیہ کیمرے کی تلاش میں نظریں اٹھائیں تو دیوار کے کونے میں محمد علی جناح کا مشہور پورٹریٹ جس میں وہ ایک آنکھ کا چشمہ

Scanned with CamScanner

لگانے مطالعے میں مصروف ہیں، نظر آیا۔ کرنل نے اپنی جی تھری کی طرف دیکھے بغیر ایک دفعہ پھر اس کا میگزین فِٹ کیا۔ جناح کے ایک آنکھ والے چشمے کے پیچھے سے شیشے کی ایک گول آنکھ ہم پر مرکوز تھی۔

**

زینت حسام

گزرے دن، گزرتے دن

مجھے میٹھادر کے اُس گھر کا صرف لکڑی کا وہ زینہ یاد ہے جس پر چلنے سے دھمک پیدا ہوتی تھی — ہم بچے اس پر کود کود کر چڑھتے اُترتے اور وہ دھمک ایک گونج میں بدل جاتی — یا پھر پرانی وضع کے خوب صورت نمونے والے ٹائلوں سے بنا چمکدار فرش۔ میٹھادر کے بازار میں واقع اس چھوٹے سے چارمنزلہ مکان کے نچلے حصے میں جوتوں کی دکان تھی اور ہر منزل پر دو کمروں پر مشتمل ایک فلیٹ۔ پہلی منزل پر دادا دادی اور دادا کی پہلی مرحوم بیوی کی اولاد، جنھیں سب بچے محمود بھائی کہتے تھے، دوسری منزل پر بڑے ابا کا کنبہ، تیسری منزل پر امی ابا اور ہم بہن بھائی (اس وقت ہم دو بہنیں اور دو بھائی تھے) اور چوتھی منزل پر چچا کا کنبہ۔ میں اسی گھر میں پیدا ہوئی تھی۔ کھارادر کے میٹرنٹی اسپتال میں کام کرنے والی ایک عیسائی نرس کی نگرانی میں۔

ابا بیس سال کی عمر میں، ستمبر ۱۹۴۷ میں، کانپور سے کراچی آئے تھے، امی اور ایک سالہ ضیا (بھائی)، اور محمود بھائی کے ساتھ۔ پھر چچا اور تایا کا کنبہ آیا اور اس کے بعد دادا دادی کو بلایا گیا۔ چھوٹے تایا کانپور چھوڑنے کو تیار نہ ہوئے اور نہ ہی کوئی پھوپھا۔ لہذا چاروں پھوپھیاں اور ان گنت دوسرے رشتے دار وہیں رہے۔ نانی نانا اور ماموں ممانی امی کی خاطر پاکستان آ گئے تھے۔ دادا کا شمار مسلمانوں کے محلے کرنل گنج کے معزز لوگوں میں ہوتا تھا۔ دادا کا کپڑوں کی چھپائی، بلاک پرنٹنگ، کا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا۔ دادا نمازی پرہیزگار تھے اور انھوں نے بیٹوں کو بھی دین کی طرف راغب کیا۔ ایک مولوی بچوں کی تعلیم پر مامور تھے۔ بچے اسکول بھی جاتے، لیکن زور دینی تعلیم پر رہا۔ مولوی صاحب مغربی تعلیم کے سخت خلاف تھے اور دادا کو، بقول ابا، بھڑکایا کرتے کہ بچوں کو اسکول بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔ ابا باغی نکلے۔ مسجد سے بھاگتے۔ مولوی سے چڑتے۔ ابا کا کہنا ہے کہ ان خاندانی مولوی نے ابا کو دین کی طرف راغب کرنے کے لیے اتنا زچ کیا کہ ابا کا دل دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم سے بھی اچاٹ ہو گیا۔ چھٹی پاس کرنے کے بعد ابا نے اسکول کا دوبارہ رخ نہ کیا۔ کاروبار سے بھی ابا کو رغبت نہ تھی۔ ان کے مشغلے تھے: فلمیں دیکھنا، کتابیں پڑھنا، دوستوں میں رہنا، گھومنا پھرنا، کباڑیوں کی دکانوں میں جانا، انوکھی چیزیں، خاص طور پہ پرانے کیمرے، خریدنا اور تصویریں بنانا۔ تقسیم ہند سے پہلے ابا نے اپنی کھینچی ہوئی

ایک تصویر "السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا" کے ایک انعامی مقابلے میں بھیجی تھی جس کو انعام بھی ملا تھا۔ ابا کے پاؤں میں چکر تھا، دل میں جنوں۔ لڑکپن ہی میں ہندوستان کے کئی شہر گھوم چکے تھے۔ اکثر دادا سے جھگڑ کر گھر چھوڑ جاتے۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جب جرمنی نے برما پر حملہ کیا تو آسام خالی ہونے لگا۔ ابا نے ٹرین پکڑی اور آسام روانہ ہو گئے۔ ابا بتاتے ہیں وہ اس ٹرین میں واحد مسافر تھے۔ لڑکپن میں عشق ہو گیا تھا۔ ابا نے دھمکی دی کہ اگر اس لڑکی سے ان کی شادی نہ ہوئی تو وہ زہر کھالیں گے۔ لیکن دادا بھی ضد کے پکے تھے۔ ابا اس بات پر بھی گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ پھر ایک سال بعد امی سے ان کا بیاہ کر دیا گیا۔ امی دادا کی پسند تھیں۔

کراچی میں میٹھادر کے قریب کاغذی بازار میں بنارسی ساریوں، کمخواب، زربفت کا مشترکہ کاروبار شروع کیا گیا۔ دکان میں ایک دوچھتی ہوا کرتی تھی۔ ابا کو اب تک دکانداری سے دلچسپی نہ ہوئی تھی۔ انھوں نے دوچھتی پر دیوار سے لگے لکڑی کے کھانچوں پر اپنی جمع کی ہوئی کتابیں سلیقے سے جمائیں۔ جب ابا کراچی آئے تھے تو کتابوں سے بھرے کئی صندوق کانپور کی کسی لائبریری کو دے دیے تھے اور صرف تین چار صندوق ہی ساتھ لا سکے تھے۔ دوچھتی میں فرش اور چاندنی بچھائی گئی تھی اور گاؤتکیے رکھے ہوئے تھے۔ دکان کی یہ دوچھتی دوپہر کے کھانے اور قیلولے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ ابا یا تو دکان میں پائے ہی نہ جاتے، یا آتے بھی تو سب سے گپ شپ کر کے دوچھتی میں بیٹھ کر کتابیں پڑھا کرتے۔ گھر چھوٹا تھا اس لیے وہاں دو چار کتابوں سے زیادہ نہ رکھتے تھے۔ کتابوں کا ذخیرہ اردو ادب اور شاعری کے نسخوں، دیوانوں، "ادب لطیف"، "عالمگیر"، "ہمایوں"، "ساقی" اور دوسرے رسالوں کے انبار پر مشتمل تھا۔ پچاس کی دہائی میں پاکستان سے نکلنے والے تمام رسالوں ـــ "سویرا"، "نقوش"، "داستان گو"، "لیل و نہار"، "نصرت" وغیرہ ـــ کے شمارے ابا محنت سے سنبھال کر رکھتے تھے۔ اکثر رسالوں کی خود نیلے رنگ کی جلد بناتے اور اپنا نام emboss کرتے۔ یہ کام ابا کانپور میں بھی کرتے تھے۔ کتابوں کی دنیا سے میرا پہلا تعارف کاغذی بازار کی دکان کی اسی دوچھتی میں ہوا۔

میں جب پانچ برس کی ہوئی تو یہ مشترکہ خاندان میٹھادر سے اٹھ کر پیر الہی بخش کالونی کے ایک دومنزلہ مکان میں منتقل ہو گیا تھا جس میں لگے امرود کے پیڑوں کی پھل دار شاخیں دوسری منزل کے کمرے کی کھڑکی اور چھجے تک آتی تھیں۔ ہم بچے چلچلاتی دوپہر کی خاموشی میں کچے امرود توڑ توڑ کر کھاتے اور پیر کالونی کی خاک آلود گلیوں میں کھیلا کرتے۔ ایک سال بعد پھر نقل مکانی ہوئی۔ دادا کا انتقال ہو چکا تھا۔ محمود بھائی اپنے کنبے کے ساتھ ملیر جا بسے تھے۔ اب ہم سب لوگ شہید ملت روڈ سے متصل پنجابی سوداگران ہاؤسنگ سوسائٹی میں واقع کرائے کے دومنزلہ مکان میں اٹھ آئے تھے جس میں چار فلیٹ تھے۔ ایک فلیٹ میں دہلی کا ایک مختصر سا خاندان تھا ـــ والدین اور دو لڑکے: مسعود اور ہارون۔ باقی تین فلیٹوں میں بڑے ابا، چچا، اور ابا اپنے اپنے ڈھیر سارے بچوں کے ساتھ رہائش پذیر ہوئے۔ یہ ۱۹۵۹ کی بات ہے۔

Scanned with CamScanner

تب کراچی کی زمین ہم بچوں کے لیے ایک وسیع کائنات تھی۔ سوسائٹی میں اکا دکا مکانات تھے۔ ہماری گلی میں صرف تین مکان تھے۔ ہمارے مکان سے متصل مالک مکان، تقی صاحب، کا گھر، اور گلی کے سرے پر ایک اور مکان۔ باقی پلاٹ خالی تھے۔ دوسری گلیوں میں بھی یہی صورتِ حال تھی۔ ہر گھر کے احاطے میں اور احاطے سے باہر مختلف طرح کے پیڑ پودے ہوتے تھے۔ امرود، آم، شریفے، گلاب، چنبیلی، موتیا احاطے کے اندر، اور باہر بادام، جامن، املی، نیم، گل مہر، بوگن ویلیا۔ ہمارے گھر کے عین مقابل ایک کھنڈر سا تھا۔ غالباً کسی نے چاردیواری اٹھائی تھی، پھر کسی وجہ سے دیواریں منہدم کر دی گئی تھیں۔ اینٹوں کے ملبے، ٹوٹی ہوئی دیواروں اور خودرو جھاڑیوں میں چھپکلیاں اور گرگٹ رینگا کرتے۔ احتشام بھائی جان اور انعام بھائی (میرے تایازاد بھائی) گنیں لیے ان گرگٹوں کا شکار کیا کرتے۔ مجھ سے چھ برس بڑے ضیا بھائی کا وقت انعام بھائی کے ساتھ گزرتا۔ نورالصباح، عائشہ، احترام (تایازاد)، صبیحہ (چچازاد)، میں، عذرا اور ریاض ـــــ ہم بچوں کا غول زیادہ وقت باہر ہی منڈلاتا رہتا۔ ہم سب بہن بھائیوں کو باہر گھومنے کی یکساں آزادی تھی۔ ہم گلیوں اور سڑکوں سے سگریٹوں کے خالی پیکٹ اکٹھا کر کے ان کے قلعے اور مینار بناتے، جن کو بنانے سے زیادہ ڈھانے میں لطف آتا۔ کانچ کی چوڑیوں کے ٹکڑے چن کر انھیں آگ دکھا کر زنجیریں تیار کی جاتیں۔ تب کراچی میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اتنے نہ ہوتے تھے۔ پلاسٹک کی تھیلیوں کا رواج نہ تھا۔ کاغذ کی پڑیوں یا پھر سلے ہوئے کپڑوں کے تھیلوں میں سودا آتا۔ سڑکوں پر کاغذ، سگریٹوں کے ڈبے اور ٹوٹی پھوٹی چیزیں تو پڑی ہوتی تھیں، لیکن گیلا کچرا نہ ہوتا تھا۔

کراچی میں تتلیاں بھی بے تحاشا ہوتی تھیں۔ خاص طور پر برسات کے بعد تتلیاں امنڈ آتیں۔ ہم بچوں نے تتلیوں کو مختلف نام دیے ہوئے تھے۔ سبز اور سیاہ "بادشاہ تتلی"، نارنجی پروں پر سیاہ و سفید دھبے والی "ملکہ تتلی"، نقرئی جامنی "شہزادی تتلی"۔ انعام بھائی نے ایک چھوٹا سا جالی کا ڈبا بھی بنایا تھا جس میں وہ تتلیوں کو پکڑ کر بند کرتے۔ مجھے اور نورالصباح کو تتلیاں چھونے کا بڑا شوق تھا۔ ہم منت سماجت کر کے ڈبے سے تتلی نکلواتے پھر فخر کے ساتھ انگلیوں پر اُترے رنگ ایک دوسرے کو دکھاتے۔ بارش کے بعد میدان میں بیر بہوٹیاں امنڈ آتیں اور سب بچے ماچس کی خالی ڈبیاں لیے بیر بہوٹیوں کو پکڑنے میں شام کر دیتے۔ پھر اپنی اپنی ڈھونڈی ہوئی بیر بہوٹیاں گنی جاتیں اور پھیلی ہوئی ہتھیلیوں پر رکھی سرخ مخملی مخلوق پر انگلیاں پھیری جاتیں۔ آج ۱۹۹۵ میں یہ بات یاد کرتے ہوئے بھی عجیب سا محسوس ہوتا ہے کہ کراچی میں کبھی بچے تتلیاں اور بیر بہوٹیاں پکڑا کرتے تھے۔ یا یہ کہ کبھی یہاں قدم قدم پر بڑے بڑے سبز پتوں والے بادام کے پیڑ ہوتے تھے اور زمین پکے ہوئے سرخ باداموں سے پٹی رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ کراچی سے بادام، امرود، جامن، شریفے اور املی کے پیڑ غائب ہوتے گئے اور شہر سفیدے کی لپیٹ میں آ گیا۔

ابا اور امی دونوں ہی کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ امی بتاتی ہیں جن دنوں مجھ سے دو سال چھوٹی بہن پیدا ہوئی، امی صالحہ عابد حسین کا ناول "عذرا" پڑھ رہی تھیں۔ میرے بڑے بھائی کا، میرا اور اس بہن کا

نام مولانا احتشام الحق (جن سے دادا کے خاندانی مراسم تھے) نے تجویز کیا تھا: ضیاالدین، زینت النسا، طلعت النسا۔ طلعت ان دنوں تین چار ماہ کی ہو گی۔ نام ساتویں دن طلعت رکھ دیا گیا تھا، لیکن امی کو عذرا ناول اس قدر بھایا کہ انھوں نے طلعت کا نام بدل کر عذرا رکھ دیا۔ امی ہم بچوں کو کہانیاں پڑھ کر سنایا کرتیں۔ کتابیں خریدنے کا شوق ضیا بھائی، مجھے اور عذرا کو بھی تھا۔ ہم لوگ جیب خرچ کا زیادہ حصہ کتابیں اور رسالے خریدنے میں صرف کرتے۔ اس زمانے میں بچوں کی (اردو) کہانیاں چار آٹھ آنے، روپے دو روپے میں آ جاتی تھیں۔ انگریزی کی Archie کامکس اور رنگین، باتصویر، عمدہ نیوز پرنٹ پر چھپی fairy tales ایک روپے میں ایک ملا کرتیں۔ یہ ۱۹۶۰ کی دہائی کی بات ہے۔ ہم بچوں کی کتابیں اور رسالے تو گھر ہی میں لڑھکتے پھرتے لیکن ابا اب تک اپنی کتابیں اور رسالے کاغذی بازار میں واقع دکان کی دو چھتی ہی میں ذخیرہ کر رہے تھے۔ دو کمروں کا تنگ فلیٹ تھا اور بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد۔ ابا صرف چند ایک کتابیں دیوار میں بنی الماری میں رکھا کرتے جس کے پٹ ہمیشہ بند رہتے۔ رات کو سونے سے پہلے بستر پر لیٹ کر ابا مجھ سے الماری کھلواتے جس کی کنڈی مجھے مونڈھے پر چڑھ کر کھولنی پڑتی۔ پھر ایک کتاب نکلواتے ___ مجھے صرف ایک کتاب یاد ہے، ممتاز مفتی کی "علی پور کا ایلی"۔ یہ ایک بے حد ضخیم کتاب تھی، مجلد، اور سبز اور خاکی ڈسٹ کور پر غالباً ٹڈے بنے ہوئے تھے۔ میں یہ کتاب مونڈھے پر چڑھ کر احتیاط سے نکال کر ابا کو دیتی۔ ٹڈے کی سرورق پر بنی تصویر دیکھ کر ایک دفعہ میں نے پوچھا، "ابا، کیا یہ ٹڈے کی کہانی ہے؟" اور ابا نے ہنس کر کہا تھا، "ہاں۔" ابا سے مجھے ایک شکایت تھی۔ وہ اس کتاب کے دو چار یا آٹھ دس صفحے پڑھ کر، نشانی لگا کر، مجھ سے واپس رکھوا دیتے۔ مجھے یہ بے صبری کہ آخر ابا اسے فوراً پورا کیوں نہیں پڑھ ڈالتے۔

ابا کو گاڑی چلانے کا بڑا شوق تھا۔ وہ سیکنڈ ہینڈ گاڑی خریدتے اور ہر سال گاڑی تبدیل کرتے۔ کبھی آسٹن، کبھی ہلمین۔ فورڈ کی سفید اسٹیشن ویگن کی یاد بے حد واضح ہے۔ وہ ہم بچوں کو بہت پسند تھی۔ پچھلے حصے میں بیٹھ کر ڈکی کا دروازہ کھلا رکھا جاتا۔ خاندان کے تمام بچوں کو گاڑی میں بھر کر ابا سیر کرانے لے جاتے۔ کلفٹن میں کوٹھاری پریڈ ہم بچوں کی پسندیدہ جگہ تھی۔ ہم سب گنبد نما کھلی عمارت کے اطراف جودھ پوری پتھر کی بنی چکنی ڈھلان پر چڑھ کر پھسلا کرتے۔ اتوار کے اتوار باکس بے، سینڈز پٹ اور پیراڈائز پوائنٹ کا چکر لگتا۔ اکثر شام کو صدر میں واقع کیفے جارج میں ہم بچوں کو آئس کریم کھلانے لے جاتے۔ منگھوپیر بھی ایک دو دفعہ گئے۔ سٹی ریلوے اسٹیشن اور ایئرپورٹ بھی تفریح کی غرض سے جایا کرتے۔ ابا کے ایک دوست تھے، ایم ایف آئس کریم فیکٹری کے مالک۔ ہم بچے اکثر ابا کے سر ہو جاتے کہ ہمیں ان کی فیکٹری کی سیر کرائیں۔ فیکٹری ملیر کے مضافات میں تھی اور آس پاس ان کے امرود کے باغات ہوا کرتے تھے۔ پہلے باغ جا کر جی بھر کر امرود کھائے جاتے۔ پھر فیکٹری کی سیر کرتے ___ آئس کریم کے لالچ میں۔ آئس کریم سے نہ صرف وہیں خاطر تواضع کی جاتی بلکہ ایم ایف آئس کریم کے ڈبے بھی تحفے میں ملتے۔ ہم بچوں کا ہر شام موٹر میں سیر کرنا لازمی ہوتا۔ اگر کہیں دور نہیں تو ابا

Scanned with CamScanner

ہمیں سوسائٹی کی گلیوں ہی کے چکر لگانے لے جاتے۔ بل پارک کے قریب ایک گلابی رنگ کا بنگلہ تھا۔ گنبدوں، محرابی کھڑکیوں اور محرابی دروازوں والے اس منفرد بنگلے کے دو گیٹ تھے لکڑی کے، اور اندر بڑا سا پورچ تھا۔ ہم بچوں کو یہ گھر بڑا سحرانگیز دکھائی دیتا، بالکل پریوں کا محل۔ اس بنگلے پر اکثر سناٹا چھایا رہتا اور دونوں گیٹ ہمیشہ کھلے ہوتے۔ ابا ایک گیٹ سے گاڑی اندر گزارتے اور دوسرے گیٹ سے نکال لیتے اور ہم بچے، سحرزدہ، اس کے درودیوار دیکھتے رہ جاتے۔ گو اس بنگلے کا رنگ آج بھی گلابی ہے لیکن اب اس کے درودیوار پر اس فسوں، معصومیت اور مہمان نوازی کی جگہ کرختگی اور سرد مہری نے لے لی ہے۔ دیواریں بلند ہو چکی ہیں اور بند آہنی گیٹوں کے باہر ایک چوکیدار بیٹھا ہوتا ہے۔

سال میں ایک دفعہ ایک تفریح کا موقع بندر روڈ پر بھی ملتا۔ یہ دس محرم کو نکلنے والے تعزیے اور علم کے بڑے جلوسوں اور ماتم کے دیدار کا موقع ہوتا۔ یہاں ہم ماموں کے ساتھ جایا کرتے۔ نانا، نانی، ماموں اور ممانی اور میری ہم عمر خالہ ملیر میں رہتے تھے۔ یہ شیعہ محلہ تھا۔ آٹھ دس گھر سنیوں کے بھی تھے۔ ہم بچے آٹھ محرم سے نانی کے گھر رہنے آ جایا کرتے۔ محلے میں ہونے والی مجلسوں میں شریک ہوتے۔ چھریوں کا ماتم اور ذوالجناح دیکھنے کے چکر میں نو اور دس محرم کی راتوں کو جاگتے رہنے کی کوشش کرتے۔ جب نیند سے آنکھیں بوجھل ہونے لگتیں تو امی، نانی یا ممانی کو تاکید کر کے کہ ہمیں جلوس کے وقت ضرور اٹھائیے گا، صحن میں بچھی چارپائیوں پر پڑ کر سو جاتے۔ واقعتاً ہمیں جلوس نکلنے پر جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا جاتا اور ہم بچے دروازے کھول کر دہلیزوں پر کھڑے ہو جاتے۔ تنگ گلیوں سے جب جلوس اور ذوالجناح گزرتے تو یہ سب اتنے قریب سے دیکھنے کی عجب خوشی ہوتی۔ بندر روڈ پر البتہ گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر ماتم دیکھا جاتا۔ اس زمانے میں لوگ گھروں کے دروازے کھلے ہی رکھتے تھے۔ اور بندر روڈ پر رہنے والے اتنے مہمان نواز ہوتے تھے کہ سب کو چھتوں اور منڈیروں پر ٹک کر جلوس دیکھنے کی بخوشی اجازت دے دی جاتی تھی۔ خاص طور پر بچوں کو۔

اسی زمانے میں ابا نے سراج الدولہ روڈ کے اس پار دارالامان ہاؤسنگ سوسائٹی میں زمین خریدی۔ مکان کی تعمیر شروع ہوئی۔ اب ہم بچوں کی آوارہ گردی کا دائرہ وسیع تر ہو گیا۔ پلاٹ پر جانے کے بہانے ہم آس پاس کی گلیوں اور تھوڑے فاصلے پر واقع پہاڑی تک جانے لگے۔ یہ پہاڑی، جو اب بل پارک کہلاتی ہے، بڑے بڑے پتھروں، جنگلی جھاڑیوں، خودرو پودوں اور گھاس پھوس سے ڈھکی ہوتی تھی۔ پہاڑی پر دو تین پگڈنڈیاں ہوتی تھیں جسے لوگ سوسائٹی کے دوسرے حصے کو عبور کر کے ڈرگ روڈ (شارع فیصل) تک پہنچنے کے لیے استعمال کرتے۔ لیکن پہاڑی پر ہم بچے کبھی اکیلے جانے کی ہمت نہ کر پائے۔ احتشام بھائی جان کے پیچھے پڑتے کہ پہاڑی پر چلیں۔ اور سب بچے ان کے پیچھے پیچھے بھاگتے دوڑتے پہاڑی پر چڑھتے۔ پہاڑی کے اوپر سے دوسری طرف ڈھلان پر بنے مکانات کھلونے اور سڑک پر چلتی موٹریں ماچس کی ڈبیاں نظر آتیں۔

ہم سب بچے دہلی مرکنٹائل سوسائٹی (ڈی ایم ایس) اسکول میں پڑھتے تھے جو گھر کے قریب ہی

Scanned with CamScanner

تھا۔ جب میں پانچویں جماعت میں آئی تو لڑکیوں کی علیحدہ شاخ کھلی جو شہید ملت روڈ کے پار کوکن سوسائٹی میں واقع تھی۔ شہید ملت روڈ اس زمانے میں ایک تنگ اور ٹوٹی پھوٹی دورویہ سڑک ہوا کرتی تھی جو ڈرگ روڈ کو جیل روڈ سے ملاتی تھی۔ سڑک کی دو پٹیوں کے درمیان ایک وسیع و عریض میدان تھا۔ گھر سے اسکول تک پندرہ منٹ کا فاصلہ تھا اور ہم بچے کھیلتے کودتے، شہید ملت روڈ کا میدان پار کرتے اسکول پہنچتے۔ (یہ سڑک ستر کی دہائی کے وسط میں چوڑی ہوئی۔) اسکول کے بعد اکثر میں، نورالصباح اور دو تین سہیلیاں گھر کی طرف لوٹتے اور گھر سے آگے واقع جھیل پارک چلے جاتے۔ (یہ سوسائٹی کا وہی پارک ہے جو ستر کی دہائی کے آخر میں کٹ کٹا کر چھوٹا ہوا، اسی کی دہائی میں یہاں رہائشی منصوبہ شروع ہوا جو شہریوں کے دباؤ کی وجہ سے اب تک کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔) مجھے یہ باغ بے حد پسند تھا۔ اس کی وجہ نفاست سے تراشی ہوئی ہری بھری باڑھیں تھیں جو باغ کو چھوٹے چھوٹے چوکور احاطوں میں تقسیم کرتی تھیں۔ یہ سبز دیواریں ہمارے قد سے اونچی ہوا کرتی تھیں۔ ہم ان سبز دیواروں کے گرد گھومتے اور دنیا ومافیہا سے بے خبر اپنی دنیا میں گم ہو جاتے۔ بے شک جب ہم باغ سے واپس لوٹتے تو پوچھا جاتا کہ ہم کہاں تھے لیکن یہ ہماری ماؤں کے لیے کوئی ایسی پریشان کن بات نہ تھی۔ وہ پرسکون دور تھا کراچی کا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم بچیوں کی طرف سے ہماری اماؤں کو صرف ایک دفعہ پریشانی لاحق ہوئی تھی کہ بچیوں کے کانوں سے سونے کی نازک بالیاں کوئی اتار نہ لے۔ ہوا یوں کہ ایک دفعہ میری چھوٹی تایازاد بہن روتی ہوئی گھر پہنچی کہ ایک بابا نے اس کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار لی ہیں۔ اس واقعہ کا ردعمل صرف یہ ہوا تھا کہ ہم سب بچیوں کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار دی گئی تھیں۔ ہمارا گھومنا پھرنا اسی طرح جاری رہا تھا۔

ساٹھ کے عشرے میں طارق روڈ پر کیفے لبرٹی کے آس پاس چند دکانیں کھل چکی تھیں۔ یہ اسٹیشنری، کتابوں اور کپڑوں کی دکانیں تھیں۔ لندن بک ہاؤس، گلستان بک اسٹال، اور پچھلی گلی میں (جو اب دوپٹہ گلی ہے) ایک دو اسٹیشنری کی دکانیں اور ایک چھوٹی سی لائبریری ہوا کرتی تھی۔ طارق روڈ ہمارے گھر سے پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ میں اور عذرا ہفتے میں کئی چکر لندن بک ہاؤس اور لائبریری کے لگاتے۔ کتابوں کے علاوہ ہم دونوں کو paper dolls جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ لندن بک ہاؤس سے باقاعدگی سے یہ کاغذ کی گڑیاں خریدی جاتیں۔ ہم دونوں اکثر اکیلے ہی طارق روڈ جایا کرتے تھے۔ کتابوں کا شوق ہم اس زمانے میں ایک چلتی پھرتی لائبریری سے بھی پورا کرتے تھے۔ اس لائبریری کا مالک ایک نرم گو، شفیق چہرے والا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جو ایک سائیکل کی پشت پر بندھے بڑے سے تھیلے میں بچوں کی کتابیں ڈالے سوسائٹی میں گلی گلی آواز لگاتا گھوما کرتا۔ یہ لائبریری والا ہفتے میں دو تین دفعہ ہماری گلی میں بھی آتا۔ ہم بچے اس کا بے چینی سے انتظار کرتے۔

نیا گھر بننے میں چار پانچ سال لگے۔ وجہ مالی مشکلات تھیں۔ آخر جب کرائے کے مکان میں رہنا مشکل ہو گیا تو ابا نئے مکان میں اٹھ آئے گو کہ ابھی چھوٹے موٹے کافی کام باقی تھے۔ گھر میں گیٹ بھی نہیں لگا تھا۔ امی، ابا اور ہم بچے (اب ہم چار بہنیں اور چار بھائی تھے) نیچے کی منزل میں مقیم ہوئے اور اوپر تایا اور

Scanned with CamScanner

چچا کے کنبے آباد ہوئے۔ یہ گھر ابا نے روایتی طرز پر بنوایا تھا، یعنی بیچ میں ایک آنگن تھا جس کے تین طرف کمرے، باورچی خانہ، غسل خانہ تھا اور چوتھی سمت ایک چھوٹی سی کھلی جگہ تھی، باغیچہ نما۔ کیاری میں پیڑ پودے لگائے گئے تھے ___ رات کی رانی، دن کا راجا، چمپا اور چنبیلی ___ اور درمیان میں گھاس لگانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس باغیچے اور گیراج کے درمیان کوئی دیوار نہ تھی اور آنگن بھی کھلا تھا۔ یعنی گیٹ سے داخل ہو کر بجائے صدر دروازے کے اس کھلی جگہ سے آنگن اور پھر کمروں میں داخل ہوا جاسکتا تھا۔ مالی دشواریوں کی بنا پر ابا تقریباً تین سال تک گیٹ نہ لگوا سکے۔ لیکن ہم سب اپنے کمروں کے دروازے کھلے رکھ کر اس تمام عرصے چین کی نیند سوتے تھے۔ اب تو کراچی کے وہ دن مٹھی میں ریت کے مانند ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔

گھر کے آنگن اور اس چھوٹے سے باغیچے کے ساتھ ایک بے حد خوش کن اور منفرد یاد وابستہ ہے۔ وہ یاد ہے چارلی چپلن کی فلموں کی۔ ابا کو موسیقی، فلموں اور فوٹوگرافی کا شوق تھا۔ ابا کے پاس دو پروجیکٹر تھے۔ ایک چھوٹا سیکنڈ ہینڈ، خاموش فلموں کے لیے، اور دوسرا بڑا، جو ابا ۱۹۵۸ میں جاپان سے خرید کے لائے تھے (ابا کا بزنس کے سلسلے میں جاپان جانا ہوا تھا)۔ ابا اس زمانے میں USIS کے ممبر تھے۔ چارلی چپلن اور ڈاکیومنٹری فلموں کی ریلیں وہیں سے لائی جاتیں۔ رات کے کھانے کے بعد باغیچے کی دیوار سے لگی کپڑے سکھانے کی ڈوری پر ایک سفید دھلی ہوئی چادر لٹکائی جاتی، ابا پروجیکٹر سیٹ کرتے، چھوٹے پایوں والے نواڑ کے دو پلنگ اور گھر میں پائی جانے والی تمام کرسیاں نکال کر آنگن میں بچھائی جاتیں، آنگن اور کمروں کی بتیاں گل کی جاتیں، اور ہم بچے اپنی اپنی سیٹیں سنبھالتے۔ کیاری میں لگی رات کی رانی اور چنبیلی کی مہک سے لبریز، کراچی کی خوشگوار ہوا آنگن میں تیرتی، اور ہم سب چارلی چپلن کی مزیدار حرکتوں پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوا کرتے!

لیکن ابا کبھی ہم بچوں کو فلم دکھانے سنیما ہال نہیں لے گئے۔ ہندوستانی اور انگریزی فلمیں ابا اپنے دوستوں کے ساتھ دیکھا کرتے۔ ابا کے ان گنت جگری یار تھے ___ دہلی کے تاجر وحید صاحب، بنگال کے بیوروکریٹ عالم صاحب، بہار کے انجینیئر سید صاحب، پنجاب کے ٹھیکے دار شیخ صاحب، اور کراچی کے پارسی بلیموریا صاحب۔ سوائے ان بلیموریا صاحب کے، باقی سب کے گھروں میں امی اور ہم بچوں کا آنا جانا تھا۔ سب سے زیادہ دوستی وحید صاحب اور عالم صاحب کی فیملی سے تھی کیوں کہ ان کے بچے ہم بچوں کے ہم عمر تھے۔ سید صاحب کی نئی نئی شادی ہوئی تھی لیکن ان کی سوشیالوجی میں ایم اے پاس بیوی سے امی کی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ بلیموریا صاحب کے ہاں اولاد نہ تھی، اور غالباً ابا کا خیال ہوگا کہ امی کی دوستی مسز بلیموریا سے شاید نہ ہو پائے، اس لیے وہ ہمیں بچپن میں ان کے گھر نہیں لے گئے۔ لیکن گھر میں بلیموریا صاحب کا تذکرہ اسی زور شور سے ہوا کرتا تھا۔

امی کو بھی فلمیں دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ امی نے زیادہ تر فلمیں بیگم وحید اور بیگم عالم کے ساتھ

Scanned with CamScanner

دیکھیں۔ عالم صاحب انویسٹمنٹ پروموشن بیورو میں ڈائریکٹر ہوا کرتے تھے اور جمشید کوارٹرز میں ان کی رہائش تھی۔ وحید صاحب فریئر روڈ کے ایک فلیٹ میں رہا کرتے تھے۔ پھر انھوں نے پی ای سی ایچ ایس میں مکان بنوایا اور وہاں منتقل ہو گئے۔ اکثر دوپہر میں امی چھوٹے بچوں کو زبیدہ چچی کی نگرانی میں ایک سواتی آیا کے حوالے کر کے میرے ساتھ چپکے سے نکل آتیں۔ پھر ہم دونوں رکشا میں عالم صاحب کے گھر پہنچتے۔ مسز عالم اور ان کی بیٹی شائستہ، جو میری ہم عمر تھی، فلم دیکھنے کے لیے بالکل تیار ہوتیں۔ وہ بھی اپنے چھوٹے بچوں کو پڑوسن کے حوالے کرتیں اور ہم چاروں پیدل فلمستان یا ناولٹی سنیما پہنچتے اور سکون سے میٹنی شو دیکھا جاتا۔ اس طرح میں اسکول کے زمانے میں راج کپور اور نرگس کی پرستار بنی۔ "آہ"، "آوارہ"، "انداز"، "برسات"، اور بہت سی دوسری فلمیں دیکھیں۔ جب ستمبر ۱۹۶۵ کی جنگ کے بعد ہندوستانی فلموں پر پابندی لگی تو مشرقی پاکستان میں بننے والی اردو فلمیں "آخری اسٹیشن"، "چندا"، "چکوری"، "تلاش" وغیرہ بڑے شوق سے دیکھیں۔

عالم صاحب کے گھر ہم سب کو بہت مزہ آتا۔ سب سے بڑی شائستہ، اس سے چھوٹا شاہد اور پھر پیار (جس کا اصل نام کچھ اور تھا)، شہناز اور محمود۔ بچے تو رواں اردو بولتے لیکن مسز عالم دو چار جملے ہی بول پاتیں۔ آپس میں وہ سب ہمیشہ بنگالی بولتے۔ اکثر ہم لوگ ایک دوسرے کے گھر دعوتیں کھایا کرتے۔ ہمیں ان کی مچھی بھات ترکاری مزیدار لگتی اور انھیں امی کے ہاتھ کے پکے کھانے بھاتے۔

شائستہ اور میں تیرہ چودہ برس کے ہو رہے تھے۔ شائستہ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں اور مکھن جیسی ملائم سنہری جلد والی پرکشش لڑکی تھی اور میں ایک گول چہرے، چپٹی ناک، اور نکلتے مہاسوں والی معنک ٹین ایجر۔ شائستہ مجھے لڑکوں کی باتیں بتاتی۔ پڑوس کے لڑکے، محلے کے لڑکے، اسکول کے سامنے بس اسٹاپ پر کھڑے ہونے والے شہر کے کالجوں کے لڑکے۔ لڑکے جو اس پر عاشق تھے۔ مجھ پر کوئی عاشق نہ تھا۔ میں رشک سے شائستہ کی باتیں سنا کرتی۔ لڑکپن کی یہ گہری دوستی ۱۹۷۰ میں ایک شام اداس کن موڑ پر پہنچ کر ختم ہوئی جب عالم صاحب کا خاندان کراچی چھوڑ کر ڈھاکے جا بسا۔

۱۹۶۰ کی دہائی اور موجودہ عشرے کے درمیان تیس برس گزر چکے ہیں۔ تیس برس۔ ان تیس برسوں میں اس شہر، اس زمین آسمان اور شہر کے مکینوں کی زندگی میں کتنی تبدیلیاں آئی ہیں۔ تیس برس اتنا طویل عرصہ تو نہیں۔ یا شاید ہے۔ لیکن کیا کسی شہر کے مکیں تین عشروں میں اتنی سنگین تبدیلیوں کے متحمل ہو سکتے ہیں؟

***

Scanned with CamScanner

ملیر کی گلیاں

ملیر کی یادوں کے ساتھ ہرے بھرے پیڑ وابستہ ہیں: امرود، آم، انار، نیم، گلاب، چنبیلی، موتیا۔
ہم بچے نانی کے گھر ہر ہفتے جایا کرتے۔ نانا اور ماموں کے کوارٹر ملے ہوئے تھے۔ ہر کوارٹر میں ایک کمرہ اور ایک بڑا سا آنگن تھا۔ نانا نانی کے ساتھ خالہ رہتی تھیں، اور ماموں، ممانی اور ان کے تین بیٹے ایک ساتھ۔ دونوں کوارٹروں کی درمیانی دیوار نہ تھی لہذا یہ ایک بڑا سا گھر نظر آتا۔ نانی کے آنگن میں امرود کے تین چار پیڑ قطار سے لگے ہوئے تھے اور ایک انار کا درخت تھا۔ ماموں کی طرف ایک بڑا سا نیم کا پیڑ اور موتیا، چنبیلی، اور گلاب کی جھاڑیاں تھیں۔

چھٹیوں کی دوپہر ہم بچے درختوں پر چڑھتے، امرود توڑ توڑ کر کھاتے، آنکھ مچولی کھیلتے۔ شام کو سڑک کے اُس پار ملیر ریلوے اسٹیشن کی سیر کو جاتے اور اسٹیشن کے باہر ریل کی پٹریوں کے نیچے بنی پلیاوں کے اندر بیٹھ کر اوپر سے جاتی ہوئی ٹرین کی آواز سنتے۔ رات کو نانی چارپائیوں پر صاف ستھرے بستر لگاتیں اور ہمیں کہانیاں سناتیں۔ اور ہم تاروں بھرے آسمان کو تکتے تکتے سو جاتے۔ یہ ۱۹۶۰ کی دہائی کی بات ہے۔

تب ملیر کے ہر کوارٹر میں آنگن اور پیڑ ہوتے تھے اور گلیاں صاف ستھری۔ ہواؤں میں امرود کی مہک اور چنبیلی کی خوشبو بسی ہوتی۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے پیڑوں کو کاٹ کر اضافی کمرے بنانے شروع کیے۔ کچے آنگن پکے ہوتے گئے۔ پیڑوں کی تعداد گھٹتی گئی۔ گلاب اور چنبیلی کی جھاڑیاں بھی بتدریج کم ہوتی گئیں۔ کمروں کے باہر ٹین کے شیڈ ڈال کر برآمدے بنائے گئے۔ یہ ۱۹۷۰ کے عشرے کا ذکر ہے۔

آبادی بڑھتی رہی۔ اسّی مربع گز پر بنے ہوادار اور روشن گھر گھٹے ہوئے، چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں والے تاریک، ایک منزلہ، دومنزلہ بدصورت مکانوں میں تبدیل ہو گئے۔ گلیوں کی چوڑائی کم ہو گئی کیوں کہ لوگوں نے گھروں کے باہر ناجائز احاطے تعمیر کرلیے اور سیاہ آہنی گیٹ لگا لیے تھے۔ پیڑوں کی شاخوں کی جگہ اب ٹی وی اینٹینوں، سیاسی جماعتوں کے رنگ برنگے جھنڈوں اور ٹیلی فون کے بے ہنگم تاروں نے لے لی تھی۔ یہ ملیر کالونی تھی ۱۹۸۰ کی دہائی میں۔

اور آج، اپریل ۱۹۹۵ کی ایک صبح، میں ملیر کی ایک پکی سڑک پر چلتے ہوئے اس حصے پر قدم رکھتی ہوں جو کلاشنکوف کی گولیوں کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے چھلنی اور ایک انسان کے خون سے سیاہ ہے ـــــ وہ انسان جسے آج سے پندرہ دن قبل سڑک کے اسی حصے پر سفاکی سے قتل کیا گیا۔ میں ان تبدیلیوں کو گرفت میں لانے کی کوشش کرتی ہوں جو گزشتہ تین دہائیوں میں اس زمین اور اس زمین کے باسیوں کی روح میں در آئی ہیں۔ کتنی گمبھیر تبدیلیاں ہیں یہ۔ اور کتنا مسخ کردیا ہے انھوں نے ملیر کو، جو کبھی ایک سرسبز اور پُرامن وادی تھی، اور اس کے مکینوں کی روح کو، وہ سادہ لوح، مہمان نواز مکیں جو

پیڑوں، پھلوں، پھولوں، سبک ہواؤں اور زندگی سے محبت کرتے تھے۔

اس منظر کی تصویر میرے ذہن کے دریچے میں ثبت ہو کر رہ گئی ہے: دوپہر کا وقت ہے۔ زندگی کا کاروبار جاری ہے۔ سڑک کے کنارے بنی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں گاہک کھڑے اشیائے صرف کی خریداری میں مصروف ہیں۔ بچے گلیوں میں کھیل رہے ہیں اور عورتیں گھروں کی دہلیز پر کھڑی ایک دوسرے سے باتیں کر رہی ہیں۔ ایک کار سڑک پر رکتی ہے۔ سامنے حلوائی اور ڈرائی کلینر کی دکانیں ہیں۔ گاڑی میں سے تین مسلح آدمی اترتے ہیں، ڈکی کھولتے ہیں۔ ایک ادھ مُوئے، نیم جان، کمر تک ننگے آدمی کو نکالتے ہیں جس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے ہیں، اور اسے تپتی ہوئی تارکول کی سڑک پر پھینکتے ہیں، اس پر کلاشنکوف سے گولیوں کی بوچھاڑ کرتے ہیں، پھر اس کے چہرے پر ٹھوکر مار کر اطمینان کرتے ہیں کہ وہ مر چکا ہے یا نہیں۔ اور جب اس کا خون آلود ساکت چہرہ ایک طرف ڈھلک جاتا ہے تو گاڑی کا دروازہ کھول کر اطمینان سے بیٹھتے ہیں اور گاڑی آہستہ خرامی سے سڑک پر چلتی ہوئی لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

لاش تین گھنٹے خون کے تالاب میں ڈوبی پڑی رہی۔ وہ ایک تنومند، گھبرو جوان تھا۔ کوئی لاش کے قریب نہ پھٹکا۔ سڑک پر زندگی کا کاروبار جاری رہا۔ البتہ ایک وحشت ناک خاموشی پھیل چکی تھی۔ لوگ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ اپنے کام جلدی جلدی نمٹا رہے تھے اور لاش کو کن انکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔ آخر کار تین گھنٹے بعد ایدھی کی ایمبولینس پہنچی اور لاش اٹھا کر لے گئی۔ "ہفتہ بھر وہ لاش مُردہ خانے میں پڑی رہی۔ پھر کہیں جا کے اس کی شناخت ہوئی۔ پتا چلا کوئی فوجی تھا۔" سفید بالوں اور جھریوں بھرے چہرے والی بزرگ خاتون موضوعِ سخن سے ہٹ چلی ہیں۔ میں ملیر کے اس گھر میں بیٹھی ان کے نوجوان بھتیجے کے بارے میں بات کرنا چاہ رہی ہوں جو چند ماہ پہلے اس گھر کے اندر قتل ہوا تھا۔

"خدا رحم کرے ہم سب پر۔ ہمیں کیا ہو گیا؟ کیا ہمارے اندر شیطان حلول کر گیا ہے؟" مقتول نوجوان کی پھوپھی، تسبیح ہلاتی ہوئی، تیز تیز بولے جا رہی ہیں۔ مقتول کی ماں کسی سوئم میں گئی ہوئی ہیں اور میں گھر کی عورتوں سے بات کر رہی ہوں۔

"لوگ اتنے بے درد، اتنے بے رحم ہو گئے ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں کہ بھیڑ بکریوں کو بھی ایسے ذبح نہیں کیا جاتا..." مقتول کی چچی تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہہ رہی ہیں۔ "ساتواں روزہ تھا۔ میں ظہر کی نماز کے بعد تسبیح پڑھ رہی تھی۔ ریحان دوسرے کمرے میں نماز پڑھ رہا تھا۔ ریحان کی ماں بھی نماز پڑھ رہی تھیں۔ دودھ والا دودھ دے کر پلٹا تھا اور میں دودھ کی تھیلی ہاتھ میں لیے باورچی خانے کی طرف مڑی ہی تھی کہ اتنے میں ایک سفید کار گھر کے گیٹ پر رکی، تین آدمی بڑی بڑی بندوقیں لیے دندناتے ہوئے اندر آ گئے اور چلّا کر پوچھا: ریحان ہے؟ انھوں نے جواب کا انتظار بھی نہ کیا اور سیدھے اندر چلے گئے۔ ہمارے گھر کے ساتھ والا مکان ریحان کا ہے اور اندر سے ایک چھوٹا سا راستا ہے جو دونوں گھروں کو ملاتا ہے۔ بس وہ سیدھے اس راستے سے ہوتے ہوئے اندر چلے گئے۔ ریحان ظہر کی نماز

Scanned with CamScanner

پڑھ رہا تھا،" چچی ایک دم سے خاموش ہو گئیں۔ پھوپھی، ماں اور چچی کی چیخوں اور بچوں کی خوف زدہ ہو کر رونے کی آوازوں کے درمیان قاتلوں نے کمرے میں داخل ہو کر گولیوں کی باڑھ ماری۔ "ریحان کے ہاتھ نماز کے لیے بندھے ہوئے تھے۔ سینے پہ بندھے ہاتھوں کے ساتھ کوئی آواز نکالے بغیر گر گیا۔ بائیس گولیاں نکلی تھیں جسم سے،" وہ مجھے بتا رہی ہیں۔

"یہ سب کچھ منٹوں میں ہو گیا اور قاتل جس راستے سے آئے تھے اسی راستے واپس ہو گئے۔ دو کے منہ پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے اور ایک جو درمیانی راستے پر جم کر کھڑا ہوا تھا نقاب نہیں پہنے تھا،" چچی نے بتایا۔

"شاید آپ اسے پہچان سکیں؟" میں سوالیہ لہجے میں کہتی ہوں۔

"میں؟ نہیں۔ نہیں۔" وہ گھبرا سی گئیں۔ "مجھے اس کی شکل بالکل یاد نہیں۔ ہوش و حواس میں کہاں تھی تب۔"

"اگر پہچان بھی لیں تو کیا ریحان ہمیں واپس مل جائے گا؟ جانے والا تو گیا،" پھوپھی جلدی سے بولیں۔

پھوپھی مجھے وہ کمرہ دکھانے لے جاتی ہیں جہاں وہ قتل ہوا تھا۔ یہ ایک بہت تنگ سا کمرہ ہے جس میں صرف ایک صوفہ سیٹ ہے جو تین دیواروں کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ صوفے کی وسطی میز کو چوتھی دیوار کے ساتھ لگا کر رکھا گیا ہے اور کمرے کے وسط میں دری بچھی ہوئی ہے جس پر جائے نماز بچھائی جا سکتی ہے۔ چاروں دیواریں، اور صوفہ سیٹ گولیوں سے چھلنی ہیں۔ میں صوفے پر بیٹھی ہوں۔ ریحان کی چچی ہمارے لیے چائے لے کر آتی ہیں۔

ستائیس سالہ ریحان ایک بہن اور سات بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ ریحان کے باپ تیرہ سال پہلے طویل بیماری کے بعد فوت ہوئے۔ ریحان اس وقت آٹھویں میں تھا۔ اس نے پڑھائی جاری رکھی اور لیاقت مارکیٹ میں اپنے ماموں کی دکان میں بطور سیلزمین کام شروع کیا۔ بی کام کرنے کے بعد اس نے دوپٹوں کی دکان لگائی۔ دو چھوٹے بھائی اس کی مدد سے جمعہ بازار میں اسٹال لگاتے۔ پورے گھر کی ذمے داری اس پر تھی۔

"ریحان کے قتل کے بعد سب کچھ ختم ہو گیا۔ بھائیوں نے تین ماہ سے جمعہ بازار میں اسٹال نہیں لگایا ہے۔ ایک چھوٹے بھائی کی ذہنی حالت بگڑ گئی۔ عجیب بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔ پنڈی بھیج دیا تھا رشتے کے چچا کے پاس۔ لیکن کوئی خاص فرق نہیں پڑا ہے۔ گھنٹوں چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ خلا میں تکتا رہتا ہے۔ ہاتھ کھڑے کھڑے سینے پر باندھ لیتا ہے جیسے نماز پڑھ رہا ہو اور بڑبڑانے لگتا ہے: میرا بھائی ستائیس سال کا تھا۔ اس کی شادی ہونے والی تھی۔ اور پتا نہیں کیا کیا،" پھوپھی کہہ رہی ہیں۔

"کیا ریحان کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ تھا؟"

پھوپھی اور چچی خاموش ہو جاتی ہیں۔

Scanned with CamScanner

"ہمیں کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ آپ اس کی ماں سے بات کریں آ کر۔ وہ بتائیں گی سب۔"
ریحان کا تعلق ایم کیو ایم سے تھا، محلے کے لوگوں سے معلوم ہوا۔ تین سال پہلے ریحان کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ اٹھارہ دن بعد واپس آیا۔ "ان دنوں اس نے ایک جگہ نوکری شروع کی تھی۔ اغوا کے بعد اس نے ہمیں کبھی کچھ نہ بتایا۔ لیکن اس کے بعد سے مہینوں وہ دہشت زدہ رہا۔ ہفتوں کھانا نہ کھا سکا۔ نوالہ ہی نہیں نگلا جاتا تھا۔ ایسا خوف، ایسی دہشت تھی کہ ہم نے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کی۔ ماں اور پھوپھی کے بیچ میں لیٹ کر سوتا۔ راتوں کو گھبرا کر اٹھ بیٹھتا۔ بس کچھ نہ پوچھو کیسا کڑا وقت تھا۔ لیکن ایک تسلی تھی کہ زندہ سلامت تو ہے۔ اب تو سب کچھ ختم ہو گیا۔ یاد ہی رہ گئی ہے۔"

ملیر، اے ون ایریا۔

دیواروں میں لکھے نعروں سے اندازہ ہوتا ہے یہاں ایم کیو ایم حقیقی کا راج ہے۔ ۱۹۷۰ کے عشرے تک یہ علاقہ ایک کھلے وسیع میدان پر مشتمل تھا جس کے کنارے بیرکوں کی صرف ایک قطار تھی۔ یہ بیرکیں شیڈ کے نام سے مشہور تھیں۔ شیڈ کے آس پاس کچھ جھگیاں تھیں اور بھینسوں کے باڑے۔ یہاں پنجابیوں، سندھیوں اور مہاجروں کی ملی جلی آبادی تھی۔ ۱۹۸۰ کی دہائی کے اوائل میں یہ علاقہ دلالوں کے ہاتھ میں آیا جو علاقے میں جلد ہونے والی قانونی پلاننگ کے منتظر تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہاں کچے گھروں کی قطاریں کھڑی ہو گئیں۔ ۱۹۸۰ کی دہائی کے وسط میں ساٹھ مربع گز کے پلاٹوں کی حد بندی شروع ہوئی۔ شیڈوں کو منہدم کیا گیا اور پرانے مکینوں کو نئے پلاٹ الاٹ ہوئے۔ لیکن ان گنت پلاٹ دلالوں کے ذریعے کراچی کے دوسرے علاقوں سے آنے والے لوگوں کے ہاتھوں فروخت کیے گئے اور یوں اے ون ایریا ۱۹۸۰ کی دہائی کے تین خطرناک عناصر ــــ ہتھیار، ہیروئن اور ایم کیو ایم ــــ کی پناہ گاہ بن گیا۔ ۱۹۹۲ کے وسط میں ہونے والے واقعات ــــ آپریشن کلین اپ اور حقیقی کی پیدائش ــــ نے بارود کا کام کیا۔

"ہم ملیر میں ۳۵ سال سے ہیں لیکن ایسے حالات نہیں دیکھے۔ یہ ایم کیو ایم کی دھڑے بندی تھی جس نے ہم سب کو برباد کیا۔ لالوکھیت، کورنگی اور دوسرے علاقوں سے ایم کیو ایم کے لڑکے چھپنے کے لیے یہاں اٹھ آئے۔ چھپنے چھپانے والوں نے ہمارے علاقے کا ستیاناس کیا۔ اب یہ لڑکے بندوقیں اٹھائے گلیوں میں دندناتے پھرتے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ڈاکے ڈالتے ہیں۔ بھتا لیتے ہیں۔

"سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ یہاں انسانوں کی کوئی عزت نہیں رہی۔ ہماری گلی میں ایک بوڑھا، سفید کھچڑی بال، سبزی کا ٹھیلا لگاتا ہے۔ اسے ان لڑکوں سے التجا کرنی پڑتی ہے۔ ہاتھ باندھ کے وہ ان اٹھارہ اٹھارہ برس کے لڑکوں سے کہتا ہے: سر جی، پھیری لگا لوں؟ ایک ہفتہ ہوا، ان لڑکوں نے پنساری کی دکان لوٹ لی۔ گلی کے بچوں میں لوٹی ہوئی ٹافیاں اور دو دو روپے تقسیم کیے اور کہا: بولو، حقیقی زندہ باد۔ ہمارے دودھ والے نے میرے میاں کو بتایا کہ لڑکے اس سے دس ہزار مانگ رہے ہیں۔

کہ اسلحہ خریدنا ہے۔ غریب دودھ والا دس ہزار کہاں سے لاتا۔ بے چارہ یہ علاقہ چھوڑ گیا۔ خدا جانے اب کہاں دودھ بیچتا ہو گا۔

"تو یہ حال ہے ہمارے علاقے کا۔ یہ غنڈے بدمعاش جن کے منہ سے ابھی دودھ کی بو آتی ہے، نہ صرف یہ کہ بھتا مانگتے ہیں بلکہ تمھارے منہ پر کہتے ہیں کہ اسلحہ ختم ہو گیا ہے، بندوقیں لانی ہیں، گولیاں خریدنی ہیں،" سکینہ، عمر پچپن کے لگ بھگ، مادری زبان پنجابی، سانس لیے بغیر بول رہی ہیں۔ تین سال کے عرصے میں سکینہ نے اس علاقے کا جو اخلاقی اور معاشرتی زوال دیکھا ہے، اس نے ان کا سر چکرا دیا ہے۔

میں ان کے گھر میں اپنی خالہ کے ساتھ ان کے بیٹے کا حال پوچھنے آئی ہوں جو گلی میں چلنے والی گولیوں سے شدید زخمی ہوا تھا۔ میری خالہ گورنمنٹ کے ایک محکمے سے وابستہ ہیں اور اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اس علاقے میں رہتی ہیں۔

"اس دن بہت فائرنگ ہو رہی تھی۔ احمد نے ہم سب کو اندرونی کمرے میں جانے کو کہا اور برآمدے میں آیا کہ گیٹ بند کر لے۔ خدا جانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے گیٹ ذرا سا کھول کر باہر جھانک لیا۔ ایک گولی اس کی دائیں آنکھ کے اوپر لگی اور وہ وہیں گر پڑا۔ باہر لڑکوں کی آوازیں آنا شروع ہوئیں: احمد بھائی کے گولی لگ گئی، فائرنگ بند کرو، فائرنگ بند کرو۔ فائرنگ بند ہو گئی۔ چند لڑکے ہماری مدد کو آئے اور احمد کو جناح اسپتال پہنچایا گیا۔ دوسرے دن دو تین لڑکے میرے پاس آئے اور کہنے لگے: خالہ معاف کرنا، لیکن یہ ہماری گولی نہیں تھی جو احمد بھائی کو لگی۔ ذرا دیکھو ان کی ہمت۔ اور ہماری بے بسی! کیا کر سکتے تھے ہم؟ اگر وہ لڑکا بھی، جس کی بندوق سے چلی ہوئی گولی احمد کو لگی، ہمارے پاس آ جاتا تو ہم کیا بگاڑ سکتے تھے اس کا؟ کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ کوئی ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا۔ اور اٹھائے بھی کیسے؟ کوئی دو لفظ بول دے تو جان سلامت نہیں،" سکینہ کہہ رہی ہیں، "ہر حال میں جیے جانے کی ہوس نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا..." وہ چپ ہو جاتی ہیں۔

"جس دن میرے بھائی کو گولی لگی جی چاہتا تھا پورے اے ون ایریا کو جلا کر راکھ کر دوں،" احمد کی چھوٹی بہن کی آواز غصے سے کپکپاتی ہے۔ وہ بی اے پاس ہے اور ایک دواساز کمپنی میں کام کرتی ہے۔ اس کی دو چھوٹی بہنیں سامنے دری پر بیٹھی مٹر کی پھلیاں چھیل رہی ہیں۔

یہ چھ بہنیں اور تین بھائی ہیں۔ احمد سب سے بڑا ہے۔ دو بہنیں نوکری کرتی ہیں۔ باپ کبھی فوج میں سپاہی تھے۔ اب معمولی پنشن ملتی ہے۔ احمد ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ پھر اسے فیکٹری سے نکال دیا گیا۔ فیکٹری نقصان میں جا رہی تھی لہذا تیس آدمیوں کی چھٹی ہوئی۔ "ایک دفعہ احمد نے باہر جانے کی کوشش کی۔ آٹھ ہزار مانگ تانگ کر کسی ایجنٹ کو دیے۔ لیکن یونان والوں نے پکڑ کر واپس بھیج دیا۔" احمد دو سال سے بے روزگار ہے۔

میں خالہ کے ساتھ ملیر کی گلیوں سے گزر رہی ہوں۔ "اس علاقے میں بہت اسلحہ ہے۔ چند ایک

Scanned with CamScanner

خالی گھر ہیں جہاں لڑکوں نے قبضہ کیا ہوا ہے۔ یہ گھر اسلحہ ڈپو بنے ہوئے ہیں۔ کبھی ان گھروں کے دروازے کھلے ہوتے ہیں اور قطار سے لگی ہوئی بندوقیں، کلاشنکوفیں اور گولیوں کی پیٹیاں ہر آنے جانے والے کو صاف نظر آتی ہیں۔ بندوقیں لٹکائے یہ لڑکے گولیوں کی پیٹیاں ادھر سے اُدھر پہنچاتے رہتے ہیں۔ آج کل البتہ یہ لڑکے روپوش ہیں۔ جب سے دو امریکی مارے گئے ہیں، تب سے ذرا سکون ہے۔

"یہاں دو بدنام ترین لڑکے ہیں حقیقی کے۔ ایک کو تو پولیس گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ محلے والوں نے سکون کا سانس لیا کہ چلو ایک تو کم ہوا۔ لیکن ایک ہفتے بعد وہ لڑکا واپس گلیوں میں گھوم رہا تھا اور فخریہ انداز میں لوگوں کو بتا رہا تھا، دو لاکھ روپے دیے ہیں۔ ان لڑکوں نے کمسن بچوں کو تنخواہ پر رکھا ہوا ہے جو پولیس یا دوسرے گروپ کے لڑکوں کے آنے کی اطلاع انہیں وقت پر پہنچاتے رہتے ہیں۔ یہ بچے بڑے ہو کر کیا کر سکیں گے؟ ہمارے محلے میں الطاف گروپ سے کسی کو کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ لیکن حقیقی والے ان سے بھی بدتر ثابت ہوئے ہیں۔"

ہم ایک گھر میں داخل ہوتے ہیں جس کا سربراہ، ایک ادھیڑ عمر کا آدمی، پانچ بیٹوں اور پانچ بیٹیوں کا باپ، دو ماہ پہلے فائرنگ میں ہلاک ہوا ہے۔ بیوہ کسی کام سے باہر گئی ہوئی ہیں۔ میں لڑکیوں سے بات چیت کر رہی ہوں۔ سب سے بڑی لڑکی بیس سال کی ہے۔ "اس دن ابا سہ پہر میں گلی کی نکڑ پر مکینک کی دکان سے اپنی اسکوٹر ٹھیک کروا رہے تھے کہ کچھ مسلح افراد گاڑی میں آئے اور گولیاں برسا کر چلے گئے۔ مکینک تو اسی وقت ختم ہو گیا۔ ابا زخمی حالت میں سڑک پر پڑے رہے۔ کوئی اٹھانے نہیں آیا۔ اتفاق سے میرے بھائی نے اس دن فیکٹری سے چھٹی کی تھی۔ جب گولیاں چلنی بند ہوئیں تو وہ باہر نکلا۔ دیکھا ابا سڑک پر پڑے ہوئے تھے۔ بہت خون بہہ گیا تھا۔ اسپتال جاتے وقت راستے میں ختم ہو گئے۔

"میرے ابا اور بھائیوں کا کسی بھی پارٹی سے تعلق نہیں رہا، لیکن ابا کی موت کے بعد ایم کیو ایم اور حقیقی دونوں تنظیموں نے دعویٰ کیا کہ ابا ان کے پارٹی کے ہمدرد تھے۔ یہ جھوٹ تھا۔ بعد میں جب اخبار سے لوگ آئے تو بھائی نے کسی سے بات نہ کی۔ کیا فائدہ ان سب باتوں کا؟ الٹا نقصان ہی پہنچ سکتا ہے۔ ایک آدمی نے کہا میں دستاویزی فلم بنا رہا ہوں دنیا بھر میں دکھانے کے لیے کہ کتنا ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔ لیکن میرے بھائیوں نے منع کر دیا۔"

ہم چارپائی پر بیٹھے ہیں اور بچے ہمارے گرد گھیرا ڈالے کھڑے خاموشی سے ہماری باتیں سن رہے ہیں۔

"ابا موٹر سائیکل پر دکانوں کو مال سپلائی کیا کرتے تھے،" وہ مجھے بتا رہی ہے۔ اب گیارہ افراد پر مشتمل اس خاندان میں دو کمانے والے ہیں۔

"جب بھی فائرنگ ہوتی تھی ابا کہتے دروازہ بند کر لو، باہر نہ نکلو۔ بہت ڈرتے تھے۔ ہنگاموں سے دور رہتے تھے۔ دو دن پہلے ہی کہا تھا کہ کھڑکیوں دروازوں میں لوہے کی جالی لگوا لیں گے۔ بہت وارداتیں ہو

رہی ہیں۔ کسی کو کیا معلوم تھا خود ہی واردات کا شکار ہو جائیں گے۔"

کیا حکومت کی طرف سے کوئی معاوضہ وغیرہ ملا؟ "ہمیں صرف ایف آئی آر کی کاپی ملی جو پولیس نے خود درج کی تھی۔ اور ابا کی موت کا سرٹیفکیٹ جو اسپتال والوں نے دیا۔"

"لیاقت آباد میں بھی بہت برا حال ہے، جہاں میں رہتی ہوں۔ لیکن یہاں کے حالات تو بہت ہی خراب ہیں، "ایک بوڑھی خاتون جو گھر میں مہمان آئی ہیں بتانے لگیں۔ "دو مہینے پہلے میں یہاں آئی تھی۔ بس سے اتر کر گلی میں داخل ہوئی۔ میری نظریں اتنی کمزور ہیں کہ میں صرف زمین کی جانب نظریں جمائے رکھتی ہوں کہ کسی پتھر سے ٹھوکر نہ کھاؤں۔ ادھر اُدھر تو دیکھتی نہیں..." انھوں نے موٹے شیشوں والا چشمہ درست کیا، اور بولیں، "بس جب گلی میں داخل ہوئی اور نظر اٹھائی تو دیکھا تین لڑکے یہ لمبی لمبی بندوقیں کندھوں پر لٹکائے کھڑے ہیں۔ میں وہیں بت بن گئی۔ مجھ سے اگلا قدم اٹھائے نہ اٹھے۔ خوف تھا کہ بلی اور ان لڑکوں نے گولی چلائی۔ ایک لڑکے نے میرے سفید بالوں اور جھکی ہوئی کمر کو دیکھتے ہوئے کہا، اماں ڈر گئیں؟ میں بولی، بیٹا ڈروں کیسے نہیں؟ بندوق جو اٹھائے ہوئے ہو۔ بولا، اماں تم تو پہلے ہی مری ہوئی ہو۔ تمھیں کیا ماریں!"

ہم تنگ گلیوں سے گزر کر خالہ کے گھر واپس لوٹتے ہیں۔ "یہاں منشیات کا مسئلہ بھی ہے،" خالہ کہتی ہیں۔ ایک مکان کے باہر بنے ہوئے چبوترے پر ایک آدمی بیٹھا ہے ــــ سرخ آنکھیں، گالوں کی ہڈیاں نکلی ہوئی، خالی الذہن، خلا میں گھورتا ہوا۔

"کچھ لوگ کھلم کھلا بیچتے ہیں ہیروئن۔ ایک پکڑا بھی گیا تھا۔ لیکن چھوٹ کے آ گیا۔ اس کا بھائی وکیل ہے۔"

میری خالہ کو حالات سے باخبر رہنا پڑتا ہے۔ ان کے بچے چھوٹے ہیں اور اسکولوں کالجوں میں پڑھ رہے ہیں۔ بڑی بیٹی کراچی یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ہے۔ دو لڑکوں نے تکنیکی ڈپلومے لیے ہیں اور اب ٹیکسٹائل ڈیزائن کا کام شروع کیا ہے۔ خالہ کی زندگی جدوجہد کی داستان ہے۔ خالو کی مسلسل بیماری کی وجہ سے گھر بار کا پورا بوجھ ہمیشہ خالہ پر ہی رہا۔

"اور اب میں سوچنے لگی تھی کہ چلو بچوں کی تعلیم ختم ہونے کو آ رہی ہے اور وہ برسرِ روزگار ہونے لگے ہیں۔ سکون سے بقیہ دن گزر سکیں گے۔ لیکن اب یہ گھر ہے، اور ہم..." خالہ ہرے بھرے گملوں پر نظر ڈالتی ہیں۔ برآمدے میں سیمنٹ کی چادر ڈلوا کر لوہے کی جالی لگوائی ہے۔ سفید پینٹ تازہ ہے۔ "اور یہ محلہ... جو تیزی سے تباہی کے گڑھے میں گر رہا ہے۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میں دلدل پہ چل رہی ہوں۔ بس ایک تسلی ہے، اگر اسے تسلی کہہ لو، کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ ہم سب ہی اس دلدل میں دھنستے جا رہے ہیں۔ شاید آگے دلدل ختم ہو جائے اور زمین مضبوط، کون جانے..."، خالہ کے چہرے پہ ایک موہوم سی مسکراہٹ ہے۔

***

کورنگی کی کہانی

صبح کے نو بجے ہیں۔ وسط مارچ کے سورج کی چمکیلی کرنیں فضا کو آہستہ آہستہ گرما رہی ہیں۔ میں پُل پر سے ہوتی ہوئی کورنگی انڈسٹریل ایریا سے گزر رہی ہوں۔ دورویہ چوڑی سڑک کے دونوں اطراف ملیں اور فیکٹریاں ہیں۔ کراچی کے سائٹ ایریا کے برخلاف، جہاں غیر ملکی کمپنیوں نے فیکٹریوں کے اردگرد پیڑ پودے، گل بوٹے لگا کر علاقے کو سرسبز کر دیا ہے، کورنگی انڈسٹریل ایریا بنجر اور خاک آلود ہے۔ یہاں دو چار ہی غیر ملکی کمپنیوں کے پلانٹ ہوں گے۔ اکثریت مقامی کارخانوں کی ہے۔ فیکٹریوں کے باہر کہیں کہیں گھاس کے قطعے ہیں اور پودوں کی دو چار قطاریں نظر آتی ہیں، گویا کسی نے بادلِ ناخواستہ کوشش کی ہو اس علاقے کو خوش نما بنانے کی اور پھر پھولوں کی کیاریوں کو تنہا چھوڑ گیا ہو۔

واقعی کورنگی اب ویران اور تنہا رہ گیا ہے۔

تنہا اور زخم خوردہ۔ خوف و دہشت اور نفرت و جنوں کے جال میں الجھا ہوا۔

کراچی کے غیر متاثرہ علاقوں کے مکینوں کے لیے کورنگی، جو کبھی شہر کا ایک چلتا پھولتا، پُرامن علاقہ تھا، آج اخبار کی صرف ایک کالمی روزانہ سرخی میں سمٹ کر گم ہو گیا ہے: "گولیوں سے چھلنی ایک لاش کورنگی میں پائی گئی۔"

ٹریفک کم ہے۔ دور دور تک کوئی پیدل چلتا ہوا نظر نہیں آتا۔ ایک پیلی ٹیکسی سڑک کے کنارے رکتی ہے اور ایک مرد چشمہ لگائے، پینٹ اور ٹائی میں ملبوس، بریف کیس ہاتھ میں لیے، ٹیکسی سے اترتا ہے اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا فیکٹری کے گیٹ کے اندر غائب ہو جاتا ہے۔ میں گاڑی روکتی ہوں اور ٹیکسی ڈرائیور سے راستا پوچھتی ہوں۔ "تیسرے چوراہے پر دائیں ہاتھ کو مڑیں۔ وہی ڈھائی نمبر کورنگی ہے۔" میں گاڑی اسٹارٹ کرتی ہوں۔

یہ کورنگی کا رہائشی علاقہ ہے۔ سڑک پر جا بجا گڑھے ہیں۔ ٹوٹے پھوٹے فٹ پاتھ پر لوگ چل رہے ہیں۔ کہیں کہیں بس کے انتظار میں لوگ کھڑے ہیں۔ سڑک کے وسط میں بنی سبز پٹی کیچڑ اور کوڑے کرکٹ سے اٹی ہوئی ہے۔ بچے کھیل رہے ہیں۔ میں گاڑی آہستہ کرتی ہوں اور لوگوں سے پتا پوچھتی ہوئی آگے بڑھتی ہوں۔ ایک مرد، ایک لڑکا اور دو برقع پوش عورتیں باری باری مجھے پتا سمجھاتی ہیں۔ میں اب بائیں ہاتھ کی سڑک پکڑتی ہوں۔ سڑک کے ایک طرف کیکر کی جھاڑیاں ہیں اور دوسری طرف ٹریفک: ایک سائیکل، ایک گدھا گاڑی اور ایک ٹیکسی۔

کورنگی ٹاؤن شپ کی بنیاد یونانی مشیروں کے تیار کردہ گریٹر کراچی ریسیٹلمنٹ پلان کے تحت ۱۹۵۹ میں کیے گئے ایک سروے کے بعد ڈالی گئی تھی۔ اُس وقت کراچی میں ایک لاکھ انیس ہزار بے گھر خاندان تھے جو شہر کے مرکز میں جھونپڑیوں اور کچے گھروں میں رہ رہے تھے۔ ۱۹۶۰ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ وسطی شہر کو جھگیوں سے صاف کیا جائے اور ان خاندانوں کو شہر کے مرکز سے اٹھا کر پندرہ

Scanned with CamScanner

میل پرے کورنگی اور نیو کراچی میں آباد کیا جائے۔ یہ بھی طے پایا کہ حکومت ایک کمرے والے ۴۵ ہزار مکانات بنائے گی۔ لیکن ۱۹٦۴ تک صرف دس ہزار مکانات بنے تھے اور یہ منصوبہ ناکام قرار پا کر سرد خانے کی نذر ہو چکا تھا۔ کورنگی میں رہائشی کالونی کے ساتھ ساتھ انڈسٹریل ایریا کی بھی داغ بیل ڈالی گئی تھی تاکہ کورنگی کے مکینوں کو روزگار کے لیے شہر نہ آنا پڑے۔ لیکن انڈسٹریل ایریا میں کارخانے اتنی تیزی سے نہ لگ پائے۔

یہ بستی پینتس سال پرانی ہے۔

میں شمشاد بھائی کا گھر تلاش کرتی ہوں۔ ان کا گھرانہ بیس سال سے کورنگی میں مقیم ہے۔ ان کی بیوی شکیلہ سے میں نے فون پر بات کی ہے اور انھوں نے مجھے کورنگی کے دو چار متاثرہ خاندانوں میں لے جانے کی ہامی بھری ہے۔ یہ وہ خاندان ہیں جو کراچی کے حالیہ پُرتشدد واقعات سے براہِ راست متاثر ہوئے ہیں۔

شمشاد بھائی کراچی کے مختلف علاقوں کے مکانوں میں رنگائی کا کام کرتے ہیں اور عام طور پر گھر رات ہی کو پہنچ پاتے ہیں۔ ان کے نو بچے ہیں: تین لڑکے اور چھ لڑکیاں۔ سب سے بڑا لڑکا ۲۳ سال کا ہے اور نیوی میں ملازمت کرتا ہے۔ انیس سالہ علی گھر کے قریب کرائے پر لی ہوئی کریانے کی دکان پر بیٹھتا ہے۔ نویں جماعت کے بعد اس نے پڑھائی چھوڑ دی ہے۔

میں شکیلہ سے باتیں کرتی ہوں۔ ہم علی کے دوست نعمان کا انتظار کر رہے ہیں جو ہمیں ایک خاتون کے پاس لے جانے والا ہے جس کا انیس سالہ بیٹا دہشت گردوں کے ہاتھوں بیس دن پہلے قتل ہوا ہے۔

شکیلہ کی بیٹی نے دالان کی ابھی ابھی دھلائی کی ہے۔ دوسری بیٹی کمروں کے فرش پر پوچا لگا رہی ہے۔ یہ تین کمروں والا ۸۰ مربع گز پر بنا مکان ہے۔ گیٹ کے چھوٹے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھلا ہوا ہے۔

"دوسرے علاقے کے لوگوں کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ہم یہاں کیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ مسلسل خوف، فکرواندیشے اور ذہنی تناؤ نے ہماری زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔" وہ کہہ رہی ہیں۔ اُن کی آٹھ سالہ بیٹی محاصرے کی رات کے بعد بخار میں ہفتوں پھنکتی رہی۔ "پلنگ سے لگ گئی تھی۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو کانوں میں انگلیاں دیے رہنے لگی۔ ذرا سی آواز پر پلنگ کے نیچے چھپ جاتی، ہر وقت میرا دامن پکڑے رہتی۔ ڈاکٹر کے پاس لے گئی تو اس نے کہا: بچی کے دل میں ڈر بیٹھ گیا ہے۔"

میں بچی کو دیکھتی ہوں ـــــ دبلی پتلی، آنکھوں کے گرد حلقے، اور ہلکی سی سُرخی۔ لگتا ہے بہت دنوں تک روتی رہی ہے۔

"میرا بیٹا جو کریانے کی دکان پر بیٹھتا ہے، خاموش رہنے لگا ہے۔ بہت خوش مزاج بچہ تھا۔ ہمیشہ چہکتا رہتا تھا۔ اب تو چپ لگ گئی ہے۔ لیکن یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میری بڑی بہن کا گھرانہ بےحد پریشان

Scanned with CamScanner

ہے۔ ان کا سب سے بڑا بیٹا اسپتال میں نفسیاتی ڈاکٹر کے زیر علاج ہے۔"

شکیلہ کی بڑی بہن پڑوس میں رہتی ہیں۔ ہم ان کے گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ چھوٹے سے دالان کو ابھی پانی سے دھویا گیا ہے۔ غالباً کورنگی میں پانی کی قلت نہیں ہے، میں سوچتی ہوں اور خاتون خانہ سے ہاتھ ملاتی ہوں۔

"ایک شام دیکھا ننگے پیر گھر چلا آ رہا ہے۔ پیر مٹی میں اٹے ہوئے، خراشیں پڑی ہوئیں۔ پوچھا جوتے کہاں گئے۔ کہنے لگا، امی، فقیر کو دے دیے۔ دوسرے دن گھڑی اتار کر کسی کو دے آیا۔ اپنے کپڑے بانٹنے شروع کر دیے۔ کہتا تھا غریبوں کو دے رہا ہوں۔ سکون ملتا ہے مجھے۔ پھر گھر کی چیزیں اٹھا اٹھا کر دینے لگا۔ برتن بھانڈے، ٹیپ ریکارڈر، بہن بھائیوں کے کپڑے، جوتے..." سراج کی ماں مجھے دھیمے لہجے میں بتا رہی ہیں۔ سفید اور سرمئی بال ملگجے ململ کے دوپٹے سے ڈھکے ہوئے، اندر کو دھنسی ہوئی بے رونق شربتی آنکھیں، جو گھیرے حلقوں کے باعث گول اور مزید نمایاں ہو گئی ہیں۔ رخسار کی ہڈیاں نکلی ہوئی، چہرے پر باریک باریک لکیروں کا جال بچھا ہوا ــــ کرب اور دکھ اور گزرے ہوئے برسوں کا جال۔ ساٹھ برس کی ہوں گی لیکن ستر پچھتر کی لگ رہی ہیں۔

"پہلے تو میں سمجھا شاید تکبر آ گیا ہے لڑکے میں۔ انا پیدا ہو گئی ہے اس کے اندر۔ کیوں کہ میں کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا تو میری بات کاٹ دیتا۔ زور زور سے بولنے لگا تھا،" سفید شلوار کرتے میں ملبوس، گھٹے ہوئے بالوں پر سفید ٹوپی اوڑھے ہوئے، خشخشی ڈاڑھی والے بزرگ، سراج کے والد، کہہ رہے ہیں۔

"تو کیا گھر میں توڑ پھوڑ بھی..." میں نے پوچھنا چاہا۔

"نہیں، ایسی بات نہیں تھی۔ توڑ پھوڑ نہیں کی کبھی اس نے،" انھوں نے بتایا۔

"آفس جانا تو چھوڑ دیا ہوگا،" میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"آفس وہ برابر جاتا رہا۔ لیکن وہاں بھی یہی باتیں شروع کر دی تھیں: امن چاہیے، سکون چاہیے۔ بس ایک ہی رٹ لگ گئی تھی۔ امن چاہیے، امن چاہیے،" سراج کی اماں بتا رہی ہیں۔

"دراصل لاشیں دیکھ کر اسے کچھ ہو گیا تھا۔ ندی کے راستے اسکوٹر پر آفس آتا جاتا تھا نا۔ روز شام مجھے آ کر بتاتا: امی، آج ایک لاش پڑی ہوئی تھی، گولیوں سے چھلنی، چہرہ اُڑا ہوا۔ کیسے تڑپ تڑپ کر جان دی ہو گی۔ اور پھر جب محاصرہ ہوا، علاقے کے تمام لڑکوں اور مردوں کو فوجی لے گئے۔ اُس کو بھی لے گئے۔ حالاں کہ اس نے اپنا پی اے ایف کا کارڈ دکھایا تھا۔ چھوڑ تو اُسی دن دیا، لیکن اس کے بعد سے ہی اس نے الٹی سیدھی باتیں کرنا شروع کر دیں اور گھر کا سامان باہر لے جا کر بانٹنے لگا۔"

"دس بارہ ہزار کا سامان بانٹ دیا۔ چھوٹا سا گھر بار ہے ہمارا۔ یہاں ہر چیز ضرورت ہی کی خریدی جاتی ہے۔ بے ضرورت چیزیں تو ہیں نہیں کہ بانٹنا شروع کر دیں اور کوئی فرق نہ پڑے۔ دس بارہ ہزار کا سامان بانٹ ڈالا اس نے،" بزرگ نے دہرایا۔ سراج کی اماں نے پہلو بدلا۔ شاید وہ سامان کی مالیت کے بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتیں۔

Scanned with CamScanner

میں سوچتی ہوں: اس چھوٹے سے گھر کے مکینوں پر اُن دنوں کیا بیتی ہو گی؟ گھر کے باہر قتل وغارت گری، دہشت گردی کی فضا، ایم کیو ایم الطاف گروپ، حقیقی، پولیس اور رینجرز کے درمیان گولیوں کی بوچھاڑیں، پولیس اور نامعلوم دہشت گردوں کے آپس میں مسلح مقابلے، گلیوں میں موت کے سائے۔ اور پھر محاصرے کی پیدا کردہ دہشت: گھروں کے اندر فوجیوں کا دندناتے ہوئے گھسنا، گھر کی چیزوں کو تہس نہس کرنا، الماریوں، صندوقوں کا سامان باہر پھینکنا ـــــ ان ہتھیاروں کی تلاش میں جو وہاں نہیں ہیں، مکینوں کی فکر اور تشویش: اگر بیٹے کو اٹھا کر لے گئے تو کیا ہو گا؟ کیا کریں گے؟ کس کے پاس فریاد لے کر جائیں گے؟ کیسے یقین دلائیں گے کہ اس کا ایم کیو ایم سے کوئی تعلق نہیں؟ کیسے اس کی بے گناہی ثابت کریں گے؟ نہ کسی صاحب اختیار کی سفارش ہے اور نہ جیب میں رقم۔ اگر لے گئے تو اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ زندہ واپس آئے گا کہ نہیں؟ اور گھر میں سب سے بڑے کماؤ پوت کی بہکی بہکی باتیں، گھر کی اشیا کو غریبوں میں تقسیم کرنا، باپ کی سرزنش، بیٹے کی اونچی ہوتی ہوئی آواز، چھوٹے بہن بھائیوں کا سہم کر دبکنا اور ماں کی سرگوشیاں: "جانے دیں... چھوڑیں بھی... غریبوں ہی کو تو دے رہا ہے، کوئی گناہ تو نہیں کر رہا..."

"دس بارہ دن بعد مجھے احساس ہوا کہ اس کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ میں اسپتال لے گیا اسے۔ ایرفورس کا اسپتال۔ ماری پور میں ہے۔ ڈاکٹر نے پوچھا، کیا چاہتے ہو؟ اس نے کہا، میں امن چاہتا ہوں، صرف امن۔ ڈاکٹر نے سوال کیا، امن کیسے قائم کیا جائے؟ بندوق سے؟ کلاشنکوف سے؟ اس نے کہا، نہیں۔ صرف پیار محبت سے۔ ڈاکٹر نے کہا، اسے داخل کرنا پڑے گا۔"

سراج کو اسپتال میں داخل ہوئے ڈھائی ماہ ہو چکے ہیں۔

سراج کی عمر ۲۵ سال ہے۔ گزشتہ سات سال سے پاکستان ایر فورس میں ملازمت کر رہا ہے۔ "کاغذ پر اس کی نوکری انجن مکینک کی لکھی ہے،" والد نے میرے دریافت کرنے پر بتایا۔ "لیکن وہ آفس میں کام کرتا ہے،" انھوں نے آفس پر زور دے کر کہا۔

"بی اے پارٹ ون کا امتحان پاس کر چکے ہیں۔ کمپیوٹر کورس بھی کیا ہوا ہے بھیا نے"، چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے سولہ سالہ چھوٹی بہن بولی۔ چمکتی ہوئی شربتی آنکھیں، ناک میں لونگ، گالوں پر مہاسے، سر پر قرمزی چُنری۔ وہ ماں کے پہلو سے لگی چارپائی پر بیٹھی ہوئی ہے اور والد صوفے کے دوسرے کنارے پر۔ کمرے کی دیواریں سبز ہیں۔ فرج کونے میں رکھا ہے، ٹی وی سامنے اور ٹیلی فون تپائی پر دھرا ہے۔

بی اے کا امتحان کیا ملازمت کے دوران دیا؟ "ہاں، بڑا محنتی اور ذہین لڑکا ہے۔ ایر فورس کے کچھ تکنیکی کورسز بھی کر چکا ہے۔" والد کے چہرے پر ٹھیراؤ کی کیفیت ہے۔ لکیروں کا جال ابھی اتنا گہرا نہیں ہوا ہے۔

سراج کے ماں باپ ۱۹۴۹ میں پاکستان آئے تھے۔ ابتدا میں کراچی ایرپورٹ کے قریب جھگیوں میں رہے، پھر ملیر اٹھ آئے۔ "۱۹۷۵ میں ہم نے ایک چھوٹا سا پلاٹ خریدا اور یہاں مکان

Scanned with CamScanner

بنوایا۔ اس زمانے میں کورنگی میں امن وامان تھا۔ ۱۹۸۵ کے بعد ایم کیو ایم یہاں بے حد مقبول ہو گئی۔ لیکن اُس وقت بھی سکون تھا۔ لڑائی جھگڑے والی کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ یہ حال تو صرف ایم کیو ایم کے دو دھڑے بننے کے بعد ہوا، جب حقیقی بنی۔ ڈھائی تین سال پہلے کی بات ہے۔ عزیز آباد، نائن زیرو کے بعد ایم کیو ایم الطاف گروپ کا سب سے بڑا مرکز کورنگی ہے۔ ایم کیو ایم اور حقیقی دونوں کے لڑکے اتنے منجھے ہوئے ہیں کہ وہ کارروائی کے بعد فوراً غائب ہو جاتے ہیں اور بے گناہوں کی شامت آتی ہے، پولیس اور رینجرز والوں کے ہاتھوں،" وہ کہہ رہے ہیں۔

"جب فوجی ہمارے گھر کی تلاشی لینے آئے تو میں نے کہا، جو لینا ہو صندوق سے نکال لو۔ پھر میں نے پوچھا، کب سے ڈیوٹی پر ہو؟ تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔ آرام کرو۔ چائے بنوا کے دی۔ ہمارے کچھ رشتے دار پنڈی، ملتان اور لاہور میں شروع سے آباد ہیں۔ پنجاب آتا جاتا رہتا ہوں، اس لیے پنجابی آتی ہے۔ ایک فوجی نے پوچھا، چاچا، کہاں کے رہنے والے ہو؟ میں نے کہا، لاہور کا رہنے والا ہوں۔ انھوں نے گھر کا کوئی سامان نہ چھوا اور خاموشی سے نکل گئے۔" سراج کے والد کی مسکراہٹ میں تلخی ہے۔

سراج کی طبیعت اب سنبھل چلی ہے۔ وہ کراچی کے حالات سے باخبر رہتا ہے۔ اسپتال میں باقاعدگی سے اخبار پڑھتا ہے، ٹی وی دیکھتا ہے۔ لیکن اب اس کی امن امن کی رٹ ختم ہو چلی ہے۔ "اب وہ سیٹ ہو گیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر کہتے ہیں دوائیوں کا کورس پورا ہو جائے تب چھٹی ملے گی۔ عید پر آیا تھا پانچ دنوں کے لیے،" والد بتا رہے ہیں۔

ہم شکیلہ کے گھر واپس آتے ہیں۔ لڑکے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ نعمان اپنے ساتھ انور کو لے کر آیا ہے۔ انور کی عمر چھبیس ستائیس سال ہے لیکن پینتس کا نظر آتا ہے ــــ سنولایا ہوا سنجیدہ چہرہ، سوچ میں ڈوبی آنکھیں۔ وہ خاموش ہے۔ انور ایم کیو ایم کا کارکن ہے۔

"یہ اُس لڑکے کا ماموں ہے جس کا قتل ہوا تھا۔ قاتل اِس کی تلاش میں آئے تھے۔ اس وقت یہ وہاں نہ تھا۔ انھوں نے بھانجے کو مار دیا،" شکیلہ مجھے سرگوشی میں بتاتی ہیں۔ "یہ اپنی بہن کے گھر سوئم کے بعد سے نہیں گیا ہے۔ کہتا ہے، آپا کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ روتا ہے کہ میں اس دن وہاں کیوں نہ ہوا۔ موجود ہوتا تو مجھے قتل کرتے، بھانجا زندہ ہوتا۔"

میں گاڑی کھڑی کرتی ہوں۔ گھر کے سامنے میدان ہے۔ غالباً یہ چوڑی، دورویہ سڑک کی جگہ ہے جو اَب معلوم نہیں کتنے برس بعد بنے گی۔ فی الوقت کورنگی میں بلدیاتی اداروں کی جانب سے کوئی ترقیاتی کام ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ سڑک کے ایک کنارے کیکر کی گھنی جھاڑیاں ہیں اور دوسری جانب ساٹھ مربع گز پر بنے مکانات کی ایک سنسان قطار۔ گھروں کے دروازے بند ہیں۔ دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دیتا، گو کہ گیارہ بجے کے آس پاس کا وقت ہے۔ گھر کے تھوڑا آگے جھاڑیوں کو کاٹ کر میدان صاف کیا گیا ہے اور ایک باڑا نظر آ رہا ہے۔ بھینسیں جگالی کر رہی ہیں اور فضا میں گوبر، چارے اور دودھ کی ملی جلی مہک بسی ہوئی ہے۔

Scanned with CamScanner

انور اپنی بہن کے دروازے پر دستک دیتا ہے اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایک بوڑھا آدمی دروازہ کھولتا ہے۔ میں اور شکیلہ اندر داخل ہوتے ہیں۔ لڑکے باہر ہی کھڑے ہیں۔

ہم صوفے پر بیٹھے ہیں۔ کمرہ چھوٹا ہے اور فرش پر دری بچھی ہوئی ہے۔ مقتول لڑکے کی ماں ایک بھاری بدن کی عورت ہیں، چالیس کے پیٹے میں۔ ان کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی ہیں۔ وہ کمرے کا سامنے والا دروازہ، جس پر ایک موٹا سیاہ تالا لٹکا ہوا ہے، کھولتی ہیں۔ کمرہ سورج کی تیز چبھتی ہوئی روشنی سے اچانک بھر جاتا ہے۔ وہ میرے برابر آ بیٹھتی ہیں۔ "ایک وقت تھا ہم سب رات کو یہ دروازہ کھول کر اس کمرے میں سویا کرتے تھے۔ اتنا امن و امان تھا کورنگی میں۔ اب تو یہ موٹا تالا اندر سے دن رات لگائے رہتی ہوں۔" پھر وہ اس بھیانک صبح کا نقشہ کھینچتی ہیں جس کی یاد زندگی بھر ان کو کچوکے دیتی رہے گی۔

"صبح کے سات بجے ہوں گے جب کسی نے دستک دی۔ میں پراٹھوں کے لیے آٹا گوندھنے کے بعد ہاتھ دھو رہی تھی۔ میں نے پوچھا، کون ہے؟ آواز آئی، انور ہے؟ میں سمجھی انور کا کوئی دوست ہو گا۔ کبھی میرا بھائی میرے گھر ہی رات رہ جاتا ہے۔ اماں قریب ہی رہتی ہیں۔ لیکن اُس صبح انور نہیں تھا۔ اچھا، منو کو بھیج دو۔ کیسٹ کا پوچھنا ہے، آواز آئی۔ میرے بیٹے نے حال ہی میں وڈیو کیسٹ کی دکان سیٹ کی تھی۔

"اس صبح منو کی آنکھ آواز سے فوراً کھل گئی۔ عام طور پر وہ دیر تک سوتا تھا اور اٹھائے نہیں اٹھتا تھا۔ اتنی گہری نیند ہوتی تھی اس کی۔ لیکن اس دن قضا جو آئی تھی۔ آنکھیں ملتا اٹھ کھڑا ہوا۔ بنیان پہنے ہوئے تھا، قمیص اٹھائی اور باہر نکل آیا۔ اماں ابھی آتا ہوں۔ اس آدمی نے غالباً اس سے کچھ کہا اور منو اس کے پیچھے چلا گیا۔ اور پھر مجھے گولیاں کی باڑھ کی دل دہلانے والی آواز آئی۔ میں سمجھی دوبارہ محاصرہ ہو گیا ہے۔ میں باہر بھاگی کہ منو سے کہوں فوراً اندر آ جائے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان گولیوں کا نشانہ میرا بیٹا ہی بنا ہے۔ جب میں نے دیکھا تو بچہ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ گولیوں نے اس کے چہرے اور ٹانگوں کو چھلنی کر دیا تھا۔ آج تک محلے والوں نے میرے ناخن تک نہ دیکھے تھے لیکن اس وقت مجھے اپنا ہوش نہ تھا۔ بس اس نے مجھے ایک نظر دیکھا اور ختم۔

"اتنا معصوم تھا میرا بچہ۔ ہر ایک سے محبت کرنے والا۔ محلے والوں کے کام کرتا۔ سب کا لاڈلا تھا۔ خدا معلوم اسے کیوں مار ڈالا۔ تین سال پہلے اس کے باپ کا انتقال ہوا تھا۔ بڑا عرصہ بیمار رہے۔ منو اس وقت نویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ باپ کے مرنے پر مجھ سے کہتا تھا، اماں تم فکر نہ کرو، بس اب مَیں گھر چلاؤں گا۔ پڑھائی چھوڑ دی اور اِدھر اُدھر چھوٹا موٹا کام کیا۔ جب مستقل روزگار نہ لگا تو بولا اماں میرا حصہ دے دو۔ چند سالوں میں تمھیں یہ روپیہ واپس لوٹا دوں گا۔ ان کے پراویڈنٹ فنڈ کے تیس ہزار پڑے تھے میرے پاس۔ اس نے ایک وڈیو کیسٹ کی دکان لگائی تھی ایک ماہ پہلے۔"

میں اٹھ کر منو کی سولہ سالہ بہن سے ملنے اندر جاتی ہوں۔ سر پر دوپٹہ، جذبات سے عاری، ساکت

چہرہ۔ "اس کو سکتہ ہو گیا تھا بھائی کی موت پر۔ نویں میں پڑھ رہی تھی۔ اسکول چھوڑ دیا ہے۔ میرا چھوٹا بیٹا ساتویں میں پڑھ رہا تھا، وہ بھی اسکول سے اٹھ گیا ہے۔ وڈیو کی دکان میں بیٹھتا ہے۔ کہتا ہے آگے نہیں پڑھے گا۔ ۱۵۰۰ روپے پنشن کے ملتے ہیں۔ میں نے والد صاحب کو گھر بلا لیا ہے تاکہ بچوں پر نظر رکھیں، گھر سے باہر نہ نکلنے دیں۔"

کورنگی جیسے علاقوں میں اسکول بیچ میں چھوڑ دینے والے بچوں کی تعداد شہر کے دوسرے علاقوں کی نسبت ویسے ہی زیادہ ہے۔ آٹھویں کے بعد والدین عام طور پر لڑکیوں کو اٹھا لیتے ہیں کیوں کہ وہ تمام بچوں کے اسکول کے اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ بعض گھروں میں اس عمر میں لڑکوں کو روزگار پر بٹھانا لازمی ہو جاتا ہے یا پھر لڑکے پڑھائی میں عدم دلچسپی کی وجہ سے خود ہی اسکول چھوڑ دیتے ہیں۔ کراچی کے بگڑتے ہوئے حالات کی وجہ سے اسکول چھوڑنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ ان علاقوں کے اسکول فائرنگ اور تشدد کے واقعات کی وجہ سے آئے دن بند رہتے ہیں۔

ہم گھر سے باہر آتے ہیں۔ لڑکے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے ہیں۔ انور ہمیں خدا حافظ کر کے چلا جاتا ہے۔ شکیلہ کا بیٹا اور اس کا دوست ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہیں۔ "وہ لوگ سمجھ رہے تھے یہ جماعت اسلامی والوں کی گاڑی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے جماعت اسلامی کا آدمی آیا تھا۔ فیچر لکھنے۔ لیکن جب اس کا مضمون آیا تو صرف جماعت کی تعریفوں سے بھرا ہوا تھا۔ جماعت نے کورنگی میں یہ کیا، جماعت نے وہ کیا..." وہ بڑبڑا رہا تھا۔ تو جماعت اسلامی بھی کورنگی میں موجود ہے؟ میرا خیال تھا یہ صرف اور صرف ایم کیو ایم کا علاقہ ہے۔

ہم شکیلہ کے گھر واپس لوٹتے ہیں۔ "ہمیں پیغام ملا ہے کہ ہم آپ کو کسی اور گھر نہ لے جائیں۔ یہ پیغام کل رات سیکٹر آفس میں آ گیا تھا لیکن مجھ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ وہ کہتے ہیں آپ کو نائن زیرو سے اجازت لینی ہو گی،" نعمان کہہ رہا ہے۔

میں اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں: میں نے آنے سے پہلے شکیلہ کو فون کیا تھا۔ شکیلہ نے اپنے بیٹے علی سے تذکرہ کیا ہو گا اور اس نے اپنے دوست نعمان کو بتایا ہو گا۔ نعمان ایم کیو ایم کا کارکن ہے۔ نعمان نے انور سے رابطہ کیا ہو گا جو ایم کیو ایم کا سرگرم کارکن ہے اور بتایا ہو گا کہ میں فیچر کے لیے آ رہی ہوں، ان خاندانوں کے بارے میں جو دہشت گردی سے براہ راست متاثر ہوئے ہیں۔ انور نے یونٹ انچارج سے بات کی ہو گی جس نے سیکٹر انچارج سے رابطہ کیا ہو گا اور وہاں سے نائن زیرو فون کیا گیا ہو گا۔ اور نائن زیرو نے اجازت نہ دی ہو گی۔

لیکن یہ پیغام اُس وقت پہنچا جب میں منو کی اماں سے باتیں کر رہی تھی۔

"میں کوئی سیاسی نوعیت کا مضمون نہیں لکھ رہی ہوں۔ میں صرف متاثرہ خاندانوں کی عورتوں سے باتیں کرنا چاہ رہی تھی۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ کون کس پارٹی سے منسلک ہے،" میں اس لڑکے کو سمجھانے کی بے سود کوشش کرتی ہوں۔

Scanned with CamScanner

"تو کیا تم مجھے ان خاندانوں سے بھی ملنے نہ دو گے جن کا کسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، میرا خیال ہے یہ مشکل ہوگا۔" وہ کچھ سوچتا ہے۔ "اچھا، میں مقصود بھائی کو پیج (page) کرتا ہوں۔" میں دوسرے کمرے میں شکیلہ کی بیٹیوں سے باتوں میں مصروف ہو جاتی ہوں اور نعمان فون کے پاس بیٹھ کر پیجر کے پیغام کا انتظار کرتا ہے۔ دن چڑھتا جا رہا ہے، اور میری بے صبری بڑھ رہی ہے۔ "آپ ٹھہریں، میں سیکٹر والوں سے بات کرتا ہوں۔" وہ باہر جاتا ہے اور تھوڑی دیر بعد واپس آتا ہے۔ "ٹھیک ہے۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔" باہر ایک لڑکا کھڑا ہے۔ تیس کے لگ بھگ ہوگا۔ وہ میرا نام پوچھتا ہے۔ میں رسالے کا ایک شمارہ اسے دیتی ہوں۔ وہ رسالہ ہاتھ میں لیتا ہے، دو چار ورق الٹتا ہے اور مجھے واپس کر دیتا ہے۔ "میرے ساتھ آئیے،" وہ کہتا ہے۔ ہم تینوں چلتے ہیں۔ گلی کے اختتام پر ایک میدان ہے۔ میدان پار کرنے کے بعد ہم دائیں مڑتے ہیں اور پھر بائیں گلی کے کنارے پہنچتے ہیں۔ وہ آدمی کہتا ہے، "آپ یہیں رہیں۔ آفس میں لوگ بیٹھے ہیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ گلی سے نکل کر غائب ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک موٹا تازہ، چوڑا چکلا آدمی نمودار ہوتا ہے۔ یہ چالیس کے لگ بھگ ہوگا۔ میں اپنی کہانی دہراتی ہوں۔ "میں عزیز آباد بھی جانا چاہتی ہوں،" میں ٹکڑا لگاتی ہوں۔ "آپ کو مرکز سے اجازت لینا ہوگی۔ پھر آپ کو ہر گھر میں لے جایا جا سکتا ہے۔ کورنگی ہو یا عزیز آباد۔" وہ رسالہ ہاتھ میں لیتا ہے اور ایک نظر ڈال کر واپس کر دیتا ہے۔ پھر دونوں آدمی گلی سے نکل کر غائب ہو جاتے ہیں اور میں نعمان کے ساتھ واپس چل پڑتی ہوں۔ جس گھر کی دیوار کے ساتھ ہم لوگ کھڑے باتیں کر رہے تھے اس کا دروازہ کھلتا ہے اور دو عورتیں سر نکال کر باہر جھانکتی ہیں۔ میں انھیں دیکھ کر مسکراتی ہوں۔ جواب میں وہ بھی مسکراتی ہیں۔ شاید یہ دیوار سے لگی سب باتیں سن رہی تھیں، میں سوچتی ہوں۔

گلی میں چلتے ہوئے مجھے لگتا ہے گھروں کے مکینوں کی آنکھیں دروازوں کی جھریوں، کھڑکیوں کی اوٹ سے مجھ پر اور نعمان پر لگی ہوئی ہیں۔ کوئی دروازہ کھول رہا ہے، کوئی کھڑکی بند کر رہا ہے۔ ایک گھر کی چھت سے ایک بوڑھا آدمی ہم دونوں کو غور سے دیکھتا ہے۔ چلچلاتی دھوپ میں چھت پر ٹہلنا؟ شاید اس محلے کے لوگ عام حالات میں بھی ایک دوسرے پر نظر رکھنے کے عادی ہیں، اور آج کل تو کورنگی کے حالات بہت خراب ہیں۔ کوئی تعجب نہیں اگر وہ ہر ایک کو شبے کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہو گئے ہوں۔

میں شکیلہ کے گھر واپس آتی ہوں۔ نعمان اب تک ہمارے ساتھ ہے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی گہری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری ہے۔ خدا جانے اندر کتنے طوفان دفن ہیں، میں سوچتی ہوں۔ محاصرے کے دن نعمان کو رینجرز لے گئے تھے۔ اٹھارہ دن رکھا۔ اس نوجوان پر کیا گزری ہو گی؟

"تم پڑھتے ہو؟" میں بات شروع کرتی ہوں۔

"میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی،" وہ کہتا ہے۔ "تین سال تک میں صدر میں ایک سنار کی

دکان پر کام کرتا رہا۔ پھر ابا کی درزی کی دکان پر بیٹھنے لگا۔ لیکن ابا بیمار رہتے ہیں اور دکان آئے دن بند ہوتی ہے۔ مجھ سے اب وہاں نہیں بیٹھا جاتا۔"

"تو آج کل کیا کر رہے ہو؟"

"سنار کی دکان پر دوبارہ جانے لگا ہوں۔"

"آج نہیں گئے؟" وہ خاموش ہے۔

نعمان کے چار بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ دو بڑے بھائی شادی شدہ ہیں اور بیوی بچوں کے ساتھ الگ رہتے ہیں۔ ایک بھائی امریکا میں ہے اور ایک ایم کیو ایم میں۔ "یہ بھائی ہمارے ساتھ نہیں رہتا۔"

فوجیوں نے اس کے ساتھ کیا کیا اٹھارہ دن تک؟ "انھوں نے ہماری آنکھوں پر اٹھارہ دن تک پٹی باندھے رکھی۔ جس کمرے میں مجھے رکھا گیا تھا وہاں بتیس لڑکے تھے۔ وہ ایک بے حد تنگ کمرہ تھا۔" میں تصور کرنے کی کوشش کرتی ہوں ــــــ ایک چھوٹے سے کمرے میں ۳۲ لڑکے جن کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ کیا وہ سب کے سب فرش پر بیٹھ سکتے تھے؟ یا کھڑے تھے؟ اور بنیادی ضروریات؟

"دو دن میں انھوں نے ہمیں پاخانے تک آنا جانا سکھا دیا تھا۔ کھانے کو دیتے تھے۔ ہر تیسرے دن ہمیں بیان دہرانا ہوتا تھا۔ اگر ایک لفظ کا فرق ہوجاتا تو مارا جاتا۔ اٹھارویں دن مجھے پولیس اسٹیشن لایا گیا اور وہاں سے رہا کیا گیا،" نعمان نے مختصراً بتایا۔

"تم ایم کیو ایم چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟" میں پوچھتی ہوں۔

"اب دلی لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔" وہ بچوں کی طرح مسکراتا ہے۔

چار سال پہلے نعمان کے بھائی نے امریکا کی ویزا لاٹری میں درخواست ڈالی تھی۔ اس کا نام نکل آیا۔ جب سے وہ وہیں ہے۔ "تم امریکا جانے کی نہیں سوچتے؟" میں نے سوال کرتی ہوں۔

"مستقبل کی سوچ ختم ہو گئی ہے۔ خدا جانے ایک گھنٹے بعد کیا ہو جائے۔ ایسے میں کل کا سوچنا ناممکن ہے۔" اب اس کی مسکراہٹ تھکی تھکی سی ہے۔

میں اس نوجوان لڑکے کی اندر کی دنیا کے بارے میں سوچتی ہوں۔ کیسی دنیا ہو گی یہ؟ خوابوں کی دھنک، امید کی کرنوں اور جوان محبت کی آرزوؤں کے بغیر یہ دنیا کتنی تاریک ہو گی! فکر اور اندیشے، نفرت اور انتقام، گولیاں اور خون، پولیس اور رینجرز۔ اور نائن زیرو۔ تنگ دائروں کے درمیان گھومتی ہوئی دنیا۔ مجھے اپنے اندر ایک سنسناہٹ دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

نعمان اٹھارہ دن بعد گھر آیا تو شکیلہ اپنے بیٹے اور نعمان کو اس کے گھر والوں کی اجازت سے لاہور لے گئیں۔ "میں لاہور رشتے داروں کے پاس رک گئی اور نعمان اور علی کو اسلام آباد اور مری بھیج دیا۔ نعمان کو تبدیلی کی شدید ضرورت تھی۔ اس کی اماں کا بھی خوف اور دکھ سے برا حال تھا کہ کہیں دوبارہ نہ اٹھا لے جائیں،" وہ بتاتی ہیں۔

ان محلوں کے مکینوں کی زندگیاں آپس میں اس طرح گتھی ہوئی ہیں کہ ایک خارجی شخص کے لیے

اس کو سمجھنا مشکل ہے۔ "کیا آپ کو کبھی یہ ڈر نہیں لگتا کہ کہیں آپ کے بیٹے بھی ان چکروں میں نہ آ جائیں؟" میں شکیلہ سے سوال کرتی ہوں۔ آخر وہ ایم کیو ایم کے لڑکوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ "ہماری زندگی جہنم بن کے رہ گئی ہے۔ مجھے لگتا ہے میں خوف اور وسوسوں کی آگ میں جل کر خاکستر ہو جاؤں گی۔ ذہنی پریشانی اتنی شدید ہے کہ مجھے مستقل سر درد اور ہائی بلڈ پریشر رہنے لگا ہے۔ میں اور میرے شوہر اس کوشش میں ہلکان ہوئے جاتے ہیں کہ ہمارے لڑکے سیاست سے دور رہیں۔ یقین جانو جتنی دیر میرا بیٹا دکان پر بیٹھتا ہے میں دروازے کی پٹی سے لگی گلی میں دیکھتی رہتی ہوں ـــــ دکان نظر آتی ہے یہاں سے ـــــ کہ کس سے بات کر رہا ہے، کون آیا ہے دکان پر۔ اب تو اتنے بُرے حالات ہیں کہ لڑکے خود بھی ایم کیو ایم سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے بچپن کے دوستوں سے قطع تعلق تو نہیں کر سکتے۔ انہیں گلیوں میں ساتھ ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے ہیں، ایک ہی اسکول میں پڑھے ہیں۔ کتنے دن کتنی شامیں اکھٹے گزاری ہیں۔ ہم اپنے بچوں سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم ان سے نہ ملو۔ دوسری بات یہ کہ اگر ہم چاہیں بھی تو اب یہ تعلقات ختم نہیں کر سکتے۔ ہمیں سب کے ساتھ ہنس بول کر رہنا ہے۔ یہ ہمارے اپنے مفاد میں ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سلام دعا رکھنی پڑتی ہے۔ ہر طرف مخبر لگے ہوئے ہیں۔ سی آئی اے کے، ایف آئی ٹی کے، حقیقی کے، ایم کیو ایم کے۔"

"کیا میں تمہاری اماں سے مل سکتی ہوں؟" میں نعمان سے کہتی ہوں۔

"کیوں نہیں۔" نعمان اٹھ پڑتا ہے۔ ہم دونوں اس کے گھر آتے ہیں۔ چھوٹا سا دو کمروں کا گھر ہے ـــــ ٹی وی، فرج، واشنگ مشین اور فون۔ اماں بوڑھی ہیں لیکن دبلی پتلی۔ جسم میں پارہ بھرا ہے، اور زبان زہر اگل رہی ہے۔

"جب جی چاہتا ہے چھلانگ مار کر آ جاتے ہیں۔ کمرے کے دروازوں کو لات مار کر کھولتے ہیں۔ ایسے ٹرک بھر بھر کر آتے ہیں جیسے انڈیا فتح کرنے جا رہے ہوں۔ پورے گھر میں چھا جاتے ہیں۔ اندھیرا کر دیتے ہیں۔ ہمارے گھر میں ۲۶ دفعہ چھاپا مار چکے ہیں۔ چھبیس دفعہ! سب کچھ تہس نہس کر دیتے ہیں۔ ذلیل کرتے ہیں۔ حقارت آمیز لہجے میں چیختے چنگھاڑتے ہیں۔ اس میں میرا کیا قصور ہے اگر میرا بیٹا ایم کیو ایم میں ہے؟ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہو؟"

نعمان کا بڑا بھائی ۲۳ سالہ سلمان، ایم کیو ایم کا سرگرم کارکن ہے۔ "وہ اس چھت کے نیچے ڈھائی سال سے نہیں سویا ہے۔ مجھے نہیں پتا میرا بیٹا کیا کھاتا ہے، کہاں سوتا ہے، کیسے جیتا ہے۔ مجھے اس کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ وہ سائے کی طرح آتا ہے ہمیں پوچھنے، اور دس پندرہ منٹ میں ہوا کے جھونکے کی طرح نکل جاتا ہے۔ میں چھاپوں کے خوف سے اور بیٹے کی ایک جھلک کی آس میں راتوں کو سو نہیں پاتی ہوں۔ میرے دونوں بڑے بیٹے میرے ساتھ ہی رہتے تھے لیکن آئے دن کے چھاپوں سے میرے پوتے پوتیاں بیمار رہنے لگے تھے۔ اسکول بھی آئے دن بند رہتے ہیں یہاں۔ مجبور ہو کر میرے دونوں بیٹے شہر میں کرائے کے مکانوں میں اٹھ گئے ہیں۔"

"آپ اپنے بیٹے سے نہیں کہتیں کہ ایم کیو ایم سے نکل جائے؟" میں سوال کرتی ہوں۔
"وہ کہتا ہے میں نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی ہے۔ میرے لیے اِدھر بھی موت ہے اُدھر بھی موت ہے۔ پارٹی چھوڑ دے گا تو کیا بچ جائے گا؟"
"شروع میں آپ لوگوں نے منع کرنے کی کوشش کی تھی؟"
"وہ ۱۹۸۵ میں ایم کیو ایم میں شامل ہوا تھا۔ تب وہ تیرہ سال کا تھا اور آٹھویں میں پڑھ رہا تھا۔ اس کے باپ درزی کی دکان کرتے ہیں۔ رات کو دیر سے لوٹتے تھے۔ مجھے گھر بار سے ہی فرصت نہ ملتی تھی۔ بس جب ہمیں پتا چلا اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ ہماری سنتا ہی نہ تھا۔"
نعمان کے والدین ۱۹۵۰ میں پاکستان آئے تھے۔ اُس وقت دو بیٹے تھے ان کے۔ چھ بچے کراچی میں پیدا ہوئے۔ "کئی سال کوئنٹ اسٹیشن کے قریب جھگیوں میں رہے۔ پھر پیسہ پیسہ جوڑ کر کورنگی میں چھوٹی سی زمین خریدی۔ اٹھارہ سال سے کورنگی میں ہیں۔"
میں باہر نکل آتی ہوں۔ ایک چھ سالہ بچی ننگے پاؤں، ملگجی فراک پہنے، خاک آلود گلی میں اپنے گھر کے باہر پودا لگانے کی کوشش کر رہی ہے۔ خوشنما سبز رنگ کا پودا۔ غالباً سوسن کی شاخ ہے۔ بچی نے زمین میں گڑھا نہیں کھودا ہے۔ بلکہ شاخ کے نچلے سرے کو پتھریلی زمین پر رکھ کر مٹی سے ڈھانپ دیا ہے۔ وہ ننھے ننھے ہاتھوں سے مٹی کو جما رہی ہے اور پلاسٹک کے ایک پرانے مگ سے اس پر پانی انڈیلتی جا رہی ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی صرف ایک چھوٹی سی بنیان پہنے، مٹی بھرے پاؤں لیے اس سارے عمل کو بغور دیکھ رہا ہے۔
دوپہر کی چبھنے والی دھوپ میں چمکیلی سبز شاخ، خاک آلود، بے رنگ گلی میں اتنی بے جوڑ لگ رہی ہے کہ تقریباً مضحکہ خیز نظر آ رہی ہے ــــ اتنا لاحاصل، اتنا بے مصرف کام۔
ماحول ایک اداس کرنے والی کیفیت سے بوجھل ہے۔ بنجر زمین، نہ آگہی، نہ وسائل۔ صرف ایک موہوم سی آرزو۔
میں آگے بڑھتی ہوں۔ گلی کے موڑ پر سوسن کی ایک اَور شاخ زمین پر پڑی ہے۔ خاک اور دھول سے اٹی سبز پتیاں تیز دھوپ میں مرجھا چکی ہیں۔

***

ڈسٹرکٹ سنٹرل

حسن اسکوائر سے لیاقت آباد کی طرف آتے ہوئے، غریب آباد سے گزر کر اگر آپ مین روڈ پر سیدھے چلتے ہوئے الکرم اسکوائر کی طرف آئیں تو آپ کو بائیں طرف فٹ پاتھ پر جا بجا سرخ چھتوں

Scanned with CamScanner

والے اسٹال نظر آئیں گے۔ پہلی دفعہ ان پر میری نظر چند سال پہلے پڑی تھی۔ اُس رات مجھے یوں لگا تھا جیسے یہ اسٹال لیاقت آباد غریب آباد کے تشدد آمیز لاوے سے اچانک نکل کر وجود میں آ گئے ہوں۔ لکڑی کے چبوترا جس کے چار کونوں پر بانس ٹکلے ہوئے، ان پر خوشنما سرخ چادر تنی ہوئی، چبوترے پر دھرا ایک بڑا سا مٹکا جس کا منہ سفید کپڑے سے ڈھکا ہوا، اور مٹکے کے پاس کرتے پاجامے میں ملبوس، سفید دوپلی ٹوپی سر پر اوڑھے، ڈاڑھی والا شخص بیٹھا ہوا۔ میں ستائشی نظروں سے ان قلفی والوں کی قطار کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ مجھے ان کی ہمت، ان کے استقلال اور ان کے طمطراق پر رشک آ رہا تھا۔ کراچی، ڈسٹرکٹ سنٹرل، میں اتنے تباہ کن، پُرتشدد حالات کے باوجود سلیقے سے روٹی کمانے کے فن پر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ دو چار گاہک، جو غالباً قریبی گلیوں کے مکین ہوں گے، اسٹال کے سامنے پڑی کرسیوں پر بیٹھے تھے، اور ایک دو گاڑیاں فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی تھیں۔ اور ان میں بیٹھے لوگ غریب آباد کی خاص دلبہار قلفی کے مزے لے رہے تھے۔ قلفی واقعی بے حد خوش ذائقہ تھی۔

ایک اور دفعہ ہم ذی شان ساحل کو الکرم اسکوائر کے پیچھے ان کے گھر چھوڑنے کے لیے اس راستے سے گزرے تھے۔ اُس دن شہر کے حالات بے حد خراب تھے۔ ایم کیو ایم کا ایک سرگرم کارکن تحویل میں مارا گیا تھا اور افواہوں کا زور تھا۔ لیاقت آباد میں دو بسیں جلائی جا چکی تھیں اور دوسرے دن ہڑتال کی تصدیق ہو چکی تھی۔ مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ سڑک سنسان پڑی تھی، گلیوں اور فٹ پاتھوں پر کوئی چلتا پھرتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور ایسے میں دلبہار قلفی والے اپنے اپنے چبوتروں پر خاموشی سے بیٹھے خالی سڑک کو تک رہے تھے۔ چبوتروں کے بانسوں سے بندھی ٹیوب لائٹوں کی نیلی دودھیا کرخت روشنی میں وہ پراسرار سے، کسی دوسرے سیارے کی مخلوق معلوم ہو رہے تھے۔

آج نومبر کی ستائیس تاریخ ہے، سن ۱۹۹۵، اور صبح کا وقت۔ میں اسی جگہ سے گاڑی چلاتی ہوئی گزر رہی ہوں۔ وہ تمام اسٹال اس وقت اُجڑے پڑے ہیں۔ بانسوں پر سے سرخ چادریں غائب ہیں۔ فٹ پاتھ کے ساتھ والی آٹو گیراج اور مکنیک کی دکانیں ابھی بند ہیں۔ میں سوچتی ہوں، کیا آج کل بھی شام میں قلفی والے اپنے ٹھیے جما کر روزی کماتے ہیں؟ میں دس نمبر لیاقت آباد کے چوراہے سے بائیں طرف مڑتی ہوں۔ چوراہے پر رش ہے۔ منی بسیں، کوچ، سوزوکی پک اپ، گاڑیاں، گدھا گاڑیاں، موٹر سائیکلیں، پولیس موبائلیں، رینجرز کی بکتر بند گاڑیاں اور پیدل چلنے والوں کی ملی جلی بھیڑ۔ یہ لیاقت آباد ہے۔ داہنی طرف لیاقت آباد کی سپر مارکیٹ ہے جس میں چھوٹی بڑی دکانوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے اور جہاں ہر نوعیت کا سامان دستیاب ہے، جیسا کہ لیاقت آباد کے ایک مکین نے برمحل کہا، "بیٹی کا پورا جہیز یہاں سے خریدا جا سکتا ہے — فرنیچر، بنارسی جوڑے، سوتی کپڑے، زیورات، برتن، الیکٹرانک کا سامان، گھریلو اشیاء، خشک میوہ، سوئی، دھاگے — لیاقت آباد سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔"

اور واقعی لیاقت آباد — جو اب تک لالو کھیت کے نام سے مشہور ہے — اور اس سے ملحق

علاقے، ناظم آباد، پاپوش نگر، گولی مار، غریب آباد شہر کے اندر ایک شہر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پولیس کے چھاپوں، دہشت گردوں کی فائرنگ، رینجرز کے محاصروں، ڈاکوں، بھتوں، قانونی اہلکاروں کے ناجائز دباؤ اور رشوت خوری کے باوجود کاروباری سرگرمیوں سے بھرپور، خودپرور اور بظاہر حسبِ معمول۔ یہ ہے کراچی ڈسٹرکٹ سنٹرل۔

لیکن اس سطح کے نیچے، اگر آپ اس علاقے کے رہنے والوں سے بات کریں تو آپ کو احساس ہو گا کہ ایک نظام ہے جو آہستہ آہستہ ڈھے رہا ہے ___ معشیت میں جمود، بکھرتا ہوا سماجی ڈھانچا اور تنزل پذیر تعلیمی نظام۔

"کاروبار تقریباً ٹھپ ہے۔ ہڑتال کے دن پوری مارکیٹ ہی بند ہوتی ہے۔ عام دنوں میں بھی اگر ذرا سی افواہ پھیل جائے کسی گڑبڑ کی تو کوئی مارکیٹ میں قدم ہی نہیں دھرتا۔ دکاندار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں،" عبدالقدوس کہہ رہے ہیں۔ وہ پچپن ساٹھ برس کے ہوں گے، سرمئی اور سفید بال، موٹی شیشوں کی عینک چڑھائے، چہرے سے تھکن کے آثار نمایاں ہیں۔ لیاقت آباد سپر مارکیٹ میں عبدالقدوس کی دکان ہے جس میں سلے سلائے، کام دار، ریشمی جوڑے بکتے ہیں۔ وہ اپنے بیٹوں اور کاریگروں کے ساتھ زردوزی اور سلائی کا کام کرتے ہیں۔

"پہلے تو دور دور سے لوگ لیاقت آباد خریداری کرنے آیا کرتے تھے۔ کہاں کہاں سے گاہک آتے تھے ہمارے پاس، نارتھ ناظم آباد، کورنگی، اورنگی، لانڈھی، لیاری، ملیر۔ لیکن اب تو قریبی علاقوں کے لوگ بھی آتے ہوئے گھبراتے ہیں کہ خدا جانے کس وقت کیا ہو جائے۔"

قدوس لیاقت آباد میں اسی مربع گز کے مکان میں رہتے ہیں۔ ان کے آٹھ لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہیں۔ دو لڑکوں اور دو لڑکیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ "ہمارا علاقہ تو پھر بھی قدرے محفوظ ہے۔ وہ اس طرح کہ ہماری گلی اور آس پاس کی گلیوں کے لڑکے ان چکروں میں نہیں ہیں۔ لیکن غریب آباد سے پیلی کوٹھی تک کے علاقے میں حقیقی والوں کا زور ہے،" قدوس کی بیوی بچوں کو ناشتہ دیتے ہوئے کہہ رہی ہیں۔

یہاں آج کل "قدرے محفوظ" کا مطلب ہے کہ آپ کے گھر کے عین سامنے کوئی پولیس مقابلہ نہ ہوا ہو اور رینجرز نے آپ کی گلی کا محاصرہ نہ کیا ہو۔

"ورنہ گولیوں کی آوازیں تو معمول کی بات ہیں۔ اگر کہیں دور بھی فائرنگ ہو رہی ہو تو لگتا ہے سر پر ہو رہی ہے،" ان کی ستائیس سالہ لڑکی صغرا اپنی دو سالہ بچے کو بہلاتے ہوئے، ہنس کر بتا رہی ہے۔ صغرا کا شوہر مرچنٹ نیوی میں ملازم ہے اور عموماً جہاز پر رہتا ہے۔ صغرا اپنے دو کمروں کے گھر میں تالا ڈال کر زیادہ تر میکے میں وقت گزارتی ہے۔ "حالات اتنے خراب ہیں۔ اکیلے رہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ رات میں بھی ادھر ہی سوتی ہوں۔"

"فائرنگ کے بعد یہاں کا دوسرا معمول ڈاکے ہیں۔ یہی لڑکے ڈاکا ڈالتے ہیں۔ سُسرے سب بدمعاش ہیں۔ جس گھر میں گھس جائیں، سب کچھ لے جاتے ہیں، زندگی بھر کی جمع پونجی،" قدوس

Scanned with CamScanner

بڑبڑاتے ہیں۔ "چوبیس گھنٹے دروازہ بند رکھنا پڑتا ہے۔ ایک زمانہ تھا باہر سے کنڈی لگا کر میں پڑوس چلی جایا کرتی تھی"، ان کی بیوی پرانے وقتوں کو یاد کرتی ہیں۔ قدوس لالوکھیت میں چالیس سال سے رہائش پذیر ہیں۔ "پاکستان آ کر یہیں ڈیرا ڈالا تھا۔"

"یہاں کا تیسرا معمول ہے رینجرز اور پولیس کی کارروائیاں،" وہ استہزائیہ انداز میں کہہ رہے ہیں۔ "جس کو چاہیں پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ چھوٹتے ہی لاکھ دو لاکھ مانگتے ہیں اور دس پانچ ہزار لیے بغیر نہیں چھوڑتے۔"

"اور اگر لڑکے کچھ کہنے کی کوشش کریں تو کاٹ مار کر پھینک دیتے ہیں اور کہتے ہیں ایم کیو ایم نے مارا۔ ابھی پچھلے دنوں سندھی ہوٹل کی طرف ایک بوری ملی تھی۔ لوگ کہنے لگے ہاتھ پاؤں ہل رہے ہیں۔ رینجرز آئے۔ بوری اٹھا کر لے گئے۔ کیا کیا ہوگا اس کے ساتھ؟ کیا پتا۔ مار مُور کر پھینک دیا ہوگا"، ان کی بیوی بولے جا رہی ہیں۔

"اگر رینجرز سے آپ بچ نکلے تو علاقے کے لڑکے تو کہیں نہیں گئے۔ وہ تو بیٹھے ہیں آپ کے سینے پر مونگ دلنے کے لیے۔ پچھلے ہفتے میری دکان کے قریب ایک بڑی دکان ہے سوٹ کے کپڑوں کی، وہاں تین لڑکے مغرب کے وقت گاہک بن کر آ گئے۔ مارکیٹ کی دکانیں بند ہو رہی تھیں۔ ان لونڈوں نے کئی ہزار کے سوٹوں کے کپڑے خریدے۔ پیسے بھی نہیں دیے اور ساتھ میں دکان کی تجوری بھی لے گئے، ہتھیار لہراتے ہوئے۔ کون چوں چرا کر سکتا ہے ان حالات میں؟ چند دنوں پہلے تک یہ لڑکے تمام دکانداروں سے بھتا وصول کرتے تھے لیکن اب لوگ عاجز آ گئے ہیں ان ہتھکنڈوں سے۔ گزارے بھر کے لیے ہی آمدنی ہو جائے تو بڑی بات ہے۔ ایسے میں کون بھتا دے؟ اب دکاندار مزاحمت کرنے لگے ہیں۔ ایک ماہ پہلے حیدری کی دکانیں اسی وجہ سے چار دن تک بند رہیں۔ دکانداروں نے بھتا دینے سے انکار کیا اور دکانیں بند کر کے بیٹھ گئے کہ جاؤ، کاروبار ہی نہیں کریں گے تو بھتا کہاں سے لو گے۔ لیکن کتنے دن یہ معاملہ چل سکتا ہے؟ اور پھر لڑکے بھی کوئی کم نہیں ہیں۔ بھتا نہ دو تو دن دہاڑے لُوٹ کر لے جاتے ہیں"۔

عبدالقدوس کے تین بڑے بیٹے زردوزی اور سلائی کا کام کرتے ہیں۔ دو بیٹے ایک چھوٹی سی اسٹیشنری کی دکان چلاتے ہیں۔ چھوٹے بیٹے نے انٹر سائنس کا امتحان پاس کیا ہے۔ اُسے بی ایس سی میں داخلہ نہیں مل سکا ہے۔

"کالجوں میں پڑھائی کہاں ہوتی ہے اب؟" قدوس کی بیوی بولیں، "آئے دن تو ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ فائرنگ کے خوف سے والدین خود بھی زیادہ زور نہیں دیتے کہ کالج جاؤ۔ اب تو ٹیوشن سنٹروں کا راج ہے۔ یہ بھی جاتا ہے ٹیوشن سنٹر۔"

سترہ سالہ عدنان اردو سائنس کالج کا طالب علم ہے۔ وہ کالج کی زندگی سے بیزار ہے۔ "کالج میں گروپ بنے ہوئے ہیں۔ جمعیت، پنجابی پختون، ایم کیو ایم، حقیقی۔ آئے دن لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جو

Scanned with CamScanner

پڑھنے والے ہیں وہ گھبرا جاتے ہیں۔ کل میں کالج گیا تھا۔ فائرنگ ہو گئی۔ لڑکوں نے آپس میں کی۔ کیا کرتا؟ الٹے قدموں گھر کو لوٹ آیا۔ کالج میں داخل ہو تو مختلف پارٹیوں کے لڑکے کونے میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں آؤ، ہمارے ساتھ بیٹھو۔ جو لڑکے ان چکروں میں نہیں ہیں اور پڑھائی کرنا چاہتے ہیں وہ کسی نہ کسی سورس سے حاضری پوری لگوا لیتے ہیں اور گھر یا ٹیوشن سنٹر میں کورس پورا کرتے ہیں۔"

"اگر لڑکے پڑھنے کے لیے کالج آ بھی جائیں تو ٹیچر اکثر غائب رہتے ہیں۔ یا پھر جلدی چلے جاتے ہیں۔ کلاس میں لڑکے کم تعداد میں ہوں تو ٹیچر پورا پیریڈ نہیں لیتے۔ بہرحال، بات صرف اتنی ہے کہ پڑھنا تو آپ کو خود ہی ہے۔ اگر آپ بغیر ٹیوشن کے پڑھ سکتے ہیں تو خود ہی مغز کھپائیں ورنہ ماں باپ کے پیچھے پڑیں کہ ٹیوشن کے پیسے دو۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ اگر مجھے بی ایس سی میں داخلہ مل بھی جاتا تو کیا مجھے اس کے بعد نوکری مل جاتی؟" وہ پوچھتا ہے۔

عدنان پاکستان امریکن کلچرل سنٹر میں داخلہ لے رہا ہے۔ "انگریزی بہتر کرنا چاہتا ہوں۔" آج کل کیا مشاغل ہیں؟ "دوپہر میں اسٹیشنری کی دکان پر بیٹھتا ہوں۔ مال لینے بھی جاتا ہوں۔ گھر میں ہوتا ہوں تو رسالے وغیرہ پڑھتا ہوں اور میوزک سنتا ہوں۔ جمعے کو کرکٹ ہوتی ہے۔ محلے میں ٹیمیں بنی ہوئی ہیں۔ روز رات کو بیڈمنٹن کھیلی جاتی ہے۔ فلیش لائٹ محلہ کمیٹی نے حفاظتی اقدام کے طور پر لگائی ہے۔ آٹھ سے دس بجے تک کھیلتے ہیں"۔

لیاقت آباد کے بچے اور نوجوان گھر میں قید ہو کر رہ گئے ہیں۔ بچیوں کے تو باہر نکل کر گلی میں کھیلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ والدین کی کوشش ہوتی ہے کہ لڑکے بھی باہر گلیوں میں نہ جائیں۔ "میرے کئی دوست لیاقت آباد کے مختلف علاقوں میں رہتے ہیں۔ کوئی دس نمبر میں ہے تو کوئی چار نمبر میں۔ لیکن میں ان سے ملنے ان کے گھر نہیں جا سکتا کیوں کہ اُن علاقوں میں زیادہ گڑبڑ رہتی ہے۔ خدامعلوم کسی وقت کوئی گولی کہاں سے آ جائے اور آپ اللہ کو پیارے ہو جائیں۔ گولی کے علاوہ دوسرا خطرہ یہ ہے کہ کہیں رینجرز آپ کو اٹھا نہ لے جائیں۔"

عدنان کا خیال ہے آج کل حالات قدرے بہتر ہیں کیوں کہ "آس پاس کی گلیوں سے بوریوں میں بند لاشیں ملنا کم ہو گئی ہیں، اور ہم دس بجے رات تک گھر کے سامنے کھیل سکتے ہیں۔" لیاقت آباد میں ایسا وقت بھی آ چکا ہے کہ آٹھ بجے گلیوں میں ہُو کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔

میں اب لیاقت آباد فرنیچر مارکیٹ سے گزرتی ہوئی، بڑا میدان اور ریلوے پھاٹک عبور کرتی ہوں۔ یہ پاپوش نگر کا آخری سرا ہے۔ بائیں جانب اورنگ آباد ہے۔ سڑک تنگ ہے اور دونوں طرف سے ٹریفک آ جا رہا ہے۔ سڑک کے اطراف چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں ــــ حجام، حلوائی، اسٹیٹ ایجنسیاں، بیکری، درزی، وڈیو، ویلڈر۔ ہر بلاک کے بعد تنگ متوازی گلیاں ہیں جو رہائشی علاقے میں کھلتی ہیں۔ اورنگ آباد کی گلیوں کے دونوں طرف ساٹھ مربع گز پر بنے ایک منزلہ، دومنزلہ مکانات ہیں۔ گلیاں پکی ہیں۔ عقبی تنگ گلیاں بھی، صاف ستھری ہیں۔ گٹر کے ڈھکن بند ہیں اور کوڑا کرکٹ بھی نظر نہیں آتا۔

Scanned with CamScanner

غالباً جب مختصر عرصے کے لیے ایم کیو ایم کی لوکل باڈیز میں حکومت رہی، یہاں کی حالت سدھری تھی۔ لوگ اب تک صفائی ستھرائی کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

لیکن ان چھوٹے چھوٹے گھروں کی پختہ دیواریں مکینوں کے ذہنی تناؤ اور خوف سے گونج رہی ہیں۔ اس علاقے میں کئی مرتبہ پولیس چھاپے مار چکی ہے۔ رینجرز محاصرہ بھی کر چکے ہیں۔

چھوٹے قد اور گٹھے ہوئے جسم والی نسیمہ پچاس کے پیٹے میں ہیں۔ ان کی آنکھوں کے گرد گھیرے حلقے ہیں، دانت پان سے سیاہ ہو چکے ہیں۔ وہ کبھی سرگوشیوں میں اور کبھی اچانک تیز ہوتی ہوئی آواز میں مجھے اپنی روداد سنا رہی ہیں: "رات کے گیارہ بجے آئے تھے۔ ذرا سوچو، یہ چھوٹا سا گھر، اور دس موٹے تازے سپاہی تلاشی لے رہے ہیں! چیزیں الٹ پلٹ کر دیں۔ الماریاں، درازیں، صندوق، سب کچھ کھلوا لیا۔ پھر ایک نے چلا کر پوچھا، لڑکے کدھر ہیں تمھارے؟ میں نے کہا صاحب، رات کی ڈیوٹی پر گئے ہوئے ہیں بچے۔ سلیمان کہاں ہے؟ دوسرے نے غرا کر پوچھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ انھیں سلیمان کا نام کیسے معلوم ہوا؟" نسیمہ کا بیٹا سلیمان گزشتہ پانچ سال سے سعودی عرب میں محنت مزدوری کر رہا ہے۔ "وہ ارسلان کو اٹھا کر لے گئے۔" تیئیس سالہ ارسلان ایک فیکٹری میں ملازمت کرتا ہے۔ نسیمہ کے شوہر تین سال سے بے روزگار ہیں اور بیمار رہتے ہیں۔ نسیمہ نے بڑے بیٹے کو اطلاع دی جو بیوی بچوں کے ساتھ قریب ہی گلی میں رہتا ہے۔

"رات گزر گئی تھی اور ہم کچھ نہ کر سکتے تھے۔ میں نے اپنے حواس یکجا رکھے اور سلیمان کے کاغذات کی فائل بناتا رہا۔ اس کے بھیجے ہوئے ڈرافٹ کی نقلیں، سعودی عرب سے ساتھ لائے ہوئے کیسٹ ریکارڈر اور دوسری چھوٹی موٹی چیزوں کی رسیدیں، اس کے خطوط اور لفافے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اکٹھا کیے۔ اماں پوری رات بیٹھی روتی رہیں،" سبحان مجھے بتاتا ہے۔

صبح سویرے سبحان اماں کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر ارسلان کی تلاش میں نکلا۔ "لے جاتے وقت بتاتے تھوڑا ہی ہیں کہ کہاں لے جا رہے ہیں۔ ہم کراچی کے سولہ تھانوں میں گئے۔ زیادہ تر تھانوں کی پولیس بری طرح پیش آئی۔ کوئی ہماری کہانی سننے کو تیار ہی نہ تھا کہ سلیمان، جس کو رینجرز نے پوچھا تھا، پانچ سال سے ملک سے باہر ہے اور ارسلان جس کو لے گئے، اس کا ایم کیو ایم سے کوئی تعلق نہیں۔

"چند ایک تھانوں میں پولیس نے ہمارے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور بتایا کہ فلاں تھانے میں جاؤ۔ آخر کار ایک تھانے کے انچارج نے تفصیل سے ہماری کہانی سنی۔ اس نے سلیمان کے تمام کاغذات بغور دیکھے اور ہمیں یقین دلایا کہ اگر تمھارے بھائی کا ایم کیو ایم سے کوئی تعلق نہیں ہے تو تمھیں تمھارا بھائی واپس مل جائے گا۔ سات بجے شام کو آنا۔"

شام کو جب نسیمہ اور سبحان پولیس اسٹیشن پہنچے تو ارسلان کو ان کے حوالے کر دیا گیا۔ "انھوں نے ہم سے کچھ نہیں مانگا، گو کہ ہمیں بتایا کہ یہ کیس اتنا پیچیدہ تھا کہ انچارج کو سی آئی اے کے افسران کو کیس سمجھانے میں پورا ایک گھنٹہ لگا۔ اور یہ کہ اس کیس کے ہم سے دو لاکھ روپے طلب کیے جا سکتے

Scanned with CamScanner

تھے۔"

"فرشتہ تھا، فرشتہ، خدا اس کو زندگی دے۔ اس کو اپنی امان میں رکھے!" کچھ تعجب نہیں کہ نسیمہ ہاتھ اٹھا کر اس کو دعائیں دیتی ہیں۔ اب یہاں وہ شخص جو اپنی ڈیوٹی سیدھے سادے طریقے سے، قانونی ضوابط کے تحت انجام دیتا ہے، انسان نہیں فرشتہ ہے۔ تھانے کے انچارج نے بتایا کہ سلیمان کا نام اور ٹیلی فون نمبر ایک لڑکے کی جیب سے نکلا تھا جو پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ لہذا اب سلیمان کے نام کی فائل کھل گئی ہے اور رینجرز اس کو لینے آئے تھے۔

"وہ لڑکا جس کی جیب سے سلیمان کا نام اور ٹیلی فون نمبر نکلا، اس کی فیملی دس سال پہلے اورنگ آباد میں رہتی تھی۔ سلیمان کی بچپن میں اس سے جان پہچان تھی۔ پھر وہ لوگ لیاقت آباد منتقل ہو گئے۔ اور پھر سلیمان پانچ سال سے سعودی عرب میں ہے لہذا کوئی رابطہ بھی نہ رہا تھا۔"

"ارسلان کی آنکھوں میں پٹی باندھے رکھی اور اسے بہت مارا۔ چوبیس گھنٹے اسے پانی پینے کو نہ دیا۔"

کس سے مارا تھا؟

"ہاتھوں سے کب مارتے ہیں؟" نسیمہ میرے احمقانہ سوال پر مسکراتی ہیں۔ "لاتوں سے مارتے ہیں وہ۔" جب ارسلان گھر آیا تو اس کی حالت غیر تھی۔ بولا نہیں جا رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے، کپڑے میلے۔ پورے جسم میں درد اور نیل۔ "ایک ہفتہ بخار میں پڑا رہا۔ چارپائی سے اٹھنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ میں نے آج زبردستی اٹھا کر ڈیوٹی پر بھیجا ہے۔ جتنے دن نہیں جائے گا، پیسے کٹیں گے۔"

ارسلان کو پچیس سو ماہانہ تنخواہ ملتی ہے، غیر حاضری پر تنخواہ کٹتی ہے اور، جیسا کہ چھوٹے کارخانوں میں رواج ہے، کسی قسم کی کوئی سہولت نہیں دی جاتی۔

نسیمہ کے دو لڑکے شادی شدہ ہیں لیکن وہ چھوٹے تین لڑکوں کی طرف سے بے حد پریشان رہتی ہیں اور ان کی صحت خراب رہنے لگی ہے۔ اکیس سالہ فرقان نے ساتویں کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ "پانچ سال طارق روڈ کے ایک گیراج میں مَیں نے مکینک کا کام کیا۔ لیکن وہ مجھے صرف گیارہ سو دیتے تھے اور نو بجے صبح سے نو بجے رات تک کام لیتے تھے۔ تنگ آ گیا تھا اس لیے کام چھوڑ دیا۔ کئی گیراجوں کے چکر لگا چکا ہوں لیکن اب کام نہیں ملتا۔ آج کل سائٹ ایریا کی ایک مل میں پارٹ ٹائم نوکری کر رہا ہوں،" دبلا پتلا، شرمیلا فرقان مجھے رک رک کر بتا رہا ہے۔

"میں زندگی سے بیزار ہو گیا ہوں۔ اماں نے زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ ہر وقت باہر نہ نکلو، گھر میں بیٹھو، کی رٹ لگائے رکھتی ہیں۔ جب سے بھیا کو رینجرز لے گئے میری اور بھی شامت آ گئی ہے۔ کیا کروں؟ اس کبوتر خانے میں چوبیس گھنٹے بند ہو کر گزاروں؟ میرا دم گھٹتا ہے۔ اور پھر میں جاتا ہی کہاں ہوں بھلا؟ تازہ ہوا کے لیے گلی ہی میں تو کھڑا ہوتا ہوں۔ اگر گھر میں رہ کر وی سی آر دیکھوں تو اس پر بھی اماں چیختی ہیں کہ فلمیں مت دیکھو۔"

Scanned with CamScanner

"ہاں میں نہیں چاہتی کہ میرے بچے تمام وقت انڈین فلمیں دیکھتے رہیں۔ کبھی کبھار دیکھ لیں تو کوئی بات نہیں۔"

نسیمہ کا چھوٹا بیٹا تیرہ سال کا ہے اور اس نے بھی پڑھائی چھوڑ دی ہے۔ "تمام وقت گلیوں میں آوارہ گردی کرتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ ان کی وجہ سے مجھے بلڈ پریشر رہنے لگا ہے۔ میں تو چاہتی ہوں ارسلان کی جلد از جلد شادی کر دوں اگر پکی نوکری لگ جائے اس کی۔ شادی کے بعد گھر تو بیٹھے گا بال بچوں کے ساتھ،" نسیمہ کا خیال ہے۔ لڑکیاں مسئلہ نہیں ہیں۔ بڑی کی شادی ہو چکی ہے۔ ایک نویں میں پڑھ رہی ہے اور سب سے چھوٹی چھٹی جماعت میں۔ اسکول کے علاوہ وہ تمام دن گھر میں بند رہتی ہیں اور گھر کے کام کاج میں اماں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔

"میں تو اس کا آج اسکول چھڑا دوں۔ مگر آج کل معلوم نہیں کیا ہو گیا کہ جو بھی رشتہ آتا ہے پڑھی لکھی لڑکی مانگتا ہے۔ اس کی منگنی کر دی ہے میں نے، لیکن لڑکا کہتا ہے جب بی اے کر لے گی تب شادی کروں گا،" نسیمہ کہہ رہی ہیں۔ "دس سال پہلے کالج یونیورسٹی کی پڑھی لڑکی سے کوئی شادی کرنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔"

پاپوش نگر میں بھی ڈاکا زنی عام بات ہے۔ "لڑکے چاہتے ہیں سب کچھ چھین کر لے جائیں۔ لوگ ڈرتے بھی ہیں ان سے۔ کیوں نہ ڈریں؟ بندوقیں جو ہوتی ہیں ان کے پاس۔ لیکن اب تو ان کی دیدہ دلیری کا یہ عالم ہے کہ ڈنڈے اور پتھر ہی سے کام چلا لیتے ہیں۔ پچھلے ہفتے ہماری گلی میں ڈھائی بجے رات ایک گھر میں لڑکا گھس آیا۔ وہ تو خیر ہوئی، خاتون خانہ کتنا پکا رہی تھیں۔ انھوں نے جو شور مچایا تو پتھر پھینک کر واپس چلا گیا۔ خیریت ہوئی کہ ان کے لگا نہیں۔"

نسیمہ کے پاس ایسی لاتعداد کہانیاں ہیں۔

ساجدہ بیوہ ہیں اور اپنے دو غیر شادی شدہ بیٹیوں اور دو بیٹوں کے ساتھ پاپوش نگر میں گزشتہ پچیس سال سے رہ رہی ہیں۔ یہ مکانات اسی مربع گز پر بنے ہوئے ہیں اور گلیاں نسبتاً چوڑی ہیں۔

"دو سال پہلے یہاں حالات بہت خراب تھے۔ ایم کیو ایم اور حقیقی والے آپس میں لڑ مر رہے تھے اور بیچ میں ہم لوگ تباہ ہو رہے تھے۔ کاؤنسلر کے آفس پر قبضے کی جنگ جاری تھی۔ پھر ایک دن رینجرز آئے۔ آفس خالی کروایا۔ تالا ڈالا، لڑکوں کو اٹھایا اور چلے گئے۔ تب سے نسبتاً سکون ہے۔"

ساجدہ پچاس کے قریب ہوں گی۔ بال ان کے سارے سفید ہے۔ وہ ایک نرم گو خاتون ہیں، ٹھنڈے مزاج کی۔ زندگی کی دھوپ چھاؤں نے ان کو مضبوط بنا دیا ہے۔

"ہم یہاں پچیس سال سے ہیں۔ دو سال کے اندر اندر کئی پرانے مکین گھروں کو بیچ کر چلے گئے۔ جن علاقوں میں زیادہ گڑبڑ ہے وہاں سے لوگ اِدھر منتقل ہو گئے ہیں۔ اب اس محلے میں کسی کو کسی کا پتا نہیں رہا"، وہ کہہ رہی ہیں۔

پاپوش نگر کے وہ مکین جو اپنا برسوں پرانا گھر اونے پونے بیچ کر کہیں اور مکان خریدنے کی استعداد

رکھتے ہیں، یہاں سے جا چکے ہیں۔ ان گھروں میں وہ لوگ منتقل ہو رہے ہیں جو گنجان ترین علاقوں میں ساٹھ مربع گز کے مکانوں میں رہ رہے تھے۔ اسی مربع گز کے رہنے والے ایک سو بیس مربع گز کے مکانوں میں منتقل ہو رہے ہیں۔ اس غیر معمولی اور جبری منتقلی سے محلوں کے سماجی ڈھانچے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ یگانگت، اپنائیت، پڑوسیوں کا وقت پڑنے پر ایک دوسرے کے کام آنا، مل جل کر محلے کے مسائل کو حل کرنا، یہ ساری قدریں ٹوٹ رہی ہیں اور ان کی جگہ بے حسی، لاتعلقی، خوف، اندیشوں اور بے اعتمادی نے لے لی ہے۔

"چند ماہ پہلے کی بات ہے کہ میں گھر میں بچیوں کے ساتھ اکیلی تھی۔ بڑا بیٹا کام پر گیا ہوا تھا اور چھوٹا نوکری کی تلاش میں نکلا تھا۔ گلی میں شور ہونے لگا۔ ہمارے گھر کے باہر کچھ لڑکے کھڑے تھے اور نعرے لگا رہے تھے: اس گھر کو آگ لگا دو! میں نے کھڑکی سے جھانک کر پوچھا کیا بات ہے، تو بولے آپ کے گھر کی چھت سے کسی نے بم پر پتھر پھینکا ہے۔" ساجدہ نے حواس جمع رکھتے ہوئے، ضبط و تحمل کے ساتھ لڑکوں کو بتایا کہ چھت پر کوئی نہیں ہے سوائے ان کے بوڑھے بہنوئی کے جو عرصے سے بیمار ہیں اور چارپائی سے لگے ہوئے ہیں۔ وہ چھت پر بنے ایک کمرے میں رہتے ہیں۔ وہ اٹھ ہی نہیں پاتے تو پتھر کیا پھینکیں گے۔ لڑکوں نے کہا وہ خود آ کر دیکھنا چاہتے ہیں۔ "میں نے لڑکوں سے کہا انھیں ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دوں گی۔ جب میرا بیٹا کام سے آ جائے تو گھر آ کر تلاشی لے لینا۔ ابھی جاؤ یہاں سے۔" غالباً ان کی آواز کے تحکم اور رعب سے لڑکے ڈھیلے پڑ گئے اور یوں معاملہ رفع دفع ہوا۔

"اگر پرانے محلے والے ہوتے تو یہ واقعہ میرے ساتھ ہرگز نہ پیش آتا۔ لیکن اب سب نئے لوگ ہیں۔ سوائے دو چار خاندانوں کے اور کوئی ایک دوسرے کو نہیں جانتا،" انھوں نے بتایا۔

عبدالسلام کا گھرانہ خوش قسمت ہے۔ وہ اس طرح کہ دو سال پہلے وہ اپنا تیس سال پرانا، مین روڈ پر واقع، چھوٹا سا مکان بیچ کر سڑک کے اس پار ایک سو بیس گز کے مکان میں منتقل ہو گئے تھے۔ "پرانے گھر میں زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ آئے دن فائرنگ ہوتی۔ ہڑتال کے دن گھر سے ایک قدم باہر نہ نکال سکتے۔ ہم اسکرین پرنٹنگ کا کام بھی گھر پر ہی کرتے تھے اور خریداروں نے مال لینے کے لیے آنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک چنیوٹی خاندان اپنا مکان بیچنے کے لیے پریشان تھا۔ بے حد مناسب قیمت میں مل گیا ہمیں،" عبدالسلام کے موجودہ دو منزلہ گھر میں کافی گنجائش ہے۔ تیسری منزل پر ٹین کی چھت ڈال کر ہال میں اسکرین پرنٹنگ کے لیے میزیں قطار سے لگی ہیں۔ کیمرا نچلی منزل کے کمرے میں سیٹ کیا ہے اور رنگ سازی علیحدہ حصے میں ہوتی ہے۔ اس علاقے میں گھر کے باہر آہنی گیٹ لگے ہوئے ہیں اور گلی کافی چوڑی ہے۔ "یہ بہتر علاقہ ہے۔ محفوظ بھی ہے، گو کہ ہیں تو اب بھی پاپوش نگر میں۔" لہٰذا جب ہڑتال ہوتی ہے تو ان کا لڑکا جو کلفٹن میں واقع ایک غیر ملکی کمپنی میں کام کرتا ہے، دو تین دن کے لیے گھر نہیں آتا۔ "کمپنی کی طرف شہر کے ہوٹل میں کمرہ بک کرا دیا جاتا ہے۔ فون پر رابطہ رہتا ہے۔" پچھلے دنوں ان کے علاقے کی تمام ٹیلی لائنیں ہفتوں خراب رہیں۔ "لڑکوں نے ٹیلی فون کی تاریں کاٹ ڈالی

تھیں۔ اب ٹیلی فون والوں نے زیر زمین تاریں بچھائی ہیں۔"
ٹیلی فون کے کٹے ہوئے تاروں کی واردات کراچی میں معمول بن گئی ہے۔ لیاقت آباد کے کئی علاقے، پی آئی بی کالونی، ایف سی ایریا، شاہ فیصل کالونی اور نارتھ ناظم آباد میں ہفتوں اور مہینوں کو، "لڑکوں، دہشت گردوں، خدا جانے کون،" کی کارستانی کا خمیازہ بھگتنا پڑا ہے۔
ڈسٹرکٹ سنٹرل کے باسیوں کے لیے زندگی دشوار تر ہوتی جارہی ہے۔ کراچی کے حالات کی وجہ سے ان کو متفرق مسائل کا سامنا ہے۔
"جب آپ کو ملازمت کے واسطے انٹرویو کے لیے بلایا جاتا ہے تو سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے آپ کہاں رہتے ہیں؟ جیسے ہی آپ کے منہ سے لیاقت آباد، ناظم آباد، پاپوش نگر کا نام نکلتا ہے تو آپ کو دروازہ دکھایا جاتا ہے، معاف کیجیے گا ڈسٹرکٹ سنٹرل کے رہنے والوں کے لیے یہاں جگہ نہیں،" ستائیس سالہ شمشاد تلخ لہجے میں بتارہا ہے۔ جب نوکری کی تلاش میں چار پانچ جگہ اس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا "تو آخر مجھے جھوٹ بولنا پڑا۔ میں نے کہا میں سوسائٹی میں رہتا ہوں۔" سوسائٹی میں شمشاد کے رشتے دار رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں جب تین دن کی ہڑتال ہوئی تھی، الطاف حسین کے بھائی کے قتل کے رد عمل میں، تو شمشاد بڑی مشکلوں سے دفتر پہنچ سکا تھا۔ اب شمشاد کی زندگی میں یہ مشکل بھی شامل ہو گئی ہے۔ شمشاد اپنی بیوہ ماں اور چھوٹے بھائی کے ساتھ ناظم آباد کے ایک کمرے کے مکان میں رہتا ہے۔
بہت سے خاندان، جن کے لڑکے سیاست سے کسی طور وابستہ نہیں ہیں، اپنے لڑکوں کی طرف سے فکر مند رہتے ہیں۔ اگر اتفاق سے آپ کا لڑکا ایم کیو ایم میں کسی کو جانتا ہے، خواہ یہ واقفیت سرسری اور عارضی نوعیت کی ہی کیوں نہ ہو، آپ کسی بھی مشکل سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ "ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کب گلی میں چھاپا پڑ جائے، محاصرہ ہو جائے"، فاطمہ کہتی ہیں۔ فاطمہ بیوہ ہیں اور ان کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ ان کے ساتھ دوسری نوعیت کا واقعہ پیش آیا۔ ایک دن محلے کے لڑکے ان کے گھر آگئے۔ "کہنے لگے، آپ کے دو بیٹے ہیں، ایک بیٹا الطاف بھائی کو دے دیجیے۔ میرے تو ہوش اڑ گئے۔ پریشانی سے برا حال کہ کیا کروں۔" بدقت تمام فاطمہ نے بیٹے کے لیے ریل کے ٹکٹ کا بندوبست کیا اور اسے پنڈی کسی دور کے رشتے دار کے پاس بھیج دیا۔
سیکنڈ ایئر کا طالب علم راشد چار ماہ کرب اور اندیشوں میں گزار کر واپس چلا آیا۔ "مجھ سے وہاں نہیں رہا جاتا۔ اور پھر کب تک چھپوں؟ رہنا تو ماں کے ساتھ ہی ہے"، راشد پریشان ہے کہ پڑھائی کا جو حرج ہوا ہے اس سے کس طرح نمٹے۔
سو زندگی جاری ہے۔ ڈسٹرکٹ سنٹرل میں۔

**

Scanned with CamScanner

عیسیٰ نگری کی زبانی تاریخ

کراچی تضادات کا منظر نامہ ہے۔ اس میں دو شہر بیک وقت موجود ہیں۔ ایک طرف دولت اور تموّل کا شہر ہے: برقی روشنیوں میں نہایا ہوا، کئی منزلہ رہائشی منصوبوں اور تجارتی مراکز کا شہر، وڈیو کلچر کا نمائندہ۔ اس کے برعکس دوسرا کراچی ہے جسے بعض لوگ دیکھ نہیں پاتے اور بعض لوگ دیکھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں، جس کے مناظر یکسر مختلف ہیں: ننگے اور پھٹے کپڑوں میں بچے کوڑے کے ڈھیر پر کھیلتے ہوئے، کچی گلیاں، اُبلتے گٹر اور نالیاں، کچے پکے مکانوں میں گنجائش سے زیادہ افراد ٹھنسے ہوئے، مناظر، بُو اور آوازوں کی مسلسل یلغار۔ یہ کچی آبادیوں کا کراچی ہے۔ شہر میں جابجا نمایاں دولت کی علامات سے قطع نظر، شہر میں بنیادی سہولتوں سے محروم افراد کی تعداد اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اسے بحرانی صورتِ حال کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ سماجی تجزیے کے ماہرین کے الفاظ میں، کراچی اُس ترقی کی کلاسیکی مثال ہے جو عدم ترقی میں اضافہ کرتی ہے۔

کراچی میں شرحِ پیدائش تقریباً ۳۵ فی ہزار افراد اور شرحِ اموات تقریباً ۱۰ فی ہزار افراد ہے، چناں چہ شہر کی آبادی صرف قدرتی اضافے کے سبب ہر سال ۲.۵ فیصد کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ ملک کے دوسرے مقامات سے نقل مکانی اس کے علاوہ ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ شہر میں ہر سال تقریباً دو لاکھ بچے پیدا ہوتے ہیں اور تقریباً ڈھائی لاکھ افراد نقلِ مکانی کر کے کراچی میں داخل ہوتے ہیں۔ اس بے تحاشا اضافے سے نمٹنے کے معاملے میں شہری انتظامیہ بہت پیچھے رہ جاتی ہے۔ نقل مکانی کر کے آنے والے افراد کی تقریباً دو تہائی تعداد کا مقدر وہ کچی آبادیاں ہیں جو پورے شہر میں جابجا خودرو پودوں کی طرح اُگ آئی ہیں۔ کراچی میں چار جانب کچی آبادیوں کی افراط ایک مانوس منظر ہے۔ دیہی علاقوں سے آنے والے وہ افراد جو کسی خصوصی مہارت کے حامل نہیں ہوتے اور چھوٹی موٹی محنت مزدوری کر کے اپنے کنبے کا پیٹ پالنے کے خواہاں ہوتے ہیں، سر چھپانے کی تھوڑی سی جگہ حاصل کرنے کی غرض سے غیر معیاری اور کام چلاؤ قسم کے انتظامات بھی گوارا کر لیتے ہیں۔ دہلی میں ایسی بستیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے جگ موہن نے جو الفاظ لکھے ہیں وہ کراچی پر بھی صادق آتے ہیں: "غربت کے مارے ہوئے دیہی علاقوں سے آنے والے افراد ہر ممکنہ خالی جگہ کو گھیر لیتے ہیں اور اس پر لکڑی، ٹین یا دفتی کی تعمیر راتوں رات کر ڈالتے ہیں۔ ان کے لیے کوئی بھی جگہ کیچڑ بھری، گندی یا خطرناک نہیں ہے۔" ابتدائی برسوں میں کچی آبادیاں ریل کی پٹریوں کے ساتھ، گندے نالوں کے کنارے، کوڑے کے ڈھیر کے برابر، شہر کے مضافات میں اور اُس ترقی کے لیے مخصوص کیے گئے خالی پلاٹوں پر بھی بن جاتی ہیں جو کبھی عملی صورت اختیار کرنے کا نام نہیں لیتی۔ ان میں سے بیش تر آبادیاں وقتی اور عارضی تھیں، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بنیادیں مضبوط ہوتی گئیں اور ان میں سے بعض پکی بستیاں بن چکی ہیں۔

اپنی ابتدائی صورت میں کچی آبادیاں کراچی کے لیے وہی حیثیت رکھتی تھیں جو دہلی کے لیے "جھگی جھونپڑی"، بمبئی کے لیے "جھونپڑپٹی"، مدراس کے لیے "چیری" اور کلکتے کے لیے "بستی" کی حیثیت ہے۔

"کچی" کا لفظ ان آبادیوں کی غیر قانونی اور عارضی حیثیت کے ساتھ ساتھ ادھورے، نامکمل اور کسی طے شدہ معیار سے کم تر درجے کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔ اس نام ہی سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان آبادیوں کی بہتری اور ترقی کی ضرورت ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کراچی میں ان آبادیوں نے اپنی بنیادیں مضبوط کر لی ہیں اور جوں جوں لوگوں کو ملکیت کا تحفظ ملتا گیا، انھوں نے اپنے مکانوں کو بہتر بنانے پر رقم لگائی ہے اور دوسری سہولتوں کے باقاعدہ حصول کی بھی کوششیں کی ہیں۔ ۱۹۸۲ میں حکومت سندھ کے مطابق کراچی میں ۴۳۶ کچی آبادیاں تھیں جو ۱۴۰۰۰ ایکڑ رقبے پر پھیلی ہوئی تھیں اور شہر کی آبادی کا ۳۷ فیصد حصہ ان میں مقیم تھا۔ ایک اور حالیہ اندازے کے مطابق شہر میں ایسی آبادیوں کی تعداد تقریباً بارہ سو ہے اور ان میں رہنے والوں کی تعداد شہر کی کل آبادی کے نصف کے قریب پہنچ رہی ہے۔

کراچی جیسے کوسموپولیٹن شہر میں کچی آبادیاں بھی متنوع طبعی اور سماجی خواص رکھتی ہیں۔ اس کے باوجود ان میں بہت سے خواص مشترک بھی ہیں جو انھیں شہر کے منصوبہ بند علاقوں سے بڑی حد تک مختلف بنا دیتے ہیں۔ عارف حسن کے الفاظ میں "خوش حال علاقے اور کم آمدنی والی آبادیاں دو مختلف دنیائیں ہیں۔ اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں رہنے والوں کے رویوں، ترجیحات اور دنیا کو دیکھنے کے انداز کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا یقینی ہے۔" جو شہری سہولتیں منصوبہ بندی کے تحت وجود میں آنے والے علاقوں میں میسر ہیں، کچی آبادیوں میں ان کا فقدان ہے۔ پانی، نکاس، بجلی، علاج، تعلیم جیسی سہولتوں کے معاملے میں یہ آبادیاں منصوبہ بند علاقوں سے بہت پیچھے ہیں۔ پینے کے صاف پانی کی کمی یوں تو مجموعی طور پر پورے شہر میں ہے، لیکن کچی آبادیوں میں شدید تر ہے۔ پائپ کے ذریعے پانی کی فراہمی محدود ہے۔ لوگ چند ایک اجتماعی نلکوں پر انحصار کرتے ہیں اور پانی بھرنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرنے والی عورتوں اور بچوں کی لمبی قطار عام نظر آتی ہے۔ انتظار کی طویل مدت اور پانی کی غیر یقینی دستیابی بعض اوقات دنگے فساد کا موجب بن جاتی ہے۔ جن آبادیوں میں یہ اجتماعی نلکے بھی میسر نہیں وہاں پانی برتنوں میں بھر بھر کر خریدا جاتا ہے اور یہ پانی دوسرے علاقوں کی بہ نسبت زیادہ مہنگا ہے۔ چناں چہ چنیسر گوٹھ کے ایک گنجان حصے "واہگری پاڑا" میں ۱۵ روپے کی اوسط روزانہ آمدنی میں سے تین یا چار روپے ہر روز پانی پر خرچ ہو جاتے ہیں۔ جن آبادیوں کو مستقل کر دیا گیا ہے وہاں بجلی کا قانونی کنکشن میسر ہے مگر وولٹیج بہت کم ہے۔ دوسری آبادیوں میں لوگ اوپر سے گزرنے والے تاروں پر کنڈے ڈال کر بجلی حاصل کرتے ہیں۔ گندے پانی کے نکاس اور سوکھے کوڑے کے اٹھائے جانے کا مستقل انتظام عموماً دیکھنے میں نہیں آتا۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، کچی آبادیاں کم آمدنی، کم تعلیم، ناکافی سہولتوں، گنجان آبادی اور آبادی میں تیز رفتار اضافے سے عبارت ہیں، لہذا یہاں کے باشندے بیماری کا زیادہ بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ مختلف ماہرین نے ترقی پذیر ملکوں کے شہری غربا (urban poor) کی صحت کا تجزیہ کرتے ہوئے مختلف عوامل کے تین گروہوں کی نشان دہی کی ہے جن کے باعث ان کی صحت کو اضافی خطرات لاحق رہتے ہیں۔ پہلے گروہ میں وہ عوامل ہیں جو براہ راست غربت کا نتیجہ ہیں جیسے کم آمدنی، محدود تعلیم اور ناقص غذا۔ دوسرا گروہ ان عوامل پر مشتمل ہے جو انسانی عمل کا نتیجہ ہیں مثلاً ناقص مکانیت، کم جگہ میں زیادہ افراد، صنعتی اثرات، آلودگی، شور، ٹریفک اور وبائی امراض کے خطرات۔ تیسرے گروہ میں وہ عوامل ہیں جو سماجی اور نفسیاتی عدم استحکام اور

Scanned with CamScanner

غیر محفوظ زندگی کے اثرات ہیں اور ذہنی بیماریاں، منشیات، سماجی جرائم وغیرہ ان عوامل سے براہِ راست متعلق ہیں۔ کراچی کی کچی آبادیوں میں عوامل کے اس پورے سلسلے کے اثرات واضح ہیں۔ یہ اندازہ لگانا تو آسان ہے کہ کچی آبادیوں کے مکین بیماریوں کا اضافی بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں، لیکن اس بوجھ کی مقدار کے بارے میں صرف قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔ کراچی شہر کے باشندوں کی صحت کے اعداد و شمار ناکافی بھی ہیں اور آسانی سے دستیاب بھی نہیں ہوتے۔

کراچی کی مختلف کچی آبادیوں کا جائزہ لینے کے بعد ۱۹۸۵ میں شہر کی ایک اعلیٰ غیر سرکاری طبی درسگاہ (آغا خان میڈیکل یونیورسٹی) ایسی چھ آبادیوں — اورنگی، گریکس، چنیسر گوٹھ، عیسیٰ نگری اعظم بستی اور بابا جزیرہ — اور ایک متوسط طبقے کے محلے — کریم آباد — میں بنیادی صحت کے ترقیاتی منصوبے کا مرحلہ وار آغاز کیا۔ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا کے کیے ہوئے سروے کے نتائج سے ایک ہی شہر کے الگ الگ حصوں کے درمیان تفاوت کی واضح نشان دہی ہوتی ہے۔ اس سروے کے مطابق مذکورہ کچی آبادیوں میں پیدا ہونے والے ہر ایک ہزار بچوں میں سے اوسطاً ۱۲۴ بچے سال بھر کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں، جبکہ متوسط طبقے کی آبادی میں ایسے بچوں کی تعداد ۳۳ فی ہزار ہے۔ کچی آبادیوں میں ہونے والی تمام اموات میں سے تقریباً نصف ایک سال تک کی عمر کے بچے ہوتے ہیں، جبکہ متوسط محلے میں کل اموات کا ۱۷ فیصد حصہ اس عمر کے بچوں پر مشتمل ہے۔

کم آمدنی والی آبادی عیسیٰ نگری اور متوسط طبقے کا محلہ کریم آباد ایک دوسرے سے بمشکل چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہیں، لیکن بیماریوں کی نوعیت (disease pattern) میں کئی دہائیوں کا فاصلہ ہے۔ عیسیٰ نگری میں اموات زیادہ تر چھوٹے بچوں میں ہو رہی ہیں اور ان اموات کا سبب اسہال، سینے کی بیماریاں وغیرہ ہیں جن سے بچاؤ کے طریقے بہت عرصہ پہلے دریافت کیے جا چکے ہیں۔ انیسویں صدی کے یوروپ کی طرح یہ چھوت کی بیماریاں ہیں۔ اس کے برخلاف کریم آباد میں اموات زیادہ تر بڑی عمر کے افراد میں ہو رہی ہیں اور ان کا سبب ہائی بلڈ پریشر، امراضِ قلب، ذیابیطس، سرطان وغیرہ ہیں۔ ۱۹۶۰ کی دہائی کے شمالی امریکا اور برطانیہ کی طرح یہ غیر متعدی بیماریاں ہیں اور ان کی بنیاد طرزِ زندگی اور طرزِ عمل پر ہے۔ مذکورہ کچی آبادیوں میں سے ایک، چنیسر گوٹھ، میں کیے گئے سروے کے مطابق بڑی عمر کے افراد میں غیر متعدی بیماریوں کا تناسب بھی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ چناں چہ کچی آبادیوں میں کم عمر بچے متعدی امراض میں اور بڑی عمر کے لوگ غیر متعدی بیماریوں میں تیزی سے مبتلا ہوتے جا رہے ہیں اور یہ آبادیاں خرابیِ صحت کے دوہرے بوجھ تلے دبی ہوئی ہیں۔

کچی آبادیوں میں ذہنی اور نفسیاتی عوارض میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ منشیات کا استعمال اتنی تیزی سے پھیلا ہے کہ ماہرین نے اسے بھی ایک قسم کی وبا قرار دیا ہے۔ سماجی عدم استحکام، ذہنی دباؤ، ترقی اور بہتری کے مواقع کا آگے چل کر محدود ہو جانا اور خاندان کی بنیادی اکائی کو لاحق طرح طرح کے خطرات وہ عوامل ہیں جن کے باعث لوگوں میں نشہ آور اشیا کی طلب بڑھی ہے۔

اس سروے کو بنیاد بنا کر بنیادی صحت کے منصوبے کا آغاز کیا گیا۔ علاقے کی کچھ خواتین کو "صحت کی کارکن" کے طور پر تربیت دی گئی۔ علاقے کے بااثر اور سرگرم افراد کی بھی نشان دہی ہوئی اور ان کے ساتھ گفتگو میں وقتاً فوقتاً علاقے کے مخصوص مسائل، لوگوں کے رسم و رواج اور یہاں آباد ہونے کے تجربے کی تفصیل

دریافت کی جاتی رہی۔ عیسیٰ نگری کے لوگوں کے ان تجربات کو دستاویزی شکل میں محفوظ کر لینے کا خیال ایسی ہی کسی گفتگو کے دوران آیا۔

عیسیٰ نگری کراچی شہر کے جغرافیائی وسط میں حسن اسکوائر اور سبزی منڈی کے قریب واقع ہے۔ بلدیۂ عظمیٰ کراچی (KMC) کا مجوزہ "ایوانِ شہر" اور ادارہ ترقیات کراچی (KDA) کا نو تعمیر شدہ "سِوک سنٹر" بھی یہاں سے نزدیک ہے۔ شہر کے نسبتاً ترقی یافتہ محلوں کے نزدیک واقع ہونے کے باوجود یہاں بنیادی شہری سہولتیں خاصی تگ و دو کے بعد اب کہیں جا کر میسّر آنا شروع ہوئی ہیں۔ بارہ ہزار سے زیادہ افراد پر مشتمل یہ بستی چوبیس ایکڑ رقبے پر آباد ہے۔ مروّجہ سماجی اشاروں (social indicators) کی رو سے اسے اگرچہ کراچی کی تمام کچی آبادیوں کی نمائندہ نہیں سمجھا جا سکتا کیوں کہ مختلف کچی آبادیاں شہری ترقی کی مختلف منزلوں سے گزر رہی ہیں، تاہم اس آبادی کے جائزے سے بعض ایسے مسائل اور حالات کی نشان دہی ضرور ہو جاتی ہے جن سے کچی آبادیوں کے مکینوں کو گزرنا پڑتا ہے۔ عیسیٰ نگری کے جائزے کے مطابق وہاں ایک مکان میں اوسطاً سات افراد رہتے ہیں جبکہ کمروں کی تعداد عموماً دو یا اس سے کم ہے۔ ایک گھرانے کی اوسط آمدنی ۱۹۸۶ کے سروے کے مطابق ساڑھے بارہ سو روپے ماہوار ہے۔ یہاں کے ۷۴ فیصد باشندے ۱۵ سال سے کم عمر کے ہیں اور پانچ برس سے کم عمر کے بچے کل آبادی کا تقریباً ۲۰ فیصد حصّہ ہیں۔

عیسیٰ نگری کے کچھ خواص کراچی کی دوسری آبادیوں سے مختلف ہیں۔ یہاں کی آبادی پنجابی مسیحی افراد پر مشتمل ہے جو ایک یا دو پشت پہلے شمالی پنجاب سے نقل مکانی کر کے کراچی میں آباد ہوئے۔ آئندہ صفحات میں پیش کیے جانے والے متن کو اس علاقے کی "زبانی تاریخ" (Oral History) کے طور پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی گفتگو ڈاکٹر آصف اسلم نے بجمن انتھونی کے ساتھ ریکارڈ کی اور پھر اس کا متن تیار کیا۔ اس متن کو سامنے رکھ کر عیسیٰ نگری کے آصف شہباز اور محبوب جان نے دوسرے راویوں سے گفتگو ریکارڈ کی۔ ریکارڈ کی ہوئی گفتگو کو کاغذ پر منتقل کرتے ہوئے پوری احتیاط برتی گئی ہے کہ تلخیص اور تدوین کے باوجود ان راویوں کی باتیں اُنھیں کی زبان اور اندازِ بیان میں سامنے آئیں۔ اس لحاظ سے اس متن کے ذریعے کراچی کی کچی آبادیوں میں بولی جانے والی عام زبان کا مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

راویوں کی گفتگو کا تدوین شدہ متن ڈاکٹر آصف اسلم نے تیار کیا اور اسے راویوں کی رضامندی اور تعاون سے حتمی شکل دی گئی تاکہ حقائق کے بیان میں کوئی غلطی نہ رہ جائے اور ان کا نقطۂ نظر پوری طرح سامنے آ سکے۔

(ا۔ ف۔)

Scanned with CamScanner

بنجمن انتھونی   شریف سوز

لیاقت منوّر   بیکسٹر بھٹی   نسرین اسٹیفن

آصف شہباز   محبوب جان

انٹرویو اور تدوین: آصف اسلم، آصف شہباز، محبوب جان

عیسیٰ نگری کی زبانی تاریخ

جس وقت آپ چھوٹے تھے، اس کچی آبادی کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی، اس وقت لوگ کیسے رہتے تھے، کیا کام کاج کرتے تھے، وقت کس طرح گزارتے تھے۔ آپ اپنے بچپن کے حوالے سے اس کچی آبادی کے بچپن کے بارے میں بتائیے، میں نے بنجمن سے پوچھا۔

یہ کچی آبادی جب وجود میں آئی تو ہم اس کے چار سال کے بعد اس علاقے میں آئے۔ ۱۹۶۰ میں دوسرے علاقوں سے لوگ یہاں آکر آباد ہوئے۔ ہم لوگ ۱۹۶۴ میں یہاں آئے۔ اس وقت یہ علاقہ جو ہے، بالکل ایک گاؤں کی سی شکل تھی اس کی۔ ہمیں ایسا ہی لگ رہا تھا کہ ہم پنجاب کے ایک گاؤں سے نکل کر دوسرے گاؤں میں آگئے ہیں۔ ہمارا تعلق سیالکوٹ کے علاقے نارووال اور اس کے ایک گاؤں کھوکھر والی سے ہے۔ تو ہمارا گاؤں بالکل اسی طرح تھا، بلکہ ہے، اب بھی موجود ہے۔ گاؤں میں بھی تھوڑی ترقی ہوتی ہے۔ لیکن اس وقت جو ہم نے آکر دیکھا تو بہت کم لوگ یہاں تھے۔ تقریباً چار پانچ گلیاں تھیں، لیکن چھوٹی چھوٹی گلیاں۔ اور پنجاب کے طریقے سے لوگ یہاں رہتے تھے، یعنی کہ کافی کھلی گلیاں ہوتی تھیں شروع میں، لوگوں کے گھروں میں درخت ہوتے تھے، کچے مکان بنے ہوئے تھے، لوگوں کے پاس بڑی بڑی حویلیاں ہوتی تھیں اور حویلی کی شکل میں جگہ ہوتی تھی۔ جیسے جیسے لوگ یہاں آباد ہوئے تو ان کے رشتے دار آنے لگے اور وہ اپنے رشتے داروں کو پنجاب سے بلانے لگے۔ لوگوں نے یہاں آکر جگہ خریدی نہیں بلکہ لوگوں کو کسی اور جگہ سے شفٹ کیا گیا تھا جہاں وہ سرکاری زمین پر آکر بیٹھ گئے تھے۔ نئے لوگ جو آتے تھے وہ اس طرح کرتے تھے... جیسے ابھی میرا گھر یہاں پر ہے، میرے رشتے دار آئے

Scanned with CamScanner

ہیں تو وہ میرے ہی ساتھ آ کر رہیں گے۔ لوگوں کے پاس بڑے بڑے پلاٹ تھے۔ بڑی بڑی جگہیں لی ہوئی تھیں اور زمین کی قیمت بھی بہت ہی کم تھی۔ جس طرح آج لوگوں کے پاس گھر ہیں جن کی مالیت لاکھوں روپے ہے تو اس وقت پچاس روپے میں بھی گھر ملتا تھا، سو روپے میں بھی گھر ملتا تھا۔ ہم جس گھر میں آئے تھے وہ ہم نے تین سو روپے میں خریدا تھا، جب کہ آج اسی گھر کی قیمت لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے کم نہیں ہو گی۔ تو اس طرح لوگ آتے گئے۔ پھر جس کام کی طرف لوگ بڑھے وہ پنجاب کی بہ نسبت یہاں ان کے لیے کرنا آسان تھا۔ کیوں کہ پنجاب میں ایک طرح کا سلسلہ تھا کہ جن لوگوں کی زمینیں ہیں اور جو کھیتی باڑی کرتے ہیں ان کے انڈر میں یہ لوگ کام کرتے تھے اور بزرگوں کے بزرگ اور خاندانوں کے پورے سلسلے وہ کام کرتے تھے۔ زیادہ تر لوگ کاشتکار کی حیثیت سے زمینوں کے مالک چودھریوں کے پاس کام کرتے تھے۔ اُجرت بھی کم تھی۔ پیسہ بھی دیکھنے میں کم آتا تھا۔ کھانے پینے کی چیزیں موسم کے حساب سے مل جاتی تھیں۔ لیکن یہاں آ کر لوگوں کے پاس پیسہ آیا۔ یہاں آ کر لوگوں نے کم محنت میں زیادہ پیسہ دیکھا۔ اور پھر انھوں نے یہ فرق دیکھا کہ یہاں پر ٹائم بھی ہے۔ یعنی کہ آپ صبح جائیں اور شام تک گھر آ جائیں۔ یہ نہیں کہ صبح سے شام تک پھر رات تک لگے رہیں، اوپر سے جب جی چاہے کام کے لیے بلالیں۔ وہاں تو اپنے گھر میں بھی کام ہوتا تھا تو اس کے لیے چودھری سے اجازت لینا پڑتی تھی۔ یہاں ٹائم اپنا تھا۔ تو یہ چیزیں لوگوں کے لیے نئی تھیں۔ پھر ہمارے لوگوں کے لیے تعلیم یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے مواقع بھی کم تھے اور شہر کراچی کا آپ کو پتا ہے، ان دنوں ہم نے سنا تھا کہ کراچی بڑا شہر ہے، وہاں تو جانا مشکل ہے، جو چلے جاتے ہیں وہ بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں۔ ان دنوں ہمارے لیے کراچی ایسا تھا جس طرح آج دُبئی کو اور یورپ کو سمجھتے ہیں۔ تو ہم اس شہر میں آئے۔

اس علاقے میں جو لوگ آ کر آباد ہوئے وہ پنجابی تھے اور ان میں سے بھی کرسچن، کیوں کہ شروع میں جو لوگ یہاں آ کر آباد ہوئے تھے وہ کرسچن تھے۔ لوگوں کا رہن سہن ویسا ہی تھا جس طرح گاؤں میں چھوڑ کر آئے تھے، مثلاً مویشی پالنا۔ گلیوں میں بھی لوگ جانور پال لیتے تھے۔ شروع میں تو گھروں میں بھی اتنی جگہ ہوتی تھی کہ جانور رکھ لیں۔ رسم ورواج میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ پانی بجلی کی سہولت تو آپ کو پتا ہے، اب بھی پوری طرح نہیں ہے۔ اُس وقت تو بالکل نہیں تھی۔ اُس وقت اس علاقے کے لوگ بہت دور دور سے پانی لاتے تھے۔ آدمی کام پر چلے جاتے تھے، عورتیں سارا دن یہاں سے دو کلو میٹر دور اور تین کلو میٹر دور سے پانی لاتی تھیں۔ بڑی کوشش کے بعد لوگوں نے ایک نلکا لگوایا جو روڈ پر تھا۔ پوری آبادی کے لیے ایک نلکا۔ لیکن اُس وقت آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔

آج کوئی دیکھے تو یقین بھی نہیں کرے گا کہ یہاں بالکل آبادی نہیں تھی۔ کھلا علاقہ تھا۔ ادھر ملک پلانٹ کی عمارت تھی اور اس کے بعد تین چار کلو میٹر آگے چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن تھا جہاں اب سنا ہے کراچی سنٹرل اسٹیشن بن رہا ہے۔ آگے سیمینری تو تھی۔ وہ تو پاکستان سے پہلے کی ہے۔ غریب آباد کا علاقہ جس طرف ہے وہاں تک کھیت تھے۔ حسن اسکوائر اور گلشنِ اقبال تو ہمارے سامنے بنا ہے۔ اس

طرف فوجیوں کا کیمپ لگا ہوا تھا، سن ۶۵ کی جنگ میں بہت فوجی ادھر آئے تھے۔ بہت سال پہلے جب نمائش لگی تھی جہاں اب سوک سنٹر بنا ہے اس کے سامنے، اور یہاں سے لوگ وہ نمائش دیکھنے گئے تو رات کے وقت بندر ان کا راستا روک لیتے تھے۔ اس طرف گیدڑ بھی بہت تھے۔ جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں اور گھپ اندھیرا ہوا کرتا تھا۔ اس علاقے میں بجلی بھی بہت دنوں کے بعد آئی اور ناجائز کنکشن سے شروع ہوئی۔ گھروں میں لالٹین جلا کرتی تھیں اور دکانوں میں گیس کی بتی استعمال ہوتی تھی۔ یا کوئی پروگرام ہوتا تھا تو اس میں گیس استعمال کرتے تھے اور جس شخص کے پاس گیس ہوتی تھی، اس کی دوسرے لوگوں میں بڑی اہمیت ہوتی تھی اور لوگ کہتے تھے اس کے گھر میں گیس جل رہی ہے، جب کہ آج کسی کے گھر میں ٹیوب لائٹ بھی جل رہی ہو تو کوئی نہیں دیکھتا...

اُس وقت یہاں گھروں میں وہ پنجاب والی گندی نالیوں کا سلسلہ نہیں تھا بلکہ لوگ گھروں میں کنویں سے کھود لیتے تھے، وہ رفع حاجت کے لیے بھی استعمال ہوتے تھے لیکن زیادہ تر ایمرجنسی کے لیے۔ ورنہ اس کام کے لیے باہر جاتے تھے۔ پورے علاقے میں کوئی ٹائلٹ سسٹم نہیں تھا۔ عورتیں شام کے وقت ٹولیوں کی شکل میں باہر جاتی تھیں۔ کپڑے دھونے اور نہانے کے لیے لوگوں نے جو کنویں سے بنائے ہوئے تھے ان کے اوپر چھت ڈال دیتے تھے اور جب وہ بھر جاتے تو یہ سب گلی میں چھوڑ دیتے اور یہ پانی گلی میں بہنے لگتا تھا اور نالے میں چلا جاتا تھا۔ یہ نالا شروع سے ہے۔ اور نیو ٹاؤن کے علاقے کا ڈرینیج یہاں سے گزرتا تھا۔ اس نالے میں پہلے صاف پانی آتا تھا، پھر گندا پانی آنے لگا۔ صاف پانی اس لیے آتا تھا کہ کے ڈی اے کا جو پلانٹ ہے یہاں پر ایک چشمہ تھا اور اس چشمے کا پانی اس نالے سے گزرتا تھا۔ عورتیں یہاں پر کپڑے دھونے اور برتن دھونے جاتی تھیں جس طرح ندی پر جاتے ہیں۔ اب سارے علاقے کا کورم کرکٹ اس میں بہتا ہوا آتا ہے۔ آبادی بڑھنے لگی تو پھر اس طرح ہو گیا۔

جب میں یہاں آیا تھا تو مجھے لگا کہ میں ایک گاؤں سے نکل کر دوسرے گاؤں میں آگیا ہوں۔ لیکن یہ گاؤں چپکے چپکے شہر بن گیا اور میں نے بھی گاؤں والے سے شہر والے ہونے کا فاصلہ طے کر لیا۔ لیکن یہ آہستہ آہستہ ہوا۔ مجھے خود بھی بعد میں پتا چلا۔ ہم کو ایک خوف رہتا تھا۔ آج سے دس پندرہ سال پہلے تک بھی یہ خیال تھا کہ یہ علاقہ مسلسل آباد نہیں رہے گا، لوگوں کو یہاں سے بھی ہٹا دیا جائے گا۔ اس لیے کہ ہم لوگوں کے پاس لیز نہیں تھی اور گورنمنٹ کا کچھ پتا نہیں، مختلف حکومتیں آتی تھیں، جاتی تھیں، لوگ وعدے کرتے تھے اس کو مستقل کرنے کے لیے، کہ اس کا الاٹمنٹ ہو جائے اور اس کو لیز مل جائے۔ اس کے باوجود لوگ اس بات پر توجہ نہیں دیتے تھے کہ ہمیں اس کو پکا کرنا ہے، ہم پکے گھروں میں شفٹ ہو جائیں۔ لیکن ساتھ ساتھ جب لوگوں کی آمدنی بڑھنا شروع ہوئی، کیوں کہ اس وقت مہنگائی کم تھی اور اخراجات بھی زیادہ نہیں تھے اور پیسے کی ویلیو بھی تھی، تو لوگوں نے آہستہ آہستہ گھروں کو بہتر کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد جس کا گھر ٹوٹتا تو اس نے یہی کوشش کی کہ اس کو بلاک سے بنایا جائے مٹی کے بجائے۔ وہ تبدیلی کا وقت تھا جب لوگوں نے ٹوٹتے ہوئے گھروں کو مٹی کے بجائے سیمنٹ کے بلاکس سے بنانا

Scanned with CamScanner

شروع کیا۔ لیکن یہ آسان کام نہیں تھا۔ وہی بات تھی کہ لوگ اتنے عرصے سے رہ رہے تھے اور یہ خطرہ تھا کہ یہاں سے اٹھا نہ دیے جائیں۔ پھر چکنی مٹی آسانی سے مل جاتی تھی، ارد گرد بہت مل جاتی تھی۔ بلکہ چکنی مٹی کا ایک حادثہ بھی ہوا۔ وہ اس طرح کہ جیسے لوگ کھودتے کھودتے رہتے ہیں اور اتنے گہرے چلے گئے کہ وہ تودہ گر گیا اور اس میں ایک دو بچے اور چند بڑے دب کر فوت ہو گئے۔ تو اس طرح ایک حادثہ بھی ہوا اور تبدیلی بھی آتی گئی۔ اور چکنی مٹی کا استعمال کم ہوتا گیا۔ اس کی جگہ لکڑی کی چھت بننے لگی اور ٹائلز بھی استعمال ہونے لگے۔

پانی کی تو بڑی مشکل تھی لوگوں کو۔ ساری ہی مشکلیں تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ یہ کوشش بھی کرنے لگے کہ کسی طرح مسائل کو حل کریں۔ شروع میں تو لوگ اس لیے خائف تھے کہ آبادی کم تھی۔ ان کو ڈر تھا کہ حکومت یہاں سے بے دخل کردے گی۔ تو جیسے جیسے آبادی بڑھتی گئی اور یہ مسائل بھی بڑھتے گئے تو لوگوں میں یہ احساس بھی ہوا کہ اپنے حقوق کے لیے لڑنا چاہیے۔ دس سال پہلے لوگوں نے اپنے طور پر وہ کنویں والا سسٹم ختم کیا اور گٹر لائنیں بنوائیں۔ نلکے کے لیے بھی کام کیا اور گلیوں میں نلکے لگوائے۔ لوگوں کے گھروں میں نلکے نہیں تھے لیکن گلیوں میں نلکے ایک ایک دو کر کے لگوائے۔ اس میں گورنمنٹ کی بھی مدد تھی لیکن زیادہ تر ہمارے اپنے لوگوں کی محنت تھی۔ اپنی مدد آپ کے تحت لوگ پیسہ جمع کرتے تھے، چیزیں خرید کر لاتے تھے، کھڈے نکالتے تھے، اس میں ڈالتے تھے۔ اور اس طرح نکاسی کے لیے بھی خود کام کیا اور پانی کے لیے بھی۔ پنچایت سسٹم اب بھی ہے لیکن اُس وقت زیادہ مضبوط تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ ہمارے مسئلے جو ہیں ہم ان کو مل کر اپنے طور پر حل کر سکتے ہیں۔ کافی دنوں تک یہ سلسلہ رہا۔ اس وقت لوگ ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے اور ایک دوسرے کو سمجھتے تھے۔ تھانا پولیس سے لوگ ڈرتے تھے۔ درمیان میں ایک وقت ایسا آیا کہ لوگ ایک دوسرے کے بھی خلاف ہو گئے، ایک دوسرے سے ڈرنا اور عزت کرنا چھوڑ دیا اور لڑائی جھگڑا جو ہوتا تھا تو پولیس تھانوں تک پہنچنے لگا۔ عیسیٰ نگری کا وہ وقت بھی ہم کو یاد ہے جب نیوٹاؤن تھانے کی پولیس اس علاقے کو سونے کی چڑیا کہنے لگی، اس لیے کہ لوگ آپس میں اتنی نااتفاقی رکھتے تھے اور پولیس والوں کو ذرا ذرا سی بات پر اچھی خاصی رقم بٹورنے کا بہانہ مل جاتا تھا۔ یہ سلسلہ کم ہوا ہے لیکن اب بھی چل رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہماری اپنی وجہ سے ہے، یہ ہمارے نوجوانوں کے مسائل ہیں جن کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ نوجوانوں کے مسائل ہیں، ہمارے بزرگوں کے مسائل ہیں اور ہمارے سیاسی لیڈروں کے مسائل ہیں۔

پچھلے کرسمس پر چرچ کے سامنے پہرہ دینے کے بہانے پولیس آ گئی۔ آنے کو تو آ گئے لیکن سارا دن لوگوں کو تنگ کرنا، عورتوں کو گھورنا، بہانے بہانے سے مانگنا کہ یہ لادو، وہ لادو... جس وقت شروع میں ہم آئے ہیں تو دو تین چرچ تھے۔ اب آپ دیکھیں جیسے جیسے لوگ بڑھے ہیں چرچز میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ پہلے تین چرچ تھے، اک یونائیٹڈ پریسبی ٹیرین، ایک چرچ آف پاکستان اور ایک کیتھولک۔ اب دس گیارہ چرچ ہیں، اور ہر ایک میں نماز کا الگ اپنا سلسلہ ہے۔ اسی طرح تعلیم کا بھی ہے۔ لوگ زیادہ تر

Scanned with CamScanner

ان پڑھ تھے لیکن انھوں نے کراچی میں آ کر دیکھا کہ دوسرے علاقوں میں جو لوگ آباد ہیں، وہ چاہے امیر ہوں یا غریب، ان میں تعلیم کا رجحان بہت ہے۔ تو اس علاقے میں بھی یہ رجحان پیدا ہوا، اور لوگوں نے سمجھا کہ بے شک وہ خود تعلیم نہیں حاصل کر سکے لیکن اپنے بچوں میں تعلیم کا انتظام کریں۔ تو لوگوں نے بہت کوشش کی۔ گورنمنٹ نے یہاں ایک اسکول بنوا کر دیا جو پرائیوٹ بھی چلتا تھا اور گورنمنٹ کی طرف سے بھی تھا۔ تو گورنمنٹ کا ایک ہی اسکول ہے لیکن پرائیوٹ اسکول چار پانچ ہیں۔ تو وہ اسکول ایک شفٹ میں گورنمنٹ کی طرف سے چلتا تھا اور ایک شفٹ میں پرائیوٹ طور پر چرچ کی طرف سے۔ میں نے اس اسکول سے پڑھا۔ پھر علاقے کے باہر کے اسکول سے بھی پڑھا۔ اس وقت علاقے سے باہر کے اسکول میں بچوں کو نہیں بھیجا جاتا تھا۔ اب تو فلیٹس میں بھی اسکول بنے ہوئے ہیں اور بنگلوں میں بھی اسکول بنے ہوئے ہیں۔ اس وقت ارد گرد بھی کوئی اسکول نہیں تھا۔ اب تو ساری سہولتیں مل سکتی ہیں۔

اب تو عیسیٰ نگری تقریباً کراچی کے وسط میں آ گئی ہے۔ پہلے یہ شہر کا غیر آباد کونا تھی۔ یہاں تک کا روڈ بھی کچا ہوا کرتا تھا، کوئی بس بھی ادھر نہیں آتی تھی۔ یہاں بس اتنا ٹریفک ہوتا تھا کہ ریتی بجری لے جانے والے ٹرک کبھی کبھی گزرا کرتے تھے رات کے وقت۔ سبزی منڈی کے بس اسٹاپ تک جانا پڑتا تھا۔ ایک نمبر بس اسٹاپ تھا پہلے، اس کے بعد دو نمبر بس اسٹاپ بھی ہو گیا۔ کنٹری کلب روڈ بنی ہوئی تھی جس کا نام یونیورسٹی روڈ ہو گیا ہے۔ اب تو یہاں سے ہر طرف کو راستے نکلتے ہیں۔ کچی آبادی سے بستی بن گئی۔

آپ نے ٹھیک کہا، جس وقت یہ ساری تبدیلیاں ہو رہی تھیں تو ان کے ساتھ ساتھ میں بھی بڑا ہو رہا تھا۔ پرائمری اسکول میں نے یہاں سے کیا۔ اس وقت یہاں پر مڈل اسکول نہیں تھا۔ ہمارے اسکول کا کانٹریکٹ تھا سولجر بازار کے ایک اسکول سے، ہم وہاں شفٹ ہوئے۔ اپنے علاقے سے باہر نکل کر پڑھنا، وہ بھی بہر حال ایک نئی چیز تھی ہمارے لیے۔ بسوں میں سفر کرنا، آنا جانا، یہ سب۔ اس وقت یہ تو نہیں تھا جس طرح اب گلی گلی میں ٹیبل فٹ بال کھیلا جا رہا ہے، کیرم چل رہا ہے۔ ہم فٹ بال کھیلتے تھے اور ٹیمیں بنی ہوئی تھیں۔ کرکٹ اتنا عام نہیں تھا۔ گلی ڈنڈا ہم کھیلتے تھے۔ جہاں آج نعمان سنٹر آپ کو نظر آ رہا ہے، یہ ہمارا فٹ بال گراونڈ ہوتا تھا۔ گلی ڈنڈے کے لیے کھلی جگہ چاہیے تو وہ یہاں بہت تھی۔ ہم گولیاں بھی کھیلتے تھے۔ بڑوں میں کشتی ہوتی تھی۔ یہاں پہلوانی کا شوق عام تھا۔ ہم سے جو بڑے تھے وہ کبڈی کھیلتے تھے اور پہلوانی کرتے تھے۔ ریلوے کراسنگ کے پاس اکھاڑا بنایا ہوا تھا۔ وہاں شام کے ٹائم پر تمام نوجوان جاتے تھے اور تیل مالش کرنا، کشتی سیکھنا اور استادی شاگردی والے سارے سلسلے۔ پھر عیسیٰ نگری کا اتنا نام ہوا کہ کمپیٹیشن شروع ہو گیا۔ دوسرے علاقوں سے لوگ آتے تھے۔ اتوار کے دن یہاں دنگل ہوتا تھا۔ ڈھول ڈھمکا ہوتا تھا، میلے کا سماں ہوتا تھا۔ دور دور سے لوگ آتے تھے۔ اس طرح کے کھیل ہوتے تھے۔ بچے کیا کرتے تھے، ہم چھوٹے تھے تو ہم سائیکل کے خالی ٹائر میں راڈ لگا کر "گاڑی گاڑی" کھیلا کرتے تھے۔ یہ روڈ کچی تھی تو اس پر چلایا کرتے تھے۔ موٹر سائیکل تو بڑی بات ہے کسی کے

پاس سائیکل بھی نہیں ہوا کرتی تھی۔ لڑکیاں گھروں کے اندر رہتی تھیں اور کھانیاں ہوتی تھیں اور پنجابی میں ہم کہتے ہیں "باتاں پانیاں"، تو یہ سب ہوتا تھا۔ لوگوں کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا بڑا ہوتا تھا۔ اور مکانوں کی چھت اس طرح ملی ہوتی تھی کہ ایک چھت سے چلیں تو پوری گلی کراس کرتے ہوئے پہنچ جاتے تھے۔ ہم اپنے گھر سے اسلم مارٹن کے گھر چھت سے ہی جاتے تھے۔ اب نہیں جا سکتے۔ جگہ کم پڑ گئی ہے اور لوگ بلڈنگوں کی شکل میں رہنے لگے ہیں۔ ہمارا جو گھر تھا اس میں گراؤنڈ فلور پر ایک کمرہ اور ایک اور چھوٹا سا کمرہ ہوتا تھا۔ شروع میں تو ہمارے پاس ایک کمرہ تھا اور ایک ورانڈا اور ایک ہم نے چھوٹا سا کچن بنایا ہوا تھا اور اس میں چولہا جلتا تھا تو دھواں سارے گھر میں پھیل جاتا تھا۔ مٹی کا تیل استعمال کرنا بعد میں شروع کیا ہے۔ اُپلے جلاتے تھے اور لکڑی۔ مٹی کا تیل مہنگا سمجھا جاتا تھا۔ لکڑی آسانی سے مل جاتی تھی، آس پاس کے علاقے میں جھاڑیاں تھیں ان سے کاٹ کر لاتے تھے۔ یہ بھی ہمارا کام تھا۔

دنگل ہوتے تھے، کُشتی ہوتی تھی، اور باتیں ہوتی تھیں۔ یہ ساری باتیں بزرگوں کے سامنے ہوتی تھیں۔ ماشاءاللہ جوان تو آپ بھی رہے ہیں۔ آپ کو پتا ہوگا کہ نوجوانوں کی باتیں اور بھی ہوتی ہیں، جن کا بزرگوں کو پتا بھی نہیں چلتا۔ اُس وقت نوجوانوں میں زیادہ تر بس یہی تھا کہ فٹ بال میں، کبڈی میں اور ادھر ادھر۔ اور کچھ دوست جو اندر رہتے تھے ان کا کام تھا تاش کھیلنا، پاشا کھیلنا، بیٹھے رہنا۔ آج کل جس طریقے سے لڑکے کارنرز پر نظر آتے ہیں، اُس وقت بہت کم ہوتے تھے۔ دو چار دوست آ کر ساتھ ہوتے تھے تو وہ کسی کے گھر میں بیٹھ جاتے تھے، یہاں تک کہ کھانے کا ٹائم ہے تو وہ بھی وہیں پر گزر جائے اور اگر سونے کا ٹائم ہے تو وہ بھی۔ کبھی کبھی اسی کے گھر سو جانا یا پھر اسکول کا کام مل کے کرنا۔ میں اٹھ کر عارف کے گھر چلا جاتا تھا اور اُدھر سے انور بھی آ جاتا تھا کہ چلو جی، عارف کے گھر میں اسکول کا کام کریں گے۔ اور وہیں پر گانا بجانا ہو رہا ہے، وہیں پر "کیپی ڈنڈے" ہو رہے ہیں اور وہیں پر کھیل کود ہو رہا ہے۔ اور پھر اگر آپ دوسرے سلسلوں کے بارے میں پوچھنا چاہیں تو وہ بڑے مختلف تھے۔ بہر حال انھیں اچھا تو نہیں کہنا چاہیے، اُس وقت کے حساب سے وہ بھی بُرے تھے لیکن آج کل کے حساب سے وہ بہتر لگتے ہیں۔ اس وقت جو جوان تھے تو وہ عشق اور محبت کا سلسلہ ہوتا تھا لیکن آج کل لوگ محبت کا نام لے کر جنسی خواہش کی تسکین کی بات کرتے ہیں۔ اُس وقت لوگ واقعی محبت کرتے تھے، اور کوئی بندہ کسی لڑکی سے محبت کرتا تھا تو وہ اس کی محبت صرف یہ نہیں ہوتی تھی کہ اس کو لپیٹے، اس کو پکڑے۔ یہ سب تھا لیکن آج کی طرح نہیں تھا۔ خط و کتابت کا چکر زیادہ ہوتا تھا۔ جو لوگ پڑھے لکھے ہوتے تھے وہ ایسا چھوٹا بچہ ڈھونڈتے تھے جس کا اُس گھر میں آنا جانا ہوتا تھا اور اس پر شک نہیں ہو سکتا تھا۔ تو اس وقت یہ ہوتا کہ قاصد بیچ میں ہے اور رقعے چل رہے ہیں۔ اُدھر سے پورا پورا نورجہاں کا گانا آ رہا ہے تو اس طرف سے پورا پورا مہدی حسن کا گانا لکھا ہوا جا رہا ہے۔ اُس وقت فلمی گانوں میں بھی مرمٹنے کا سلسلہ ہوتا تھا۔ اور گانے بھی ایسے ہوتے تھے، "سانوں نہر والے پُل پر بُلا کے" اور "تیرے بنا یوں گھڑیاں بیتیں جیسے صدیاں بیت گئیں۔" انتظار کا بڑا سلسلہ تھا۔ اور جو لوگ ان پڑھ تھے ان کا کام تھا چکر بازی، اس گلی سے نکلے اور

گھوم کر چکر کاٹ کر پھر اسی گلی میں آ گئے۔ اور وقت ان کو پتا ہوتا تھا، جھلک دیکھ لی کہ آ رہا ہے تو مسکرا لیے، اشارہ کر دیا۔ دیواروں سے جھانکنا زیادہ ہوتا تھا۔ عیسیٰ نگری میں اب لوگوں کی چھتیں زیادہ اونچی ہو گئی ہیں تو چھت سے اشارے ہوتے ہیں، ایک دوسرے کی طرف ٹار چیں مارتے رہتے ہیں۔

یہ نہیں کہ اُس وقت یہ سب کچھ نہیں ہوتا تھا، لیکن اتنی بے حیائی نہیں تھی۔ جس طرح اب علاقے میں کبھی کبھی کوئی لڑکا لڑکی رنگے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں تو اُس وقت اتنے زیادہ کیس نہیں ہوتے تھے۔ یہ ضرور ہوتا تھا کہ کسی کا کسی کے ساتھ نام چل گیا۔ کچھ لوگ اُس وقت بھی ہیرو ہوتے تھے۔ اس وقت کے ہیرو ٹیڈی پینٹ پہنتے تھے اور جس نے پینٹ پہن لی وہ ہیرو ہو گیا، چاہے وہ انگوٹھا چھاپ کیوں نہ ہو۔ پھر یہ فیشن نکلا کہ گلے میں رومال باندھ کر گھوم رہے ہیں۔ ایک کو چھوڑا، دوسرے سے محبت کی، پھر اس کو چھوڑا۔ اُس وقت کے کچھ پرانے عاشق اب بھی زندہ ہیں۔ بڈھے ہو گئے ہیں پر زندہ ہیں۔ ہیرو تو آج کل بھی بہت گھوم رہے ہیں۔

پھر ڈرامے بازیاں بڑی ہوتی تھیں۔ ڈرامے کرتے تھے اور اس میں ملاپ ہوا کرتا تھا۔ پھر چرچ میں بھی ملنے اور دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ اور چرچ چھوٹنے کا ٹائم ہوتا تھا تو سارے عاشق باہر کھڑے ہوتے ہیں۔ آج کل بھی کھڑے ہوتے ہیں۔ چرچ میں بھی چٹھیاں فلائی ہوتی تھیں یا پھر گلی میں۔ لڑکا گزرتے گزرتے چٹھی کا کام کر گیا۔ چرچ تو بعد میں بن گئے ورنہ کرسمس کے دن بھی لوگ سیمیناری جایا کرتے تھے۔ جلوس کی شکل میں جا کر نماز کیا کرتے تھے۔ جب یہاں پر چرچ بن گئے تو ان میں بھی نماز شروع ہو گئی۔ کھجوروں والا اتوار ہوتا تھا تو ایک جگہ سے دوسری جگہ جلوس کی شکل میں جاتے تھے، بڑا اچھا لگتا تھا۔ اب لوگوں کے پاس وقت بھی کم ہے اور اچھی رسومات ادا کرنے کا رواج بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ مذہبی ڈرامے بھی ہوتے تھے اور سوشل ڈرامے بھی۔ علاقے میں جو شہزادے گھوم رہے ہوتے تھے وہ کوشش کرتے تھے کہ ہمیں ہیرو کا چانس ملے۔ جب آبادی بڑھنے لگی تو لوگوں میں گروپ بازیاں بھی ہونے لگیں۔ تہوار والے دن خاص طور اسکول والے پروگرام بنا لیتے تھے یا چرچ کمیٹیاں پروگرام بنا لیتی تھیں۔ کرسمس والے دن میلہ لگنے لگا۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ اس میں ہر طرح کے اسٹالز ہوں۔ جھولے، کھانے پینے کی چیزیں، بچوں کے لیے کھیل، گانا بجانا، اسٹیج کے آئٹم وغیرہ ہوں۔ اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ کسی کے گھر خوشی ہوتی تھی تو رات بھر ناچ ہوتا تھا اور ایک لڑکا لڑکی بن کر ناچتا تھا، اور پرانے قصّے، ہیر رانجھا اور لیلیٰ مجنوں وغیرہ کے سنائے جاتے تھے۔ اس کو ''راس ڈالنا'' کہتے تھے۔ پھر یہ ہونے لگا کہ کسی کے گھر بچہ پیدا ہوا تو لاؤڈ اسپیکر لگا کر خوشی کا اعلان کر رہے ہیں۔ بچے کی چھٹی پر ''نیوندرا'' کا طریقہ اس وقت سے بھی پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ اس رسم سے وقتی طور پر مدد مل جاتی ہے لیکن بندہ قرض میں بھی بندھ جاتا ہے۔ اب راس ڈالنے کے بجائے میوزیکل ایوننگ کرتے ہیں، باہر سے گلوکار بلاتے ہیں اور ٹکٹ رکھتے ہیں۔ جو پیسے گانے والوں کے سر پر سے پھینکتے تھے وہ اب ٹکٹ میں لگا دیتے ہیں۔

ایک کرسمس میلہ ہم نے بھی کیا تھا۔ آج سے اٹھارہ اُنیس سال پہلے کی بات ہے۔ سڑک کے

Scanned with CamScanner

سامنے کیتھولک سوشل سروس والوں نے معذور بچوں کے لیے سنٹر بنایا تھا جہاں ان کو دن بھر رکھنے کا انتظام تھا۔ سلائی سنٹر تھا اور ڈاکٹر بھی بیٹھتا تھا۔ اسی سنٹر کو مزید ڈیولپ کرنے کے لیے ہم نے میلہ کیا۔ اس میلے میں اسٹالز لگائے۔ کھیلیں رکھیں۔ اور ہم نے ایک اسٹال لگایا ناچنے کا۔ اس وقت ٹیپ رکارڈر کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ ٹیپ رکارڈر پر گانے سننے کے لیے بہت لوگ آتے تھے۔ تو ہم نے سوچا کیوں نہ ٹیپ رکارڈر لگا کر اس سے آمدنی کی جائے۔ اس پر ناچنے کا کردار میں نے کیا۔ میرے ساتھ دوسرے بھی تھے۔ میں نے مونچھیں صاف کر کے لیڈیز کپڑے پہنے اور ڈانس کیا۔ اس کے اوپر ٹکٹ لگائی۔ اس میں بہت لوگ آئے اور ایک گانا ختم ہوتا تھا تو پچاس لوگ دوسرے گانے کی فرمائش کرتے تھے۔ اس وقت بھی وہ بڑا عجیب تھا اور عیسیٰ نگری میں پہلی مرتبہ اس طرح ہوا۔ لوگوں نے اس کا بُرا نہیں مانا بلکہ بہت پسند کیا۔ لیکن اب میں سوچتا ہوں تو مجھے خود عجیب سالگتا ہے۔

باہر سے ایک جیسی نظر آتی ہیں کچی آبادیاں لیکن اگر سطح کے نیچے ذرا کریدا جائے تو ایک دوسرے سے خاصی مختلف معلوم ہوتی ہیں۔ روزمرہ زندگی کی بنیادی سہولتوں کے حصول کی جنگ ہر جگہ ایک کہانی ہے جو زمین پر پیر ٹکانے کی کوشش سے شروع ہو کر بہت آگے تک چلی جاتی ہے۔ عیسیٰ نگری پہلے ایک کچی آبادی تھی جہاں آج بنیادی سہولتیں میسّر ہیں بلکہ سندھ اسمبلی میں منتخب ہونے والے دو اقلیتی نمائندے اسی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس تمام عمل کے پیچھے جو تنظیمی اور سماجی کام ہوتا رہا ہے اس کے بارے میں محبوب جان اور آصف شہباز کے سوالوں پر شریف سوز نے تفصیل بیان کی۔

میں ۱۹۶۲ میں عیسیٰ نگری آیا۔ اس وقت کچھ بھی نہیں تھا، ایک میدان تھا جس میں آ کر ہم نے ڈیرا ڈالا تھا۔ ہم نے جھگیاں بنائیں، پھر آہستہ آہستہ مٹی کے گھر بنائے۔ اُس وقت کسی قسم کی ضروریاتِ زندگی حاصل نہیں تھیں، اس وقت جتنی آبادیاں ہیں ان کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ یوں سمجھیے کہ ہم ایک قسم کے جنگل میں آکر آباد ہوئے تھے جہاں چوری، خوں ریزی اور ڈکیتیاں عام تھیں۔ اور ناجائز کاموں کی وجہ سے جن لوگوں کو قتل کر دیا جاتا تھا، انھیں یہاں برابر والے قبرستان میں پھینک جاتے تھے۔ یہاں پر آباد ہونے کا مقصد تو یہ تھا کہ یہاں اس وقت کُل اسّی نوّے گھر تھے۔ جو خاندان آباد ہوئے تھے انھوں نے اپنے رشتے داروں کو کراچی کے دوسرے علاقوں سے اور پنجاب سے بلوایا۔ چوں کہ یہاں زمین کے معاملے میں بندش نہیں تھی لہذا جس کا جتنا جی چاہا اس نے زمین حاصل کر لی اور اس طرح عیسیٰ نگری آباد ہو گئی۔ یہاں صرف چند لوگ تعلیم یافتہ تھے جن میں ڈاکٹر چیمن، ڈاکٹر ہدایت اور لال دین شامل تھے۔ باقی تمام ان پڑھ لوگ تھے جن کا آبائی پیشہ کاشت کاری تھا لیکن یہاں کراچی میں صرف محنت

مزدوری کرنے کے لیے آئے تھے۔

ضروریاتِ زندگی تو کسی نہ کسی طرح پوری ہوتی تھیں لیکن ہمارا زیادہ رجحان زمین کی لیز کی طرف تھا کہ کسی طرح ہم اس کو لیز کروالیں۔ جب ہم یہاں آئے تھے تو ہمیں پتا چلا کہ یہ جگہ گنوشالا کی ہے، یعنی یہ ہندوؤں کی جگہ تھی۔ تو ہمیں اس بات کا ڈر رہتا تھا کہ کہیں وہ لوگ واپس نہ آجائیں۔ تو اس مشکل کو ہم پہلے حل کرنا چاہتے تھے جو صرف لیز کی صورت ہی میں ہوسکتی تھی۔ ہم لوگوں نے سوچا کہ یہ مسئلہ حل ہو جائے تو ضروریاتِ زندگی خود بخود حل ہوجائیں گی۔ اس سلسلے میں ہم نے کافی لوگوں کو یہاں بلایا جن میں لیڈر اور مختلف سیاسی وسماجی جماعتوں کے لوگ شامل تھے لیکن ہمارا کوئی مسئلہ حل نہ ہوسکا۔

ہم نے یہ کام ایک جماعت کی صورت میں کیے تھے جس کے صدر جناب لال دین تھے۔ اس جماعت کی وجہ سے دوسری برادریوں سے اختلاف بھی پیدا ہوے، اس کے نتیجے میں دوسری جماعت بھی بنی جس کے صدر جناب اللہ رکھا صاحب تھے۔ ان دونوں جماعتوں میں لڑائی جھگڑے بھی ہوے اور کام بھی چلتا رہا۔ ہم نے اپنی تنظیم کے ذریعے بہت کام کیے جن میں سب سے پہلا کام ہم نے یہ کیا کہ لوگوں کے راشن کارڈز بنوائے۔ یہ سارے کام اسی گروپ کی محلہ کمیٹی کے لوگ کیا کرتے تھے اور یہ رجسٹرڈ تنظیم بن گئی۔ اس تنظیم کے ذریعے تمام لڑائی جھگڑے جو ہوا کرتے تھے حل کیے جاتے تھے اور پولیس کو موقع نہیں ملتا تھا کہ وہ یہاں آکر مداخلت کرے۔ اس کے علاوہ ہم نے ایک اور تنظیم کی بنیاد رکھی جو طالب علموں کے لیے تھی اور یہ تقریباً ۱۹۶۶ میں قائم کی گئی۔ اس کے علاوہ ہم نے کمیونٹی سنٹر کے ذریعے نرسری، سلائی سنٹر اور ڈسپنسری کھولی۔ یہ کام ہم نے مسٹر بیکسٹر کے ساتھ مل کر کیا جن کا تعلق کیتھولک سوشل سروسز سے تھا۔ دوسرے لڑکے لڑکیوں کی طرح میں نے بھی سوشل ورک کی ٹریننگ لی، اس میں شامل لوگوں نے ہم سے کہا، آپ مکانات نہ بنائیں کیوں کہ جب لیز ہوگی تو مشکل پیش آئے گی۔ لیکن موسم کے لحاظ سے اور دوسری مشکلات کے پیشِ نظر کچے مکانات رہنے کے قابل نہیں تھے، بارش وغیرہ میں بہت نقصان ہوتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ بھٹو صاحب نے بیرونِ ملک جانے کا راستا کھول دیا تو یہاں کے لوگ بیرون ملک جانے لگے اور وہاں سے پیسہ بھیجا جس سے مختلف لوگوں نے اپنے گھر بنائے۔ اُس زمانے میں لوگ تعلیم سے زیادہ ناآشنا تھے اور ان کے پاس کوئی ہنر نہیں تھا۔ زیادہ تر لوگ کے ایم سی میں سینیٹری ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ تھے، لیکن آج کل بہت سے نوجوان ڈرائیونگ اور سلائی کے پیشے سے وابستگی اختیار کیے ہوے ہیں۔

عیسیٰ نگری کی تنظیم کے علاوہ ایک اور تنظیم ہم نے سارے کراچی کے لیے بنائی جو کہ کرسچین ویلفیئر آرگنائزیشن تھی۔ اس میں تیرہ دوسری تنظیمیں شامل تھیں جن کا تعلق سلاٹر ہاؤس، ناظم آباد، لیاقت آباد اور دوسرے علاقوں سے تھا۔ اس وقت کے ایم سی میں لوکل باڈی کے الیکشن ہونے والے تھے لہذا ہم نے لوگوں سے کہا کہ ہم لوگوں کو اپنا آدمی کھڑا کرنا چاہیے اور جو الیکشن لڑنا چاہتا ہے وہ سامنے آئے۔ لیکن کسی نے ہماری بات نہ مانی۔ صرف جوزف گل تھے۔ اس نے الیکشن میں کھڑے ہونے کی

Scanned with CamScanner

خواہش کا اظہار کیا جو ہم نے قبول کر لی۔ لہذا جب وہ الیکشن جیت گیا تو اس نے عیسیٰ نگری کی ترقی کے لیے جو سب سے پہلا کام کیا وہ پانی کا تھا۔

باہر سے لوگوں کو بُلوا کر کمیونٹی سنٹر میں جلسے کیا کرتے تھے۔ تو ہوا یہ کہ سی ایس ایس والوں سے ہمارے اختلافات ہو گئے جس کے نتیجے میں انھوں نے ہمیں جگہ دینی بند کر دی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ہم سیاست میں نہ آئیں۔ لیکن جب تک ہم سیاست میں نہ آتے ہم ترقی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ہمیں سیاسی لوگوں کو بلانا پڑا۔ اس زمانے میں سی ایس ایس والوں کا ایک تعلیم یافتہ سوشل ورکر ہوا کرتا تھا جس کے انڈر تمام کام ہوتے تھے اور اس وقت یہ مائیکل جاوید ان کے ساتھ کام کرتا تھا اور پڑھتا بھی تھا، جی ہاں، یہی ایم پی اے مائیکل جاوید۔ اس نے ہمارے ساتھ مل کر کام کیا۔ اس وقت ہم ایک رسالہ بھی نکالتے تھے۔ "یہ لوگ" نام کے اس رسالے کا ایڈیٹر مائیکل جاوید ہوا کرتا تھا۔ اسسٹنٹ کے طور پر میرا نام آتا تھا۔ رسالے کا سارا کام میرے ہاتھوں سے ہوتا تھا اور اس کی تقسیم وغیرہ مائیکل جاوید کے ذمے تھی۔ یہ رسالہ تقریباً ڈیڑھ سال تک چلا۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ اس کا سارا ریکارڈ میں نے غصے میں جلا دیا تھا۔ اس رسالے سے مائیکل جاوید کو خوب فائدہ ہوا۔ بند اس لیے ہو گیا کہ رسالے کے لیے فنڈ نہیں تھا۔ وہ روپیہ کہاں گیا، یہ مجھے نہیں معلوم۔

چھوڑیں جی اس بات کو۔ بتانا میں یہ چاہ رہا تھا کہ اس علاقے کا نام عیسیٰ نگری کیسے رکھا گیا۔ یہاں ہمارے چودھری غلام تھے جو اب فوت ہو چکے ہیں۔ ہوا یہ کہ گلی نمبر ۱ میں پیر بخاری کی طرف بلوچوں نے یہاں آ کر تندور اور ہوٹل کھولا جسے ہمارے لوگوں نے پسند نہیں کیا اس لیے کہ وہ لوگ باہر سے آئے تھے۔ شام کو چودھری غلام مسیح اور یوسف مسیح چوپال میں بیٹھے تھے جو کہ موجودہ کیتھولک چرچ کی جگہ پر کھلی زمین تھی۔ انھوں نے کہا کہ یہ سلسلہ آگے بڑھے گا اور پھر یہ لوگ تنگ کریں گے، تو وہاں فیصلہ ہوا کہ جو کوئی ان کے ہوٹل سے خریداری کرے گا اسے ۵۰ روپیہ جرمانہ ہوگا اور ۵۰ جوتے مارے جائیں گے۔ اس فیصلے پر لوگوں نے متفقہ طور پر عمل کیا اور تین چار دن بعد ہوٹل والے یہاں سے چلے گئے تو چوتھے دن ہم شام کو چودھری غلام کو لے کر آئے۔ وہ بہت خوش ہوئے کہ لوگوں نے ان کے فیصلے پر عمل کیا ہے۔ ان کے منھ سے اچانک نکلا کہ ہم عیسائی ہیں اور یہ عیسیٰ نگری ہے، سو اس دن سے ہم نے اس کا نام عیسیٰ نگری رکھ دیا۔ اس سے پہلے چوں کہ ہم لوگ لیاقت بستی سے آئے تھے اس لیے عام طور پر لوگ اسے بھی لیاقت بستی کہنے لگے تھے۔ وہاں سے ہم لوگ اس لیے اٹھ گئے تھے کہ وہ جگہ گورنمنٹ کو پریس کے لیے درکار تھی اور اس وقت مہاجرین کی آبادکاری کا سلسلہ بھی تھا۔ ایوب خاں صاحب نے لانڈھی میں مکان بنوائے تھے اور وہاں مہاجرین کو آباد کیا جا رہا تھا۔ ہماری کوشش تھی، اس میں میرے والد دولت مسیح اور حاکم مسیح، اور لوگ بھی شامل تھے، انھوں نے بی ڈی ممبر جو تھے، نام مجھے یاد نہیں، ان کے تھرو ہمارے بزرگوں کا پولیس سے رابطہ ہوا تو بی ڈی ممبر نے کوشش کی کہ ان لوگوں کا بھی کوئی انتظام ہونا چاہیے۔ تو ان کی کوششوں سے ہمارے لیے بھی لانڈھی میں مکان منظور ہوئے۔ جب بزرگوں نے اس کی

اطلاع لوگوں کو دی تو لوگوں نے کہا ہم وہاں نہیں جائیں گے، وہ بہت دور ہے، قریب ہی کوئی جگہ مل جائے تو بہتر ہے۔ بی ڈی ممبر اور تھانیدار نے کہا کہ ٹھیک ہے، آپ کوئی اور جگہ دیکھ لیں، ہم آپ کو وہاں بٹھا دیں گے۔ یہاں ہمارے آنے پر آس پاس کے گوٹھ میں سندھیوں نے مخالفت کی۔ لیکن دوسرے دن ہم لوگ لیاقت بستی سے جو پیر الٰہی بخش کالونی کے قریب تھی، یہاں آ کر بیٹھ گئے۔ پھر آہستہ آہستہ یہاں آباد ہو گئے۔

اُس وقت سب کچھ ہم لوگ کیا کرتے تھے۔ میں جنرل سیکرٹری تھا، ایک صدر تھا۔ اس وقت لوگ ہماری بات مانتے تھے، ہماری عزت کرتے تھے۔ لوگ جانتے تھے کہ وہ تو کام میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی ہمارے لیے کام کرے۔ تو یہ کام ہم نے کیے اور میرے پاس کافی رکارڈ موجود ہے۔ گورنمنٹ یا تھانے کی طرف سے کوئی چودھراہٹ نہیں تھی۔ بلکہ یہ ہماری خود ساختہ تھی۔ جو کہ ہمارا سسٹم پنجاب میں ہے کہ زمین دار کو چودھری کہتے ہیں، تو یہاں بھی سب کھاتے پیتے لوگ چاہتے تھے کہ ان کو بھی چودھری کہا جائے، لیکن ایسا نہیں تھا۔ جو کام مسائل کے حوالے سے چودھریوں کے کرنے کے تھے وہ لڑکوں نے کیے۔ بیس پچیس سال ہم لوگوں کی طرف دیکھتے رہے، چودھری لوگوں نے ہمیں صرف نقصان دیا ہے۔ بڑی مشکل سے چودھریوں نے ہمیں قبول کیا اور کام کرنے دیا۔ کام نوجوان کرتے تھے اور مشورہ ان سے لیتے تھے بلکہ ہم ان کو باقاعدہ رپورٹ دیتے تھے کہ ہم نے یہ کیا ہے، اتنا چندہ جمع ہوا ہے۔

پچھلے بیس پچیس سال میں جو ہم نے محنتیں کی ہیں اور کوششیں کی ہیں تو اس دوران ہم نے سب کو آزمایا ہے، لیکن مسائل حل نہ ہوئے تو پھر ہمیں یہ سمجھ میں آئی کہ جس مجلس میں اپنا آدمی نہ ہو وہاں بات اپنی نہیں ہوتی۔ تو پھر ہمارے ذہن میں آیا کہ یہاں سے لیڈرشپ لائی جائے اور یہاں سے ایک نمائندہ کے ایم سی میں ہو یا ایم پی اے لایا جائے۔ اس وقت ہمارا کونسلر اقبال لال تھا جس کا تعلق دوسرے علاقے سے تھا۔ اقبال لال سے میری بات ہوئی تو اس نے مخالفت کی کہ ہم اپنا آدمی کھڑا کریں، لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے کچھ ایسی باتیں بھی کیں جس سے ہمیں غیرت آئی اور غصہ بھی آیا، تو میں نے اپنے لڑکوں سے اسی کمرے میں بیٹھ کر پروگرام بنایا۔ سب سے پہلے میں نے اسلم سے کہا آپ کونسلر کے لیے تیار ہوں، تو اس نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد مقصود گوہر سے کہا کہ آپ الیکشن لڑیں، کیوں کہ یہ لڑکے پڑھے لکھے تھے، تو انھوں نے بھی انکار کر دیا۔ پھر بیکسٹر سے کہا گیا، اس نے بھی انکار کر دیا۔ تو پھر میں نے انھیں شرم دلانے کے لیے کہا کہ میں کھڑا ہو جاتا ہوں، تو کہنے لگے کہ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں نے کہا شرم کرو، میں بوڑھا آدمی ہوں۔ پھر میں نے کہا کہ میں ایک نام اور پیش کرتا ہوں۔ آپ متفق ہو کر اس کی منظوری دیں۔ پھر میں نے سلیم کھوکھر کا نام دیا، تو انھوں نے کہا ٹھیک ہے۔ اور پھر ہم نے ڈبا بجا کر لوگوں کو گلی نمبر ۶ میں برات گھر میں جمع کیا اور لوگوں کو بتایا کہ ہماری جماعت کا فیصلہ ہے کہ آئندہ الیکشن میں سلیم کھوکھر کو نسلر کے لیے کھڑا کیا جائے گا، تو لوگوں نے اس

کو قبول کیا۔ پھر ہم نے ووٹ بنانے شروع کر دیے اور دوسرے علاقوں مثلاً سولجر بازار میں بھی گئے۔ سلیم کھوکھر نے الیکشن لڑا اور کامیاب ہوے۔ آج وہ ایم پی اے ہیں۔ سلیم کھوکھر کی کامیابی کے بعد وہ لوگ جو ہمیں ٹرخاتے تھے انھوں نے یہ بھی دیکھا اور علاقے میں ترقیاتی کام ہونے لگے۔ یہاں پانی آیا، گٹر بنے، بجلی آئی، گیس آئی۔ جب گورنمنٹ دیکھتی ہے کہ بستی لیز ہو گئی تو اس قسم کی ایجنسیاں خود بخود آجاتی ہیں اور منتخب نمائندے سے رابطہ بھی ہو جاتا ہے۔

میں تعلیم کی بات بھی کرنا چاہتا ہوں۔ آرگنائزیشن کے پلیٹ فارم سے ہم نے یہاں ایک پرائمری اسکول کھولا جو گلی نمبر ۴ کے برات گھر میں تھا۔ اس وقت ہمارے پاس دریاں بھی نہیں تھیں۔ اُس وقت جو ٹیچر رکھا گیا وہ مائیکل جاوید تھا لیکن جب ایک اور تنظیم بن گئی تو اس نے ہم پر کیس کر دیا۔ ہم یہ کیس لڑے جس کی وجہ سے پڑھائی کا سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک دفعہ ہم سیر و تفریح کے لیے بچوں کو چڑیا گھر بھی لے کر گئے۔ وہاں پر چھ سال کا ایک بچہ گم ہو گیا۔ باوجود کوشش کے وہ ہمیں نہ مل سکا۔ دوسرے دن ایک پٹھان اس کو ہمارے پاس لا کر چھوڑ گیا۔

اسکول دوبارہ اس طرح کھلے کہ یہاں صرف ایک ہی مشن تھا، کیتھولک مشن۔ ان کی خواہش تھی کہ انھیں وہ جگہ مل جائے جس پر اس وقت چرچ آف پاکستان ہے لیکن وہ نہیں مل سکا۔ کیتھولک مشن میں اس وقت فادر بریگنزا ہوا کرتے تھے، انھوں نے یہاں دو پلاٹ لیے۔ پھر دو یہاں مشن ہو گئے۔ اس وقت جو چرچ آف پاکستان تھا وہ میتھوڈسٹ مشن تھا، اس نے یہاں ایک اسکول کھولا، وہ ایسے کہ پادری واکر کی جو بیوی تھی وہ تعلیمِ بالغاں کا سلسلہ شروع کیے ہوے تھی تو اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے پرائمری اسکول بھی شروع کیا۔ جب یہ ہوا تو میں اس وقت کیتھولک چرچ کمیٹی کا جنرل سیکرٹری تھا۔ اس وقت ہم نے مسٹر خشک لال کو رکھا اور بنجمن انتھنی کے والد صاحب تھے، انھوں نے اسکول کھول لیا۔ یہاں سب سے پہلے دریاں ڈالی گئیں اور سب سے پہلے جو استاد تھے وہ ماسٹر یوسف تھے اور ماسٹر خزاں تھے، ان کی بیوی تھیں۔ اس طرح ان اسکولوں نے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر پادری واکر سے میتھوڈسٹ والوں سے اختلاف ہو گئے تو انھوں نے نیا چرچ بنا لیا اور اس کو یوپی چرچ کا نام دیا۔ اس میں اسکول بھی تھا۔ اس طرح سیونتھ ڈے والوں نے اسکول کھول لیا اور ان کے اسکول کا ایک آدمی تھا اس نے ان کا اسکول چھوڑ کر اپنا اسکول کھول لیا۔ اس طرح یہ سلسلہ چل نکلا۔ اب میں عوامی چرچ میں اپنا اسکول چلا رہا ہوں۔ وہاں چپڑاسی سے لے کر مینیجر تک سارے کام کرتا ہوں۔

میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ خدا نے مجھے خاص طور پر عیسیٰ نگری کی خدمت کے لیے پیدا کیا ورنہ میں کسی اور جگہ بھی جا سکتا تھا، تو یہاں پر ایک عجیب بات ہے کہ میں بزرگوں کی تنظیم کا بھی جنرل سیکرٹری رہا ہوں، نوجوانوں کی تنظیم کا بھی، لڑکیوں اور خواتین کی تنظیم کا بھی جنرل سیکرٹری رہا ہوں۔ ہر قسم کی تنظیم کی میں نے نمائندگی کی ہے۔ اس وقت کے نوجوان کے ذہن میں تفکرات تھے۔ اس وجہ سے بھی کہ اسے پانی دور دراز علاقوں سے لانا پڑتا تھا۔ لیکن آج کا نوجوان اٹھ کر سوچ آن کرنا پسند

نہیں کرتا کہ موٹر سے پانی بھر لیا جائے۔ وہ سہل پسند ہو گیا ہے۔ میں اس کو یوں دیکھتا ہوں کہ وہ سوچتے ہیں ہمارے بزرگوں نے بہت کچھ کر دیا ہے۔ اس سے گیپ پیدا ہو گیا ہے۔ اس میں ہماری غلطی ہے۔ ہم نے یہ کیا کہ جب ہمارا کونسلر بن گیا، ایم پی اے بن گیا، تو ہم یہ سمجھنے لگ گئے کہ ہمارے تمام مسائل حل ہو گئے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ یہاں کی تنظیم پاورفل ہوتی۔ جب تک ایک مضبوط تنظیم نہ ہوگی ہمارے مسائل حل نہ ہوں گے۔ ایم پی اے ہمارے لیے آرڈر لے سکتا ہے، پیسے لے سکتا ہے، کنٹرلائن لے سکتا ہے، لیکن وہ اس کو سنبھال نہیں سکتا۔ اس کو صرف علاقے کی تنظیم سنبھال سکتی ہے۔

آج کل کے نوجوانوں میں سب سے پہلی برائی تو یہ ہے کہ جو لوگ کے ایم سی میں ملازم تھے وہ یا تو ریٹائر ہو گئے یا باہر چلے گئے۔ جو ملازمت خالی ہوئی اس پر اپنے بیٹوں کو لگا دیا ہے۔ ان کو تنخواہ تو ملتی ہے، چاہے وہ کام کریں یا نہ کریں۔ تو جب کوئی فارغ ہوگا تو ان کا ذہن خالی رہے گا۔ کہتے ہیں خالی ذہن شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ ان کے پاس جو پیسے ہوتے تھے تو انھوں نے ڈرگز کا استعمال شروع کر دیا۔ ان کی دیکھا دیکھی اوروں نے بھی یہ کام شروع کر دیا۔ پچھلے چار پانچ سال میں ڈرگ کلچر حاوی ہو گیا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں اشعار بھی لکھے ہیں۔ ایک نظم آپ کو سناتا ہوں۔ میں پنجابی میں بھی شاعری کرتا ہوں اور اردو میں بھی۔ شریف میرا نام ہے اور سوز میرا تخلص ہے۔

> انسانی زندگی کے لیے بنیادی سہولیات آج بھی عیسیٰ نگری میں محدود ہیں۔ اور یہ محدود سہولتیں بھی بڑی کوشش اور جدوجہد کے بعد حاصل ہوئی ہیں۔ ان سہولتوں کے حصول اور علاقے کی ترقی کے بارے میں لیاقت منور نے، جو سیاسی اور سماجی کاموں میں فعّال رہے ہیں، انٹرویو کے دوران بعض تفصیلات بتائیں۔

ماضی میں عیسیٰ نگری میں جھونپڑیاں تھیں، اس کے بعد لوگوں میں تھوڑا شعور پیدا ہوا اور اس شعور سے یہ ہوا کہ لوگوں نے محسوس کیا یہاں مکان ہونے چاہییں، جھونپڑیاں اچھی نہیں ہیں، محفوظ نہیں ہیں۔ لوگوں نے کچے مکان مٹی سے گارے سے بنائے۔ یہ لوگوں کی اپنی ایک سوچ تھی۔ چودھری سسٹم یہاں پر رائج تھا اور چودھریوں کی پنچایت ہوتی تھی، وہی فیصلہ کرتے تھے۔ لوگوں نے پھر اس کے بارے میں بھی سن ۷۰ کے بعد محسوس کیا۔

جہاں تک آپ کا سوال ہے کہ یہ شعور کیسے آیا، تو بات یہ ہے کہ جب لوگ مل کر بیٹھتے ہیں، گفتگو کرتے ہیں، باتیں نکلتی ہیں تو سوچ پیدا ہوتی ہے اور شعور آتا ہے۔ ہم لوگ تو نہیں، ہمارے بزرگ جنھیں کہہ لیں، بیٹھتے تھے۔ آپس کی باتوں کا فیصلہ تھانے کے بجائے پنچایت میں ہو جاتا تھا۔ جب ایک جگہ لوگ بیٹھتے ہیں تو ایک دوسرے کا احساس ہوتا ہے۔ ہمارے لوگ باہر زیادہ کام کرتے تھے، اپنا بزنس کسی کا

نہیں تھا۔ تو ان کو احساس ہوا کہ لوگ اچھے مکانوں میں رہ رہے ہیں، ہم جھونپڑیوں میں ہیں تو اس کے لیے ہمیں بھی کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے، اور مل کر کرنا چاہیے۔ تو سوسائٹیز تو ہر دور میں رہی ہیں۔ مسلمانوں کی بھی رہی ہیں اور یہ کلفٹن، ڈیفنس کی بھی رہی ہیں۔ تو لوگوں کا اکٹھ جو ہے ہر دور میں، ہر جگہ موجود رہا ہے۔ تو اس وجہ سے جب یہ لوگ بھی بیٹھتے تھے تو ادھر اُدھر کی کہانیوں کے بعد، یا کہانیوں سے پہلے، یہ اپنے مسائل بھی ڈسکس کرتے تھے اور مسائل کے حل کے لیے بھی گفتگو کر لیتے تھے۔ اس زمانے میں جو مسائل تھے، ان میں تین مسائل اہم تھے۔ پانی نہیں تھا، گٹر لائن نہیں تھی اور بجلی نہیں تھی۔ اس وقت پانی کا مسئلہ حل تو نہیں ہوا، لوگ دور سے پانی لاتے تھے، مستقل بنیادوں پر یہ مسئلہ حل نہیں ہوا۔ ایک نل تھا جس پر پوری عیسیٰ نگری گزارا کر رہی تھی۔ خیر آبادی بھی کم تھی۔ پانی بھی انھوں نے توڑ کر لیا تھا۔ پائپ لائن گزر رہی تھی، لوگوں کو ضرورت تھی اور ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ لوگوں نے پائپ لائن توڑی اور وہاں سے نل لیا، پورے علاقے کے لوگوں کو پانی ملتا تھا۔ اس کے بعد لوگوں کے لیے سیوریج لائن کا مسئلہ اہم تھا۔ لوگوں نے گھروں کے سامنے کنویں کھدوائے اور سارا فضلہ، پانی وغیرہ اس میں گرتا تھا۔ سال چھ مہینے بعد اس کو ختم کر دیتے تھے یا خالی کروا لیتے تھے۔ شارٹ ٹرم میں کام کروا لیتے تھے۔

اس کے بعد میں دوسرے دور کی بات کروں گا۔ سن ۷۰ کے بعد لوگوں نے محسوس کیا کہ مکان بھی ہیں اور یہ کنواں سسٹم اچھا نہیں ہے، یہ بھر جاتا ہے اور مستقل نہیں ہے۔ سیوریج لائن ڈالی گئی اور لوگوں نے اپنے طور پر پانی بھی جاری کروایا۔ اس سلسلے میں جو لوگ سیاسی طور پر کام کر رہے تھے ان کا کیا کنٹری بیوشن تھا تو میرے نظریے میں صحیح سیاست شروع ہوئی ہے ۱۹۸۵ کے بعد۔ اس سے پہلے سیاست ہوتی رہی ہے، سیاسی شخصیات ہوتی رہی ہیں، ۸۵ سے اس لیے شروع ہوئی ہے کہ ہمیں جداگانہ انتخاب ملے۔ جب جداگانہ انتخاب ملتے ہیں تو، ظاہر ہے اب آپ اور میں بھی سیاست پر بات کر رہے ہیں اور جداگانہ انتخاب نہیں ہوتے تو ہمیں بھی کسی مسلمان ایم پی اے، یا ایم این اے یا کونسلر کے پاس جانا پڑتا۔ اور باہر جا کر بیٹھنا پڑتا۔ آج کم از کم یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے ایم پی اے، ایم این اے کے پاس بیٹھتے ہیں، ان کو بات بھی سنا سکتے ہیں اور سن بھی سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ میں جداگانہ کی حمایت اس لیے کر رہا ہوں۔ اس وقت سیاسی شخصیت اسلم مارٹن تھے اور مقصود فراز۔ میرے نزدیک ان کی کوئی خدمات ایسی نہیں ہیں جو لوگوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی ہوں۔

سیاست کی وجہ سے یا سماجی سرگریوں کی وجہ سے لوگوں کی زندگی میں تبدیلی آئی تو سماجی سرگرمیوں سے چینجنگ آئی۔ شروع میں ہم نے ایک سماجی تنظیم بنائی تھی جس کا میں فاؤنڈنگ ممبر ہوں۔ اس کا نام تھا، انجمنِ مسیحی نوجوانانِ کراچی۔ انجمن نے یہاں کی نوجوان نسل کو شعور دیا ہے۔ ہر کام میں، یعنی سیاست میں، کھیل میں، ادب وغیرہ میں۔ انجمن نے یہ کیا، سیاسی طور پر انجمن نے یہ کام کیا کہ بلدیاتی الیکشن تو شروع ہو چکے تھے ۸۰ کے بعد، تو پہلے دوسرے علاقوں کے کونسلر ہوا کرتے تھے تو ۱۹۸۷ میں انجمن کے پلیٹ فارم سے ہم نے سلیم کھوکھر کو نامزد کیا، سلیم کھوکھر جیتا۔ اس کے بعد

Scanned with CamScanner

لوگوں کی زندگی میں تو نہیں، عیسیٰ نگری کی زندگی میں یہ تبدیلی آئی کہ عیسیٰ نگری کو لیز ملی سلیم کھوکھر کے آنے کے بعد اور پانی بجلی، یہ وہ حاصل ہوئے۔ تو سیاسی سرگرمی سے ترقیاتی کام ہوئے۔

۷۰ سے ۸۰ تک عیسیٰ نگری کا ایک دور ہے۔ اس دور میں یوتھ کے حوالے سے بھی ایکٹوٹیز تھیں۔ اس زمانے میں یوتھ ڈرامے کرتی تھی، زیادہ تر مذہبی تھے لیکن سوشل کم ہوا کرتے تھے۔ پانچ سال میں ایک ہو گیا۔ مذہبی ڈراموں میں بھی سماجی پہلو سے کچھ نہ کچھ پیغام مل جایا کرتا تھا۔ اس دور میں اسلم مارٹن، انجمن اور مقصود فراز ڈراموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ یہ ایکٹوٹی سال میں ایک دو بار ہوا کرتی تھی مذہبی تہوار کے وقت۔ عام دنوں میں نوجوان یہ کیا کرتے تھے کہ امتحان کے دن نزدیک آیا کرتے تو کیتھولک چرچ میں کلاسیں لے لیا کرتے، کمیونٹی سنٹر جو گلی نمبر ۶ میں ہے اور جس پر اب ایک با اثر شخص کا ناجائز قبضہ ہے، وہ عیسیٰ نگری کے نوجوانوں کے پاس تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوتی تھیں تو مجھے یاد ہے کہ یہاں کے جو پڑھے لکھے لڑکے تھے، وہ چھوٹے لڑکوں کو، مطلب یہ کہ ساتویں آٹھویں کے لڑکے بلکہ پرائمری سے لے کر دسویں تک، ان کو وہاں چھٹیوں میں پڑھاتے تھے۔ ایک ہیلتھ کلب بھی تھا اسی کمیونٹی سنٹر میں جس پر ناجائز قبضہ ہے۔

میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ سیاست کی وجہ سے تمام ترقی ہوئی ہے۔ سماج جو ہے، لوگوں کا اکٹھ یہ اہم چیز تھی۔ سیاست میں آنے کے بعد یہ ہوا ہے کہ تیزی آئی ہے کاموں میں۔ مطلب یہ کہ کام پہلے بھی ہو رہے تھے۔ پانی تو پہلے بھی آ گیا تھا، وہ گلیوں میں تھا، سلیم کھوکھر کے جیتنے کے بعد گھروں میں بھی آ گیا۔ مطلب یہ کہ شروع سے ابھی تک ترقی کا عمل جاری رہا ہے اور بعد میں آنے والے لوگوں نے اسے آگے بڑھایا ہے۔

اس دور میں خواتین کا کیا کردار رہا ہے، یہ مشکل سوال ہے۔ خواتین کے لیے کسی نے باقاعدہ کوشش نہیں کی، نہ انجمن نے اس سلسلے میں کوئی کوشش کی ہے۔ ہیلتھ سنٹر بنا تو اس کے بعد سے ہمارا رابطہ قائم ہوا۔ جب سنٹر تھا تو خواتین ٹائم بھی دیتی تھیں، میٹنگ میں بھی آتی تھیں۔ آج بلا کر تو دیکھ لیں۔ دس کو بلائیں گے تو دو آئیں گی۔ ہمارا معاشرہ خواتین کو اجازت نہیں دیتا۔ وہ اپنی مشکلات پیش کریں گی کہ میرا بچہ بیمار تھا، خاوند نے اجازت نہیں دی۔ خواتین کام تو کرنا چاہتی تھیں۔ ۷۰ میں لڑکیاں یوتھ میں شامل تھیں، ۸۰ میں آ کر پھر کٹ گئی ہیں۔ بھرپور تو نہیں کہہ سکتے لیکن ۷۰ میں لڑکیاں سوشل کاموں میں شامل رہی ہیں۔ اب خواتین موجود ہیں، کام بھی کرنا چاہتی ہیں، آنا چاہتی ہیں، لیکن ان پلیٹ فارم نہیں ہے۔ اب ایک تنظیم بنائی ہے جس کا میں صدر ہوں، اس میں خواتین ممبر بھی ہیں، بھی ہمارے ساتھ کام کریں گی۔ ہماری تنظیم ہیلتھ اور ایجوکیشن کے لیے، منشیات کے خلاف کام کر رہی ہے اور انسانی حقوق کے لیے کام کر رہی ہے۔

جیسے جیسے عیسیٰ نگری میں ترقی ہوئی ہے، شہر بھی اپنی ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا ہے۔ پہلے کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا تھا کہ کچی بستی میں رہنے کے حوالے سے یا پیشے کے حوالے سے لوگ تعصب

نظری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ عام سطح پر، محلوں کی سطح پر تعصب رہا ہے، لیکن اب کم ہو گیا ہے۔ اس وقت شاید ایجوکیشن کم تھی اور پیشے کے حوالے سے لوگ تنگ کیا کرتے تھے۔ ہمارے بزرگوں نے جو میونسپل کارپوریشن میں ملازم تھے، انھوں نے کوشش کی ہے کہ اپنے بیٹوں کو تعلیم دلوائیں۔ جو تعلیم نہیں حاصل کر سکے انھوں نے کوشش کی، کوئی ڈرائیور بن گیا، کوئی میکینک بن گیا، کسی نے سبزی کا ٹھیلا لگا لیا، اس طرح پیشے بدلنے کی کوشش کی۔ اب اس طرح کے الفاظ کہ بھنگی وغیرہ کم ہیں۔ اب جو ہے ڈائریکٹ تعصب آ گیا ہے کہ آپ نوکری کر رہے ہیں اور مسیحی کوئی ذہین ہے تو لوگ اس سے جلنے لگتے ہیں کہ یہ ترقی کیوں کر رہا ہے، یہ ہے تو بھنگی۔ پچھلے دنوں مائیکل جاوید کے ساتھ ہوا تھا کہ اس نے کچھ دیر کے لیے سندھ اسمبلی کے اسپیکر کے بجائے صدارت کی تو "پرچم" اخبار میں سرخی لگ گئی کہ بھنگی نے صدارت کی۔ مائیکل جاوید کچھ بھی ہیں، لیکن وہ مسیحیوں کے نمائندے ہیں، ووٹ لے کر کامیاب ہوئے ہیں، تو سب کو شاک لگا کہ یہ لوگ ہمارے نمائندے کے ساتھ ایسی حرکت کر سکتے ہیں۔ اگر پڑھے لکھے لوگوں کی ایسی سوچ ہے تو عام لوگوں کے ساتھ یہ کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ اس تعصب سے نجات کے لیے ہمیں تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ ہمارے نوجوان انٹیلی جنٹ ہوں گے تو ہم سب کچھ کر سکتے ہیں، اس کام سے نکل سکتے ہیں۔ جب تعلیم آتی ہے تو شعور آتا ہے، شعور آتا ہے تو پھر بندہ ترقی کی سوچتا ہے اور جب ترقی کی سوچتا ہے تو اپنے حالات بدلنے کی سوچتا ہے۔ علاقے کے حالات بدلتا ہے، ملک کے حالات بدلتا ہے۔

ترقی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ علاقے میں مسائل بدل گئے ہیں۔ ۶۴ سے ۹۵ تک بہت سفر کیا۔ آج ہمارے پاس سب کچھ ہے، لیز ہے، بجلی ہے، پانی ہے لیکن ایک چیز کی میں کمی محسوس کر رہا ہے اور اس پر حیرت بھی ہے اور افسوس بھی ہے کہ پہلے جو اتحاد تھا عیسیٰ نگری کے نوجوانوں میں اور بزرگوں میں اور علاقے کے لوگوں میں، اس کی کمی میں شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔ اب نہ ہی ایک پلیٹ فارم ہے۔ دو ایم پی اے ہیں، دونوں کی الگ الگ پارٹی ہے، دونوں کے الگ الگ بندے ہیں۔ کچھ ایسے لوگ ہیں جو اپنے فائدے کے لیے کبھی مائیکل کے پاس چلے جاتے ہیں، کبھی سلیم کے پاس آ جاتے ہیں۔ باقی ہماری تنظیم بھی کام کر رہی ہے، ایک پلیٹ فارم ہے ہمارے پاس اور ہم کوشش کر رہے ہیں کہ لوگوں کو پہلے کی طرح، جو پہلے ہماری انجمن نے شعور دیا تھا لوگوں کو تو آج ہم اس ترقی تک پہنچے، ہم پھر کوشش کر رہے ہیں ایسے لوگوں کو ساتھ ملا رہے ہیں تا کہ ہم پھر اسی ڈگر پر آ جائیں۔

اتحاد اس لیے متاثر ہوا کہ پارٹی بن گئی اور جہاں طاقت آتی ہے وہاں پارٹیشن ہوتی ہے۔ آپ دیکھیں کہ ایم کیو ایم کی مثال ہے۔ جب حقیقی والوں کے ساتھ فوج آئی، انھیں فوج کی طاقت ملی تو وہ علیحدہ ہو گئے۔ یہی سلیم کھوکھر کے ساتھ ہوا۔ اس کو انجمن نے یہاں تک پہنچایا۔ اس کے پاس جب طاقت آئی تو اس نے ساتھیوں کو اگنور کیا۔ ساتھیوں نے دیکھا کہ ہمیں اگنور کیا جا رہا ہے مسلسل تو ساتھی علیحدہ ہو گئے۔ اتحاد کا یہ فقدان طاقت کے آنے سے ہوا۔ پھر یہ ہوا کہ دو سیٹیں آ گئیں اور دو

Scanned with CamScanner

سیٹوں سے دو پارٹیاں بن گئیں۔

اتحاد کے علاوہ اور بھی مسائل آئے ہیں۔ ہیروئن کا ایک بھرپور دور گزرا ہے جس کی آج بھی علامات باقی ہیں۔ لوگوں نے خاصی مقدار میں ہیروئن بیچی، یہاں پر ایک لائن لگی ہوتی تھی ہیروئن بیچنے والوں کی اور ہیروئن خریدنے والوں کی۔ عیسیٰ نگری میں دو سو کے قریب لوگ ہوں گے جو ہیروئن دیتے ہیں۔ ان میں چرس اور کُپی دینے والے بھی ہیں۔ ٹنکچر سے کپی بناتے ہیں اور تین لوگ پوری کپی پی جاتے ہیں۔ ہماری تنظیم اس کے خلاف بھی کام کر رہی ہے۔ ہم ایک ٹورنامنٹ کروا رہے ہیں نوجوانوں کو نشے سے دور رکھنے کے لیے۔ نوجوان بڑھ چڑھ کر تیاری کر رہے ہیں، پریکٹس کر رہے ہیں اور دوسرے علاقوں سے بھی فٹ بال کی ٹیمیں آئیں گی۔ جب ٹورنامنٹ ہوگا تو ہم ایک صحت مند سرگرمی دیں گے نوجوانوں کو۔ ایسی سرگرمیاں ہوں گی تو لوگ لازمی طور پر یہ ہیروئن، شراب، پان، سگریٹ وغیرہ کو اچھا نہیں سمجھیں گے۔

میں نوجوانوں کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں، اپنے مسیحی نوجوانوں کو، کہ وہ آگے آئیں۔ اب ہماری قوم کے نوجوان باشعور ہیں، کافی ترقی کی ہے انھوں نے۔ اب وہ لوگوں کو بتائیں کہ ان کے حقوق کیا ہیں، ان کے ایم پی اے ان کے لیے کیا کر سکتے ہیں، ان کے ایم این اے ان کے لیے کیا کر سکتے ہیں، ان کے کونسلر ان کے لیے کیا کر سکتے ہیں، ملک کی بیوروکریسی پر اُن کا کتنا اختیار ہے۔ یہ بیوروکریسی پبلک سرونٹ ہے، انھیں پبلک سرونٹ بن کر رہنا چاہیے، نہ کہ ہمارے حاکم بن کر۔ یہ فریضہ نوجوانوں پر عائد ہوتا ہے کہ لوگوں میں یہ شعور عام کریں، سماجی تنظیموں سے یہ اپیل ہے کہ وہ لوگوں کو ان باتوں سے آگاہ کریں کہ جو لوگ سیاست میں ہیں ہم ان سے کس طرح کام لے سکتے ہیں اور آئندہ جب انتخابات ہوں تو ان کا احتساب کیا جائے، ان سے پوچھا جائے کہ قوم نے آپ کو مینڈیٹ دیا تھا، آپ نے قوم کے لیے کیا کیا۔ ہمیں شراب خانوں کے پرمٹ سے مطمئن نہیں کر سکتے۔ اور ہم لوکل لیڈرشپ پر قناعت نہیں کر سکتے۔ میں ان لوگوں سے بات چیت کر رہا ہوں جن کے دل دُکھے ہوئے ہیں۔

> شہر کراچی کی طرح عیسیٰ نگری بھی ایسے سماجی عمل سے گزرتی رہی ہے جس کی رفتار بظاہر آہستہ ہے لیکن جس کے نتیجے میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ عیسیٰ نگری میں کئی لوگ ایسے ہیں جو اس سماجی عمل کا قریب سے مشاہدہ کرنے کے ساتھ ساتھ فعال بھی رہے ہیں۔ ان لوگوں میں بیکسٹر بھٹی کا نام بھی آتا ہے۔ بیکسٹر بھٹی نے سیاسی اور سماجی عمل اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ سیاسی اور سماجی حوالے سے جو بات ہم کر رہے ہیں، ان دونوں کا آپس

میں گہرا تعلق ہے۔ عیسیٰ نگری کا ماضی یہی تھا کہ جو لوگ یہاں آ کر بسے وہ پنجاب کا پسا ہوا طبقہ تھا۔ وہاں کے جاگیرداروں کا ستایا ہوا اور کچلا ہوا طبقہ تھا۔ جیسے ہم ذہنی پسماندگی کہہ سکتے ہیں، وہ اپنے ساتھ لائے تھے، اس کا جو اثر تھا وہ ساتھ لے کر آئے تھے۔ وہ خود جاگیردار تو نہیں تھے، لیکن ان کا جو مزاج تھا اس پر جاگیرداری کا اثر تھا اور یہ جو بگڑا ہوا مزاج تھا اس کی وجہ سے شروع میں یہاں کافی رکاوٹیں پیش آئیں۔ لوگ آپس میں بٹے ہوئے تھے، ایک دوسرے کی ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اور باہمی اعتماد جو ہوتا ہے اس کا فقدان تھا۔

ایسے کام بھی تھے جو اس علاقے کے مفاد میں تھے لیکن اس چودھری سسٹم اور چودھراہٹ کی وجہ سے ختم ہو گئے۔ یہاں پر ایک فادر جان ڈیکروز ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے بڑی اچھی کوشش کی کہ بیرونی امداد سے اس علاقے کی اَپ لفٹ ہو جائے۔ وہ باؤسنگ کا ایک پروجیکٹ بھی لائے تھے یہاں پر۔ اور یہ جو کمیونٹی سنٹر ہے جس پر آج کل ایک ایم پی اے صاحب کا قبضہ ہے، اس کو اسٹور بنا دیا گودام ٹائپ کا کہ سارا جو بلڈنگ میٹیریل ہو گا وہاں پر جمع کیا جائے گا اور وہ کمیونٹی کے استعمال میں آئے گا۔ لیکن ایسا ہوا کہ یہاں پر چودھراہٹ سسٹم جو تھا اس نے اس کو فیل کر دیا۔ کیوں کہ لوگوں نے کہا کہ عیسیٰ نگری میں فلیٹ بن گئے اور ہم کو وہاں رہنا پڑا تو ہم بکری کہاں باندھیں گے۔ کسی نے اس کو یوں سبوتاژ کرنے کی کوشش کی کہ ہم صفائی کریں گے تو کچرا نیچے والے کے گھر پر گرے گا۔ کسی نے کہا ہم بھینس کہاں پر باندھیں گے۔ تو یہ وہ چیزیں تھیں جو لوگوں نے کہیں۔ اس کے پیچھے محرکات وہی تھے کہ لوگوں کی ذہنی پسماندگی بہت تھی۔ یہ لوگ تعلیمی لحاظ سے پسماندہ تھے، معاشی لحاظ سے پسماندہ تھے، سماجی لحاظ سے پسماندہ تھے جس کی وجہ سے وہ اس پروجیکٹ کو سمجھ نہیں سکے اور ہمارا وہ پروجیکٹ چودھراہٹ کی نذر ہو گیا۔

یہ چیزیں ہمارے مشاہدے میں تھیں۔ اُس وقت ہم لوگ چھوٹے تھے اور جو لوگ ہم سے بڑے تھے یا تھوڑے بہت پڑھے ہوئے دوست تھے وہ بھی یہ دیکھتے تھے کہ پسماندگی اور بگڑے ہوئے مزاج کا آپس میں ایسا انٹرلنک تھا کہ اس کو توڑنا بہت مشکل نظر آتا تھا اور جو یہ تھوڑے بہت سمجھ دار دوست تھے اپنا فرسٹریشن ڈراموں میں نکالتے تھے، وہ بھی کرسمس آ گیا، ایسٹر آ گیا تو مل بیٹھ کر کام کرتے تھے اور یہاں تک ان کی ایکٹویٹی ہوا کرتی تھی۔ تو اس باہمی ربط کو توڑنے میں بڑی مشکل تھی۔ لیکن میں نے عرض کیا ہے اس سارے عمل میں کچھ تو پلاننگ ہوتی ہے اور قدرتی فیکٹرز بھی ہوتے ہیں۔ تو ایسا ہوا کہ ۷۵ میں یہاں ایک واقعہ ہوا کہ کچھ ہمارے مسیحی غیر ذمے دار لوگ اور کچھ ہمارے پڑوس میں جو مسلم ہیں ان میں سے غیر ذمے دار لوگوں میں لڑائی ہوئی اور تین مسیحی نوجوان شہید ہوئے جو اس وقت عوامی چرچ میں دفن ہیں۔ اس وقت جو عیسیٰ نگری کی قیادت تھی وہ چودھراہٹ سسٹم کے پاس تھی اور وہ اس واقعے کا سامنا کرنے میں ناکام رہی۔ انھوں نے کہیں پر مفاہمت کر لی جس کا لوگوں میں ری ایکشن ہوا۔ یہ واقعہ ایسا ہے میری نظر میں جس نے اس سسٹم پر ضرب لگانے میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ اور یہی واقعہ تھا جس کی

Scanned with CamScanner

وجہ سے ہم جیسے نوخیز ذہن جو تھے، یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ کم از کم ہمیں ہی آگے آنا پڑے گا اور کم از کم ہمیں ہی بدلتے ہوئے حالات میں کچھ کرنا پڑے گا۔ ہمارے چودھری جو تھے ان کا بس یہی تھا کہ بندے کو پکڑوا دیا تھانے میں، پیسے دیے، چھڑوا دیا، یا کوئی انصاف بھی کیا تو غلط طریقے سے۔ تو یہ ساری چیزیں لوگوں میں اندر ہی اندر دبی ہوئی تھیں لیکن لوگ اس قابل نہیں تھے کہ اس کو توڑتے۔ اب یہ اجتماعی مسئلہ بن گیا اور اس کے بعد چل سو چل ہوا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ جو نوجوان ہمارے ساتھ ملے اس وقت، انھوں نے بہت سارے initiatives لیے کیوں کہ یہاں سماجی برائیاں، بہت زیادہ تو آپ نہیں کہہ سکتے لیکن کچھ ایسی سماجی برائیاں یہاں تھیں جن کو ختم کرنے کا بیڑا نوجوانوں نے اٹھایا۔ مثلاً جب ضیا صاحب کا دور آیا تو شہر میں فحاشی کے جتنے اڈے تھے انھوں نے ختم کیے تو وہاں سے کرپٹ لوگ بھاگے تو انھوں نے slum ایریا میں جگہ ڈھونڈنی شروع کر دی جہاں انھیں کوئی پکڑ نہ پائے۔ یہاں ہمارے نوجوانوں نے اس مسئلے پر کام کیا اور لوگوں میں اعتماد بحال ہوا۔ پیسہ لیے بغیر انھوں نے رضاکارانہ طور پر کام کیا۔ یہاں پر انھوں نے صفائی کی بھی بات کی، ایجوکیشن کی بھی بات کی، انھوں نے مختلف طور پر ایسے کام کیے کہ لوگوں کا شعور بھی بلند ہوا اور آگے چل کر انھوں نے محسوس کیا کہ ہمیں ایک تنظیم بنانی پڑے گی تاکہ اس سلسلے کو ہم مستقل جاری رکھ سکیں۔ اس طرح رائے عامہ ہموار ہوئی اور انھوں نے متفقہ پلیٹ فارم تیار کیا۔

اس پلیٹ فارم سے ہم نے حقوق کی بات کی، سیاسی شعور کے حوالے سے بات کی، کیوں کہ ایک ایک گھر سے ہی معاشرہ بنتا ہے اور معاشرے سے ملک ہوتا ہے۔ سماجی مسائل کے ساتھ ہم نے سیاسی حقوق کی بھی بات کی۔ ہمارے لوگ سمجھتے تھے کہ ہم کٹے ہوئے لوگ ہیں۔ ہم نے مین اسٹریم کی بات کی۔ اس حوالے سے ہم نے کام کیا۔ تھوڑی بہت جدوجہد کی۔ میں وہ طوائفوں والی بات آپ کو بتا رہا تھا۔ مارشل لا اتھارٹیز فیل ہو گئیں، مقامی پولیس کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔ نوجوانوں کی جدوجہد تھی کہ ہم نے اپنے علاقے سے ان کا جرائم پیشہ اڈا ختم کیا۔ ہماری تنظیم کے مقاصد یہی تھے کہ اپنے علاقے کی فلاح کے لیے اور بہبود کے لیے کام کیا جائے اور لوگوں کا شعور بلند کیا جائے۔ تو ان مقاصد میں یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم ناکام رہے، ہم بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جو ترقی ہوئی ہے یہ ان ہی عوامل کی بدولت ہے اور ترقی کا عمل ایسا ہے کہ کبھی جامد نہیں ہوتا، بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے بہت زیادہ کیا ہے، لیکن کم از کم ماضی کے مقابلے میں بہتر کام کیا ہے۔

نوجوان جو لوگ تھے، ان کی میں نے پہلے بھی بات کی ہے، ان کا گراف بہت نیچے تھا۔ اس کے بعد ہمارا طبقہ پیدا ہوا اور ایک دور میں ہم نے جدوجہد کی۔ وہ دور تھا جدوجہد کا۔ آپ بار بار میری بات کر رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اس میں میرا اتنا کوئی عمل دخل نہیں تھا، ایک مشترکہ جدوجہد تھی۔ جو کچھ ہم نے کیا دوستوں اور ساتھیوں کی مدد سے کیا۔ ابھی تعلیم کا گراف بہت اوپر گیا ہے، لیکن وہ جو چیز تھی،

Scanned with CamScanner

میں ۷۷، ۷۸ کی بات کر رہا ہوں، اُس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے لوگوں نے محسوس کیا ہو کہ دو ایم پی اے کے آنے سے ہماری جدوجہد رک گئی ہے۔ اب لوگوں کی تربیت اس طرح کی جا رہی ہے کہ ان میں جدوجہد پیدا نہ ہو۔ لوگ ان ہی کی طرف دیکھتے ہیں اور وہ بھی لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ طاقت ہم میں ہی ہے۔ لوگوں کو جب آپ یہ جا کر کہہ دیں گے کہ آپ کا کام میں کر دیتا ہوں تو آپ تو گھر جا کر سو جائیں گے۔ تو آپ تو یہ سمجھیں گے کہ ایم پی اے ہے ہمارے پاس۔ ہمارا کوئی اور کام نہیں رہا۔ نوجوان طبقہ ایک طرح سے یرغمال ہو کر رہ گیا ہے کہ ہمارے دکھوں کا مداوا ہمارے لیڈر ہی ہیں۔ جب تک یہ لیڈر شپ ہے ہمارے لیے بھی بہت مشکل ہے۔ لوگ مفادات کی توقع رکھتے ہیں۔ اب نوجوان بھی کام کرنے کے بجائے یہ سوچ کر آتے ہیں کہ جس طرح ان کو فائدے ہوئے ہیں اور پیسہ کمایا ہے، وہ بھی اس طرح کریں، تو اس کام میں بھی ایم پی اے کی وجہ سے ایک چمک دمک آ گئی ہے۔ میں نہیں کہتا کہ ہمارے لیڈرز نے کوئی انوکھا کام کیا ہے۔ جو کچھ پاکستان میں ہو رہا ہے، عیسیٰ نگری بھی اسی سسٹم کا حصہ ہے، چھوٹا سا حصہ۔ ہم جس طرف جا رہے ہیں تو لوگوں کی محرومیاں کسی منطقی نتیجے پر پہنچیں گی۔

> علاقے کی دوسری عورتوں کی طرح نسرین اسٹیفن کی زندگی بھی ایک مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے، ایسی جدوجہد جس کا محور اس کا گھر اور بچے ہیں۔ عیسیٰ نگری کی گلی نمبر ۶ میں برات گھر کے سامنے ایک چھوٹی سی دکان ہے جہاں روزمرہ کی ضروریات کا عام سامان ملتا ہے۔ یہ دکان نسرین چلاتی ہے۔ اس دکان کے اوپر اس کا گھر ہے۔ گھر اور کام کی اس جدوجہد کے بارے میں نسرین اسٹیفن نے تفصیلات بتائیں۔

علاقے میں سی ایچ ڈبلیو (کمیونٹی ہیلتھ ورکر) کا کام شروع ہوا تو سنٹر میں میری بڑی بہن جوزیفین صدیق نے چائے وغیرہ بنا کر دینے کا کام لیا۔ ٹریننگ شروع ہوئی تو وہ بھی ساری باتیں سنتی تھی۔ اس نے ڈاکٹر صاحب سے کہا یہ کام میں بھی کر سکتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کا امتحان لیا اور وہ سی ایچ ڈبلیو بن گئی۔ وہ مجھے بھی اس کام میں لے آئی۔

اسٹیفن اور میں ۱۹۷۶ میں کراچی آئے۔ ہم نے عیسیٰ نگری میں رہنا شروع کیا۔ اسٹیفن چھوٹی موٹی مزدوری کرتا تھا۔ ہمارے پاس کوئی رقم نہیں تھی کہ اپنا کام شروع کریں۔ وہ پھل، سبزیاں بیچتا تھا یہاں سبزی منڈی سے لے کر۔ لیکن ٹھیلا لگانا بھی اتنا آسان نہیں تھا جتنا ہم سمجھتے تھے۔ اسٹیفن کے پاس اپنا ٹھیلا نہیں تھا۔ اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ ٹھیلا خرید لے۔ ٹھیلا اچھا خاصا مہنگا آتا ہے۔ ٹھیلا کرائے پر بھی مل جاتا ہے لیکن اس کے لیے ضمانت ضروری ہوتی ہے۔ ٹھیلے کا مالک ضمانت کے بغیر

Scanned with CamScanner

ٹھیلا نہیں دیتا، اس لیے کہ کوئی اس کا ٹھیلا لے کر واپس نہ آئے تو وہ کیا کرے گا؟ اسٹیفن ابھی ابھی پنجاب سے آیا تھا، اس کا ضمانتی کون ہوتا؟ کسی نہ کسی طرح وہ ٹھیلا پھر بھی لگاتا تھا۔ لیکن پورا نہیں پڑتا تھا۔

یہاں ساری عورتیں کام کرتی ہیں۔ جو باہر نہیں جاتیں وہ بھی کچھ نہ کچھ کام ضرور کرتی ہیں۔ میرے شوہر نے باہر کام کرنے کی اجازت نہیں دی اس لیے میں نے دکان کے بارے میں سوچا۔ گاؤں میں میری امی نے گھر میں چھوٹی سی دکان کھولی ہوئی تھی۔ گھر کے صحن میں لکڑی کے تختے لگا کر چھوٹی چھوٹی چیزیں رکھ لیں۔ یہ جی دکان بن گئی۔ ہمارے لیے جگہ تو کم پڑ گئی لیکن لگی بندھی آمدنی ہونے لگی۔ گھر کے ساتھ ساتھ دکان چلانا بڑا مشکل تھا۔ گھر کا کام بھی کرتی تھی، دکان بھی دیکھتی تھی۔ ایک دفعہ میرا چھوٹا بچہ تیل کے کنستر میں گر گیا۔ بڑی مشکلیں اٹھائی ہیں میں نے۔ پندرہ سال ہو گئے ہیں دکان چلاتے ہوئے۔ اب اسٹیفن کو بھی کوئی اور کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ دکان پر بیٹھتا ہے۔

میرا ہاتھ خالی ہوا تو میں نے سی ایچ ڈبلیو کا کام کیا۔ دائی کا کام بھی میں نے سیکھا ہے۔ لیکن زیادہ کیسز نہیں کراتی۔

دوکان پر بیٹھ کر میں نے دیکھا کہ عورتیں کتنی مجبور ہیں اور کتنی مشکل سے گھر چلاتی ہیں۔ دکان والوں سے قرض چلتا رہتا ہے۔ اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ سارے مہینے کا سودا شروع میں منگا کر رکھ لیں، اور مہینے کی آخری تاریخوں میں اُدھار زیادہ چلتا ہے۔ یہاں کے دکان دار تھوڑا مہنگا بھی اس لیے بیچ لیتے ہیں۔ میں نے گیارہ گھروں کا سروے کیا کہ ان کے یہاں مہینے بھر میں گھی، چاول، آٹا، چینی، مٹی کا تیل، صابن وغیرہ کا کتنا خرچ ہے۔ پھر حساب لگایا کہ اگر میں جونا مارکیٹ سے تھوک کے بھاؤ یہ چیزیں لا کر دوں تو ان کی بھی بچت ہو گی کیوں کہ ان کو بازار سے کم دام پر چیزیں مل جائیں گی اور یہ لوگ مہینے کے شروع میں مجھے پیسے ادا کر دیں گے۔ اس طرح ہم بچت اسکیم شروع کر سکیں گے۔ سنٹر والوں نے میری مدد کی، بینک سے قرض دلوایا اور خود بھی قرضے کا انتظام کیا۔ سنٹر میں کام ختم ہو گیا اور بچت اسکیم بھی چل نہیں سکی۔ میں نے بینک کا قرضہ اتار دیا ہے۔ بچوں کو تعلیم دلوا رہی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میری بیٹی نرسنگ کی تعلیم مکمل کر لے۔

عیسیٰ نگری کے سماجی عمل اور سماجی تاریخ کو اس کمیونٹی کی خودشناسی کی داستان بھی کہا جا سکتا ہے۔ گفتگو کے دوران یہ سوال بھی ضمنی طور پر اٹھا کہ شناخت کے اس لمحے میں کیا ہوتا ہے جب کمیونٹی کو یہ پتا چلتا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں سے مختلف ہیں، یا ان میں اور دوسروں میں کوئی فرق ہے۔ یہ فرق اور اس کا احساس عیسیٰ نگری کے لوگوں میں مختلف طور پر ظاہر ہوتا ہے اور وہ اس کے بارے میں کئی حوالوں سے گفتگو کرتے ہیں۔ اپنی شناخت اور فرق

Scanned with CamScanner

کے بارے میں بنجمن انتھونی نے تفصیل کے ساتھ بات کی۔

جب ہم کراچی میں شروع شروع میں اسکول جایا کرتے تھے تب بھی اس قسم کی بات ہوتی تھی اور کئی واقعات دیکھنے میں آئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ لوگ ہوٹل میں بیٹھتے تھے اور کسی کو پتا چل جاتا تھا کہ یہ عیسیٰ نگری کے ہیں یا کرسچن ہیں تو اس وقت لوگوں کا رویہ ہمارے ساتھ تبدیل ہو جایا کرتا تھا۔ بعض دفعہ وہ منع کر دیا کرتے تھے کہ بھئی آپ لوگوں کو کس نے کہا ہوٹل میں بیٹھنے کے لیے۔ اس طرح ایک اندرونی فرق کا احساس ہوتا تھا۔ بعض دفعہ مارپیٹ بھی ہو جاتی تھی۔ میرے ایک دوست کے ساتھ ایسا ہوا۔ وہ لوگ کسی ہوٹل میں گئے۔ ہمارے علاقے کے ارد گرد بہت سی آبادیاں ہیں۔ بلوچ بھی ہیں، پٹھان بھی ہیں، ہندوستانی بھی ہیں۔ تو وہاں کے کسی آدمی نے دیکھ لیا اور ہوٹل کے مالک سے کہہ دیا کہ یہ لوگ جو یہاں کھانے کے لیے بیٹھے ہیں اور جس آبادی سے آئے ہیں اور ان کے تو برتن علیحدہ ہونے چاہییں۔ ہوٹل کا مالک آیا اور اس نے اتنے بُرے طریقے سے بات کی کہ گرما گرمی ہوئی اور جھگڑا ہو گیا۔ وہاں موجود سارے لوگ ہمارے خلاف ہو گئے کہ تم کو کس نے کہا ہوٹل میں بیٹھو۔ اس وقت سے اب تک خاصا فرق پڑا ہے۔

میں نے جس اسکول سے پڑھا ہے اس میں مسلم بھی تھے اور ہندو بھی تھے۔ ہندو بہت تھے کیوں کہ ان کی آبادی نزدیک تھی۔ ہمارے ساتھ جو مسلم پڑھتے تھے ان میں کبھی یہ بات نکل کر نہیں آئی تھی کہ آپس میں فرق سمجھا ہو یا اونچ نیچ کی بات کی ہو۔ اس وقت ہمارے ماسٹر دیہاتی اسٹائل کے تھے۔ اب تو زمانہ بڑا ماڈرن ہو گیا ہے اور لوگ انگریزی کو ساری لفٹ کراتے ہیں، اُس وقت ایسا نہیں تھا۔ ہمارے حساب کے ماسٹر بڑے اچھے تھے، بہت اچھے ٹیچر تھے۔ ایک دفعہ اسکول کے پرنسپل اور گورنمنٹ کی طرف سے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے کچھ لوگ آئے چیکنگ وغیرہ کے لیے تو اس وقت ماسٹر صاحب جس طریقے سے پڑھا رہے تھے تو وہ پنجابی اسٹائل میں میتھس پڑھا رہے تھے۔ ان لوگوں نے بھی ماسٹر کو اس نظروں سے دیکھا اور پرنسپل نے بھی انگریزی جھاڑی جیسے ماسٹر کو کچھ آتا جاتا نہیں ہے۔ ماسٹر صاحب اس طرح سے پوچھتے تھے کہ وھاٹ از یور نیم اوئے؟

ہمارے کمیونٹی میں دوسری کمیونٹیز کے برخلاف بہت سی عورتیں گھروں سے باہر نکل کر کام پر جاتی ہیں۔ اس کی وجہ سے بہت سے واقعات ہوئے اور اب بھی پیش آتے ہیں۔ ہمارے ہاں پردے کا کوئی اتنا رواج نہیں ہے، میل جول، گھروں میں آنا جانا ہوتا ہے، گلی میں نکل کر بیٹھنا، چھتوں پر بیٹھنا یہ سب ہوتا ہے۔ آس پڑوس کی آبادیوں میں اس طرح کی آزادی نہیں ہوتی تھی۔ عورتیں جب گھروں سے کام کے لیے نکلتی تھیں تو دوسرے لوگ ان کے لیے رکاوٹ بھی بنتے تھے۔ یہاں تک کہ خواتین جب گھروں سے نکلتی تھیں تو کچھ لوگوں کا کام تھا پیچھے سے ہوٹنگ کرنا یا پتھر مارنے یا کوئی ٹون مارنی یا ان کے لیے ایسے الفاظ نکالنے یا مذاق اڑانا ان کو پریشان کرنے کے لیے۔ ہمارے علاقے میں ایک تبدیلی

شروع سے یہ آئی ہے کہ بہت سی لڑکیاں پڑھنے کے لیے جاتی ہیں۔ اُس وقت بھی جب لڑکیاں جاتی تھیں تو ایک پرابلم ہوتی تھی کہ بچیاں جب گھر سے یونیفارم پہن کر نکلتی تھیں تو ان کو دور جانا پڑتا تھا کیوں کہ ان کے لیے نزدیک کوئی اسکول نہیں تھا، تو لڑکیوں کا گھر سے اسکول جانا اور اسکول سے گھر آنا ایک مسئلہ ہوتا تھا۔ اس طرح کے کئی واقعات پیش آئے۔

ایک دفعہ بات بڑھ گئی۔ باہر کے علاقے کے جو لڑکے تھے ان کی آہستہ آہستہ اتنی ہمت بڑھی کہ ہماری گلیوں تک آنا شروع ہو گئے۔ پھر چند لڑکیوں کی وجہ سے اس علاقے میں جھگڑا ہوا۔ یہ ۱۹۷۵ کی بات ہے اور عیسیٰ نگری کی تاریخ میں بنیادی واقعات میں سے ایک ہے، میں سمجھتا ہوں۔ دوسرے علاقے کا ایک لڑکا تھا جو مسلسل ہماری لڑکیوں کا پیچھا کرتے ہوئے گلی میں اندر تک آ گیا۔ اور اسے جب روکا گیا تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی غلطی کو مانتا، اس نے اپنے آپ کو ہم سے برتر جانا اور اپنی غلطی پر شرمندہ ہونے کے بجائے اس گلی کے نوجوانوں اور بزرگوں سے بد تمیزی بھی کی۔ بد تمیزی کرتے کرتے بات یہاں تک بڑھی کہ لڑائی جھگڑے پر چلی گئی۔ اس لڑکے کا بیک گراؤنڈ کچھ اس قسم کا تھا، خاصا آوارہ لڑکا تھا۔ ہتھیار بھی اپنے پاس رکھتا تھا۔ بات بڑھ گئی تو اس نے ہتھیار نکال لیا۔ خنجر ٹائپ کوئی چیز اس کے پاس ہوتی تھی۔ جس آدمی نے اس کو روکا تھا اس کو بھی شدید زخمی کر دیا۔ وہ وہاں سے بھاگا تو لوگ اس کے پیچھے بھاگے اور وہ بھاگتے بھاگتے سیدھا مسجد میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ عیسیٰ نگری کے کارنر پر دوسرے علاقے کے ساتھ مسجد ہے۔ وہ وہاں جا کر گھس گیا۔ اتنے سال سے یہ مسجد آباد ہے، لوگ بھی آتے ہیں، کبھی کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ یہ شخص اپنی جان بچانے کے لیے مسجد میں چھپ گیا تو اس نے شور مچایا کہ یہ جو عیسائی لوگ ہیں انھوں نے مسجد کو شہید کرنے کے لیے ہتھیار اٹھا لیے ہیں، مسجد کو بچاؤ۔ اس نے یہ کہا تو ارد گرد کے مسلمان بھائیوں نے دیکھا کہ عیسیٰ نگری سے اتنے آدمی ہتھیار اٹھا کر آ گئے ہیں، مسجد کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ لوگ بھی نکل آئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ علاقہ میدانِ جنگ کی شکل اختیار کر گیا۔ دوپہر کا ٹائم تھا۔ ساتھ میں جو دوسری بستیاں ہیں، کرنال کالونی اور بلوچ کالونی، پٹھانوں اور ہندوستانیوں کی بستیاں ہیں، وہاں جا کر یہ لوگ کہہ آئے کہ عیسائیوں نے مسجد پر حملہ کر دیا، مسجد کو شہید کر رہے ہیں۔ بات پھیلتی پھیلتی سبزی منڈی تک پہنچ گئی۔ سبزی منڈی میں دوپہر کے ٹائم مزدور آرام کر رہے ہوتے ہیں۔ انھوں نے جب یہ سنا کہ مسجد پر حملہ ہو گیا ہے تو لاٹھیاں، ڈنڈے، جو بھی ان کے پاس تھا وہ لے کر میدان میں آ گئے۔ یہ میدان جو تینوں علاقوں کو لگتا ہے، یہ جنگ کا میدان بن گیا۔ پولیس بھی اس وقت وہاں پر پہنچ گئی۔ پولیس والوں کا کردار آپ کو پتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ لوگوں کو روکتے، انھوں نے مسجد پر حملے کا سن کر بدلہ لینے کے لیے فائرنگ کر دی۔ ہمارے لوگوں کے پاس ڈنڈوں کے سوائے کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اصل بات دب گئی اور مذہبی فساد شروع ہو گیا۔ اس میں تین لوگ مارے گئے جو اس لڑائی سے واقف بھی نہیں تھے۔ ان تین میں سے دو تو اسی وقت بے چارے اپنے کام سے تھکے ہارے آئے تھے تو ان پر لاٹھی ڈنڈے چارج کیے گئے اور وہ بھاگے تو پولیس نے ان پر فائر کر دیا۔ آج بھی ان کی

قبریں عیسیٰ نگری میں موجود ہیں اور اس بات کی شہادت ہیں۔ آج بھی ہر سال شہیدوں کے لیے دعا ہوتی ہے۔ انجمن کے نوجوان سالانہ پروگرام کرتے ہیں۔

تعصب صرف مذہبی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ کام کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو ہمارے مذہب کے ہیں لیکن ہمیں اپنے برابر کا نہیں سمجھتے۔ اتنا زیادہ تو نہیں لیکن اونچ نیچ کا، امیر غریب کا فرق ہوتا ہے۔

پہلے جو حالات تھے اور اب جو حالات ہیں ان میں تبدیلی آئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اتنے عرصے لوگوں کا ایک جگہ رہنا اور وہاں کے ماحول کو اپنانا، اس سے فرق پڑتا ہے۔ ساتھ ساتھ تعلیم سے بھی فرق پڑا ہے۔ تعلیم کا رجحان بڑھا ہے اور مسلم اور غیر مسلم میں یہ بھی ہوا ہے کہ ایک دوسرے کو قبول کرنے لگے ہیں۔ پنجاب میں یہ تھا کہ صرف ایک ہی پیشہ تھا جس میں جا سکتے تھے۔ یہاں لڑکے لڑکیوں کو ایک حد تک یہ موقع ملتا ہے کہ دوسرے پیشے بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ پنجاب میں یہ لوگ چودھریوں کے پاس کام کرتے تھے تو ایک ہی کام کر سکتے تھے۔ یہاں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ بہت سے شعبے ہیں جن کو اپنا سکتے ہیں۔

اس بات کی مزید وضاحت آصف شہباز نے کی۔

عموماً اس سلسلے میں ہماری خواتین کو جو پریشانیاں پیش آئیں وہ یہ تھیں کہ جن گھروں میں بھی یہ کام پر جاتی تھیں ان سے صفائی، جھاڑ پونچھ اور ٹائلٹ کی صفائی جیسے کام کرائے جاتے تھے۔ یہ احتیاط کی جاتی تھی کہ برتنوں کو نہ چھُو لیں یا گھر میں کوئی خاص کمرہ ہے تو اس میں نہ گھس آئیں۔ اس کی وجہ سے یہ احساس پیدا ہوتا تھا کہ ہم کو فرق سمجھا جا رہا ہے۔

بلدیہ میں، کے ایم سی میں یا لوکل باڈیز میں جو لوگ کام کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ وہ گٹر کی صفائی بھی کرتے ہیں، کچرا بھی اٹھاتے ہیں، روڈوں پر صفائی بھی کرتے ہیں، وہ زیادہ نشانہ بنتے ہیں۔ اب بھی جن علاقوں میں یہ لوگ کام کرتے ہیں ان کے ساتھ اس امتیازی سلوک میں کوئی تبدیلی نہیں آئی جو ان کے ساتھ پہلے روا رکھا جاتا تھا۔ تبدیلی جہاں آئی ہے وہ اس وجہ سے آئی ہے کہ صفائی کا کام کرنے والوں نے اپنے بچوں کو تعلیم دلوائی جس کی وجہ سے ان کو اپنے آپ کو دوسرے شعبوں میں شامل کرنے کا موقع ملا۔ ڈرائیور بنے، کارپنٹر بنے، مکینک بنے اور اس طرح کے جو دوسرے ٹیکنیکل کام ہیں ان میں آگے بڑھے۔ نرسنگ اور پیرا میڈیکل میں ہمارے بہت سے لڑکے جاتے ہیں۔

تعصب اور قبولیت کے بدلتے ہوئے تعلق کے حوالے سے بنجمن انتھونی نے کچھ اور تفصیلات بتائیں۔

Scanned with CamScanner

بعض لوگوں نے تعصب برتا اور چھوت چھات کے باوجود فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکے۔ فرق سمجھنے کے باوجود جب اپنے فائدے کی بات آتی ہے تو پھر سب ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ ہمارے لوگوں کے وسیلے سے جن کو شراب حاصل کرنی ہوتی ہے وہ ضرور کرتے ہیں۔ یا پھر ہیروئن خریدنے آتے ہیں۔ وہ ہمیں نیچا سمجھتے ہوں گے لیکن ان چیزوں کے لیے ہم سے مدد مانگنے سے نہیں گھبراتے۔ رمضان کے دنوں میں علاقے کی گلیوں میں چھوٹی چھوٹی دکانیں کھلی ہوتی ہیں تو حسن اسکوائر سے یا سوک سنٹر سے وہ لوگ کھانے کی تلاش میں آ جاتے ہیں جو ویسے کبھی یہاں آنے کا تصور بھی نہ کریں۔ نعمان سنٹر اور ارد گرد اب تو بہت فلیٹ بن گئے ہیں۔ رمضان میں عیسیٰ نگری میں گھما گھمی رہتی ہے۔ لوگ ان ہی ہاتھوں کے بنے ہوئے پان خریدنے آ جاتے ہیں جو ویسے عام دنوں میں تصور بھی نہ کریں۔ شراب کا بھی ہم سے زیادہ ہمارے مسلم بھائیوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔

تعصب کے حوالے سے ایک مثال ہے جو زیادہ مناسب تو نہیں ہے لیکن بہر حال حقیقت ہے۔ ہمارے ایک دوست حیدر آباد گئے اور وہاں ایک بدنام سی جگہ وہاں گئے، یعنی کہ سمجھ لیں طوائف کے پاس گئے۔ بات چیت ہوئی اور سارے معاملات طے ہو گئے، ریٹ وغیرہ۔ جب کام کرنے لگے تو اس طوائف کی نظر ان کے جسم پر پڑی۔ اس طوائف نے کہا کہ ابھی ہم اتنے بے غیرت بھی نہیں ہوئے کہ عیسائیوں کے ساتھ کرنے لگیں۔ اور یہ کہہ کر اس نے ان صاحب کو وہاں سے واپس کر دیا۔

ان ہی لوگوں کو جب ہیروئن کی طلب ہوتی ہے یا اپنے دوستوں اور سہیلیوں کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ یہاں آنے سے نہیں شرماتے۔ برائی بہت سی دیواروں کو توڑ دیتی ہے۔

اس مسئلے سے بیکسٹر بھٹی کو اختلاف ہے اور وہ تعصب کے سوال کو دوسرے حوالے سے دیکھتے ہیں۔

اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ تعلیم بڑھی ہے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن آپ کیسی تعلیم کی بات کر رہے ہیں؟ پروفیشنل تعلیم کی بات کر رہے ہیں یا ذہنی ترقی کی بات کر رہے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس بات کو ذہن میں رکھنا ہو گا کہ عیسیٰ نگری ایک چھوٹا سا علاقہ ہے اور اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے جس سے دوسری پسماندہ بستیاں تعلق رکھتی ہیں۔ آپ لیاری ندی کے علاقے میں جو لوگ رہ رہے ہیں ان کو دیکھ لیں، چنیسر گوٹھ چلے جائیں، یا لیاقت آباد کے چھوٹے چھوٹے علاقوں میں چلے جائیں۔ آپ ان کو اس تناظر میں نہ دیکھیں کہ وہ کرسچن ہیں یا مسلم ہیں۔ یہ جو چیز چل رہی ہے یہ طبقاتی مسئلہ ہے۔ اس میں آپ کو پاکستان کے پچانوے فیصد لوگوں کو دیکھنا پڑے گا۔ جو بچہ بھی پیلے اسکول میں پڑھے گا وہ ایسے مسائل کا شکار ہو گا۔ تعصب تو ہے۔ امیر غریب کا تعصب، جاگیردار کا اور ورکنگ کلاس کا تعصب چل رہا ہے۔

کراچی کی حد تک تعصب ختم ہو گیا ہے۔ اب اگر کوئی آدمی گندا ہو گا تو اس کے پاس کوئی بھی بیٹھنا نہیں پسند کرے گا۔ اس کو آپ تعصب نہیں کہہ سکتے۔ میرے بچے مسلم اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تعصب نہیں ہمارا احساسِ کمتری ہے۔ یہ تعصب صرف عیسیٰ نگری کے ساتھ نہیں ہے۔ یہ ٹرینڈ بن گیا ہے کہ جس کی سفارش ہے اسی کا کام ہو گا، چاہے وہ مسلم ہو یا کرسچن۔ جس کی سفارش نہیں ہے اس کو کوئی پوچھتا نہیں۔ ہاں، اگر میں پنجاب کے کسی پسماندہ علاقے میں ہوتا تو دوسری بات تھی۔ میں کراچی میں بیٹھا ہوں اس لیے آپ کی بات سے اختلاف کر رہا ہوں۔

> علاقے میں تبدیلی کے عمل نے لوگوں کی زندگی پر مثبت اور منفی دونوں طرح کے اثرات مرتب کیے ہیں۔ بعض مرتبہ یہ اثرات ایک ہی شخص کی زندگی میں بیک وقت موجود ہوتے ہیں اور عُمر کے مختلف مراحل پر ان کا تناسب گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ ماحول کے مثبت اور منفی اثرات کے بارے میں محبوب جان نے اپنی ذاتی زندگی کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔

۱۹۶۵ میں کراچی ایسٹ کے علاقے پیر الٰہی بخش کالونی میں میری پیدائش ہوئی تھی۔ ہم لوگ ویسے تو پیچھے پنجاب سے ہیں، گوجرانوالہ کی طرف کے، لیکن ہمارے باپ دادا کراچی شفٹ ہو گئے تھے۔ پی آئی بی کالونی میں ہمارا گھر بہت چھوٹا سا تھا۔ ہماری پوری فیملی، تائے چچا، وہ سب پی آئی بی کالونی سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر عیسیٰ نگری ہے، وہ نئی نئی آباد ہوئی تھی، وہ وہاں شفٹ ہو گئے تھے تو پھر ہمیں بھی مجبوراً یہاں شفٹ ہونا پڑا۔ اور یہاں پانچ سال کی عمر میں، میں نے سینٹ میری اسکول میں ایڈمیشن لیا۔ پانچویں تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۹۷۵ یا ۷۶ میں، بھٹو صاحب کا زمانہ تھا، پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد طارق روڈ پر سیکنڈری اسکول تھا، چھٹی جماعت میں میں نے وہاں داخلہ لیا اور میٹرک تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ ۸۲ میں میٹرک کی۔ اس کے بعد اسلامیہ آرٹس کالج میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا۔ انٹر تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ یہ ہے میری تعلیمی کارکردگی۔

جب میں نے میٹرک پاس کیا تو میرے کچھ دوست تھے، لیاقت منور تھا، عمانوئیل انتھونی تھا، تو یہ کیوں کہ مجھ سے ایک سال سینیئر تھے تو انھوں نے کیا کیا کہ لیاقت اسپتال میں جنرل نرسنگ کا کورس ہو رہا تھا، انھوں نے وہاں ایپلی کیشن دی اور مجھے بھی کافی مجبور کیا کہ تم بھی چلو، تم بھی چلو۔ میں نے کہا نہیں، مجھے جنرل نرسنگ نہیں کرنی۔ میرے خیالات کچھ اور تھے کہ میں کچھ بنوں۔ میں نے کہا نرسنگ میں مجھے کچھ اسکوپ نظر نہیں آتا۔ انھوں نے کہا کہ ہم بھی مزے کے لیے جا رہے ہیں، تین چار ماہ کا جو پی ٹی سی کورس ہوتا ہے وہ کریں گے، اس کے بعد بھاگ آئیں گے۔ میں نے کہا کہ نہیں جی، مجھے وہ بھی نہیں کرنا۔ وہ ایک سنہری چانس تھا وہ میں نے مس کیا۔ اس کے بعد کمپیوٹر میں داخلہ لیا، وہ دو

Scanned with CamScanner

سال کا کورس تھا۔ اس میں بھی بس چھ ماہ لگائے، پھر چھوڑ دیا کہ بعد میں کر لیں گے جب کہیں کام کرنا ہو گا۔ اس طرح یہ بھی مجھ سے مس ہو گیا۔ اصل میں یہ سب چکر جو تھا وہ یہ تھا کہ میں نے جیسے ہی میٹرک پاس کی، اس دور میں انڈین فلمیں وڈیو پر لوگوں میں کافی مقبول ہو رہی تھیں، تو ہمارے گھر میں بھی اور دوستوں میں بھی انڈین فلمیں دیکھنے کا رجحان کافی بڑھ رہا تھا۔ یہ وی سی آر اور ٹی وی اس زمانے میں بہت مہنگے تھے اور ہم خرید تو نہیں سکتے تھے لیکن ہم اس کو کرائے پر لے کر آتے تھے، کافی دور سے۔ پانچ چھ سو روپیہ اس کا کرایہ ہوتا تھا۔ اس میں ہماری کافی دل چسپی بڑھ گئی۔ میں اور میرا ایک دوست تھا، ہم دونوں لے کر آتے تھے تو اپنے گھر میں یا کسی اور کے گھر میں رکھ کر لوگوں سے، لڑکوں سے بیس بیس، تیس تیس یا پچاس روپے لے کر وہ ان کو دکھاتے تھے۔ شروع ہی میں میرا ذہن پیسے کی طرف چلا گیا۔ اس وجہ سے کچھ پڑھائی میں... ایک سال اسی طرح چلتا رہا۔ پھر میں فرسٹ ایئر میں آیا تو میرا ایک دوست تھا، اس کے پاس ستائیس اٹھائیس فلمیں تھیں اور میرے پاس پانچ چھ فلمیں تھیں، تو وہ مجھے کہنے لگا کہ ایسا کرتے ہیں کہ عیسیٰ نگری میں ایک چھوٹا سا وڈیو سنٹر کھول لیتے ہیں، تو اس طرح ہمارے اوپر کے اخراجات نکلتے رہیں گے، شوق بھی پورا ہو جائے گا اور پڑھائی بھی جاری رہے گی۔ لیکن اس نے میٹرک کے بعد چھوڑ دیا تھا اور میں فرسٹ ایئر میں تھا۔ میں نے اپنے گھر میں بات کی کہ ہم وڈیو سنٹر کھول رہے ہیں، تو میرے والد اور میری والدہ نے منع کیا کہ بھئی اس طرح تمھاری پڑھائی میں ہرج ہو گا تو آپ اس طرح یہ بزنس نہ کریں۔ میں اپنے دوست کو لے کر گھر آیا کیوں کہ میری اس سے پہلے سے بات چیت ہو چکی تھی کہ وہ مجھے کالج جانے کے لیے، میری پڑھائی کے لیے اور ٹیوشن کے لیے ٹائم دیا کرے گا۔ اس نے کہا کہ نہیں جی آنٹی جی، میں اس کو کالج کے لیے اور ٹیوشن کے لیے وقت دیا کروں گا اور اس کی پڑھائی میں کوئی ہرج نہیں ہو گا۔ لیکن گھر والے پھر بھی نہیں مانے۔ میں نے ضد کی۔ انھوں نے پیسے نہیں دیے۔ میں نے جو میری جیب خرچی تھی، ہزار چھ سات سو روپے، اسی سے کام کیا۔ ہم نے چھوٹا سا وڈیو سنٹر کھول لیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس میں کافی بچت ہوئی اور اس طرح وڈیو سنٹر چل پڑا۔ پھر میرا دوست آؤٹ سائڈ ہو گیا اور میں پوری طرح انوالو ہو گیا۔ اس طرح میرے کورسز اور اسٹڈی ختم ہو گئی۔

شروع میں میرا خیال تھا کہ ڈی ایس پی یا ایس پی کی رینج کا کوئی افسر بننا چاہتا تھا۔ میں پولیس میں بھرتی ہونا چاہتا تھا۔ لیکن وہ نہ ہو سکا۔ میرے خاندان کا تعلق پنجاب سے تھا۔ تعلیم تو ان کے پاس تھی نہیں۔ پھر وہی جو پنجابی کرسچنز کا کام زیادہ ہے، وہ صفائی کی طرف مائل تھے۔ تو شروع میں وہ صفائی کا کام کرتے تھے۔ اس کے بعد بھٹو صاحب کا دور آیا، پاسپورٹ وغیرہ بنے تو کافی لوگ جو تھے وہ اپنی اور اپنے خاندان کی ترقی کے لیے باہر کی طرف ان کا رجحان تھا۔ اسی طرح میرے والد صاحب کو بھی شوق ہوا کہ میں بھی باہر جاؤں، اس طرح ہمارے خاندان میں بھی ترقی ہو جائے گی۔ میرے والد صاحب نے کوشش کی۔ اس ٹائم میں تقریباً چودہ پندرہ سال کا تھا۔ تو میرے والد صاحب انگلینڈ چلے گئے۔ میرے والد صاحب کے جانے سے فرق تو یہ ہوا کہ گھر میں اگر پہلے تھوڑی خوشحالی تھی تو اچھی خوشحالی ہو

گئی، پہلے ہمارا گھر کچا تھا تو ہم نے اینٹوں والا گھر بنا لیا کیوں کہ عیسیٰ نگری میں وہ دور چل رہا تھا کہ ہر گھر کو توڑ کر بنائیں، کیوں کہ پہلے کچّے گھر تھے تو ان کو توڑ کر پکّے بنانے شروع کر دیے۔ تو اسی دور میں ہم بھی شریک ہو گئے اور اپنا گھر پکّا کر لیا۔ لیکن یہ ہے کہ جہاں یہ ہوتا ہے کہ باپ کا سایہ اگر موجود نہ ہو تو اولاد کچھ ڈسٹرب ہوتی ہے۔ لیکن ہمارا خاص طور پر ایسا نہیں تھا کیوں کہ شروع میں جیسے ہم نے ہوش سنبھالی تو ہمارے والد صاحب اتنے سخت آدمی نہ اس وقت تھے نہ اب ہیں۔ وہ بہت پیار کرنے والے آدمی تھے۔ مجھے نہیں یاد کہ انھوں نے کبھی ہمیں مارا بھی ہو۔ ہاں، ہماری والدہ جو ہیں، بہت سخت تھیں۔ کافی ہم بچوں پر پابندیاں تھیں کہ باہر نہ کھیلو۔ مار کٹائی بھی ہمیں والدہ سے ہی ملی۔

میٹرک کے زمانے میں یار دوست جمع ہوتے تھے، فرصت کا ٹائم پاس کرنے کے لیے۔ فلموں کی طرف میرا رجحان نہیں رہا، پاکستانی فلموں کی طرف۔ یہ تو انڈین فلموں کی طرف ایک دم شوق چلا گیا۔ جیسے ہم پانچویں چھٹی کلاس میں تھے تو ہاکی مقبول تھی۔ بعد میں ہم پانچ چھ دوست ایسے تھے جو ڈنڈوں کی مدد سے بھی ہاکی کھیل لیا کرتے تھے۔ تھوڑی سی اور ہوش سنبھالی تو اپنی ہاکیاں خرید لیں۔ کبھی کبھی وہاں پر جہاں آج کمیونٹی سنٹر ہے، مائیکل جاوید صاحب کا گھر ہے، یہاں پر ایک چھوٹا سا گراؤنڈ ہوا کرتا تھا اور وہاں ہم کھیلا کرتے تھے۔ اس کے بعد ساتویں آٹھویں میں پہنچے تو ہم لوگ کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ اسکول سے میں آتا تھا تو ٹیوشن پر چلا جاتا تھا اور ٹیوشن سے ہی، اگر کوئی خاص میچ ہمیں کھیلنا ہوتا تھا شام کو، تو میرے دوست ٹیوشن سنٹر میں ہی آ جاتے تھے اور وہاں سے ان کے ساتھ مل کر چلا جاتا تھا۔ یا رات کو کہیں بیٹھ کر گپیں مار لیتے تھے۔ یہی رہتا تھا۔ اس کے بعد پھر وہی ویڈیو سنٹر۔ انڈین فلمیں اس زمانے میں سبھی دیکھ رہے تھے۔ نئی نئی چیز کا شوق تھا۔ امیتابھ بچن اور دھرمیندر اچھے لگتے تھے اور کافی ڈفرنٹ لگتے تھے۔

ہاں جی، دوسری قسم کی فلموں سے بھی تعارف تھا۔ کیوں کہ جب کرائے پر لے کر آتے تھے تو اس وقت بھی کچھ دوست ایسے ہوتے تھے جو کہتے تھے، نہیں جی، ہم تو پیسے دے رہے ہیں صرف بلو پرنٹ کے لیے، تو آپ ایسا کریں کہ اگر چار فلمیں چلائیں گے تو تین آپ انڈین چلا لیں اور ایک یہ چلا لیں، جو نہیں دیکھنا پسند کرے گا اسے باہر بھیج دیں گے اور جو دیکھنا پسند کریں گے وہ بیٹھ کر دیکھ لیں گے۔ تو وہ ہمیں لانی پڑتی تھیں اور لازمی ہم بھی، اُس وقت تھوڑا سا اینگ بلڈ تھا، تو ہم بھی دل چسپی رکھتے تھے کہ چلیں خیر ہے، دیکھ بھی لیں گے۔ ایک دفعہ تو ایسے ہوا کہ میرا ایک کزن ہے، میرا ہم عمر تھا وہ بھی، تو وہ مجھے کہنے لگا کہ آج جو پروگرام چلے گا وہ صرف اور صرف بلو پرنٹ کا چلے گا۔ کچھ اور ایسے ہی دوست تھے، انھوں نے پیسے دیے اور اس میں میں نے کوئی پیسہ نہیں دیا، میں نے بس یہ کیا کہ وی سی آر اور ٹی وی اور فلمیں لے کر آیا اور بیٹھ گیا ان کے ساتھ۔ تقریباً پوری رات انھوں نے یہی چیزیں دیکھیں۔ رہی یہ بات کہ ان فلموں کو دیکھ کر شوق ہوتا تھا کہ ہم بھی یہی سب کریں، تجربے کریں، تو یہ چیز تو ہے، اس ٹائم پر کسی فلم کو دیکھ کر... وہ زمانہ ایسا تھا کہ کسی فلم کو دیکھ کر سوچا کرتے تھے کہ ہم بھی

Scanned with CamScanner

ایکٹرس ہیں یا ہیرو ہیں تو دیکھ کر یہ چیز ذہن میں پیدا ہوتی تھی کہ کیا ہے اس میں، اس میں لذت کیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ پانچویں چھٹی کلاس میں لڑکیوں کو چھیڑنا یا لڑکیوں کی طرف دیکھنا یا ان کی باتیں کرنا، ہمارا تین چار لڑکوں کا ایک گروپ تھا، یہ بھی ہم اس طرح لڑکیوں کے متعلق گفتگو کیا کرتے تھے۔ اس میں یہ واقعہ بھی ہے کہ ایک میرا کزن ہے، اس کی بڑی سسٹر تھی، اس کی سہیلی آئی ہوئی تھی۔ ہم لوگ چھوٹے تھے تو ان کو کیا پتا کہ ان کا ذہن کس طرف ہے۔ تو ہم لیٹے ہوئے تھے چارپائی پر اور وہ لڑکی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ تو میرے کزن نے کیا کیا، ذہن میں تو یہی بات تھی، انگلی ان کے پیچھے رکھ دی۔ تو ہو گا کوئی سلسلہ اس میں۔ انگلی رکھ دی اور باتیں مجھ سے کر رہا ہے۔ جب انگلی لڑکی کو ٹچ ہوئی تو اس نے ہمیں ڈانٹا۔ لیکن ہم لوگ اس وقت چھوٹے تھے۔ جیسے بازاری عورتیں وغیرہ ہوتی ہیں، ہم لوگ اس طرف کبھی نہیں گئے۔ میرے کلوز فرینڈ بھی نہیں گئے۔ جیسے یہ ہوتا ہے لڑکیوں کے ساتھ فرینڈشپ وغیرہ، تو یہ اٹھارہ بیس سال کی ایج میں تھے تو یہ بھی ہوئی۔

اسی زمانے میں پینے پلانے کا شوق اور اس کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی میں بتاتا چلوں۔ پہلے تو میں اپنے گھر سے بتلاتا ہوں۔ کچھ جگہ تو ایسا ہوتا ہے کہ بڑا بھائی پی رہا ہے یا باپ ہے یا چچا ہے، اس کی وجہ سے کچھ چیزیں ورثے میں ملتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے گھر میں کوئی بھی ڈرنک نہیں کرتا تھا۔ میرے والد صاحب وہ بھی صرف سگریٹ پیتے تھے۔ میں نے... میں جب میٹرک میں تھا یا میٹرک پاس کیا تھا، اب اتنی اچھی طرح یاد نہیں ہے، تو میرا کزن ہے وہ کسی گھر میں کام کرتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا نہیں تھا، ایسے چار پانچ جماعتیں پڑھ کر چھوڑ دیا تھا، تو کسی گھر میں وہ صفائی وغیرہ کا کام کرتا تھا۔ وہاں جو اس کا "باس" تھا اس نے کہا کہ کرسچن لوگ جو ہیں ان کا کوئی خاص کوٹا سسٹم ہے، ان کا لائسنس ہوتا ہے اور اس لائسنس پر وسکی ملتی ہے، تو آپ ایسا کریں کہ آپ مجھے لا کر دیا کریں اور جو پیسے ہوں گے وہ میں آپ کو دے دیا کروں گا۔ تو میرے کزن نے کیا کیا کہ اس نے ساری انفارمیشن لی اور وہاں اسٹور پر گیا، کاغذات جمع کیے اور اس کو وہ لائسنس مل گیا۔ تو وہ مجھے بھی ایسے ہی کہنے لگا کہ کیا کر رہے ہو۔ میں نے کہا کہ فارغ بیٹھا ہوں۔ اس نے کہا، آؤ میرے ساتھ چلو۔ تو مجھے وہ ساتھ لے گیا، اس نے وسکی کی بوتلیں لیں اور اس کے باس کا دفتر تھا، وہاں پر دیں، اور اس نے اندر ہی پیسہ وغیرہ جو بھی کچھ تھا لے لیا۔ اسی طرح مجھے وہ آہستہ آہستہ اپنے ساتھ لے کر جاتا رہا۔ یا پھر ایسے ہوتا تھا کہ میرے کچھ باہر کے فرینڈ ہوتے تھے، تو وہ کہتے تھے کہ یار آپ لوگوں میں یہ چیزیں ہیں۔ تو ہمارے ایریا میں ایک دو لوگ تھے جو یہ چیزیں بیچا کرتے تھے۔ تو انھوں نے کہا کہ ہمیں وہ چیزیں لا کر دے دیں۔ تو میں نے وہ پچاس ساٹھ روپے لینے، اس آدمی سے وہ چیز لے کر اس دوست کو پہنچا دینی۔ اس میں میرا کوئی اتنا انٹرسٹ نہیں تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ میں نے سوچا... پھر مجھے پتا چلا کہ چالیس کی اگر وہ چیز آتی ہے تو ساٹھ کی جا رہی ہے اور بیس روپیہ پرافٹ ہے۔ تو میں نے سوچا کہ میں جاتا تو ہوں، تو کیوں نہ کچھ اپنے لیے لے لوں۔ تو اس طرح سے ایک دو بوتلیں اپنے لیے بھی لے لیں۔ اپنے گھر میں رکھ لیں۔ دوست آتے تھے، ان کو دے دیں۔ اس طرح

Scanned with CamScanner

پیسوں کا تھوڑا سا لالچ جو ہے ڈیولپ ہوا۔

خود پینی تو میں نے کافی بعد میں شروع کی، لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ ایک قسم کا ایڈکٹ بن جاؤں۔ اس کے علاوہ جو دوسرے نشے ہیں ان کے بارے میں بتاؤں۔ شروع میں تو ہم لوگ یہ چرس وغیرہ دیکھتے تھے کہ گلی کے کونے میں لڑکے کھڑے ہوئے چرس بھر رہے ہیں اور پی رہے ہیں۔ ہیروئن کا نام سننے میں نہیں آیا تھا، اس کے بہت بعد جا کر ہمیں پتا چلا کہ ہیروئن بھی کوئی نشہ ہے۔ اس کے متعلق بھی میرا ایک چھوٹا سا تجربہ ہے، وہ بتاتا چلوں۔ میرے ایک کزن نے ہیروئن پینی شروع کر دی۔ پہلے تو میں نے اسے سمجھایا کہ نہیں پیو، کیوں کہ اس کی وائف بھی اس کے ساتھ جھگڑتی تھیں، ہم لوگ بھی اسے سمجھاتے تھے۔ یہ دور تھا جب میں وسکی کی سیل میں ملوث ہو چکا تھا، وڈیو سنٹر بھی میرا چل رہا تھا۔ وڈیو سنٹر کی وجہ سے کچھ دوست ایسے الٹے سیدھے بھی آنا شروع ہو گئے اور کچھ نئے دوست بھی بن گئے۔ تو ایک دوست ہے میرا، اس دوست کا ایک دوست پولیس میں تھا، سی آئی اے میں۔ اس نے کہا کہ کل رات ایک کار آ رہی تھی ایرپورٹ کی طرف سے، اسے روکا تو اس کار میں سے چرس برآمد ہوئی ہے، آپ کے علاقے میں پینے بھی ہیں اور بیچنے بھی ہیں تو آپ ایسا کرو کہ یہ جو چرس ہے میری یہ بکوا دو۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، میں بکوا دیتا ہوں۔ میں نے دو ایک بندوں سے بات کی تو انھوں نے کہا ہم لے لیں گے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تم اگر یہ بکواؤ گے تو اتنے فی صد تم لے لینا۔ کیوں کہ وہ ڈیلنگ میں نے کروائی تھی تو اس میں پیسے مجھے مل گئے۔ ایک اور دفعہ پھر تھوڑا سا میرے پاس آ گیا۔ وہ کہنے لگا کہ میرے دوست نے پاوڈر پکڑا ہے۔ اس وقت علاقے میں اس کی سیل ہو رہی تھی، عیسیٰ نگری میں اس کا عروج تھا۔ وہ مجھے کہنے لگا کہ اگر یہ کروا دو تو اس میں بھی تمھارا پرسنٹ ہے۔ میں نے علاقے کے کچھ لڑکوں سے کہا کہ ایک بندہ ہے، اس کو ٹیسٹ کر لو۔ اگر اس کے پاس صحیح ہے تو تم اس سے لے لو۔ انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے، آپ اس کا تھوڑا سیمپل لے لیں۔ وہ دوست آیا تو میں نے اس سے کہا کہ تھوڑا سیمپل دے دو، وہ لڑکے چیک کریں گے اور سیٹ ہوا تو تم سے لے لیں گے۔ اس وقت یہاں کے لوگ سہراب گوٹھ کی طرف جاتے تھے اور اس میں کافی خطرہ بھی تھا۔ انھوں نے سوچا کہ اگر کوئی بندہ یہاں دے رہا ہے تو ہم یہاں لے لیتے ہیں، ہماری پریشانی کم ہو گی۔ خیر کچھ اس طرح کی بھی ڈیلنگ ہوئی اور ایک دو دفعہ میں اس میں بھی رہا۔ لیکن ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میرا ایک کزن بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کیا کیا کہ تھوڑا سا نکال لیا۔ کیوں کہ میں یہ چیز گھر تو نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں نے وہ اپنے کزن کے پاس رکھوائی ہوئی تھی کہ تم رکھ لو، کل وہ آدمی آئے گا تو اس کو واپس کرنا ہے۔ میرے دوست نے کیا کیا کہ لالچ کی بنا پر اس میں سوئی مار کر تھیلی میں سے تھوڑا سا پاوڈر نکال لیا اور اس نے بیچنے کی کوشش کی۔ کسی نے اسے دیکھ لیا۔ کیوں کہ ہم لوگ تو یہ کام نہیں کرتے تھے، تو انھوں نے گھر میں اطلاع کر دی کہ ان کے پاس اتنا سا پاوڈر ہے اور یہ اسے بیچ رہے ہیں۔ گھر میں ہماری کافی جھاڑ جھپڑ ہوئی کہ کیوں کر رہے ہو۔ ہم نے کہا کہ نہیں، ایک آدمی یہاں رکھ گیا تھا، وہ بھول گیا ہے تو ہم نے سوچا کہ اسے پھینکنے سے بہتر ہے کہ بیچ دو۔ خیر، پھر ہم نے

Scanned with CamScanner

اسے بیچا نہیں بلکہ گھر والوں کے سامنے پھونک دیا۔ اس کے بعد میں نے توبہ کر لی کہ کوئی بھی آئے گا، میں اس کیس میں نہیں پڑوں گا۔

ہیروئن میں نے خود کبھی نہیں پی۔ البتہ یہ ہے کہ چرس جو ہے تو جب میں وسکی وغیرہ پی لیتا تھا تو میرے کچھ دوست ایسے تھے جو ریگولر چرس پیتے تھے، وہ کہتے تھے کہ وسکی کے بعد چرس پینے سے نشہ بڑھ جاتا ہے۔ ایسے ہی تجربے کے لیے میں نے بھی پی۔ تقریباً پندرہ بیس دن پیتا ہی رہا۔ میرا ایک دوست ہے، میں تو سمجھتا ہوں وہ اچھا ہی تھا، تو جیسے ہی ہم پی کر نکلتے تھے، ہمارا گھر بن رہا تھا، گھر والے نہیں تھے، تو ہم تین چار دوست اندر چلے جاتے تھے، پانچ چھ سگریٹیں پیں اور باہر آ گئے۔ تو یہ دوست اس چیز کو برا سمجھتا تھا۔ برا تو ہم بھی سمجھتے تھے لیکن انوالو ہو گئے۔ تو جیسے ہی ہم باہر نکلتے تھے وہ کہتا تھا اوئے چرسی آ گئے، چرسی آ گئے۔ پھر مجھے کافی شرم آئی۔ میں نے ان دوستوں سے کہا کہ بھئی اگر تم چھوڑتے ہو تو صحیح ہے ورنہ میں تم میں نہیں بیٹھوں گا۔ ان دوستوں میں سے کچھ لوگوں نے تو چھوڑ دی، کچھ پی رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کے بعد میں نے بھی اسے ہاتھ نہیں لگایا۔

میں اب خود تو نہیں پیتا لیکن میں نے بہت سے لوگوں کو پیتے ہوئے دیکھا ہے اور بعد میں ان کے ساتھ کام بھی کیا ہے، اس لیے مجھے اندازہ ہے کہ یہ لوگ کس طرح پیتے ہیں، کہاں سے لاتے ہیں، اس عادت کے لیے کیا کیا کرتے ہیں، اس میں کیسے پھنس جاتے ہیں۔ میرا ایک چچازاد بھائی تھا، اس کا ایک واقعہ آپ کو بتلا دیتا ہوں، بقول اس کے، میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے کیوں استعمال کی۔ اس سے آدمی بہت ساری پیسے محدود ٹائم میں اور شارٹ کٹ میں کما لیتا ہے۔ میرا یہ چچازاد بھائی بھی خریدنے اور بیچنے کی لت میں شریک ہو گیا۔ اس نے بیچنی شروع کر دی۔ تین چار دفعہ پولیس نے پکڑا بھی۔ پھر چھڑا کر ہم لوگ لایا کرتے تھے۔ وہ معافیاں مانگتا تھا کہ اب نہیں بیچوں گا، لیکن پھر بیچنی شروع کر دیتا تھا۔ کچھ عرصے بعد ہمیں پتا چلا، کچھ لڑکوں نے ہمیں بتلایا کہ آپ کا بھائی جو ہے، اس نے پینی بھی شروع کر دی ہے۔ ہم لوگوں نے پوچھا کہ تو پیتا ہے۔ اس نے کہا نہیں نہیں، کسی نے جھوٹ بولا ہے۔ لیکن آخر کار ہمیں پتا چل گیا۔ اس کا میں نے ایک دفعہ ٹریٹمنٹ بھی کروایا تھا ڈاکٹر سلیم اعظم کے ہاسپٹل سے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تو نے کیسے یہ لگالی؟ تجھے تو پتا بھی تھا کہ اس کے اثرات کیا ہوتے ہیں، ارد گرد کے حالات تو نے دیکھے ہوئے ہیں، تجھے پتا ہے کہ بیوی بچوں پر بھی برا اثر پڑتا ہے، دوسرے رشتے دار بھی نفرت کرتے ہیں، پھر تو نے کیوں اس کو پینا شروع کر دیا؟ اس نے بتایا کہ اصل میں اس کی سالی تھی، اس کے ساتھ اس کی کچھ لو اسٹوری وغیرہ چل رہی تھی۔ تو اس کی بیوی کو پتا چل گیا تو اس نے ڈانٹا ڈپٹا اور اس لڑکی کو گھر آنے سے منع کر دیا۔ دوسرے یہ کہ اس کی سالی نے بھی سوچا ہو گا کہ یہ تو بالکل غلط چیز ہے، شادی بھی نہیں ہو سکتی اور اس سے ایسی نازک سی رشتے داری بھی ہے تو اس نے بھی ہیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ بقول میرے کزن کے، اس نے اپنی سالی کی نفرت کی وجہ سے یہ شروع کر دی کہ وہ ذہنی طور پر اس سے دور ہو جائے۔ کچھ لوگوں نے اس سے کہا تھا کہ یہ ذہنی تسکین پہنچاتی ہے۔ اس نے یہ پینا شروع

Scanned with CamScanner

کی تو ایک دو دفعہ اسے کافی تسکین ملی اور بعد میں وہ اس کا ایڈکٹ ہو گیا۔

علاقے میں کئی لڑکے ایسے ہیں جو لاتے ہیں، بیچتے ہیں، اپنی زندگیاں تباہ کر لیتے ہیں۔ بہت سارے تو اسی طرح کے چکروں کی وجہ سے اس میں پڑ گئے۔ بعض لوگ چرس وغیرہ استعمال کر رہے تھے تو وہ بھی اس طرف آ گئے۔ دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس کا ٹیسٹ یہ ہے، تو ایک ٹائم آتا ہے کہ آدمی کہتا ہے میں بھی اسے چیک کر لوں۔ آج چیک کر لوں، کل اس کو نہیں پیوں گا۔ اس وجہ سے آج پیتے ہیں، پھر کہتے ہیں کل پی لیتا ہوں، پرسوں نہیں پیوں گا۔ اس کے بعد وہ ایڈکٹ ہو جاتے ہیں۔ چرس کو چھوڑ کر بہت سے لوگ ہیروئن کی طرف آئے۔ یہ تو نہیں کہ چرس ختم ہو گئی، لیکن اس کی جگہ بڑی حد تک ہیروئن نے لے لی۔

بد قسمتی ہم لوگوں کی یہ ہے کہ ہیروئن عیسیٰ نگری میں بہت عام ہو گئی ہے۔ پہلے یہ لوگ دوسری جگہوں پر جاتے تھے، جیسے سہراب گوٹھ۔ افغانستان سے جو مہاجر آئے تھے، یہ چیزیں تو وہی لے کر آئے تھے اور سہراب گوٹھ پر ان کے کیمپ ہوا کرتے تھے۔ اس وقت عیسیٰ نگری میں بھی پینے والوں کی کمی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ یہاں تعداد بڑھتی گئی۔ اس کے بعد یہ ہوتا تھا کہ جس ایڈکٹ کے پاس تھوڑا سا پیسہ ہے، وہ وہاں سے اکٹھا لے آتا تھا۔ اور اس کے بعد دوسرے نشئی جو ارد گرد کے علاقوں سے آتے تھے، برابر میں جو سندھی بلوچی ایریا ہیں وہاں بھی یہ چیز آ گئی تھی۔ جب یہ چیز عیسیٰ نگری میں بڑھ رہی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ عیسیٰ نگری میں ہی بڑھ رہی تھی، یہ ارد گرد اور پوری کراچی میں بڑھ رہی تھی۔ پوری کراچی میں ہیروئن پینے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ تو ان لوگوں نے وہ لینی شروع کر دی۔ ایک ایڈکٹ نے ایک تھیلی پچیس یا پچاس گرام کی لے کر آتا تھا تو اس کا اپنا حصہ بھی نکل جاتا تھا اور دوسرے لوگ بھی سمجھتے تھے کہ ہمیں ایزی مل رہا ہے، کہیں اور نہیں جانا پڑ رہا۔ سہراب گوٹھ یا ناظم آباد نہیں جانا پڑے گا۔ تو ان لوگوں کی پوری چین بنی ہوتی ہے، اگر وہ ایک آدمی کو کہہ دے گا کہ ہاں، میرے پاس ہے تو وہ دوسرے کو کہہ دے گا کہ تُو وہاں نہیں جانا، وہ دو نمبر گلی میں فلاں آدمی ہے وہ بیچ رہا ہے، اس سے لے لو اور اس کا مال بھی اچھا ہے۔ تو اس طرح سب تک خبر پہنچ جاتی ہے۔

بیچنے کے لیے لانے میں ایک میرا ایکسپیرینس ہے۔ ایک پٹھان تھا جو حسن اسکوائر پر رہتا تھا۔ میرا ایک دوست کالج میں میرے ساتھ پڑھتا تھا تو اس سے میں نے ذکر کیا کہ یار ہمارے علاقے میں یہ کام ہو رہا ہے۔ اس وقت میں شراب کے کام میں کافی ملوث تھا، لے کر آتا تھا اور بیچتا تھا۔ روزانہ کی تقریباً آٹھ دس بوتلیں نکل جاتی تھیں۔ میرے دوست نے کہا کہ ایک پٹھان ہے میرا جاننے والا، اگر وہ تمہیں دے دے تو تمہیں ایک چکر کے کم از کم چار سو پانچ سو مل جائیں گے۔ میں نے بھی کہا، چلو ٹھیک ہے، پیسے بھی ملیں گے اور خطرہ بھی نہیں ہے، تو میں یہ کام کر لیتا ہوں۔ تو میں کالج سے سیدھا اس کے گھر جاتا تھا۔ تو اس نے کہا کہ یہ جرنل جو ہے تمہارا، اس میں رکھ لیا کرو۔ تو میرا سائنس کا جو جرنل تھا، اس میں وہ پڑیاں اور پیکٹ پچیس گرام والے رکھ کر لے آتا تھا اور دوسری جگہ جا کر بیچ آتا تھا۔ اس طرح

وہ بھی کمیشن دے دیتے تھے۔ اس طرح تقریباً ایک ہفتہ یہ کام کیا۔ یہ تو ہے غلط ہی، لیکن میرا یہ بہت شارٹ ٹرم تھا اس وجہ سے پولیس تک تو بات نہیں پہنچی، لیکن وسکی کا میرا کافی لانگ پیریڈ تھا اور اس میں میں پولیس والوں کے ساتھ کافی اٹیچ رہا۔ لاتے ہوئے بھی میں تین چار دفعہ پکڑا گیا۔

ایک دفعہ تو جیسے ہی اسٹور سے نکلے، پکڑے گئے۔ پرمٹ ہوتا تھا اور پرمٹ پر تین بوتلیں ملتی تھیں لیکن ہمیں کچھ زیادہ لینی ہوتی تھیں تو وہ اسٹور والے ہمیں بلیک پر دیتے تھے۔ جیسے ہی ہم اسٹور کی حدود سے نکلے تو پولیس نے ہمیں پکڑ لیا۔ میں تھا اور میرا کزن تھا۔ مجھے وہ کہنے لگے کہ تو چل ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن۔ میں نے کہا ٹھیک ہے بھئی، اور کزن سے کہا تم جاؤ، میں ان کے ساتھ جاتا ہوں۔ وہ کھارادر پولیس اسٹیشن لے گئے اور مجھے وہاں بند کر دیا۔ بعد میں مجھے کہنے لگے، قصور تیرا نہیں ہے، جو تمہیں دیتا ہے قصور اس کا ہے، تو تمہیں گواہ کی حیثیت سے رکھیں گے اور ایف آئی آر اسٹور والوں کی کاٹیں گے۔ اصل میں ان کا پھڈا چل رہا تھا۔ وہ اسٹور والوں سے بھتا لیتے تھے اور اسٹور والے بھتا دیتے نہیں تھے۔ خیر، پھر اسٹور کا مالک آیا، اس نے بھتے کی بات کی اور مجھے بھی چھڑا لیا۔ یہ بالکل ایک دو گھنٹے میں کیس ہوا تھا اور اس کے بعد میں واپس گھر آ گیا۔ لیکن جیسے میں وڈیو سنٹر پر ہوا کرتا تھا اور ہم بیچتے تھے تو لازمی طور پر پبلک کو بھی پتا چلتا تھا کہ یہ چیز یہاں سے مل رہی ہے۔ تو ایک دو دفعہ جو ہمارے کسٹمر ہوا کرتے تھے جیسے ہی لے کر نکلے، راستے میں پکڑے گئے۔ "ہاں بھئی، کہاں سے لے کر آئے؟" "جی وہ وڈیو سنٹر ہے وہاں پر، اور یہ آدمی کا نام ہے۔ ہم تو اس سے لے کر آئے ہیں۔" وہ میرے پاس آئے تو میں نے کہا جی میں تو نہیں بیچتا۔ خیر، وہ کچھ مخبر بھی تھے ایریا میں تو اس وجہ سے بھی... اور ہم لوگوں نے سمجھا اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ وہیں وڈیو سنٹر میں تین چار سو روپیہ دیا اور پولیس والے چلے گئے۔ اتنا بڑا کیس نہیں ہوا۔ لیکن ایک دفعہ میں اور میرا دوست گلشن میں جا رہے تھے۔ ایک اور دوست کے ہاں ہماری کرسمس پارٹی تھی۔ تو اس نے مجھے کہا کہ تُو ایسا کر، تُو وسکی لے آنا، میں کھانے کا سامان لے آؤں گا اور یہیں بیٹھ کر کھا پی لیں گے۔ میں آ رہا تھا تو گلشن اقبال کے موڑ پر پولیس موبائل کھڑی تھی۔ ہم اسکوٹر پر تھے۔ انھوں نے رکنے کا اشارہ دیا۔ میں نہیں رکا کیوں کہ مجھے تو پتا تھا کہ میرے پاس شراب کے دو چھوٹے پائنٹ ہیں۔ میں رکا نہیں، وہ سمجھے پتا نہیں کیا بات ہے۔ انھوں نے موبائل میرے پیچھے لگا دی۔ میں نے اپنے دوست سے کہا بھی کہ اس کو پیچھے سے پھینک دے۔ اس سے وہ پھینکی نہیں گئی۔ پولیس نے ہمیں پکڑ لیا۔ دیکھا تو دو پائنٹ نکلے۔ انھوں نے کہا یہ شراب ہے تمہارے پاس، تم بیچتے ہو۔ میں نے کہا نہیں، ہم تو پینے کے لیے لائے ہیں۔ اس چکر میں انھوں نے میری ایف آئی آر کاٹ دی اور مجھے کورٹ جانا پڑا۔ پھر تین چار ہزار میں کیس ختم ہوا۔ تو یہ ہے۔ پولیس کے ساتھ میں یہاں تک پہنچا۔ باقی ہمارے ایریے کی پولیس ہمارے پاس آتی تھی اور کہتی تھی کہ بس تم ایسا کرو کہ روزانہ کا پائنٹ یا دو سو روپیہ ہمیں دے دیا کریں، پھر بیچیں یا جو مرضی آئے کریں۔ وہ خود آتے تھے، پیتے بھی تھے اور پیسے لے کر چلے جاتے تھے۔ اس وجہ سے پولیس کی طرف سے پریشانی نہیں رہی۔ لیکن یہ

Scanned with CamScanner

ایک پیریڈ تھا کہ یہ کام مجھ سے ہوے۔ جیسے جیسے میں نے اپنے آپ میں تبدیلی لانی شروع کی تو میں نے یہ کام بالکل بند کر دیا۔ لیکن یہ پولیس والے تو نہیں مانتے کہ آپ نے بند کر دیا ہے۔ ان کو تو یہ ہوتا ہے کہ بھئی آپ کام کریں، ہمیں ہمارا شیئر چاہیے۔ پولیس والے میرے پاس آئے تو میں نے کہا کہ بند کر دیا ہے۔ جب تک یہ کام کیا آپ کو بھتا دیا ہے۔ اب کچھ نہیں ہے تو کہاں سے دیں؟ وہ مانتے نہیں تھے۔ خیر جی، ان سے کافی منہ ماری ہوئی۔ اس وقت وہ چلے گئے۔ تین چار دن بعد میرے گھر چھاپا مارا۔ ایک چیز بھی میرے گھر سے نہیں ملی لیکن پھر بھی پکڑ کر لے گئے۔ پھر کچھ پیسے مجھے دینے پڑے۔ پھر میں اپنے دوست کو ساتھ لے کر گیا اور ایس ایچ او سے بات کی۔ پھر معاملہ رفع دفع ہوا۔

میں نشے کی طرف گیا اور اس طرف سے واپس آ گیا۔ اس کی دو تین وجوہات تھیں۔ ایک تو اس کی وجہ سے میری تعلیم ختم ہو گئی۔ میں نے شروع میں بتایا کہ میرا ایک خواب تھا، وہ ادھورا کیا بالکل ختم ہو گیا۔ مجھے پتا تھا کہ میں اب اسے حاصل نہیں کر سکتا۔ دوسرا یہ کہ شروع سے گھر والوں کی طرف سے میری کوئی سپورٹ نہیں تھی کیوں کہ گھر والے تو مجھے شروع سے منع کرتے تھے، لیکن میں تھوڑا ضدی تھا تو میں نے کسی اور کے گھر میں رکھ کر یا وڈیو سنٹر میں رکھ کر گھر والوں کو پتا بھی نہیں چلنے دیا اور الٹے سیدھے کام کر لیے۔ لیکن گھر والوں کو جیسے ہی پتا چل گیا کہ اب یہ زیادہ آگے نکل گیا ہے تو مجھ پر پابندیاں بھی عائد ہونا شروع ہو گئیں اور ان پابندیوں کے ساتھ ساتھ میری وہ ایک ایج تھی میرج کی، کیوں کہ ہم لوگوں میں بیس بائیس برس کی عمر میں شادی ہو جاتی ہے۔ بائیس سال کی میری عمر تھی کہ گھر والوں نے رشتے کی بات کی۔ میں ایریا میں کافی پاپولر ہو چکا تھا وسکی کے حوالے سے کہ یہ لڑکا وسکی بیچتا ہے۔ بات بھی پکی ہو گئی، دو تین ماہ کے بعد لڑکی والوں کو پتا چلا کہ یہ لڑکا وسکی بیچتا ہے، تو انھوں نے انکار کر دیا۔ تو گھر میں بھی کافی پریشانی آ گئی۔ اب وہ ہر وقت مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ تمھاری وجہ سے ایسے ہوا، اگر تم نہیں بیچتے تو آج یہ تو نہیں ہوتا۔ پھر اسی طرح میرج کے حوالے سے تین چار سال کا یہ پیریڈ گزر گیا۔ مجھے بھی کافی ٹینشن تھی کہ یہ غلط کام ہے جس کی وجہ سے رشتے کی بات میں ایسے واقعات آ جاتے ہیں۔ ایک واقعہ تو یہ ہوا کہ میری ایک جگہ بات چلی تو وڈیو سنٹر میں ہم تین چار دوست بیٹھے پی رہے تھے کہ دو آدمی آئے۔ کہنے لگے کہ جی... پہلے تو انھوں نے نام پوچھا۔ میں نے سمجھا کہ پولیس والے ہیں۔ کہنے لگے کہ جی، محبوب کس کا نام ہے۔ کہنے لگے کہ اچھا، پھر مجھے گھور گھور کر دیکھنا شروع کر دیا۔ کہنے لگے ہمیں فلمیں چاہییں، پنجابی کی۔ میں نے پوچھا کہ آپ پڑھے ہو؟ انھوں نے کہا ہاں، تو پنجابی فلموں کی لسٹ دے دی۔ اس آدمی کے دیکھنے کا اسٹائل اور تھا۔ اس نے لسٹ رکھ دی اور کہا، میں چلتا ہوں۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا کہ آپ ہیں کون؟ پہلے مجھے یہ بتلائیں، کیوں کہ آپ فلمیں لینے تو نہیں آئے۔ تو وہ آدمی ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ میں فلمیں لینے ہی آیا ہوں اور بعد میں لے لوں گا۔ میں نے کہا نہیں، آپ نے اس میں سے ایک فلم بھی نہیں لی اور نہ مجھ سے پوچھا ہے۔ تو وہ آدمی کہنے لگا میں سلاٹر ہاؤس سے آیا ہوں، وہ... پتا نہیں اس لڑکی کا نام کیا تھا، اس کا ماموں ہوں۔ تو مجھے کافی شرمندگی

ہوئی کہ یہ بات تو ابھی چل رہی ہے اور یہ ہو سکتا ہے مجھے چیک کرنے آئے ہوں اور میں ایسی حالت میں ان کے سامنے آیا ہوں۔ تو میں نے کہا اصل میں میرے دوست کی شادی تھی اور ہم لوگ یہاں پی رہے ہیں۔ وہ کہنے لگا نہیں نہیں، کوئی بات نہیں۔ میں نے اپنی والدہ کو بتلا دیا۔ مجھے کافی شرمندگی ہوئی اور میری والدہ نے بھی رونا شروع کر دیا۔ خیر، وہ رشتہ بھی گیا۔ اسی وجہ سے کہ سب کہتے تھے لڑکا تو بیچتا بھی ہے اور پیتا بھی ہے۔ اس کے کچھ عرصے بعد میں نے چھوڑ دی۔ میں یہ سمجھ رہا تھا... دو تین دفعہ میں نے بریک بھی کیا تھا اس سلسلے کو لیکن پھر دوبارہ آ کر لوگ مجھے مجبور کر دیتے تھے۔ "ارے یار، تو نے چھوڑ دی ہے، تیرے پاس نہیں ہے۔ جاؤ، وہ آدمی ہے، تجھے سستی بھی دے دے گا اور اصل مال بھی دے گا، تو تُو مجھے لا دے۔" باہر کے دوست بھی آتے تھے۔ تو میں پھر جاتا تھا اور کسی آدمی سے لا کر دے دی تو پھر دوبارہ وہ چیز ڈیولپ ہوتی تھی کہ کسی اور سے جو لا کر دینا ہے تو بدنامی تو وہی رہی، تو کیوں نہ میں اپنا لے کر آؤں۔ پھر دوبارہ اسی چیز میں آجاتا تھا۔ تو میں نے سوچا اور یہ تجزیہ کیا کہ برائی اصل میں کہاں سے ہو رہی ہے۔ تو دیکھا کہ یہ وڈیو سنٹر سے بڑھ رہی ہے یہ بیماری۔ میں نے اپنا بہت سارا پیسے کا نقصان کیا اور وڈیو سنٹر کو بند کر دیا۔ کچھ اور دوست بھی تھے جنھوں نے میری مدد کی۔ جیسے ہی میں نے بند کیا، تو شروع سے میرے ذہن میں شوق تو تھا مختلف تنظیموں میں کام کرنے کا اور اس میں رہتے ہوئے بھی ہلکا سا میرا اٹیچمنٹ تو رہتا تھا، براہ راست نہیں تھا، لیکن میرے دوست تو وہی تھے جو میرے بچپن کے دوست تھے۔ جیسے ہی میں نے وڈیو سنٹر بند کیا اور فارغ ہوا تو پھر دوبارہ تنظیم میں چلا گیا اور آج تک خدا کا شکر ہے کہ اس چیز سے ہٹا ہوا ہوں۔

میں پانچویں جماعت میں تھا جب عیسیٰ نگری میں آیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک بہت سی تبدیلیاں دیکھی ہیں۔ ان میں اچھی تبدیلیاں بھی ہیں اور بُری تبدیلیاں بھی۔ اصل میں یہ جو برائیاں آ رہی ہیں، اس میں یہ ہے کہ آدمی جب بالکل فری ہو گا تو اس کے سوچنے کا زیادہ رجحان غلط چیزوں کی طرف جائے گا۔ ویسے تو پورے پاکستان میں بے روزگاری کا مسئلہ ہے لیکن عیسیٰ نگری میں کافی زیادہ ہے۔ یا پھر یہ کہ جہاں باپ ریٹائر ہو گئے ہیں کے ایم سی وغیرہ سے، تو انھوں نے اپنی اولاد کی ملازمت میں انٹری تو کروا دی ہے، لیکن وہ کام کرنے بھی نہیں جاتے۔ وہ اگر پڑھے لکھے بھی ہیں اور صفائی کے کام کو برا بھی سمجھتے ہیں، پھر بھی نام لکھوا دیا اور جاتے نہیں ہیں۔ گھر میں بیٹھے بٹھائے ہزار پندرہ سو روپیہ آجاتا ہے۔ اس وجہ سے بھی ان کا رجحان غلط چیزوں کی طرف ہے۔ تاش بیٹھ کر کھیلیں گے۔ اگر جیت کر دکھا دو تو۔ اسی طرح وہ آہستہ آہستہ جُوے کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ جوے سے ہی نکل کر... اگر کسی نے پیسے زیادہ جیت لیے ہیں، ہزار پندرہ سو، تو وہ یہ کہتے ہیں کہ آج تو نے جیتا ہے تو ہمیں پارٹی دے دے۔ تو وہ پارٹی کیا ہو گی، شراب کی ہو جائے گی۔ اسی طرح بڑھتے بڑھتے وہ آدمی مختلف برائیوں کی طرف چلا جاتا ہے۔

ان برائیوں میں ہیروئن بھی ہے، عیاشی بھی ہے۔ ہمارے علاقے میں کم سے کم دس پندرہ ہیں

Scanned with CamScanner

جن کو ہم اپنی زبان میں "مُورت" کہتے ہیں۔ "کے ٹو" بھی کہتے ہیں۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ وہی لوگ جو زیادہ عیاشی کی طرف مائل ہوتے ہیں، شراب ناچ گانا یا اداکاری کی طرف شوق رکھتے ہیں، ان کی دوستی ہو جاتی ہے اور وہی مُورتوں کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ ان کی ملاقات ہو جاتی ہے اور پھر ملاپ ہو جاتا ہے۔ اصل میں ترقی کے ساتھ ساتھ کچھ اچھی باتیں بھی ہوئی ہیں اور کچھ بری باتیں بھی ہوئی ہیں۔ پورے پاکستان میں، لیکن میں فی الحال اپنے علاقے کی بات کر رہا ہوں۔ ہمارے علاقے میں ترقی ہوئی جس سے مراد یہ ہے کہ ایجوکیشن میں ترقی ہوئی، سماجی ترقی ہوئی۔ پانی نہیں تھا، گیس بجلی نہیں تھی، یہ چیزیں ملی ہیں ہم کو۔ تو اس کے ساتھ ساتھ کچھ بری چیزیں بھی ڈیولپ ہوئیں۔ جیسے دیکھا جائے تو چرس پینے والے لڑکے چوری چھپے استعمال کرتے تھے جیسے اگر کوئی پی رہا ہے اور دور سے دیکھا کہ وہ آدمی آرہا ہے تو اسے چھپا لیتے تھے۔ جیسے ہی وہ آدمی کراس ہو کر ان کے پاس سے چلا گیا، دوبارہ سگریٹ بھرنی شروع کر دی۔ اور کہیں دور کونے کھانچوں میں بیٹھ کر پیتے تھے۔ اب یہ ہے کہ پینا تو دور کی بات ہے، دوسروں کے سامنے بیچتے ہیں۔ پچھلے دنوں تو یہ تھا کہ ہمارے ایریا میں جو لڑکے بیچتے تھے، ہاتھوں میں آدھے کلو کی تھیلی ہوتی تھی اور اس میں پڑیاں ہیروئن اور چرس کی ہوتی تھیں، تو ایک طرف کھڑے ہو کر اور خریدنے والے لڑکوں کی لائن بنوا کر بیچتے تھے۔ ان کی بلا سے کوئی لیڈیز آرہی ہیں یا کوئی معزز بندہ آرہا ہے، یا باہر سے کوئی مہمان آرہا ہے۔ اکثر تو ایسا ہوا کہ کسی کا کوئی مہمان آرہا ہے باہر سے اور اس کی صحت تھوڑی سی ڈاؤن ہے تو دوسرا آدمی یہی سمجھے گا کہ یہ باہر سے آیا ہے اور پینے والا ہے تو اس سے کہتے تھے، چل بھئی لائن میں لگ جا۔ تو ایسی اطلاع ہمیں ملی۔ لڑائی جھگڑے بھی ہوئے۔ اور دوسری برائی یہ ہے کہ ابھی ہمارے علاقے میں یہ مُورتیں بہت زیادہ ہیں۔ اور ان کا رہنے سہنے کا جو ڈھنگ ہے وہ بھی ترقی کر چکا ہے۔ شروع میں جہاں تک ہم نے دیکھا ہے کہ ہمارے علاقے میں تین چار اس قسم کے... فی الحال تو ہم آدمی ہی کہہ سکتے ہیں... تین چار آدمی تھے جن میں یہ چیزیں تھیں، مورتوں والے اسٹائل ہیں بولنے کے، چلنے پھرنے کے، یہ ان میں تھیں۔ تو اس کا یہی دیکھنے میں آیا تھا کہ گھر میں لڑکیاں زیادہ ہیں تو وہ بھی لڑکیوں کی طرح بولتے تھے یا لڑکیوں کے ساتھ کام کرتے تھے، آٹا گوندھ لیا یا برتن دھو لیے جھاڑو لگا لیا، تو اس سے وہ چیزیں پیدا ہو گئیں۔ لیکن وہ جو تین چار مُورتیں تھیں انھوں نے کیا کیا کہ ان کی جو ایج تھی میرج کی، اس پر ان کے گھر والوں نے ان کی شادی بھی کی، ان کے بچے بھی ہوئے لیکن وہ تھیں مورتیں۔ لیکن اب دیکھتے ہیں کہ بارہ تیرہ سال کی عمر میں، وہ جو ان کی نشانیاں ہیں، وہ رونما ہو گئیں تو جو بڑی عمر کی مورتیں ہیں ان کے ساتھ چلے جاتے ہیں، شامل ہو جاتے ہیں ان کے گروپ میں اور گھر سے تقریباً نکل جاتے ہیں، آوارہ ہو جاتے ہیں۔ ان مورتوں نے گھروں کی قریب ہی اپنی جگہ بنا لی ہے۔ ہمارے علاقے میں کرائے پر مکان لے لیا، وہیں رہنا شروع کر دیا۔ وہیں ان کے برتن ہیں، کھانا پینا ہے۔ جس طرح کوئی دوسرا آدمی اپنا گھر بنا کر رکھتا ہے، اسی طرح یہ بھی اپنے گھر کو بنا سنوار کر رکھتی ہیں اور نئی مورتوں کو وہاں پر رکھ کر باتیں سکھاتی ہیں۔ تو یہ ہے کہ اب وہ شرماتے نہیں ہیں۔ اپنے گھر والوں کو بولتے ہیں ہم

Scanned with CamScanner

مورتیں ہیں۔ اپنے بھائیوں کے سامنے بھی اور سارے رشتے داروں کے سامنے بھی وہی لیڈیز والے کپڑے پہنتے ہیں اور وہی لیڈیز والی چال۔ ان میں سے اکثر نے تو اپنا آپریشن تک کروالیا ہے۔ اور اب بالکل آزادی ہے۔ ہم کوئی جرائم بھی کررہے ہیں تو بالکل آزادی سے۔ یہ چیز ڈیولپ ہوئی ہے۔

پچھلے دنوں ڈاکٹر صاحب نے سروے کیا، اس سلسلے میں وہ ان کا انٹرویو کرنا چاہ رہے تھے۔ تو ہم انھیں وہاں لے کر گئے تو وہاں پتا چلا کہ مورتیں دو قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو سیکس کے حوالے سے ہیں اور دوسری وہ ایسی ہیں، کسی کے گھر چلی گئیں، کسی کا بیٹا پیدا ہوا یا کسی کی خوشی ہے تو وہاں ناچ گا کر پیسے لے لیے۔ تو یہ ایک سماجی برائی ہے۔

شروع سے میں نے آپ کو بتلایا میرا زیادہ تر رجحان سوشل ورک کی طرف تھا۔ میں ساتویں آٹھویں کلاس میں تھا اس وقت ہمارا ایک گروپ بنا ہوا تھا آٹھ دس لڑکوں کا، کوئی آٹھویں میں تھا، کوئی نویں میں تھا۔ تو ہمارے ذہنوں میں بھی یہی کام تھا کہ علاقے کے مسائل جو بھی ہیں، ان سے نمٹنے کے لیے چھوٹا موٹا گروپ ڈیولپ کیا جائے۔ اسی زمانے میں مائیکل جاوید، جو موجودہ ایم پی اے ہیں، ان کی عیسیٰ نگری میں انٹری ہوئی۔ یہ اصل میں کوئٹہ کے رہنے والے ہیں۔ ہم لوگ چھوٹا سا گروپ بنانے کی کوشش کررہے تھے تو یہ انٹر ہوئے۔ ہم لوگ کرکٹ کھیلتے تھے اور یہ بھی وہیں کرکٹ کھیلنے آتے تھے تو دوستی بڑھی۔ اور یہ ہم سے آپ ہو کر بیکسٹر اور اسلم مارٹن کی طرف چلے گئے لیکن یہ کہ ہم لوگوں نے بھی ان کے ساتھ کام کیا۔ جیسے ہی ہم لوگ چھوٹا سا گروپ بناتے تھے تو اس میں بہت جلدی ٹوٹ پھوٹ شروع ہوجاتی تھی۔ یا تو ہم لوگ ناتجربہ کار تھے یا کوئی چیز سوچتے تھے تو فوری طور پر کرنے کے چکر میں آجاتے تھے تو اس وجہ سے گڑبڑ شروع ہوجاتی۔ مطلب یہ کہ میٹنگ نہیں ہوپاتی تھی، یا کوئی کام کرنا ہے تو اس کی پلاننگ کرلی، پھر اس کو چھوڑ دیا۔ کافی لڑکوں نے دیکھا کہ اس میں کام نہیں ہو رہا تو انھوں نے اپنی اپنی راہیں منتخب کرلیں اور ان میں چلے گئے۔ اس وجہ سے میں بھی کافی بددل ہوچکا تھا اس سوشل ورک کے چکر میں۔ کچھ لڑکوں نے سوچا کہ عیسیٰ نگری کے پلیٹ فارم پر پھر دوبارہ کوئی تنظیم بنائی جائے۔ تو اس وقت انجمن کی تنظیم موجود تھی، اسے بنانے کی کوشش کررہے تھے۔ میرے پاس بھی آئے، سلیم کھوکھر تھا اور دو تین لڑکے بھی تھے۔ تو میں نے کہا کہ نہیں جی، مجھے تو کافی پریشانی ہوئی ہے، اگر یہ تنظیم تین چار ماہ چلے گی تو میں خود آجاؤں گا، اس لیے کہ مجھے یہ تجربہ ہے کہ کوئی بھی تنظیم ہو ایک دو ماہ کے بعد بالکل بیٹھ جاتی ہے۔ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ میری وہ بات غلط نکلی اور انجمن کافی عرصہ چلی۔

بس پھر کچھ اسٹیج آگیا کہ میں دوسری طرف چلا گیا اور آٹھ دس سال کا پیریڈ میں نے سماجی کاموں سے دور رہ کر گزارا۔ پھر غلط کام چھوڑ دیے، سوشل ورک کی طرف واپس آگیا اور کمیونٹی انٹروینشن ٹیم کے ممبر کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اس پروجیکٹ میں کام کرتا رہا ہوں کہ علاقے کے نوجوانوں کو مثبت سرگرمیاں فراہم کریں تاکہ ان کو نشے کی طرف جانے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔

**

Scanned with CamScanner

ذی شان ساحل

کراچی

اور دوسری نظمیں

سرورق اور ڈرائنگز
نفیسہ شاہ

قیمت: ۱۰۰ روپے

آج کی کتابیں
اے ۱۶، سفاری ہائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

Scanned with CamScanner

کراچی کے مسئلے کو درست تناظر میں دیکھ پانے کے لیے اس اہم حقیقت کا سامنا کرنا ضروری ہے کہ شہر کے تقریباً نصف باشندے کچی آبادیوں میں رہنے پر مجبور ہیں جنھیں غیر قانونی قرار دیے جانے کے باعث شہر کے وسائل پر ان غریب باشندوں کا حق سرکاری طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ان باشندوں کی تعداد، تخمینے کے مطابق، شہر کی "قانونی" آبادی کے مقابلے میں کم از کم دگنی رفتار سے بڑھ رہی ہے، اور اگر یہ رجحان جاری رہتا ہے تو آئندہ ایک دہائی کے عرصے میں شہر کی آبادی میں ان کی اکثریت ہو گی۔ چناں چہ کراچی شہر کو سمجھنے کے لیے کچی آبادیاں قائم ہونے کے عمل اور اس کے مضمرات پر پوری توجہ دینا لازمی ہے۔ اگلے چار مضامین میں یہی کوشش کی گئی ہے۔

تسنیم احمد صدیقی حکومت سندھ کے محکمے سندھ کچی آبادیز اتھارٹی کے سربراہ ہیں۔ ان کا مضمون "کچی آبادیاں کیوں؟" ان عوامل پر روشنی ڈالتا ہے جو کچی آبادیوں کے وجود کا باعث ہیں۔

کچی آبادیوں کو، جب وہ شہر کے ایسے علاقوں میں واقع ہوں جہاں زمین کی مالیت بڑھ رہی ہو، انہدام اور بےدخلی کے خطرے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو لوگ اپنے مالی فائدے کے لیے غریب باشندوں سے یہ زمین خالی کرانا چاہتے ہیں وہ رائے عامہ کو بیدار ہونے سے روکنے کے لیے ہر قسم کے لسانی، نسلی یا مذہبی اختلاف کو نفرت میں تبدیل کرنا روا رکھتے ہیں۔ عارف حسن اور کینتھ فرنانڈیز (Kenneth Fernandes) نے اپنے مضامین میں ایسی ہی دو آبادیوں کے انہدام کی تفصیلات پیش کی ہیں۔

عارف حسن کا مضمون The Sohrab Goth Massacre کے عنوان سے کراچی کے ماہ نامہ "ہیرلڈ" کے فروری ۱۹۸۷ کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ کینتھ فرنانڈیز کا مضمون Katchi Abadis: living on the edge کے عنوان سے شہری مطالعات کے ایک بین الاقوامی جریدے *Environment and Urbanization* کی جلد ۶، شمارہ ۱ (اپریل ۱۹۹۴) میں شائع ہوا۔

کینتھ فرنانڈیز کراچی کی مقامی مسیحی کمیونٹی کے فرد ہیں جو پچھلی ایک صدی کے دوران گوا سے آکر کراچی میں آباد ہوئی اور اس شہر کی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ وہ کراچی کے ایک غیر سرکاری ادارے Urban Resource Centre کے انتظامی سربراہ ہیں۔ اس ادارے کا کام کراچی کے شہری مسائل اور معاملات کے بارے میں حقائق، اعداد و شمار اور تجزیے جمع کرنا اور اسے فوٹوسٹیٹ نقلوں اور مطبوعات کی صورت میں دل چسپی رکھنے والے افراد اور اداروں تک پہنچانا ہے۔ URC کی جانب سے ایک ماہانہ نیوزلیٹر *Facts & Figures* کے نام سے انگریزی اور اردو میں شائع ہوتا ہے۔

چوتھا مضمون "دلال آباد" کراچی میں سرکاری ملکیت کی زمین پر غیر قانونی قبضے اور اس زمین کے پلاٹوں کی فروخت کے عمل پر، جس کے ذریعے سے غیر آباد زمین کچی آبادی میں تبدیل ہوتی ہے، تفصیل سے روشنی ڈالتا ہے۔ یہ ایک ولندیزی ریسرچ اسکالر یان فانڈر لنڈن (Jan van der Linden) کی تحقیق کا حاصل ہے۔ فانڈر لنڈن ایمسٹرڈیم فری یونیورسٹی سے وابستہ ہیں اور ۱۹۷۰ سے ۱۹۷۵ تک کراچی یونیورسٹی کے تعاون سے جوائنٹ ریسرچ پروجیکٹ ۴ (JRP-IV) کے تحت کراچی میں رہائشی سہولتوں کی صورت حال کے موضوع پر اپنے چند ساتھیوں سمیت نہایت اہم تحقیق کر چکے ہیں۔ اس پروجیکٹ کے تحقیقی مقالات کا مجموعہ *Karachi: Migrants, Housing and Housing Policy* کے عنوان سے ۱۹۹۱ میں وین گارڈ بکس، لاہور، نے شائع کیا۔ "دلال آباد" نامی مضمون اسی کتاب سے لیا گیا ہے۔

Scanned with CamScanner

تسنیم احمد صدیقی

انگریزی سے ترجمہ : اجمل کمال

کچی آبادیاں کیوں؟

کچی آبادیاں آخر کیوں بنتی ہیں؟ آخر تمام شہری عمدہ مکانوں میں، منصوبہ بندی سے بنائے گئے محلوں میں، تمام شہری سہولتوں کے ساتھ کیوں نہیں رہ سکتے؟ کیا لوگ خواہ مخواہ پسماندہ بستیوں میں رہتے ہیں؟ کیا یہ کچی آبادیوں کے باشندوں کا قصور ہے کہ وہ وہاں رہنے لگتے ہیں یا وہ کسی اَور کے عمل کا نشانہ ہیں؟ اور، کیا غریبوں کا شہر میں آنا اُن کا جرم ہے یا یہ ریاست اور اس کے اداروں کی ناکامی ہے کہ اُنھیں ان کے آبائی علاقوں میں روزگار کے موقعے فراہم نہیں کیے جا سکے اور یوں شہروں کی آبادی بے تحاشا بڑھ گئی؟

اس مختصر مضمون میں انھیں جیسے سوالوں پر گفتگو کی گئی ہے۔

مال دار اور خوش حال درمیانہ طبقے کے لوگوں کے نزدیک کچی آبادیاں شہر کی بدصورتی ہیں اور وہ ان آبادیوں کے وجود سے نالاں ہیں۔ وجہ ظاہر ہے۔ اگر اُن کے اپنے محلّے کے درمیان کوئی کچی آبادی بن جائے تو ان کی جائیداد کی قیمت گھٹ جاتی ہے۔ وہ ان آبادیوں کو غلیظ اور ماحولیاتی طور پر آلودہ علاقوں کے طور پر دیکھتے ہیں جہاں ہر قسم کی سماجی بُرائیوں اور جرائم ـــــ منشیات، قمار بازی، عصمت فروشی وغیرہ ـــــ کے پھلنے پھولنے کے لیے سازگار ماحول ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ کچی آبادیاں سماجی اور سیاسی ہلچل کے مرکز ہیں۔

بہت سے اعلیٰ سرکاری افسر، شہری منصوبہ ساز، انجنیئر اور ڈویلپر بھی کچی آبادیوں کے وجود سے متنفر ہیں۔ یہ آبادیاں ان کی حسِ جمال اور تجارتی مفادات کو ٹھیس پہنچاتی ہیں۔ وہ انھیں بُل ڈوزروں سے مسمار کروا کر اس قیمتی زمین کو کثیر منزلہ عمارتوں یا "خوب صورت باغات" کے لیے استعمال کرنے کے خواہش مند ہیں۔ کچی آبادیوں کا وجود ان کی ناقص کارکردگی کی بھی عکاسی کرتا ہے کہ وہ شہر کے ماحول کو صاف ستھرا اور تجاوزات سے پاک رکھنے میں ناکام ہیں۔ اکثر و بیشتر یہ افراد "لینڈ مافیا" کو ان آبادیوں کے قیام کا قصوروار ٹھہراتے ہیں اور غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) کو ان آبادیوں کی حمایت کا۔ یہ ایسے اداروں کے بھی خلاف ہیں جو کچی آبادیوں میں کسی ترقیاتی کام کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

بہت کم لوگوں کو سنجیدگی سے احساس ہوتا ہے کہ ان کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ ان سے بھی کم تعداد ان لوگوں کی ہے جو یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ آخر لوگ شہروں کا رخ کیوں کر رہے ہیں۔ کیا اپنے آبائی علاقوں کا محفوظ سماجی ماحول چھوڑ کر شہروں کی اجنبی دنیا میں قدم رکھنا آسان کام ہے جہاں دو وقت کی روٹی کے سوا کسی چیز کا آسرا نہیں؟ یہ بات جاننے کی کوئی بھی کوشش نہیں کرتا کہ یہ لوگ شہر کی لاکھوں کی آبادی میں شامل ہونے کے بعد کہاں رہتے ہیں۔ انھیں رہنے کے لیے زمین اور دوسری سہولتیں ـــــ پانی، ٹرانسپورٹ، بجلی ـــــ کون مہیا کرتا ہے، اور کس قیمت پر؟ اور سب سے اہم بات کہ شہر میں آنے والے لوگ اپنی دو وقت کی روٹی کیسے حاصل کرتے ہیں؟

مال دار اور اونچے درمیانہ طبقے کے لوگ اپنے الگ تھلگ، محفوظ اور "صاف ستھرے" محلوں میں ہنسی خوشی رہتے ہیں جہاں ان کے لیے ٹرانسپورٹ، علاج، تعلیم کا بندوبست ہے، زیرزمین نکاس اور فلٹر کیے ہوئے پانی کا انتظام ہے اور سپرمارکیٹوں، کلبوں، کھانے پینے اور تفریح کرنے کی عمدہ جگہوں کی دلکش دنیا موجود ہے۔ انھیں اس بات سے کچھ غرض نہیں کہ غریب کن حالات میں رہتے ہیں اور ان کی روزمرہ زندگی کی دشواریاں کیا ہیں۔ اور بھلا انھیں اسے غرض ہو بھی کیوں؟ یہ تو دو شہروں کی کہانی ہے: دو کلچر، دو دنیائیں، دو قومیں جو ایک دوسرے کے پاس آباد ہیں۔ دولت کی بدنما نمائش کے بیچوں بیچ غریب باشندے جیتے مرتے رہتے ہیں۔ لیکن کیا کچی آبادیاں اونچے طبقے کے لوگوں اور شہری منصوبہ سازوں کی نظر سے اوجھل رہ سکتی ہیں جب کہ ان میں بسنے والے لوگ کراچی کی کل آبادی کے ۴۰ فیصد سے بڑھ چکے ہیں؟ کیا وہ ان خوش حال لوگوں کی زندگیوں میں خلل ڈالے بغیر الگ تھلگ قائم رہ سکتی ہیں؟ نہیں، اب ایسا نہیں ہو سکتا۔

کچی آبادیوں کے وجود اور ان کی بڑھتی ہوئی تعداد نے حکمراں اور مال دار طبقوں کے لیے مسائل پیدا کرنے شروع کر دیے ہیں۔ جب آدھا شہر کچی آبادیوں پر مشتمل ہو ـــــ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کے رہنے والے زمین پر غیرقانونی قبضہ کیے بیٹھے ہوں، اس تمام ڈویلپمنٹ کی قیمت کا ایک پیسا بھی سرکاری خزانے میں نہ پہنچا ہو، اور ان آبادیوں میں استعمال ہونے والے پانی، بجلی اور گیس کی قیمت ان کے متعلقہ محکموں کو نہ ملتی ہو ـــــ تو باقی آدھے شہر کے لیے مشکلات کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ جب کوئی معاشرہ اپنے کم خوش نصیب شہریوں کو جگہ دینے میں ناکام رہے تو اس کے اقتصادی نتائج خاصے ہولناک ہو سکتے ہیں، لیکن اس مسئلے کے مضمرات سمجھنے کی کسی کو فرصت نہیں۔

یہ تباہی کا ایک مکمل دائرہ ہے۔ دیہات کے غریب باشندے روزگار کی تلاش میں شہر آتے ہیں۔ سب سے پہلے انھیں زمین کا ایک ٹکڑا چاہیے جہاں کم سے کم بنیادی سہولتیں میسر ہوں اور اس زمین کی قیمت آسان قسطوں میں ادا کی جا سکے۔ یہ لوگ محنتی، باہمت اور ہوشیار ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض ماہر باہنر ہوتے ہیں، کچھ کا ہنر کم درجے کا ہوتا ہے۔ یہ لوگ سرکاری نوکریاں تلاش نہیں کرتے بلکہ اپنی صلاحیت کے بل پر اپنی روزی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر انھیں ایک چھوٹا سا پلاٹ مل جائے تو وہ اس پر اپنا

Scanned with CamScanner

مکان تھوڑا بہت بنا کر وہاں رہنے لگتے ہیں اور اپنے وسائل استعمال کر کے اسے رفتہ رفتہ بہتر بناتے رہتے ہیں۔ وہ پانی، بجلی، گیس وغیرہ کی قیمت بھی ادا کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ لیکن حکومت انھیں رہنے کے لیے زمین مہیا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ چناں چہ وہ زمینوں کے قبضہ گیروں کے ہاتھوں میں جا پڑتے ہیں جو سرکاری زمین کو اپنی ملکیت ظاہر کر کے اُن سے وہی قیمت وصول کرتے ہیں جو اگر حکومت اس کام کے لیے تیار ہوتی تو اُسے بھی مل سکتی تھی۔

ایسا ہرگز نہیں ہے کہ کچی آبادیوں میں رہنے والے پانی، بجلی وغیرہ قیمت دیے بغیر حاصل کرتے ہیں، لیکن اصل بات یہ ہے کہ سرکاری محکمے انھیں یہ سہولتیں جائز طریقے سے مہیا نہیں کرتے۔ ان محکموں کا طریقِ کار بہت پیچیدہ ہے۔ بدعنوانی کا تناسب بہت زیادہ ہے۔ روز کی مزدوری کرنے والے لوگ کنکشن حاصل کرنے کے لیے ان کے دفتروں کے بے شمار چکر نہیں لگا سکتے۔ لہذا وہ لوگ یہ سہولتیں لائن مین اور والو آپریٹر کو مروجہ نرخ پر رقم ادا کر کے حاصل کرتے ہیں۔ انھیں قیمت ادا کیے بغیر بجلی اور پانی حاصل کرنے کا الزام دیا جاتا ہے، جبکہ وہ سرکاری نرخ سے زیادہ قیمت ادا کرتے ہیں اور استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔ اس عمل کے نتیجے میں سرکاری محکمے غریب اور ان کے اہلکار مالدار سے مالدار ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اس کی ایک مختصر سی مثال یہ ہے کہ کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن (KESC) زبردست خسارے میں چلتی ہے اور ڈویلپمنٹ اور مینٹے ننس کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کی وجہ صرف کچی آبادیوں میں استعمال ہونے والی بجلی نہیں ہے۔ مالدار صنعت کار، سنیماؤں، آئس فیکٹریوں، شادی ہالوں کے مالک اور اونچے بااثر لوگ بجلی چُراتے ہیں؛ کارپوریشن کی لیبر یونینیں جعلی اوورٹائم اور میڈیکل بِل انتظامیہ سے زبردستی منظور کراتی ہیں؛ کارپوریشن کے اعلیٰ افسر نئے ٹھیکے دیتے وقت بھاری کمیشن وصول کرتے ہیں۔ یہ سارا مالی بوجھ اُن صارفوں کو اٹھانا پڑتا ہے جو اپنے بجلی کے بِل باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں اور سخت مہنگائی اور بے تحاشا بڑھتے ہوئے سرچارج برداشت کرتے ہیں۔ اس طرح، اگر ہم مہینے بھر استعمال کی ہوئی بجلی کے بدلے کارپوریشن کو تین سو روپے ادا کرتے ہیں تو اس کا ایک تہائی حصہ عملے کی بدعنوانی اور ناکارکردگی کی قیمت ہوتی ہے اور ایک تہائی اُس چوری کی ہوئی بجلی کی جو امیروں اور غریبوں کے کام آئی۔

کچی آبادیوں کے باشندے

مقبولِ عام خیال کے برعکس، کچی آبادیوں کے باشندے نہ تو جرائم پیشہ ہیں نہ منشیات فروش نہ غیرقانونی پناہ گزیں نہ دہشت گرد اور نہ بائیں بازو کے انقلابی۔ (افسوس، انقلاب کے دن گزر چکے ہیں!) یہ بالکل عام، قانون پسند، سیدھے سادے شہری ہیں جو کسی نہ کسی طرح اپنی روزی کما رہے ہیں۔ اس میں

شبہ نہیں کہ ان آبادیوں میں بھی سماج دشمن عناصر اور بدمعاش موجود ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کچی آبادیاں غیر قانونی پناہ گزینوں کو رہنے کی جگہ دیتی ہیں۔ لیکن ان لوگوں سے کراچی کا کون سا محلہ خالی ہے؟ فرق صرف قوت برداشت کا ہے۔

ہمارے اونچے طبقے کو اس زبردست معاشی سرگرمی کی خبر ہی نہیں ہو پاتی جو ان کچی آبادیوں میں جاری و ساری ہے۔ دراصل یہ آبادیاں، شہر بھر کی معاشی سرگرمی کی شہ رگ ہیں۔ یہی شہر کی صنعتوں کو بھی ہنرمند مزدور فراہم کرتی ہیں اور یہاں کے باشندے خود بھی چھوٹے پیمانے کی بے شمار اور قسم قسم کی صنعتیں چلاتے ہیں۔ یہاں تقریباً ہر مکان ایک ورکشاپ ہے جہاں پورے پورے خاندان پیداواری سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔ ان آبادیوں سے بڑے صاحب لوگوں کو ڈرائیور، بیگم صاحباؤں کو آیائیں اور ماسیاں، بڑے تجارتی اداروں کو ٹائپسٹ اور سروس سیکٹر کو ہر طرح کے کارندے ملتے ہیں۔ شہر کے ماہر مکینک، پلمبر، الیکٹریشین اور فورمین انھیں آبادیوں میں رہتے ہیں۔ یہ شہر میں جاری تعمیراتی سرگرمیوں کے لیے راج اور مزدور مہیا کرتے ہیں اور شہر کا پورا ٹرانسپورٹ کا نظام چلاتے ہیں۔ کیا کراچی جیسا بڑا شہر ان کے بغیر ایک دن بھی چل سکتا ہے؟

ملک کے دیہات اور قصبوں سے کراچی میں آ کر بسنے والے لوگ شہر کو اپنے ہنروں، تکنیکوں، ثقافتی طور طریقوں اور قدروں سے مالامال کر رہے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو شہر کی زندگی کو متحرک رکھتے ہیں اور پاکستان کی معاشی ترقی اور ثقافتی اور لسانی یک جہتی کی کلید انھیں کے پاس ہے۔

شہر کی جانب نقلِ مکانی کے اسباب

کچی آبادیوں کے بیش تر باشندے دیہی علاقوں سے آئے ہیں جہاں ان کے لیے دو وقت کی روٹی کمانا دشوار ہو گیا تھا۔ ان کی شہروں کی طرف ہجرت کے کئی فوری اسباب ہوتے ہیں:

* موروثی زمینوں کا بٹوارا۔

* آبادی میں اضافہ (جس کی شرح ۳.۲ فیصد سالانہ ہے۔)

* بے تحاشا کاشت اور کیمیائی کھاد کے بڑھتے ہوئے استعمال سے زمین کا کمزور پڑ جانا یا سیم اور تھور کا شکار ہو جانا (ہر سال چالیس ہزار ہیکٹیئر زمین اس طرح بنجر ہوتی جا رہی ہے۔)

* جنگلوں کا تیزی سے کٹنا، خاص طور پر شمالی علاقوں میں جہاں اس کے نتیجے میں سیلاب بار بار آنے لگے ہیں اور زرخیز مٹی اکھڑتی جا رہی ہے۔

دیہی علاقوں میں لوگوں کے پاس قابلِ کاشت زمین کم ہوتی جا رہی ہے۔ ۱۹۵۱ میں فی کس قابلِ کاشت رقبہ ۰.۴۶ ہیکٹیئر تھا جو ۱۹۸۱ تک کم ہو کر ۰.۳۱ ہیکٹیئر فی کس ہو چکا تھا۔ ۱۹۶۰ کی دہائی کے "سبز انقلاب" کے تحت زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں اور کیمیائی کھادوں کے استعمال نے صورتِ

حال میں اور شدت پیدا کی۔ زرعی سیکٹر کو مشینوں اور ٹیکنولوجی پر بہت سرمایہ لگانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خوش حال زمین داروں نے چھوٹے کسانوں کی زمینیں خرید لیں جو یہ خرچ برداشت نہ کر سکتے تھے۔

اُن علاقوں میں معاشی مواقع نہ ہونے کے برابر تھے اور بے زمین ہونے والے لوگ وہاں کوئی اور پیشہ اختیار کر کے دو وقت کی روٹی حاصل نہیں کر سکتے تھے، چناں چہ انھوں نے شہروں کی طرف نقل مکانی شروع کی۔

جینے کا ہُنر

جب یہ لوگ شہر میں آتے ہیں تو روزانہ اُجرت پر جسمانی محنت کا کام کرتے ہیں یا ٹھیلا چلا کر چھوٹی موٹی چیزیں بیچتے ہیں یا ایسا کوئی اور پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ اگر قسمت زور کرے تو کسی کمپنی یا سرکاری دفتر میں چپراسی یا چوکیدار لگ جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ لوگ شہر کی زندگی سے تعلق پیدا کرتے ہیں اور اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے لگتے ہیں۔ ان میں سے ہر قدم پر غیر رسمی سیکٹر ہی ان کی مدد کرتا ہے، کیوں کہ حکومت کی طرف سے کوئی تعاون یا امداد حاصل نہیں ہوتی۔ ان کی زندگی کو ذرا قریب سے دیکھیے۔ رہنے کے لیے زمین خریدنی ہو یا مکان بنانے کے لیے قرض حاصل کرنا ہو، یا ٹرانسپورٹ، پانی، بجلی وغیرہ کے مسائل حل کرنے ہوں، ہر جگہ غیر سرکاری، غیر رسمی سیکٹر ہی ان کے کام آتا ہے۔

ان کا اپنا علاج معالجے کا نظام ہے، اپنے تعلیمی ادارے ہیں، اپنی تفریح گاہیں ہیں۔ ان میں سے ہر چیز ان کی مالی استطاعت کے مطابق ہے، گھر کے قریب واقع ہے اور رہن سہن سے ہم آہنگ ہے۔ کم ہی لوگ اس بات پر یقین کریں گے کہ کچی آبادیوں کے بیش تر والدین اپنے بچوں کو تجارتی بنیاد پر چلائے جانے والے چھوٹے اسکولوں میں بھیجتے ہیں اور فی بچہ ۲۵ سے ۶۰ روپے تک ادا کرتے ہیں۔ یہ لوگ تعلیم کی اہمیت سے آگاہ ہیں اور سرکاری پرائمری اسکولوں پر انحصار نہیں کرتے جو ایک تو ہر محلّے میں موجود نہیں ہیں اور جہاں ہیں بھی وہاں ان کا معیار نہایت گھٹیا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بعض کچی آبادیوں میں خواندگی کا تناسب ۸۰ فیصد تک پہنچا ہوا ہے۔

کچی آبادیوں کی قسمیں

کراچی کی کچی آبادیوں کو مجموعی طور پر دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) پرانی کچی آبادیاں جو اُس وقت وجود میں آئیں جب ہندوستان سے چھ لاکھ مہاجر شہر میں آئے۔ پھر ۱۹۵۰ کی دہائی کے وسط سے، جب کراچی میں صنعتیں لگنی شروع ہوئیں، بڑی تعداد میں لوگ

Scanned with CamScanner

ملک کے شمالی علاقوں سے آ کر شہر میں بسنے لگے۔ دونوں موقعوں پر حکومت اتنی بڑی تعداد میں بے روزگار اور بے گھر لوگوں کا بندوبست کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ چناں چہ دونوں موقعوں پر انھوں نے شہر کے مرکزی علاقے کے آس پاس کی خالی جگہوں پر قبضہ کر کے رہنا شروع کر دیا۔ تب یہ سرگرمی بالکل فطری طور پر ہوئی اور اس عمل میں دلالوں یا قبضہ گیروں کا کوئی حصہ نہ تھا۔ اس طرح آباد ہونے والے محلے بغیر کسی منصوبہ بندی کے، بالکل بے ترتیبی سے بسے اور ان میں سڑکوں یا سہولتوں کی فراہمی کی کوئی گنجائش نہ رکھی گئی۔

(۲) ۱۹۷۰ کے آس پاس، اور خصوصاً مشرقی پاکستان کے الگ ہونے کے بعد، مہاجروں کی ایک نئی لہر کراچی میں داخل ہوئی۔ حکومت اس بار بھی ان کا پوری طرح بندوبست کرنے کے قابل نہیں تھی۔ اب ایک نیا عمل شروع ہوا۔ رہائش کی نئی ضرورتوں اور مانگ کے پیدا ہونے سے پیشہ ور قبضہ گیروں اور دلالوں پر مشتمل ایک نیا طبقہ وجود میں آیا۔ انھوں نے پھیلتے ہوئے شہر کی بیرونی سرحدوں پر واقع سرکاری زمین کے بڑے بڑے قطعات پر قبضہ کر لیا اور ان پر غریب اور کم آمدنی والے لوگوں کے لیے چھوٹے چھوٹے پلاٹ بنائے۔ اس منصوبہ بندی میں انھوں نے کے ڈی اے کے طریقوں کی پیروی کی اور سیدھی سڑکوں، تجارتی علاقوں اور شہری سہولتوں کے لیے کھلی جگہوں کا انتظام رکھا۔ ضرورت مند لوگ انھیں نقد قیمت ادا کرتے اور انھیں اپنے پلاٹ کا فوری قبضہ مل جاتا۔ کوئی کاغذی کارروائی حائل نہ ہوتی۔ تمام سہولتیں انھیں آہستہ آہستہ اور طویل عرصے میں فراہم ہوتیں۔ یہ بلدیہ، قصبہ، اورنگی اور لانڈھی کی بڑی کچی آبادیوں کی ابتدا تھی۔

کچی آبادیوں کا ظہور شہر کے غریب باشندوں کی رہائشی ضرورتوں کا ایک حل ہے جو غیر رسمی سیکٹر نے پیش کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ شہر کی باربط اور حقیقت پسندانہ منصوبہ بندی کرنے کے سلسلے میں معاشرے کی ناکامی کا بھی مظہر ہے۔ اگر معاشی نظام معاشرے کے تمام طبقوں کی ترقی کو مدنظر رکھتا، منصفانہ ہوتا اور تمام طبقوں کی سماجی اور معاشی حالت سے ہم آہنگ ہوتا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کراچی شہر میں اس وقت ایک بھی کچی آبادی نہ ہوتی۔ آخر یہی شہر تھا جسے ۱۹۴۷ تک سوئز کے اس طرف کے علاقے کا سب سے صاف ستھرا شہر کہا جاتا تھا۔ لیکن اگر اس شہر کی منصوبہ بندی پر شروع سے طاقت ور ڈویلپروں، ٹھیکے داروں، لینڈ مافیا، لالچی سیاست دانوں اور اُتنے ہی بدعنوان اور بے کردار سرکاری اہلکاروں کی بالادستی رہی ہوتی تو آج یہ شہر اس سے کہیں زیادہ بُری حالت میں ہوتا۔

کچی آبادیوں کی مستقلی

۱۹۷۵ کے بعد سے کچی آبادیوں کی مستقلی اور بہتری ریاستی پالیسی میں شامل ہے۔ اس سے پہلے حکومت کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ان لوگوں کو ان آبادیوں سے ہٹا کر کہیں اور بنے بنائے مکان فراہم کیے

Scanned with CamScanner

جائیں (جیسا کہ ۶۰-۱۹۵۹ کی کورنگی اسکیم تھی) یا ادھورے تعمیر شدہ مکان مہیا کیے جائیں (جیسا کہ ۱۹۷۰ کی دہائی کے میٹروول پروگرام کا مقصد تھا)۔ لیکن یہ کوششیں ناکام رہیں۔ کچی آبادیوں کی مستقلی کا فیصلہ کرنے کے بعد ابتدا میں میونسپل کارپوریشن کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ کچی آبادیوں کے باشندوں کو لیز اور شہری سہولتیں فراہم کرے۔ لیکن ۱۹۸۷ میں ایک نیا محکمہ سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے نام سے قائم کیا گیا جس کا کام ان تمام کارروائیوں میں ربط پیدا کرنا اور کچی آبادیوں کی مستقلی کے عمل کو تیز کرنا تھا تاکہ اسے پانچ سال کے اندر اندر پورا کیا جاسکے۔

۱۹۸۹ میں کراچی اسپیشل ڈویلپمنٹ پروگرام کے تحت ۲۰۰ کچی آبادیوں کی بہتری کے لیے ۱۳ کروڑ ۶۱ لاکھ ۶۶ ہزار روپے کی رقم فراہم کی گئی۔ یہ رقم ۵ کروڑ ۲۲ لاکھ کی اُس رقم کے علاوہ تھی جو سندھ کے سالانہ ترقیاتی پروگرام کے تحت رکھی گئی تھی۔

لیکن اس سب کے باوجود کچی آبادیوں کی مستقلی اور بہتری کے کام کی رفتار نہایت سست تھی۔ مقامی کاؤنسلوں اور کچی آبادی اتھارٹی کی کارکردگی کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۷۵ سے ۱۹۹۳ تک کے اٹھارہ برسوں میں ۱۲۹۳ غیرقانونی بستیوں میں سے (جنھیں نومبر ۱۹۹۰ تک کچی آبادیوں کا درجہ دیا جاچکا تھا) صرف ۱۳۲ کی بہتری کا کام مکمل ہوا ہے۔ لیز یا جائیداد کی ملکیت کے کاغذات (PEC) فراہم کرنے کا کام بھی اتنا ہی سست ہے۔ کچی آبادیوں کے ۶۱۸،۸۱۵ مکانوں میں سے صرف ۲۹،۲۶۷ مکانوں کو لیز اور ۳۵،۲۲۴ کو پی ای سی مل سکی ہے۔ یہ رفتار ایک فیصد سالانہ سے بھی ذرا کم ہے۔ اس رفتار سے سندھ کی تمام کچی آبادیوں کو بہتر بنانے میں سو سال لگیں گے، بشرطے کہ اس عرصے میں کوئی نئی کچی آبادی وجود میں نہ آئے۔

اپنی ناکارکردگی، نااہلی اور بے بصیرتی کو تسلیم کرنے کے بجائے کچی آبادیوں سے متعلق سرکاری محکموں کے اہلکاروں نے کچی آبادیوں کے باشندوں کے بارے میں کچھ عجیب و غریب اور غلط تصورات پھیلادیے ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) کچی آبادیوں کے باشندے لیز حاصل کرنا ہی نہیں چاہتے۔ چوں کہ حکومت کے اعلان ہی سے ان کو زمین اپنے قبضے میں رکھنے کا غیردستاویزی حق مل جاتا ہے، اس لیے انھیں دستاویزات حاصل کرنے سے کوئی دل چسپی نہیں رہتی۔

(۲) وہ اس قدر غریب ہیں کہ لیز کی رقم ادا نہیں کرسکتے۔ یہ رقم ان کی استطاعت سے باہر ہے۔ اگر اسے کم بھی کردیا جائے تو وہ اتنی بچت نہیں کرسکتے کہ یہ رقم ادا کرسکیں۔

(۳) سرکاری محکموں اور لوکل کاؤنسلوں کے پاس وسائل اتنے کم ہیں کہ وہ تمام آبادیوں کی مستقلی اور بہتری کا کام انجام نہیں دے سکتے۔

ان تصورات کی جانچ کے لیے اکتوبر ۱۹۹۰ میں سندھ کچی آبادی اتھارٹی کی طرف سے لیز جاری کرنے کا ایک چھوٹا سا آزمائشی پروجیکٹ شروع کیا گیا۔ کراچی کی چار، اور حیدرآباد اور سکھر کی دو دو کچی

Scanned with CamScanner

آبادیوں کو اس مقصد سے منتخب کیا گیا۔ اسی طرح ترقیاتی بہتری کے کام کے لیے کراچی اور سکھر کی چند کچی آبادیاں چنی گئیں اور ان آبادیوں کی بیرونی ترقیاتی تعمیر کے سلسلے میں یونیسیف اور اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے تعاون سے کم لاگت کے منصوبے تیار کیے گئے۔

لیز جاری کرنے کا کام شروع کرنے سے پہلے اس بات کی تحقیق کی گئی کہ درخواست گزاروں کو لیز جاری کرنے کی راہ میں کیا رکاوٹیں ہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ ان کو لیز حاصل کرنے کی کوشش سے جو چیز باز رکھتی ہے وہ ان میں دل چسپی یا لیز کی رقم ادا کرنے کی صلاحیت کا فقدان نہیں بلکہ سرخ فیتے کا پیچیدہ طریق کار ہے۔ لیز جاری کرنے کے نظام میں مندرجہ ذیل خامیاں پائی گئیں:

(۱) طریق کار نہایت پیچیدہ اور دشوار ہے۔ درخواست گزار کو اس پورے عمل میں کم از کم دس مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہر مرحلے پر مختلف دفتروں کے کئی چکر لگانے پڑتے ہیں۔ لیز کی منظوری میں دو تین مہینے لگ جاتے ہیں۔ درخواست گزار عموماً روز کی اجرت پر کام کرنے والے لوگ ہوتے ہیں اور اپنا کام چھوڑ چھوڑ کر نہیں آسکتے۔ اور آبادی کی مالی حالت کے لحاظ سے پانچ سو سے دو ہزار روپے تک ان سے مختلف مرحلوں پر مختلف سرکاری اہلکار رشوت کے طور پر مانگتے ہیں۔ بعض صورتوں میں رشوت کی رقم لیز کی سرکاری رقم کے برابر پہنچ جاتی ہے۔

(۲) آبادی میں ترقیاتی کام کا طریق کار نہایت ناقص ہے۔ یہ بہت مہنگا بھی پڑتا ہے کیوں کہ بیشتر صورتوں میں نہ تو پہلے سے موجود ترقیاتی صورت حال کا جائزہ لیا جاتا ہے اور نہ لاگت کم کرنے کے لیے ڈِزائن میں تبدیلی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تعمیری کام ناقص ہوتا ہے کیوں کہ نگرانی نہیں کی جاتی۔

(۳) سڑکوں کو چوڑا کرنے کے لیے غیر ضروری انہدام کیے جاتے ہیں۔ اگر اس سے متاثر ہونے والے باشندوں آبادی کے بیس پچیس فیصد لوگ ہوں تو وہ باقی باشندوں کو لیز کی درخواست نہ دینے پر آمادہ کر لیتے ہیں۔ ان متاثرہ خاندانوں کی رہائش کا متبادل انتظام کرنا بھی بہت دشوار کام ہے۔ عموماً اس مقصد کے لیے زمین موجود ہی نہیں ہوتی۔

ان مشکلات سے نمٹنے کے لیے پورے عمل پر نظر ثانی کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اصل مقصد ناکامی کے اس دائرے کو توڑ کر لیز جاری کرنے کے کام کو تیز کرنا تھا۔ اس کے پیشِ نظر مندرجہ ذیل فیصلے کیے گئے اور انھیں تیزی سے عمل میں لایا گیا:

(۱) کام کو دفتر میں مرکوز رکھنے کا سلسلہ ختم کیا گیا۔ فیصلہ ہوا کہ لوگ درخواستیں لے کر افسروں کے پاس نہ آئیں بلکہ افسر خود ان کے پاس جائیں۔ چناں چہ کچی آبادیوں میں لیز کیمپ لگائے جائیں اور دن بھر کی تمام دفتری کارروائی وہیں کیمپ میں کی جائے۔ چھوٹے موٹے تنازعات لیز ٹیم کا سربراہ موقعے پر ہی آبادی کے باشندوں کے ساتھ مل کر طے کرے۔ صرف بڑے معاملات اور پالیسی پر اثر ڈالنے والے فیصلوں کے لیے ڈائرکٹر جنرل سے رجوع کیا جائے۔

Scanned with CamScanner

(۲) لیز جاری کرنے کے مرحلوں کی تعداد کو کم سے کم کر دیا جائے۔

(۳) تمام طریق کار بالکل شفاف ہو۔ لوگوں کو بینروں، پمفلٹوں اور اعلانوں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی جائیں۔

(۴) آبادی کے باشندوں اور ان کے نمایاں افراد کو لیز کے کام میں شامل کیا جائے۔ وہ ایک کمیٹی بنا کر کام کے مختلف مرحلوں کی نگرانی کریں۔

(۵) انہدام صرف وہاں کیا جائے جہاں ناگزیر ہو کیوں کہ اکثر صورتوں میں یہ نہ صرف غیر ضروری ہوتا ہے بلکہ لوگ اپنے قبضے کا فالتو رقبہ چھوڑنے پر آسانی سے راضی بھی نہیں ہوتے۔

(۶) لیز کی رقم کو آبادی کے باشندوں کی مالی حالت کے مطابق رکھنے کے لیے ہر کچی آبادی کو ایک علیحدہ اکائی کے طور پر دیکھا جائے۔ اس مقصد کے لیے اس سارے ترقیاتی کام کو پیشِ نظر رکھا جائے جو لوکل کاؤنسلیں یا کاؤنسلر اپنے ترقیاتی فنڈ سے وہاں پہلے ہی کر چکے ہیں۔

(۷) ترقیاتی کام کی لاگت کو مزید کم رکھنے کے لیے جہاں کہیں ممکن ہو ڈزائن میں تبدیلی پر غور کیا جائے۔ اس طرح ترقیاتی کام کے لیے رقم کی کمی نہیں ہو گی اور وہ خود کفیل رہ سکے گا، کیوں کہ حکومت نے زمین کی قیمت دس روپے فی مربع گز بہت معقول رکھی ہے۔

(۸) معلوم ہوا کہ آبادی کی مستقلی کا کام شروع کرنے سے پہلے صرف تین چیزوں کی معلومات فراہم ہونا ضروری ہے: (الف) آبادی کا حالیہ نقشہ، (ب) ترقیاتی کام کا نقشہ اور (۳) فیلڈ بک جس میں ہر پلاٹ اور اس کے مالک کے بارے میں درست معلومات درج ہوں۔

لیز کیمپ جوں ہی لگائے گئے وہاں لیز کی درخواستیں دینے اور لیز کی رقم کے چالان جمع کرانے والوں کی بھیڑ لگ گئی۔ آٹھ مہینے سے بھی کم وقت میں سندھ کچی آبادی اتھارٹی اپنی تاریخ میں پہلی بار مالی طور پر خود کفیل ہو گئی۔ اس مختصر مدت میں اس نے لیز کی رقم کی مد میں ۸۹ لاکھ ۶۷ ہزار روپے جمع کیے جو اس کے سال بھر کے بجٹ کے برابر تھے۔ اس آزمائشی پروجیکٹ کے نتائج نے کچی آبادیوں کے باشندوں کے بارے میں تمام غلط تصورات کی نفی کر دی۔

**

عارف حسن

انگریزی سے ترجمہ: افضال احمد سید

سہراب گوٹھ کا انہدام

سہراب گوٹھ میں قتلِ عام ۱۱ دسمبر ۱۹۸۶ کو، علی گڑھ کالونی کے قتل وغارت کے دو دن بعد، شروع ہوا۔ یہ انسانی جانوں کا نہیں بلکہ گھروں، معاشی سرگرمیوں، کمیونٹی تنظیموں، تعلیم اور صحت کے اداروں اور آکاخیل آبادی کی امیدوں اور امنگوں کا قتلِ عام تھا جو یہاں ۱۹۷۲ سے رہتی آئی تھی۔ یہ اپنے طبعی اور معاشرتی ماحول کو بہتر بنانے کی ان کی سولہ سالہ جدوجہد کا قتلِ عام تھا جس پر انھوں سات کروڑ سے زیادہ روپے صرف کیے تھے۔ یہ قتلِ عام، علی گڑھ کالونی کے قتلِ عام کے برخلاف، مافیا کے قاتل گروہوں نے نہیں، بلکہ حکومت پاکستان نے، کچی آبادی کے مکینوں سے کیے ہوئے اپنے وعدوں، عوام کے آئینی حقوق اور ریاستی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، کیا تھا۔

اس قتلِ عام سے ۲۰۰ پاکستانی اور ۱۲۰۰ کے قریب آکاخیل خاندان متاثر ہوئے۔ انھیں بےدخل کر کے سپر ہائی وے پر بنائے گئے تین کیمپوں میں منتقل کیا گیا، جہاں وہ ناداروں کی طرح کھلے آسمان کے نیچے پڑے رہے۔

آکاخیل، کوچی یا پاوندے بھی کہلاتے ہیں۔ تاریخی طور پر یہ وہ خانہ بدوش ہیں جو موسم خزاں میں وسط ایشیائی برفانی میدانوں سے ہندوستان کے میدانی علاقوں کو ہجرت کیا کرتے اور موسم بہار کے اواخر میں وسط ایشیا کو لوٹ جاتے۔ ۱۹۲۰ میں بالشویک حکومت نے ان کی نقل وحرکت ماوراالنہر تک محدود کردی۔ ۱۹۴۷ میں قیامِ پاکستان کے بعد سے ان کے لیے دریائے جہلم عبور کر کے ہندوستان جانا ممکن نہیں رہا۔ ۱۹۶۰ میں حکومتِ پاکستان نے ان کی ڈیورنڈ لائن کے ساتھ نقل وحرکت پر پابندی عائد کر دی، اور اس طرح ان کی بڑی تعداد صوبہ سرحد میں بس گئی اور یہ پاکستانی شہری بن گئے۔

تمام خانہ بدوش گروہوں کی طرح کوچیوں کے پاس بھی کبھی غیر منقولہ جائیداد (مثلاً زمین یا مکانات) نہیں رہی، اور مستقل آباد لوگوں نے، جن کے علاقوں سے ان کی آمدورفت رہی ہے، انھیں ہمیشہ مشکوک سمجھا۔ ان کی چند ذیلی برادریوں کے افراد وسط ایشیا سے اُون لے کر میدانی ہندوستان تک آتے اور واپسی میں سوتی کپڑے لے جاتے۔ ذیلی برادری کے یہ افراد رفتہ رفتہ کپڑے اور گھریلو

Scanned with CamScanner

اشیائے صرف کے فروخت کرنے والے بن گئے اور آج بھی پاکستان کے طول وعرض میں، ان میں سے اکثر گھر گھر گھوم کر اپنی اشیا فروخت کرتے ہیں۔

۱۹۷۱ میں تقریباً ۸۰۰ آکاخیل خاندان پشاور کے کوچی بازار سے اٹھ کر کراچی آ گئے۔ کراچی میں خانہ بدوشوں کے خلاف تعصب صوبہ سرحد کی بہ نسبت کم تھا اور یہاں بہتر معاشی مواقع میسر تھے۔ ابتدا میں انھوں نے ابراہیم حیدری میں ایک خیمہ بستی بنائی مگر ۱۹۷۲ کے اوائل میں وہ اپنے خیموں کو سہراب گوٹھ کے قریب لے گئے جو سپر ہائی وے پر بلوچوں کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ برادری کا ایک بزرگ حاجی فتح خان نے اس مقام کو منتخب کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا، "کوچی ہمیشہ شہر سے دور رہا کرتے ہیں اور اُن دنوں یہ جگہ ایک ویرانہ تھی۔ ابھی نہ گلشن آباد ہوا تھا اور نہ پلازا کھڑے ہوئے تھے۔ یہ جگہ سڑک کے ساتھ تھی اور اس طرح ہم شہر تک اپنی اشیا فروخت کرنے آسانی سے جاسکتے تھے۔"

خیموں کی جگہ بتدریج مٹی کی دیواروں اور چٹائی کی چھتوں نے لے لی۔ پھر مٹی کی دیواروں اور چٹائی کی چھتوں کی جگہ کنکریٹ کے بلاک اور ٹین کی چھتیں آ گئیں۔ ابتدائی چند برسوں تک پانی شاہراہ پاکستان کے واٹر پمپ سے خرید کر گدھا گاڑیوں پر بستی میں لایا جاتا تھا۔ ۱۹۷۸ میں بستی کے مکینوں کی طرف سے ایک کوچی بزرگ حاجی حسن نے حکومت کو پانی کی فراہمی کے لیے درخواست دی۔ ایک سال بعد بلدیاتی اداروں کے انتخابات منعقد ہوئے اور اس بستی کا ایک باشندہ غازہ خان کاؤنسلر بن گیا۔ اس کی کوششوں سے ڈسٹرکٹ کاؤنسل نے سہراب گوٹھ میں، جسے کوچی "حاجی حسن کالونی" کہنا پسند کرتے تھے، ۱۹۸۰ میں پانی کی ایک مین لائن بچھائی۔ مین لائن سے گلیوں یا گھروں تک کنکشن لوگوں نے اپنے اخراجات سے پہنچائے۔ اس سسٹم کی نگہداشت کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ حکام پر بجلی کی فراہمی کے لیے دباؤ ڈالا گیا اور جس وقت دسمبر ۱۹۸۶ میں آبادی کو بے دخل کیا گیا، یہاں تقریباً آدھے سے زیادہ گھروں میں بجلی کے میٹر نصب ہو چکے تھے اور کے ای ایس سی کو بل باقاعدگی سے ادا کیے جارہے تھے۔

جب شہر سپر ہائی وے کی طرف پھیلنے لگا، کوچیوں نے اپنی بستی کو ایک بازار میں تبدیل کر دیا۔ ۱۹۷۸ تک کراچی کے ہر علاقے سے لوگوں نے وہاں جا کر "درآمد شدہ" کپڑے اور کراکری خریدنا شروع کر دیا اور آکاخیل گشت لگا کر چیزیں بیچنے والوں کے بجائے دکان دار بن گئے۔ وہ اللہ والا اور موتن داس مارکیٹ سے پاکستانی کپڑے اور کسٹم اور ایکسائز اہلکاروں سے غیر ملکی کپڑے خریدتے۔ زمان خان، جس نے کالونی میں پہلی دکان قائم کی، یاد کرتے ہوئے کہتا ہے، "ہماری زیادہ تر خریدار ڈیفنس اور کلفٹن کی بیگمات تھیں۔ وہ ہمارے ہاں اس لیے نہیں آتی تھیں کہ ہماری اشیا ارزاں تھیں بلکہ شہر سے سہراب گوٹھ تک آنا ان کے لیے ایک تفریح تھی۔" شہر کے متمول علاقوں سے اس تعلق کی بنا پر آکاخیل لوگوں کی خوش حالی میں نمایاں اضافہ ہوا۔ ان میں بہتوں نے ٹی وی اور موٹر سائیکلیں خرید لیں۔ چند لوگوں نے وی سی آر، سوزوکی پک اپ بلکہ کاریں بھی خریدیں۔

بستی میں متعدد اسکول اور کلینک بھی قائم ہوئے۔ پہلا اسکول زیب خان نے ۱۹۷۶ میں قائم

Scanned with CamScanner

کیا۔ اس میں چھ کلاس روم اور سات ٹیچر تھے۔ یہ ٹیچر غیر پٹھان تھے اور حاجی حسن کالونی سے باہر سے آتے تھے۔ ڈیڑھ سو سے زیادہ آکاخیل بچے، بے دخلی کے وقت، یہاں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ٹیوشن فیس دینے کے علاوہ آکاخیل باشندوں نے اسکول کی عمارت کو پختہ کرانے کے اخراجات بھی برداشت کیے اور کلاس روموں میں پنکھے لگوائے۔ اس علاقے میں چھ اسکول تھے اور اس کے علاوہ ۷۰ سے زیادہ آکاخیل لڑکیاں قریبی آصف اسکوائر کے ایک اسکول میں پڑھ رہی تھیں۔

۱۹۷۱ میں کراچی آنے والے آکاخیل غیر تعلیم یافتہ تھے مگر ان اسکولوں کی وجہ سے ان کے ۱۸ سال سے کم عمر کے تقریباً تمام لڑکے اور بہت سی لڑکیاں روانی سے لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ اپنے بزرگوں کے برخلاف وہ پشتو لب و لہجے کی آمیزش کے بغیر اردو بولتے ہیں۔ اب یہ اسکول ڈھا دیے گئے ہیں اور ۳۲ طالب علم، جنھیں اس سال بورڈ کا امتحان دینا تھا، کراچی سے ۲۷ میل دور ایک ویرانے میں پڑے ہیں۔

کمیونٹی نے ممکنہ بے دخلی کے خلاف جدوجہد شروع کر رکھی تھی۔ ۱۹۷۸ میں انھیں سندھ پبلک پراپرٹی (انسدادِ تجاوزات) ایکٹ ۱۹۷۵ کے تحت نوٹس ملے تھے۔ ان نوٹسوں پر عمل کرانے کی کوشش نہیں کی گئی کیوں کہ، کمیونٹی کے بزرگوں کے مطابق، حکام سے "سمجھوتا" ہو گیا تھا۔ فروری ۱۹۸۳ میں کراچی کے شیعہ سنی فسادات کے دوران شیعہ انچولی اور سنی سہراب گوٹھ میں فائرنگ کا تبادلہ ہوا تھا اور سپر ہائی وے کچھ دیر کے لیے بند ہو گیا تھا۔ اس واقعے کے نتیجے میں اس کمیونٹی کو دوبارہ نوٹس بھیجے گئے جس کے خلاف اس نے عدالت میں اپیل کی۔ گورنر ایس ایم عباسی کی اس یقین دہانی کے ساتھ کہ آکاخیل برادری کو سہراب گوٹھ سے نہیں ہٹایا جائے گا، حکومت سے مذاکرات اختتام کو پہنچے۔ کمیونٹی کے بزرگوں کے مطابق کمشنر سردار احمد نے انھیں ایک خط لکھا تھا جس سے گورنر کی یقین دہانی کی تائید ہوتی تھی۔ یہ خط اب کاؤنسلر غازہ خان کی تحویل میں ہے جسے آپریشن کے شروع ہوتے وقت گرفتار کر لیا گیا تھا۔

۱۹۸۱ میں افغان مہاجر بھی آکاخیل بستی کے قرب و جوار میں آباد ہونے لگے۔ یہ تمام تر فارسی بولنے والے لوگ تھے۔ ان کی اکثریت غریب تھی اور تعمیراتی اور صنعتی مزدوروں کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ چند لوگ ہوٹلوں اور چھوٹے کاروبار کے مالک تھے۔ یہ کچے مکانوں میں رہتے تھے اور اپنا پانی واٹر پمپ سے خود لاتے تھے۔ انھیں دنوں میں دیر، باجوڑ، مردان اور سوات سے آنے والے پٹھان بھی سہراب گوٹھ کے قریب آباد ہو گئے۔ یہ آکاخیل نہیں بلکہ محسود، پشاوری اور مُہمند تھے۔ ان میں بیشتر ٹرانسپورٹر یا ٹرانسپورٹ کے شعبے سے متعلق مزدور تھے۔ اس آخرالذکر بستی میں کئی متموّل ٹرانسپورٹر بھی آباد ہو گئے اور انھوں نے یہاں اپنا کاروبار شروع کیا۔ ان کی آمد سے تازہ پٹھان بستیاں منشیات اور اسلحے کی تجارت کا مرکز بن گئیں اور علاقے کے غریب لوگ ان کے خدمت گزار بن گئے۔ صرف اس ایک سیکٹر کی حرکتوں کی وجہ سے پورا سہراب گوٹھ بدنام ہوا اور اس کے تمام باشندوں کو سزا ملی۔

Scanned with CamScanner

۷ اپریل ۱۹۸۶ کو وزیر اعظم جونیجو نے لاہور میں ایک عظیم الشان جلسے میں کچی آبادیوں کی بابت سرکاری پالیسی کا اعلان کیا۔ جونیجو نے عوام کو بتایا کہ سرکاری زمینوں پر ۲۳ مارچ ۱۹۸۳ سے قبل بننے والی ۴۰ یا اس سے زیادہ مکانوں پر مشتمل تمام کچی آبادیوں کو مستقل کر دیا جائے گا۔ آکا خیل اس اعلان سے بہت خوش ہوئے اور خاص اجتماع میں انھوں نے وزیر اعظم کے حق میں دعائیں مانگیں۔ جونیجو کے ۷ اپریل ۱۹۸۶ کے اعلان اور اس کے بعد کراچی کے میئر کے بیان کے نتیجے میں آکا خیل علاقے میں زبردست تعمیراتی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ ٹین کی چھتیں اکھاڑ دی گئیں اور ان کی جگہ کنکریٹ کی چھتیں پڑیں، دیواروں پر پلاسٹر ہوئے، مٹی کے فرش کی جگہ موزائیک فرش بنے، کنکریٹ کی جالیوں کی جگہ اسٹیل اور شیشے کی کھڑکیاں لگیں۔ دکانوں میں اسٹیل کے شٹر لگنے لگے اور لوگوں نے پانی کے نکاس اور گلیوں کو پختہ بنانے کے پروگرام شروع کیے۔ جن گھروں میں بجلی نہیں تھی انھوں نے کارپوریشن کو بجلی کے کنکشن کے لیے درخواستیں دیں۔ لوگوں نے اپنی پونجی اپنے مکانوں اور ماحول کو بہتر کرنے میں لگا دی۔ گلرنگ خان نے اپنے اس مکان پر ڈیڑھ لاکھ روپے صرف کیے تھے جس پر بلڈوزر چلا دیے گئے۔ اس رقم میں سے ۹۰ ہزار روپے اس نے ایک "سودخود" سے حاصل کیے تھے۔ اسے یہ رقم بمع سود ادا کرنی ہوگی۔ عیسیٰ خان نے اپنے مکان کی چھت اور فرش پر ۶۰ ہزار روپے صرف کیے تھے اور شیر آغا خان نے اپنی قیمتی اشیا فروخت کر کے اپنے مکان اور دکان کو ٹھیک کرایا تھا۔ یہ سب کچھ اور اس کے علاوہ ان افراد کا جذباتی تعلق جو اس آبادی کے ساتھ قائم تھا، دسمبر ۱۹۸۶ کے تیسرے ہفتے میں فوج کے تحفظ میں کے ڈی اے کے بُل ڈوزروں نے خاک میں ملا دیا۔

۱۲ دسمبر ۱۹۸۶ کی صبح سہراب گوٹھ کے لوگوں نے جاگتے ہی یہ دیکھا کہ ان کی آبادی کو فوج نے گھیر لیا ہے اور قریبی پلازوں کی چھتوں پر پوزیشن لیے جوانوں کی بندوقوں کا رخ ان کی طرف ہے۔ مسجد سے کیے جانے والے اعلان سے انھیں پتا چلا کہ وہ کرفیو میں ہیں۔ تھوڑی دیر بعد پولیس نے ان کے گھروں کی تلاشیاں لینی شروع کر دیں۔ انھیں تلاشی کا کوئی وارنٹ نہیں دکھایا گیا جو کہ ضابطہ فوجداری کے تحت لازمی ہے۔ اس تلاشی کے آپریشن کی تفصیل، جو وہاں کے باشندوں نے بیان کی، سندھ میں ڈاکوؤں کے خلاف ہونے والے آپریشن سے ملتی جلتی ہے۔ پولیس زیورات، نقدی اور تمام قیمتی اشیا چھین کر لے گئی۔ لائسنس یافتہ بندوقیں لائسنس سمیت ضبط کر لی گئیں اور ان کی کوئی رسید نہیں دی گئی۔ شناختی کارڈ اور کئی گھروں سے بجلی کے کنکشن کے کاغذات اور موٹر سائیکلوں اور سوزوکیوں کی رجسٹریشن کے کاغذات بھی چھین لیے گئے۔ ان میں سے کئی گاڑیاں کہا جاتا ہے کہ گلزار ہجری تھانے میں موجود ہیں۔ بعض قیمتی اشیا بھی جو پولیس افسروں نے اپنے جوانوں سے بازیاب کی تھیں، تھانے میں ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ لوٹ کے خلاف احتجاج کرنے پر ان کو زدوکوب کیا۔ آکا خیل علاقے میں تلاشی کا عمل ۷۲ گھنٹوں تک جاری رہا جس کے دوران لوگ کرفیو کے باعث فاقے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے بعد بل ڈوزروں سے مکانوں کو گرانے کا کام شروع ہوا۔ مسجد سے اعلان ہوا تھا کہ صرف سڑک کے کنارے کے مکانات

Scanned with CamScanner

گرائے جائیں گے اور لوگوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر اپنا سامان ہٹالیں۔ بائی وے کے قریب کے علاقے کو اس طرح صاف کرنے کے بعد دوسرے علاقوں کو بل ڈوز کرنے کا آغاز ہوا۔ صرف ایک گھنٹے میں لوگوں کو اپنے اسباب کو بچانے کا بہت کم موقع ملا اور نتیجتاً دروازوں، کھڑکیوں، چھتوں کی دھات کی شیٹوں، نلکوں جیسی ہٹائے جانے کے قابل چیزیں بھی دیواروں اور چھتوں کے ساتھ تباہ ہو گئیں۔ آپریشن کے دوران جانی نقصان بھی ہوا۔ عنایت ولد طہراب خان وقت پر گھر سے نہیں نکل سکا اور ایک گرتی ہوئی دیوار کے نیچے دب کر مر گیا۔ انظار گل کی ٹانگ اپنے ڈھیتے ہوئے گھر سے اسباب نکالتے ہوئے ٹوٹ گئی۔ ۷۰ سالہ آئین خان ٹرانزٹ کیمپ تک لے جائے جانے کے انتظار میں سردی سے اکڑ کر مر گیا۔

یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ آکاخیل اور دوسرے پاکستانی پٹھانوں کو ان کی حتمی منزل تک، جس کا انھیں کوئی علم نہیں تھا، لے جانے سے پہلے انھیں سپر ہائی وے پر واقع معمار کمپلیکس میں ٹھہرایا جائے گا۔ غیر آکاخیل آبادی کے رشتے دار اور برداری والے کراچی کی دوسری آبادیوں میں یا صوبۂ سرحد میں موجود تھے۔ انھوں نے معمار کمپلیکس کے ٹرانزٹ کیمپ میں نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک آکاخیل بزرگ محمد گل کا کہنا ہے، "ان میں سے زیادہ تر لوگ صوبۂ سرحد میں اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ باقی لوگ جن کے بیوی بچے نہیں تھے، کراچی میں اپنی برادری والوں کے پاس چلے گئے۔ مگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارا پورا خاندان ہمارے ساتھ ہے اور کراچی میں ہماری برداری کے لوگ نہیں اور نہ ہی سرحد میں ہمارا گھر ہے۔"

۲۲ دسمبر کو آپریشن کے آغاز کے دس دن بعد، آکاخیل سپر ہائی وے پر ٹول پلازا کے نزدیک تین کیمپوں میں منتقل کر دیے گئے۔ انھیں رہنے کے لیے خیمے فراہم کیے گئے تھے جو انھیں خود گاڑنے پڑے۔ خیمے کم پڑ گئے اور ایک کیمپ میں سو سے زیادہ خاندان کھلے آسمان کے نیچے پڑے رہے۔ شروع کے تین دنوں تک انھیں پڑوس کے فارم سے پانی کی بھیک مانگنی پڑی۔ چوتھے دن سے حکومت نے ہر کیمپ کو یومیہ پانی کے ٹینکر پہنچانے شروع کیے۔ ایک واٹر ٹینکر ڈرائیور محمد الیاس کہتا ہے، "پانی بہت ہے، مگر ان کے پاس پانی رکھنے کے لیے برتن نہیں ہیں اس لیے میں زیادہ تر پانی واپس لے جاتا ہوں۔ ان کو ایک بڑے ٹینک کی ضرورت ہے جیسا اقوام متحدہ نے افغانیوں کو دیا ہے۔" یہ لوگ صرف اتنا پانی ذخیرہ کر سکتے ہیں جو پینے اور کھانا پکانے کے لیے کافی ہو۔

حکومت نے آکاخیل کو ان کے کیمپ کے نزدیک ۶۰ مربع گز کے پلاٹ دیے جن کی قیمت نو ہزار روپے فی پلاٹ انھیں تین اقساط میں ادا کرنی ہو گی۔ پانی، بجلی اور ٹرانسپورٹ کی سہولتیں اس ویرانے میں مستقبل قریب میں مہیا نہیں ہوں گی۔ اس کے علاوہ کیمپ سپر ہائی وے سے بہت اندر ہے اور وہاں تک کوئی پختہ سڑک نہیں جاتی۔ انھیں کوئی کاروباری پلاٹ فراہم نہیں کیا گیا ہے۔ چناں چہ یہ لوگ اپنا کاروبار اس مقام سے جاری نہیں رکھ سکیں گے۔ ۳۷ سالہ زیب خان کہتا ہے، "یہاں کوئی روزگار

Scanned with CamScanner

نہیں ہے۔ ہم فاقے سے مر جائیں گے۔ ہم اپنے بچائے ہوئے پیسے خرچ کر رہے ہیں اور صرف قریب کے فارم سے مولیاں لے کر کھا رہے ہیں۔" ان کیمپوں میں رہنے والے لوگوں کو کوئی امداد نہیں ملی۔ صرف ابتدا میں ایدھی ٹرسٹ نے چند سو آٹے کی بوریاں دی تھیں۔ کھانے پکانے کے لیے چولھوں کی قلت ہے اور جلانے کا تیل تقریباً نہیں ہے۔

"کسی کو ہماری فکر نہیں۔ ہمیں ہیروئن اور اسلحے کے اسمگلروں کے ساتھ ملوث کر دیا گیا ہے۔ ہماری تذلیل کی گئی، ہمیں ختم کر دیا گیا اور فراموش کر دیا گیا۔ ہمیں پاکستان چھوڑ دینا چاہیے اور ہندوستان یا روس چلے جانا چاہیے،" حاجی فتح خان کہتا ہے۔ "ہمیں ان جرائم کی سزا دی گئی ہے جو ہم نے نہیں کیے تھے،" بنارس خان کہتا ہے، جو پٹھان کالونی میں ایک دوست کے گھر منتقل ہو گیا ہے۔ "حکومت کو علم ہے کہ اسمگلر کون ہیں۔ حکومت کے اہلکار ان کے ڈیروں میں عیاشیاں کرتے تھے اور پارٹیاں دیتے تھے اور بھتا وصول کرتے تھے۔ حکومت کے یہ دلال چوروں کی طرح آپریشن شروع ہونے سے پہلے رات کی تاریکی میں بھاگ گئے۔ انھیں ڈیفنس اور کلفٹن نے پناہ دی، اور اب بھی دے رکھی ہے۔ انھیں ہم نے پناہ نہیں دی۔"

سہراب گوٹھ کو کامیابی سے ڈھا دیا گیا اور وزیر اعلیٰ نے وعدہ کیا کہ اسے ایک خوبصورت پارک میں تبدیل کر دیا جائے گا جو غالباً "خیر کی شر پر فتح" کی علامت ہو گا۔ مگر اس کچی آبادی کو ڈھانے کے طریقِ عمل سے اہم قانونی اور اخلاقی سوالات پیدا ہوتے ہیں، جنھیں نظر انداز کرنے کا مطلب، اور باتوں کے علاوہ، پاکستانی آئین کے آرٹیکل ۱۴ کی خلاف ورزی کی حمایت اور حوصلہ افزائی ہو گا جس میں درج ہے کہ انسان کی عزتِ نفس اور اس کے گھر کی حدود واجب الاحترام ہوں گی۔

پولیس کا کسی گھر میں داخل ہونے کا اختیار واضح طور پر ضابطۂ فوجداری میں متعین کر دیا گیا ہے۔ "سرچ وارنٹ جاری کیے بغیر کوئی تلاشی نہیں لی جا سکتی،" کراچی کے ایک ممتاز بیرسٹر کا کہنا ہے۔ "اس کے علاوہ تلاشی کے دوران علاقے کے کم از کم دو معززین کی موجودگی لازمی ہے۔" حتیٰ کہ اگر تلاشی کسٹم ایکٹ ۱۹۶۹ کے تحت لی جا رہی ہو، تب بھی ضابطے کی ان شرائط کو پورا کرنا لازمی ہے۔

کوچیوں کے گھروں کی بغیر وارنٹ تلاشی لینے کا دفاع کرتے ہوئے پولیس کے کئی اعلیٰ عہدے داروں کی دلیل ہے کہ اگر تلاشی اسلحے، منشیات اور سمگل کیے ہوئے سامان کے لیے لی جائے تو سرچ وارنٹ کی شرط نظر انداز کی جا سکتی ہے۔ مگر پنجاب ہائی کورٹ نے ۱۹۸۱ میں مقدمہ شوکت حسین بنام ذوالفقار علی میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ "قانون پولیس کا اسمگل شدہ سامان کی تلاشی کے لیے نجی املاک میں داخل ہونے کا کوئی عام حق تسلیم نہیں کرتا۔" حدود آرڈر مارشل لا حکومت نے فروری ۱۹۷۹ میں نافذ کیا تھا۔ آرڈر کے سیکشن ۲۲ میں لکھا ہے، "اگر کوئی کلکٹر، آبکاری افسر یا مجسٹریٹ، اطلاع ملنے پر اور اس تحقیق کے بعد جو اس کے خیال میں لازمی ہو اس بات کا یقین کرنے کی وجوہ رکھتا ہو کہ کوئی جرم سرزد ہوا ہے، تلاشی کے وارنٹ جاری کر سکتا ہے۔" سیکشن ۲۲ اور ۲۷ میں اس امر کی ضمانت موجود

Scanned with CamScanner

ہے کہ ضابطۂ فوجداری اس حالت میں بھی نافذالعمل رہے گا۔ کوچی بزرگوں کے مطابق سہراب گوٹھ کے باشندوں کو کوئی سرچ وارنٹ نہیں دکھایا گیا تھا اور نہ ہی تلاشی علاقے کے دو یا اس سے زیادہ معززین کی موجودگی میں لی گئی تھی۔ اگر یہ درست ہے تو تلاشی کا آپریشن غیر قانونی ٹھہرتا ہے۔

سندھ میں کچی آبادیاں صرف سندھ پبلک پراپرٹی ایکٹ ۱۹۷۵ کے تحت ہٹائی جاسکتی ہیں۔ اس ایکٹ کے سیکشن ۳ کے تحت لازمی ہے کہ ناجائز تجاوزات کے باشندوں کو کم از کم تین دن کا نوٹس دیا جائے اور انہیں از خود تجاوزات ہٹانے کو کہا جائے۔ سیکشن ۴ کے تحت متاثرہ افراد کو متعلقہ حکام کو نوٹس پر نظرثانی کرنے کی درخواست دینے کا حق ہے۔ حکومت طاقت کے ذریعے بے دخل کرنے کی کارروائی صرف سیکشن ۳ کے تحت دیے گئے نوٹس یا اس پر نظرثانی کی درخواست کے سات دنوں کے بعد کر سکتی ہے۔ سہراب گوٹھ کے باشندوں کے مطابق ان کی بے دخلی اور ان کی املاک پر بلڈوز چلائے جانے سے پہلے انہیں کوئی نوٹس نہیں دیا گیا تھا۔ پاکستان کے آئین کے آرٹیکل ۴ کے تحت تمام شہریوں کو قانون کے مطابق سلوک کا حق ہے۔ سب سیکشن ۲ (الف) کے تحت کسی بھی شخص کی جان ومال کے خلاف کوئی غیر قانونی قدم نہیں اٹھایا جاسکتا۔ آئین میں کہیں نہیں لکھا ہے کہ جن لوگوں پر منشیات کے اسمگر ہونے کا الزام لگایا گیا ہو ان سے یا ان ملزموں کے قرب وجوار میں رہنے والے افراد کے ساتھ آئین کے خلاف سلوک کیا جائے۔

حکومت سندھ کے لیے قانون کے برخلاف آپریشن کلین اپ کس طرح ممکن ہوا اور کیوں اس کی کوئی گرفت نہیں ہوئی؟ "یہ حقیقت ہے کہ سہراب گوٹھ میں اسمگلر اور بدمعاش بھی تھے، مگر اخباروں نے یہ تاثر دیا جیسے وہاں صرف جرائم پیشہ لوگ رہتے ہیں، تاکہ لوگوں کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ نہ ہوں،" فتح خان کہتا ہے۔ "ہمیں یقین ہے کہ یہاں تشدد کے واقعات جان بوجھ کر کرائے گئے تھے تاکہ حکام کے لیے ہمیں بے دخل کرنا آسان ہو جائے۔ ہم تجارت پیشہ لوگ ہیں اور ہمارا روزگار تمام طبقوں کے ساتھ اچھے تعلقات پر منحصر ہے۔ "مگر حکومت کیوں سہراب گوٹھ کو ختم کرنا چاہتی تھی؟" جواب بہت آسان ہے۔ سہراب گوٹھ سے متصل زمینیں بااثر افراد کی ملکیت ہیں۔ یہ زمینیں بہت قیمتی ہیں،" میر احمد خان کہتا ہے۔ "اگر ان زمینوں کے پاس سے غریب لوگوں کی کالونی ہٹادی جائے تو ان کی قیمت سو گنا ہو جائے گی۔"

سپر ہائی وے پر سہراب گوٹھ سے ٹول پلازا تک کے ڈی اے نے اسکیم ۳۳ کے ایک حصے کے طور پر ۲۶ ہزار ایکڑ زمین تقریباً ۱۵۰ ہاؤسنگ سوسائٹیوں کو الاٹ کی ہے۔ اس میں تقریباً ۷۰ ہزار پلاٹ نکالے گئے ہیں۔ زیادہ تر سوسائٹیاں اور پلاٹ، براہ راست یا بالواسطہ، کراچی کے ڈویلپروں کے تسلط میں ہیں۔ اسٹیٹ ایجنسیوں کا کہنا ہے کہ سہراب گوٹھ کے آپریشن کے خاتمے کے بعد بڑی تعداد میں لوگوں نے ان پلاٹوں میں دلچسپی لینی شروع کی ہے اور قیمتوں کا آئندہ چند مہینوں میں کم از کم ۲۵ فیصد چڑھ جانا لازمی ہے۔ اگر زمین کی قیمت میں ۱۵ فیصد بھی اضافہ ہوتا ہے تو یہ رقم ۴۰ کروڑ روپے سے زیادہ ہو

Scanned with CamScanner

گی۔

کے ڈی اے کی معروف گلزار ہجری اسکیم سپر ہائی وے پر واقع ہے۔ اس کے ۱۴۰۰ ایکڑ رقبے پر دوسری تعمیرات کے علاوہ وسیع کثیر منزلہ عمارتیں اور رہائشی کمپلیکس بنیں گے۔ مقامی حکام جو بیشتر صورتوں میں طاقتور مفادی گروہوں کے خدمت گزار ہیں، اعلیٰ رہائشی علاقوں یا پسندیدہ اسکیموں تک جانے والی سڑکوں پر واقع نچلی آمدنی والے علاقوں سے ناخوش ہیں۔ کراچی میں اس طرح کچی آبادیوں کو ہٹانے کی کوششیں پہلے بھی کی جا چکی ہیں۔ اس تناظر میں سہراب گوٹھ کا قتلِ عام بامعنی ہو جاتا ہے۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر یہ آبادی کہیں اور واقع ہوتی تو کوئی آپریشن کلین اپ نہ کیا جاتا۔

اسٹیٹ ایجنسیوں کا کہنا ہے کہ اگر کوچیوں کو بائی وے سے اور زیادہ دور بسایا جاتا تو زمینوں کی قیمتیں اس سے بھی زیادہ بڑھ جاتیں۔ اگر یہ درست ہے تو ممکن ہے کہ ان کے لیے حالات اتنے دشوار بنا دیے جائیں کہ وہ دوبارہ نقل مکانی پر مجبور ہو جائیں یا دوسری صورت میں حکومت ان کی موجودہ بستی کو عارضی قرار دے کر ان کو کہیں اور بسانے کا منصوبہ بنائے۔ ان کی حتمی منزل جہاں بھی ہو، یہ حقیقت واضح ہے کہ حکومت نے کوچی آبادی اور سہراب گوٹھ کے دوسرے باشندوں کے ساتھ سخت بے انصافی کی ہے۔

**

Scanned with CamScanner

کینتھ فرنانڈیز

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

بے دخلی اور بے گھری

کراچی کی متعدد پرانی کچی آبادیوں کو ڈھانے کے لیے بُل ڈوزر ایک مرتبہ پھر حرکت میں آ گئے ہیں۔ انہدام اور بے دخلی کی اس حالیہ لہر سے پیدا ہونے والے ملبے میں ہزاروں تباہ شدہ زندگیوں کی، نظرانداز یا بے اثر کر دیے گئے قوانین کی، اور لالچ اور تشدد کی کہانیاں دفن ہیں۔ زیادہ تر سرکاری محکموں اور عام لوگوں کی نظر میں کچی آبادیاں "غیر قانونی بستیوں" سے زیادہ کچھ نہیں ہیں، اور قانونی اصطلاح میں بلاشبہ ایسا ہی ہے۔ لیکن انھیں ایک اعتبار سے جائز سمجھا جانا چاہیے، کیوں کہ ریاست اپنی اس ذمے داری کو پورا کرنے میں ناکام ہو چکی ہے کہ ہر شہری کو سر چھپانے کی مناسب جگہ جائز طور پر فراہم کرے۔ انتظامیہ کی اس ناکامی کے بعد شہر کے غریب باشندوں کے پاس اس کے سوا کوئی راستا نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنے اس مسئلے کا اپنے طور پر کوئی حل تلاش کریں۔

کسی خوش حال علاقے کے بیچوں بیچ قائم کچی آبادی سے اس علاقے کی زمین اور مکانوں کی قیمت کم ہو جاتی ہے۔ کراچی کو "خوب صورت بنانے" اور زمین کی قیمت کو کم ہونے سے بچانے یا بڑھانے کے مقصد سے کچی آبادیاں، مختصر نوٹس پر یا کسی نوٹس کے بغیر، مسمار کر دی جاتی ہیں اور ان کے مکینوں کو بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ بیش تر صورتوں میں انھیں شہر کے دور دراز کنارے پر پھینک دیا جاتا ہے۔ ماضی قریب میں ہونے والی بے دخلیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا محرک صرف شہر کی زیبائش نہیں ہے۔ اس عمل کا ایک اہم عنصر غیر قانونی طور پر قبضہ کی گئی زمین کو خالی کروا کے مالی منافع حاصل کرنا ہے کیوں کہ اس زمین کی قیمت پچھلے چند برسوں میں خاصی بڑھ چکی ہے۔ اسے غیر قانونی قبضے سے آزاد کرا کر بہت بڑے منافعے پر تجارتی ڈویلپرز کے ہاتھ فروخت کیا جا سکتا ہے جو اس پر عالی شان مکان اور فلیٹ یا شاپنگ سنٹر تعمیر کریں گے۔ اس پس منظر میں یہ سمجھنا بالکل آسان ہے کہ کچی آبادیوں کو خوش حالی اور ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ کیوں قرار دیا جاتا ہے۔

***

Scanned with CamScanner

کراچی میں کچی آبادیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا سبب شہر میں آنے والی مہاجرت کی دو بڑی لہریں ہیں ـــ پاکستان کے قیام کے وقت ہندوستان سے بہت بڑی تعداد میں آنے والے مہاجر، اور روزگار کی تلاش میں بہت بڑی تعداد میں کراچی آنے والے ملک کے شمالی علاقوں کے باشندے۔ کراچی کی آبادی، جو ۱۹۴۷ میں پانچ لاکھ سے کم تھی، ۱۹۹۱ میں ایک کروڑ تک جا پہنچی۔ شہر کی آبادی میں اس کثیر اضافے نے رہائش کے بے پناہ مسائل پیدا کیے جو اب تک موجود ہیں۔

کراچی میں آنے والے بیشتر لوگ کم آمدنی والے طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور معاشی بہتری کی تلاش میں یہاں آتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس قانونی طور پر رہائش اختیار کرنے یا قانونی طور پر ڈویلپ کیے ہوئے پلاٹ خریدنے کے لیے نہ تو رقم ہوتی ہے اور نہ اُنھیں ایسا کوئی موقع ملتا ہے۔ سرکاری طور پر ڈویلپ کی گئی منصوبہ بند آبادیوں میں جگہ پانے میں ناکام رہ کر وہ خالی زمینوں پر آباد ہو جاتے ہیں (عموماً یہ زمین سرکاری ملکیت ہوتی ہے) اور متعلقہ حکام سے اجازت حاصل کیے بغیر اپنے رہنے کی جگہ تعمیر کر لیتے ہیں۔ ڈویلپمنٹ یا امپروومنٹ کے محکموں کی اصطلاح میں ان آبادیوں کو "سب اسٹینڈرڈ علاقے" اور عام زبان میں "کچی آبادیاں" کہا جاتا ہے۔

کراچی میں ایک تخمینے کے مطابق اس وقت ۵۵۰ کچی آبادیاں ہیں، اور ان آبادیوں میں شہر کے ۴۱ فیصد لوگ رہتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کچی آبادیاں سرکاری زمینوں پر قائم ہیں جن پر لوگوں نے "جائیداد کے قانونی حقوق" حاصل کیے بغیر اپنے مکان بنا لیے ہیں۔ برسوں کے عمل میں ان آبادیوں کے مکینوں نے اپنی کوششوں کے بل پر ان علاقوں کی حالت میں رفتہ رفتہ بہتری پیدا کی ہے اور بجلی، گیس اور دوسری سہولتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کے گھروں نے بھی بتدریج کچی جھونپڑیوں سے نیم پختہ یا پکے مکانوں کی صورت اختیار کی ہے۔

شہری آبادی میں تیز رفتار اضافے کے دباؤ کے باعث زمین کے خالی پلاٹوں کی قیمت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ زمینیں، جن میں سے بعض پر کچی آبادیاں ۲۵ سال سے قائم ہیں، اتنی بیش قیمت ہیں کہ انھیں خالی کرانے کے لیے ہر قسم کے حربے کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ غیر قانونی طور پر قبضہ کی گئی زمین کو خالی کرانے کی کوشش میں حکام ان آبادیوں کے مکینوں کی ضروریات اور حقوق کو یکسر نظرانداز کر دیتے ہیں اور ان کے ساتھ نہایت غیر انسانی برتاؤ کرتے ہیں؛ اکثر ان لوگوں کو کسی قسم کی امداد دیے بغیر نکال باہر کیا جاتا ہے۔ (اس کی مثال رحمان آباد کے مکینوں کی بے دخلی سے دی جا سکتی ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔) جب کبھی بے دخل کیے جانے والوں کو متبادل پلاٹ دیے بھی جاتے ہیں، انھیں ان کے نقصان کا کوئی مالی معاوضہ نہیں دیا جاتا۔ علاوہ ازیں انھیں اپنے مکانوں اور اپنی زندگیوں کو ازسرِنو تعمیر کرنے کے لیے قرضے کی کوئی سہولت دستیاب نہیں ہوتی۔ ان میں سے جن لوگوں کے پاس قومی شناختی کارڈ نہ ہوں انھیں متبادل پلاٹ ملنے کا بھی کوئی امکان نہیں رہتا۔

Scanned with CamScanner

***

حکومت کو زمینوں پر غیر قانونی قبضے یا کچی آبادیوں کے مسئلے سے نمٹنے کی کوشش کرتے ہوئے ۴۰ سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ شہر بھر میں پھیل جانے والی کچی آبادیوں سے تشویش میں مبتلا ہو کر شہری اداروں نے اپنے قلیل وسائل استعمال کر کے شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی کے رہائش کے مسئلے کا قابلِ عمل حل دریافت کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ کئی بار تحقیق کرائی گئی ہے، منصوبے تیار کیے گئے ہیں اور اس مسئلے کے حل کی کئی اسکیمیں تجویز کی گئی ہیں۔ لیکن یہ تمام کوششیں غیر موزوں ثابت ہوئیں اور شہر کی غریب آبادی کے رہائش کے مسئلے حل نہیں کر سکیں۔

شہر کا بلدیاتی ادارہ کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن (KMC) ہے جس کے اختیارات منتخب بلدیاتی نمائندوں کی کاؤنسل کے ذریعے استعمال ہوتے ہیں۔ دستور کے مطابق ہر چار سال بعد کاؤنسل کے انتخابات ہوتے ہیں جو شہر کے میئر اور ڈپٹی میئر کا انتخاب کرتی ہے۔ لیکن کراچی کی ترقیاتی منصوبہ بندی اور ان منصوبوں کو نافذ کرنے کا اختیار ایک سرکاری محکمے کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی (KDA) کے پاس ہے جسے پیشہ ور ماہرین چلاتے ہیں اور جو عوام کو کسی بھی طرح جواب دہ نہیں ہے۔ کے ڈی اے شہر کے کسی علاقے کا منصوبہ تیار کرتا ہے اور اسے ڈویلپ کرتا ہے، جس کے بعد اس علاقے کو کے ایم سی کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اس انتظامی بندوبست کے تحت کراچی کے شہریوں، خصوصاً غریب باشندوں، کو شہر کے ترقیاتی پھیلاؤ کے فیصلوں میں کوئی براہ راست یا بالواسطہ شمولیت حاصل نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اگر صوبائی حکومت کے خیال میں کارپوریشن اپنا کام درست طرح سے انجام دینے میں ناکام رہے تو ایک سرکاری افسر (بلدیاتی اداروں کے صوبائی سیکرٹری) کو اسے برطرف کر دینے کا اختیار حاصل ہے۔ اس طرح کارپوریشن مکمل طور پر صوبائی حکومت کے رحم و کرم پر ہے اور شہری منصوبہ بندی اور پالیسی سازی میں مقامی شہریوں کا اختیار اور بھی کم ہو جاتا ہے۔

شروع شروع میں یہ خیال کیا گیا کہ شہر کے مرکز میں قائم کچی آبادیوں کو وہاں سے نکال کر شہر سے دور کے علاقوں ـــ کورنگی، لانڈھی اور نیو کراچی ـــ میں منتقل کر دینا کراچی کو ترقی دینے کا بہترین لائحہ عمل ہے۔ ان خطوط پر تیار کیے گئے منصوبے ـــ گریٹر کراچی ری سیٹلمنٹ پلان ـــ کے تحت غریب باشندوں کے لیے تین لاکھ مکان رعایتی قیمت پر تیار کیے جانے تھے، لیکن دس ہزار مکان تعمیر ہونے کے بعد اس منصوبے پر عمل روک دیا گیا۔ جائیداد کی سٹے بازی (speculation) کا رجحان اور اس منصوبے کے لیے ضروری وسائل مہیا کرنے میں حکومت کی ناکامی اس کے اسباب میں شامل تھی۔ لیکن اس منصوبے، اور اس قسم کے دوسرے منصوبوں، کی ناکامی کا سب سے اہم عنصر یہ تھا کہ یہ منصوبہ بندی غریب باشندوں کی زندگی کے حقائق کو سمجھے بغیر کی گئی تھی جن کو فائدہ پہنچانا ہی اس کا اصل

مقصد تھا۔ ان ابتدائی منصوبوں میں غریبوں کے رہنے کے لیے جو علاقے منتخب کیے گئے وہ روزگار کی جگہوں سے بہت دور واقع تھے اور مکانوں کی رعایتی قیمت بھی ان کی استطاعت سے باہر تھی۔ حکومت نے اپنی منصوبہ بندی میں ٹرانسپورٹ اور پانی کی فراہمی کو بالکل نظرانداز کر دیا تھا۔ چناں چہ ان منصوبوں کو ناکام ہونا ہی تھا۔

شہر کو پسماندہ بستیوں (slums) سے پاک کرنے کے سرکاری عزم کا نتیجہ میٹروول پروگرام اور کچی آبادیوں کے مکینوں کے لیے فلیٹوں کی تعمیر جیسی اسکیموں کی صورت میں برآمد ہوا۔ لیکن ان اسکیموں پر آنے والی لاگت اتنی زیادہ تھی کہ یہ غریبوں کے بجائے نسبتاً خوش حال لوگوں کے کام آئیں۔ اس کے علاوہ شہر کے غریب باشندوں کی تعداد میں اضافہ اتنی تیزرفتاری سے ہوا کہ حکومت کے پاس ان سب کو رہائش کی سہولت مہیا کرنے کے لیے نہ تو وسائل تھے اور نہ صلاحیت۔

لیکن ان کچی آبادیوں میں رہنے والوں کی بے پناہ تعداد — جو شہر کی کل آبادی کے نصف کے قریب پہنچ رہی ہے — بجائے خود انھیں ایک طرح کی سیاسی قوت عطا کر دیتی ہے۔ اب ان سب آبادیوں کو بل ڈوزروں سے مسمار کر کے ان کے مکینوں کو بے دخل کر دینا ممکن نہیں رہا۔ کوئی اور چارہ نہ پا کر حکومت اس نسبتاً انسان دوست فیصلے پر مجبور ہو گئی کہ ان آبادیوں کو ریگولرائز (مستقل) کر دیا جائے — یعنی یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ کچی آبادیوں میں رہنے والوں کو مالکانہ حقوق دے دیے جائیں گے اور ان آبادیوں کی حالت میں بہتری پیدا کر کے ان کو انفرااسٹرکچر اور چند بنیادی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

۱۹۷۸ میں مارشل لا کا حکم نمبر ۱۸۳ نافذ کیا گیا جس کے تحت ان تمام آبادیوں کو جو یکم جنوری ۱۹۷۸ تک قائم ہو چکی تھیں، ریگولرائز کیا جانا تھا۔ اس تاریخ کے بعد وجود میں آنے والی آبادیاں غیرقانونی قرار دی گئیں اور انھیں زبردستی مسمار کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ ریگولرائز کی جانے والی آبادیوں میں وہ آبادیاں شامل نہیں تھیں جو بجلی کے ہائی ٹینشن تاروں کے نیچے یا دریائی زمین، رفاہی پلاٹوں یا نجی ملکیت کی زمینوں پر قائم تھیں۔ ان استثنائی شقوں کو بعد میں مفادپرست بلڈروں نے اپنے فائدے میں استعمال کیا اور متعدد ایسی کچی آبادیوں کو بھی مسمار کرا دیا جو مارشل لا کے اس حکم کے تحت قانونی طور پر جائز قرار دیے جانے کی مستحق تھیں۔

کچی آبادیوں کو قانونی حیثیت دینے کے اس اقدام کے باوجود اُسی دور میں حکومت کی جانب سے بے دخلی کی بہت بڑی مہم چلائی گئی۔ پرائیویٹ ڈویلپروں نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا اور سرکاری اہلکاروں کو رشوتیں دے کر نہایت بیش قیمت زمینیں اپنے لیے خالی کروائیں۔ اس عمل کے نتیجے میں بہت سی آبادیاں جنھیں ریگولرائز کیا جانا تھا مسمار کر دی گئیں اور ان کی جگہ عالی شان بنگلے اور کئی منزلہ فلیٹ تعمیر کیے گئے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ حکومت کے جو محکمے غریبوں کا رہائش کا مسئلہ حل کرنے کے مقصد سے قائم

کیے گئے ہیں، اس مقصد کی مکمل نفی کرتے ہوئے در حقیقت غریبوں کے خلاف استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔ اس کی ایک مثال ۱۹۸۰ کی دہائی کے وسط میں کلفٹن میں عبداللہ شاہ غازی کے مزار کے سامنے قائم کچی آبادی کا انہدام ہے جہاں دو سو خاندان مقیم تھے۔ اس آبادی کے مکینوں کو زبردستی بے دخل کیا گیا حالاں کہ یہ لوگ اس آبادی میں دس برس سے زائد عرصے سے رہ رہے تھے اور انھیں مارشل لا کے حکم کے تحت ریگولرائز ہونے کا حق حاصل تھا۔ اس طرح خالی کرائی گئی زمین پر اب چار پُرتعیش بنگلے تعمیر کیے جا چکے ہیں۔ اس قسم کی بے دخلیاں مقامی مکینوں کی زندگیوں کو کس طرح تباہ کر دیتی ہیں اس کی تفصیل آگے پیش کی جائے گی۔

کچی آبادیوں کے مکینوں اور بہت سے گروپوں اور غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) کی طرف سے سخت احتجاج، اور اخباروں میں خبریں شائع ہونے پر انہدام اور بے دخلی کی اس مہم کی رفتار سست کر دی گئی تھی۔ اپریل ۱۹۸۶ میں اُس وقت کے وزیرِاعظم نے اعلان کیا کہ ۲۳ مارچ ۱۹۸۳ تک قائم ہونے والی کچی آبادیوں کو ریگولرائز کیا جائے گا اور ان میں بہتری پیدا کی جائے گی۔ ۱۹۸۶ ہی کے ایک آرڈیننس کے ذریعے سندھ کچی آبادی اتھارٹی (SKAA) قائم کی گئی۔ (اس کے بعد ۱۹۸۷ کا سندھ کچی آبادیز ایکٹ جاری ہوا۔) اس محکمے کو حکومت کی پالیسیوں کے مطابق کچی آبادیوں کو ریگولرائز کرنے اور ان کی حالت بہتر بنانے کا کام سونپا گیا۔ اس کے قیام سے پہلے یہ کام کے ڈی اے کے کچی آبادی ڈائرکٹریٹ کے ذمے تھا۔ تاہم نئے قائم شدہ محکمے نے اعتراف کیا ہے کہ اس کی کارکردگی کی رفتار کچی آبادیوں کی تعداد کے لحاظ سے ایک فیصد سالانہ سے زیادہ نہیں ہے۔

***

کچی آبادیوں میں رہنے والے بیش تر لوگ بہت قلیل وسائل کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ روزگار کے مواقع نہ ہونے کے باعث اپنے گھروں سے نکلنے پر مجبور ہوتے ہیں اور روزی کی تلاش میں کراچی کا رخ کرتے ہیں۔ کئی برس کے عرصے میں یہ لوگ رفتہ رفتہ اپنی مالی حالت کو کسی حد تک بہتر بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں اور اپنی سخت مشقت سے کمائی ہوئی زیادہ تر رقم اپنے مکانوں کو رہنے کے قابل بنانے میں صرف کرتے ہیں۔

سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے مطابق کراچی کی بیشتر کچی آبادیاں ایسی ہیں کہ انھیں ریگولرائز کیا جانا ممکن ہے، لیکن محکمے میں مالی وسائل اور افرادی قوت کی کمی اس عمل میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ مقامی کاؤنسلروں کو اپنے حلقوں میں آنے والی کچی آبادیوں کو مستقل کرنے کا اختیار حاصل ہے، اور جب کبھی ان آبادیوں نے زور پکڑا تو وہ ان کے مطالبوں پر کان دھرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن کچی آبادیوں میں رہنے والوں میں ان مطالبوں پر زیادہ زور دینے کا رجحان نہیں ہے، کیوں کہ کسی کچی آبادی کو

Scanned with CamScanner

ریگولرائز کرنے کا عمل بہت پیچیدہ، سُست رفتار اور مہنگا ہے۔

کچی آبادیوں کے جو مکین مالکانہ حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں انھیں مندرجہ ذیل مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے:

(۱) سب سے پہلے انھیں مقررہ فارم پر درخواست اور مطلوبہ کاغذات داخل کرنے ہوتے ہیں، یعنی علاقے کے کاؤنسلر کا جاری کیا ہوا تصدیق نامہ کہ مذکورہ پلاٹ واقعی درخواست گزار کے قبضے میں ہے، گواہوں کے دستخط، حلف نامہ، قومی شناختی کارڈ کی نقل، پلاٹ کی ملکیت کے بارے میں کسی بیان کے غلط نکلنے کی صورت میں تمام ذمے داری لینے کا اقرارنامہ، دوسری دستاویزات مثلاً راشن کارڈ اور بجلی کے بل جن سے یہ تصدیق ہوتی ہو کہ درخواست گزار واقعی اس پلاٹ پر کافی عرصے سے رہ رہا ہے۔

(۲) اس کے بعد متعلقہ محکمہ ان تمام کاغذات کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔

(۳) موقعے کا معائنہ کر کے پلاٹ کے سائز اور رہائشی استعمال کی تصدیق کی جاتی ہے۔

(۴) پھر سائٹ پلان تیار کیا جاتا ہے اور مقررہ فارم پر اس رقبے کا تخمینہ لگایا جاتا ہے جس کے مالکانہ حقوق دیے جائیں گے۔

(۵) منظورشدہ رقبے سے باہر کی تمام تعمیرات کو درخواست گزار خود مسمار کراتا ہے۔

(۶) تب منظورشدہ نرخ پر لیز حاصل کرنے کے اخراجات کا ڈیمانڈ نوٹ جاری کیا جاتا ہے۔

(۷) درخواست گزار یہ رقم کسی سرکاری بینک میں جمع کراتا ہے۔

(۸) یہ تمام مرحلے پورے ہونے پر مالکانہ حقوق کی دستاویز (لیز ڈیڈ) جاری کی جاتی ہے جس پر درخواست گزار کو رسیدی ٹکٹ لگوانے ہوتے ہیں۔

اس عمل کے مکمل ہونے کے بعد بھی اندراج کے بعد لیز حاصل ہونے میں چار پانچ یا اس سے زیادہ مہینے لگ جاتے ہیں۔ ہر مرحلے پر درخواست گزار کا سابقہ سرکاری اہلکاروں کی بدعنوانی اور دھونس سے پڑتا ہے۔ اس عمل میں اسے پچیس تیس دن لگانے پڑتے ہیں جس کا مطلب کم آمدنی والوں کے لیے اتنے دنوں کی کمائی کا نقصان ہے۔ اس کے علاوہ چار سو سے بارہ سو روپے تک رشوت کی مد میں ادا کرنے پڑتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے سندھ کچی آبادی اتھارٹی نے اس عمل کے مرحلوں کو کم کر دیا ہے اور لوگوں کو اس سے آگاہ کرنے کے لیے تشہیری مہم بھی چلائی ہے۔

اس کے باوجود کچی آبادیوں میں رہنے والے زیادہ تر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ لیز حاصل کرنے کے بجائے بجلی، پانی، نکاس اور ٹیلی فون کی سہولتوں کا مطالبہ کرنا زیادہ آسان، اور شاید زیادہ فائدہ مند ہے۔ ان سہولتوں کے حاصل ہونے سے نہ صرف ان کی زندگی کی مشکلات کم ہو جاتی ہیں بلکہ اس طرح انھیں بے دخلی کے مستقل خطرے سے کسی قدر تحفظ حاصل ہو جاتا ہے۔

رہائش کا عدم تحفظ شہر کے غریب باشندوں کی تشویش کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔ ظاہر ہے کہ لوگ ایسے کسی علاقے کی ترقی پر اپنی کمائی ہوئی رقم خرچ کرنے سے ہچکچاتے ہیں جہاں سے انھیں کسی بھی

Scanned with CamScanner

وقت نکالا جا سکتا ہو۔ نچلی سطح پر حقیقی ترقی صرف سرکاری محکموں کی شراکت اور حوصلہ افزائی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

نچلی سطح پر کام کرنے والی ایک شہری تنظیم "ادارۂ امن و انصاف" ۱۹۸۰ کی دہائی کے آغاز سے کچی آبادیوں کے مکینوں کے حق میں کام کرنے میں مصروف ہے۔ کئی موقعوں پر اس تنظیم نے آبادیوں کو مسمار ہونے سے بچانے کے لیے عدالتوں سے حکم امتناعی حاصل کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے بے دخل کیے جانے والوں کو قانونی اور دیگر مشورے بھی فراہم کیے ہیں۔ اس تنظیم کے علاوہ بعض وکیل انفرادی طور پر بھی بے دخلی کا شکار ہونے والوں کی قانونی امداد کرتے رہے ہیں۔ اس تنظیم اور ان افراد کا کیا ہوا کام قابلِ تعریف ہے، مگر غریبوں کی رہائش کا مسئلہ ایک ایسا موضوع ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں اور گروپوں کی حمایت کی ضرورت ہے۔ رحمان آباد کے انہدام کے خلاف کئی غیر سرکاری تنظیموں، انسانی حقوق کے اداروں اور عورتوں کی انجمنوں نے اخبارات میں سخت بیانات جاری کیے تھے۔ لیکن ان بیانات کے بعد اس آبادی کے تحفظ کے لیے کوئی دیرپا مہم نہ چلائی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسی شہری تنظیم کی غیر موجودگی اور دوسرے حلقوں کی بے حسی کے باعث اس آبادی کو منہدم کر کے یہاں کے مکینوں کو بے دخل کر دیا گیا۔

***

کراچی کے باشندوں کے پانچ گروہ بے دخلی کے خطرے کی مستقل زد میں ہیں:

(۱) وہ لوگ جو رفاہی پلاٹوں اور ماحولیاتی اعتبار سے خطرناک جگہوں پر مقیم ہیں۔ جوں ہی ان زمینوں کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے، پرائیویٹ ڈویلپر انھیں بے دخل کرا دیتے ہیں یا یہ جگہ خرید لیتے ہیں۔

(۲) منظور شدہ کچی آبادیوں میں رہنے والے، جنھیں آبادی کو بہتر بنانے کے عمل میں اپنی جگہ چھوڑنی پڑتی ہے۔

(۳) شہر کے مرکزی علاقوں میں رہنے والے جہاں زمین کی قیمت بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ان میں شہر کے درمیان سے گزرنے والے دریائے لیاری کے دونوں کناروں پر قائم آبادیاں شامل ہیں۔

(۴) اُن علاقوں میں رہنے والے جہاں بڑے بڑے ترقیاتی منصوبے قائم کیے جا رہے ہیں، مثلاً سیلاب سے بچاو کی اسکیمیں یا شاہراہوں کے منصوبے۔

(۵) نسلی اقلیتوں، مثلاً بنگالیوں اور افغانوں، اور مذہبی اقلیتوں، مثلاً عیسائیوں اور ہندوؤں، کی آبادیاں۔

پچھلی دہائی میں بڑے پیمانے پر بے دخلی کی مہمیں بہت زیادہ نہیں چلیں۔ وجہ یہ تھی کہ شہری

Scanned with CamScanner

حکومت کمزور اور اخلاقی جواز سے محروم تھی۔ جوں ہی شہر کے بلدیاتی اداروں کو سیاسی جواز حاصل ہو گا، آبادیوں کے انہدام کا عمل تیز ہو جائے گا۔

بدسلوکی اور توہین سے گزرتے رہنے کے باعث شہر کے غریب باشندے خود پر اور دوسروں پر اعتماد کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ اپنی حالت کو اپنے مقدر کی خرابی قرار دیتے ہیں۔ شہر کے لیے فکرمند افراد اور گروپوں کے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ غریبوں کے اعتماد کو تقویت دینے کی کوشش کریں تاکہ وہ اپنے حقوق اور اپنا وقار حاصل کر سکیں۔ وسیع تر حمایت اور منظم مزاحمت کی غیر موجودگی میں نہ صرف پُرتشدد اور غیر قانونی بے دخلیوں میں اضافہ ہونے کا امکان ہے بلکہ جبر اور تشدد کے اس رجحان کے بھی مزید زور پکڑنے کی توقع ہے کہ کراچی شہر میں صرف ایک قسم کی ترقی ہونی چاہیے جو مال دار اور طاقت ور لوگوں کے فائدے میں ہو۔ کچی آبادیوں میں رہنے والے مردوں اور عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے کوئی قانون موجود نہیں ہے۔ بلکہ اکثر صورتوں میں قانون کو شہر کے غریب باشندوں کو ان کے بنیادی حق ــــ یعنی سر چھپانے کی جگہ ــــ سے محروم کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ بے دخلیوں کو "جائز" ثابت کرنے کے لیے قوانین میں کمزور پہلو تلاش کر لیے جاتے ہیں، غیر قانونی ادائیگیاں کی جاتی ہیں اور یوں ایک اور کچی آبادی کو مسمار کر دیا جاتا ہے۔

***

۱۹۹۲ کے آغاز میں کراچی کے تقریباً دس ہزار باشندے رحمان آباد نامی چھوٹی پُرسکون بستی کے ۸۵۰ مکانوں میں رہ رہے تھے۔ اس بستی کی زندگی کے بائیس برسوں میں ان باشندوں نے اپنی زندگیوں کو ایک ایک اینٹ رکھ کر تعمیر کیا تھا اور قریب کے علاقوں میں روزی کما رہے تھے۔ اچانک، ۲۳ فروری ۱۹۹۲ کو، کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن کے بُل ڈوزر پولیس کی حفاظت میں وہاں آ پہنچے اور انھوں نے پوری بستی کو مسمار کر دیا۔ اس کے بعد ہونے والے واقعات میں بستی کے کئی باشندے ہلاک اور متعدد زخمی ہو گئے اور بہت سوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ بستی کی کئی عورتوں کو جبری زنا کا نشانہ بنائے جانے کی بھی اطلاعات ملیں۔ بستی کے رہنے والوں کی سیدھی سادی زندگیاں اچانک تباہی کا شکار ہو گئیں۔

رحمان آباد فیڈرل بی ایریا بلاک ۵ میں عائشہ منزل کے پیچھے واقع ایک کچی آبادی تھی جس کے اردگرد ۴۰۰، ۶۰۰ اور ۱۰۰۰ مربع گز کے بنگلے تھے۔ رحمان آباد کے مکینوں نے اپنی برسوں کی قلیل آمدنی کو جوڑ جوڑ کر اپنے کچے اور پکے مکان تعمیر کیے تھے۔ ان میں سے اکثر لوگ فیکٹریوں میں روزانہ اُجرت پر کام کرنے والے مزدور، کباڑیوں کے لیے چیزیں اکٹھی کرنے والے اور خوانچہ فروش تھے، اور کچھ عورتیں آس پاس کے بنگلوں میں گھریلو ملازماؤں کے طور پر کام کرتی تھیں۔ وہاں رہنے والے ۸۰

فیصد لوگ بنگالی، اور باقی پنجابی اور پٹھان تھے۔

سندھ کچی آبادی اتھارٹی کی طرف سے جنوری ۱۹۹۲ میں جاری کیے گئے ایک نوٹیفکیشن کے مطابق رحمان آباد کو ۱۹۸۷ کے سندھ کچی آبادیز ایکٹ کے تحت ریگولرائز کیا جانے والا تھا۔ لیکن بستی کے باشندوں کو ان کا قانونی حق ملنے سے پہلے اسے مسمار کر دیا گیا۔ اس سے پچھلے سال مقامی کاؤنسلر، سینیٹر زاہد اختر، جو ایک بااثر بلڈر رکن الدین کا بیٹا ہے، رحمان آباد کے مکینوں کو ہراساں کر کے یہ جگہ چھوڑ دینے پر مجبور کرتا رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے کسی پیشگی نوٹس کے بغیر غنڈوں کی مدد سے رحمان آباد میں داخلے کے پانچوں راستوں پر رکاوٹی دیواریں تعمیر کرا دیں۔ اس طرح رحمان آباد میں داخل ہونے اور نکلنے کے لیے صرف ایک راستا باقی رہ گیا اور وہاں کے باشندے سخت دشواری میں مبتلا ہو گئے۔

جب کاؤنسلر سے کی جانے والی تمام اپیلیں بے اثر ثابت ہوئیں تو رحمان آباد کے باشندوں نے عدالت سے رجوع کیا اور حکمِ امتناعی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کاؤنسلر کی طرف سے ان کی بےدخلی کے حق میں یہ دلیل دی گئی کہ انھوں نے اس زمین پر غیر قانونی قبضہ کر رکھا ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ یہ زمین دراصل ایک رفاہی پلاٹ ہے اور اس پر ایک پارک بنایا جانا تھا۔

فروری ۱۹۹۲ کے شروع میں کاؤنسلر نے رحمان آباد کے رہنے والوں کو زبانی نوٹس دیا کہ زمین خالی کر دیں۔ انھوں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا کیوں کہ ان کے پاس عدالت کا حکم موجود تھا جو ۲۴ فروری ۱۹۹۲ تک موثر تھا۔ تب ضلعے کے ڈپٹی کمشنر نے ان سے ایک دستاویز پر دستخط کرا لیے کہ وہ اپنی مرضی سے یہ زمین چھوڑ کر چلے جائیں گے اور انھیں بدلے میں بلدیہ ٹاؤن شپ میں متبادل پلاٹ دیے جائیں گے۔ لیکن چوں کہ بلدیہ میں پانی اور بجلی جیسی بنیادی سہولتیں موجود نہیں تھیں، اس لیے یہ لوگ قدرتی طور پر وہاں منتقل ہونے میں ہچکچا رہے تھے۔ اس کے علاوہ رحمان آباد کے بیشتر باشندے اردگرد کے علاقے میں کام کرتے تھے اور دوردراز کے علاقے میں منتقل ہونا ان کے لیے سخت دشوار تھا۔

۲۳ فروری ۱۹۹۲ کو، یعنی عدالتی حکم کی میعاد پوری ہونے سے ایک دن پہلے، کے ایم سی کے بُل ڈوزر پولیس کو ساتھ لے کر وہاں آ پہنچے۔ بستی کے غیر مسلح مکینوں پر فائرنگ کی گئی جس سے ایک شخص ہلاک ہو گیا اور کئی لوگ زخمی ہوئے۔ اطلاعات کے مطابق پچیس عورتوں کو اجتماعی زنا بالجبر کا نشانہ بنایا گیا اور پولیس نے گھروں کا قیمتی سامان لُوٹ لیا۔ عدالت میں اپیل کرنے پر حکمِ امتناعی کی میعاد ۲۷ فروری تک بڑھا دی گئی تھی لیکن یہ بےفائدہ تھا کیوں کہ اس میعاد کے ختم ہونے سے پہلے ہی بستی کو مسمار کیا جا چکا تھا۔

انسانی حقوق کے کارکنوں، عورتوں کی انجمنوں اور دوسری مقامی تنظیموں نے اخباروں میں غم و غصے کے بیانات جاری کیے، لیکن ظلم کا نشانہ بننے والے خود معاملے کو آگے بڑھانے میں پُرجوش نہ ہوئے۔ اس کے علاوہ بستی کے مسمار ہو جانے کے بعد رحمان آباد کے سابق مکینوں سے رابطہ قائم کرنا ممکن نہ رہا کیوں کہ وہ شہر بھر میں اپنے رشتےداروں اور دوستوں کے مکانوں میں منتقل ہو گئے تھے۔

Scanned with CamScanner

ان میں سے بعض مکینوں کو کورنگی اور بلدیہ میں ۶۰ مربع گز کے متبادل پلاٹ دیے گئے۔ ساڑھے پانچ سو متاثرہ خاندانوں میں سے صرف چار سو کو متبادل پلاٹ الاٹ کیے گئے۔ باقی لوگوں کے پاس سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ رہی، کیوں کہ پلاٹ حاصل کرنے کے لیے قومی شناختی کارڈ کا ہونا لازمی تھا جس سے یہ لوگ محروم تھے۔ اس اثنا میں خالی کرائی گئی زمین کا صرف ایک حصہ پارک میں تبدیل کیا گیا ہے، جبکہ باقی حصے پر رہائشی پلاٹ بنا دیے گئے ہیں۔

جون ۱۹۹۲ میں کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن کو برطرف کر دیا گیا اور فوج نے شہر میں امن و امان قائم کرنے کی ذمے داری سنبھال لی۔ اس اقدام سے شہر کی انتظامیہ پر مہاجر قومی موومنٹ کی گرفت ختم ہو گئی۔ مقامی کاؤنسلر بھی اسی لسانی تنظیم سے وابستہ تھا اور رحمان آباد سے بے دخل کیے جانے والوں کو محسوس ہوا کہ اب وہ اپنے چھوڑے ہوئے علاقے میں واپس آ سکتے ہیں۔ ان میں سے کچھ نے اس زمین پر جھگیاں ڈال لیں اور رفتہ رفتہ اپنی حالت کو بحال کرنے لگے۔

تب ۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ کو جھگیوں میں آگ لگا دی گئی۔ ساری جھگیاں جل کر راکھ ہو گئیں۔ دو شیر خوار بچے ہلاک اور متعدد لوگ شدید زخمی ہوئے۔ مقامی لوگوں نے آگ لگوانے کا ذمے دار سینیٹر زاہد اختر کو ٹھہرایا۔

کئی غیر سرکاری تنظیموں اور اخبار نویسوں کے دل چسپی لینے کے باعث متاثرہ افراد کو خاصی حمایت حاصل ہوئی۔ معاملہ اب عدالت میں ہے اور متاثرہ خاندان اپنے اس حق کو حاصل کرنے کے لیے قانونی جنگ لڑ رہے ہیں جس کا ان سے سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے نوٹیفکیشن میں وعدہ کیا گیا تھا۔

***

رحیمہ خاتون کہتی ہے: "دیکھو، یہاں کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ نہ پانی ہے نہ بجلی۔ بس تیز ہوا ہے، دھول مٹی اور سامنے سمندر... کوئی ہماری مدد نہیں کرے گا۔ مجھے تو یہ فکر ہے کہ میرے بچے کیا کھائیں گے۔" رحیمہ خاتون جس جگہ کی بات کر رہی ہے وہ کورنگی ہے جہاں اسے اور اس کے خاندان کو منتقل کیا گیا ہے۔ وہ تقسیم ہند کے تقریباً چھ سال بعد کراچی آئی تھی اور تب سے مختلف کچی آبادیوں میں رہتی چلی آئی تھی۔ آخر کار وہ غیر قانونی طور پر فیڈرل بی ایریا میں عائشہ منزل کے پیچھے رحمان آباد کے پاس ہی بس گئی تھی اور رفتہ رفتہ کئی برس کی مدت میں اس نے اپنا مکان پکا کرا لیا تھا۔

"پچھلے سال اگست میں ہمارے علاقے کے کونسلر نے بتایا کہ تمھیں یہاں سے نکلنا پڑے گا۔ ہم نے پوچھا کہ آخر ہم جائیں گے کہاں۔ اس نے کہا کہ فکر مت کرو، میں اس کے بدلے میں پلاٹ دلوا دوں گا۔ کچھ لوگ تیار نہ ہوئے کیوں کہ اس نئی جگہ پر کچھ بھی نہیں تھا۔ اور پھر ہماری روزی کا کیا ہو گا؟ ہمارے کونسلر نے بتایا کہ وہاں پہنچنے کے ایک ہفتے کے اندر اندر ہمیں ساری سہولتیں مل جائیں گی۔ ہمیں اس کی

بات پر شک تھا لیکن ہم کیا کر سکتے تھے؟ ہم غریب لوگ ہیں۔ ہمارے پاس نہ پیسا ہے نہ طاقت۔ ہمارے پاس راستا ہی کیا تھا۔

پھر ۱۶ اگست کو کونسلر پولیس اور بہت سارے آدمیوں کے ساتھ آ گیا اور ہم سے کہا کہ سامان باندھ لو، تمھیں کورنگی لے جا رہے ہیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میرے بچوں کا کیا ہوگا؟ میں ان کو کہاں سے کھلاؤں گی؟ میرے مکان کا کیا بنے گا؟ اور میری نوکری؟

ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اُن لوگوں کے پاس بندوقیں تھیں۔ مرنا کون چاہتا ہے؟ ہم نے اپنا جو تھوڑا بہت سامان تھا سمیٹا اور مکان کی جتنی چیزیں بچائی جا سکتی تھیں بچائیں... سب عورتیں رو رہی تھیں۔ ہم نے ایک ایک پیسا جوڑ کر اتنی مشکلوں سے یہ مکان بنائے تھے اور اب انھیں گرایا جا رہا تھا۔

ہمیں ایک گڑھے میں پلاٹ دیے گئے... یہاں کوئی کیسے مکان بنا سکتا ہے؟ دو مہینے پہلے پانی کی لائن پھٹ گئی تھی تو سارے میں پانی بھر گیا تھا... پلاٹ کی قیمت نو ہزار روپے ہے۔ دو قسطوں میں دینی ہے۔ ساڑھے چار ہزار روپے کہاں سے لائیں؟... ایک سال ہو چکا ہے۔ دو وقت کی روٹی ہی مشکل سے چلتی ہے۔ پیسے بچیں کیسے؟ ہمیں قرضہ بھی کون دے گا؟ ہم سڑک کے دوسری طرف آ پڑے ہیں، یہ جگہ ذرا اونچی ہے۔ مگر یہ بھی عارضی ہے۔

کونسلر نے کہا تھا کہ ایک ہفتے میں ساری سہولتیں مل جائیں گی۔ اب تک صرف پانی کا نل ملا ہے۔ اس میں بھی پانی رات کو دو بجے آتا ہے، صرف دو گھنٹے کے لیے۔ یہاں تین سو گھر ہیں۔ ہمارے حصے میں صرف تین کنستر آتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو بالکل پانی نہیں ملتا۔ اُنھیں بھی اپنے حصے میں سے دینا پڑتا ہے۔

ہم صرف جھگیاں ہی ڈال سکتے ہیں۔ پاخانے نہیں ہیں۔ مردوں کے لیے تو زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ وہ کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ مگر ہم عورتوں کے لیے بڑا مسئلہ ہے۔ یہاں رہنا اس قدر مشکل ہے۔ ہوا اتنی تیز چلتی ہے کہ کبھی کبھی تو جھگیوں کی چھتیں اُڑ جاتی ہیں۔ پھر یہ جگہ شہر سے اتنی دور ہے کہ آنے جانے میں روز کے دس روپے لگتے ہیں۔

عائشہ منزل میں کم از کم ہم شہر میں تو تھے۔ وہاں کام بھی مل جاتا تھا۔ مرد بھی گھر چلانے کے لیے تھوڑا بہت کما لیتے تھے۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ وہاں کچھ لوگوں کی دکانیں تھیں یا چائے کے کھوکھے تھے۔ عورتیں آس پاس کے بنگلوں میں کام کرتی تھیں۔ ہم مہینے میں آٹھ نو سو روپے کما لیتے تھے۔ اب وہاں پہنچنے ہی میں روز کے دس روپے خرچ ہو جاتے ہیں اور مہینے میں پانچ چھ سو روپے بچتے ہیں۔

یہاں مردوں کو دیکھو۔ سب کے سب بے کار بیٹھے ہیں۔ پرانی آبادی میں کچھ لوگ قریب کی ملوں میں کام کرتے تھے، روز کی مزدوری پر۔ کچھ ٹھیلے چلاتے تھے۔ یہاں کہاں ٹھیلا چلائیں؟ خریدنے والا کون ہے؟ سڑک یہاں سے اتنی دور ہے۔ اور پھر مال خریدنے کے لیے بھی تو پیسا چاہیے۔ پیسا کس کے پاس ہے؟ کچھ مردوں نے مچھلیاں پکڑنے کا کام شروع کیا تھا۔ مگر اب مچھلی پکڑنے پر بھی پابندی لگ گئی

ہے۔ ان کی حالت بہت خراب ہے۔
اب عورتوں ہی کو کام کرنا پڑتا ہے۔ کام پر جانے اور واپس آنے ہی میں دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ اگر میں کام نہ کروں تو میرے بچے بھوکے مر جائیں۔ ہر چیز اتنی مہنگی ہو گئی ہے... جو لوگ سب سے زیادہ غریب تھے وہی یہاں آئے۔ جن کے پاس تھوڑا بہت پیسا تھا وہ نہیں آئے۔ انھوں نے موسیٰ کالونی میں یا کہیں اور کرائے پر رہنا شروع کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ کم از کم روزی کی جگہ سے تو قریب رہیں گے۔ اگر ہمارے پاس کچھ پیسے ہوتے تو شاید ہم بھی اپنے کام کی جگہ کے پاس ہی کہیں رہنے لگتے۔ ہماری قسمت ہی خراب ہے۔ نہ کسی کو ہماری پروا ہے نہ کوئی کچھ کرتا ہے ہمارے لیے۔ ہمیں خود ہی پھر سے ایک ایک پیسا جوڑ کر اپنے گھر بنانے پڑیں گے۔

**

یان فاندڑ لنڈن

انگریزی سے ترجمہ اور تلخیص: فہمیدہ ریاض

دلّال آباد

> Herzog was all too aware of the layers upon layers of reality — loathsomeness, arrogance, deceit and then —God help us all!— truth as well.
>
> (Saul Bellow: *Herzog*)

کراچی شہر میں کم آمدنی والے طبقوں کی رہائش کے بندوبست کا اہم ترین حصہ زمین کی غیر قانونی پلاٹ بندی اور فروخت پر مبنی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس غیر رسمی نظام نے بے حد اہمیت حاصل کرلی ہے، اور لوگوں کے (غیر منظم طور پر) زمین پر جھگی ڈال کر بیٹھ جانے کے طریقے کو قریب قریب ختم کردیا ہے۔ اس نظام کے تحت وجود میں آنے والی کچی آبادیوں میں مندرجہ ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں:

-- یہ آبادیاں شہر کے بیرونی کناروں پر بنائی جاتی ہیں۔

-- منظم طور پر بنائے جانے کے باعث ان آبادیاں کا نقشہ بہتر ہوتا ہے اور پلاٹ کا رقبہ کسی قدر بڑا ہوتا ہے۔

-- ان کو ڈویلپ کرنے والے شخص کے اثرورسوخ کے باعث یہاں آکر آباد ہونے والوں کے لیے بے دخلی کا خطرہ نسبتاً کم ہوتا ہے گو کہ ان کے پاس ملکیت کا کوئی کاغذی ثبوت موجود نہیں ہوتا۔

-- نقشے کے بہتر ہونے اور بے دخلی سے قدرے محفوظ ہونے کے باعث یہ آبادیاں کم آمدنی والے طبقوں کے لیے رہنے کی پُرکشش جگہیں بن جاتی ہیں۔ لیکن شہر سے اور روزگار کی جگہوں سے دور واقع ہونے کے باعث ٹرانسپورٹ کے اخراجات زیادہ ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں کسی زمین پر جھگی ڈال کر بیٹھ جانے کے برعکس ان آبادیوں میں پلاٹ خریدنا پڑتا ہے۔ ان تمام اسباب کا نتیجہ یہ ہے کہ ان آبادیوں میں آکر بسنے والے شہر کے غریب ترین لوگ نہیں بلکہ ان سے ذرا بہتر مالی حالت والے ہوتے ہیں۔

-- اس آخری خصوصیت اور بے دخلی سے تحفظ اور بہتر ابتدائی منصوبہ بندی کے باعث ان

Scanned with CamScanner

آبادیوں کے انفرادی مکانوں میں ڈویلپمنٹ کی سطح نسبتاً بہتر ہوتی ہے۔
دنیا کے دوسرے بڑے شہروں کے برخلاف، کراچی میں یہ آبادیاں قائم کرنے والے لوگ سرکاری زمین پر قبضہ کر کے ان کی پلاٹ بندی اور فروخت کا کام کرتے ہیں۔ اس لیے کراچی کی ان آبادیوں، اور ان کے قائم ہونے کے نظام، کا مطالعہ نہایت کارآمد ہو سکتا ہے۔ اس مضمون میں مَیں نے کراچی کی ایک ایسی ہی غیر قانونی آبادی کے قیام کی کچھ تفصیلات پیش کی ہیں۔ ایک غیر قانونی طور پر چلنے والے نظام کے بارے میں جمع کی گئی تفصیلات بعض اوقات ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں۔ لیکن اس نظام کے مختلف کرداروں سے بات چیت کر کے میں ان تفصیلات کو معقول حد تک درستی کے ساتھ متعین کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ جہاں کہیں ضروری تھا، میں نے کرداروں کے اصل نام بدل دیے ہیں اور اس آبادی کا نام اور اس کے بارے میں بھی بعض کم اہم تفصیلات تبدیل کر دی ہیں تاکہ اسے پہچانا نہ جا سکے۔

پس منظر

کراچی کے شمال مغرب میں واقع علاقے اورنگی میں زمین کی غیر قانونی پلاٹ بندی اور تقسیم کا کام ۱۹۶۹ سے جاری ہے۔ اورنگی کا علاقہ بیشتر بنجر زمین اور پہاڑیوں پر مشتمل ہے اور پہاڑیوں کی قطاروں کے بیچ میں کہیں کہیں وسیع وادیاں ہیں۔ ۱۹۶۵ کے بعد سے کے ڈی اے نے اورنگی کے تین حصوں میں "پلاٹ اونرشپ اسکیمیں" شروع کیں جن میں مکان بنانے کی جگہ اور کچھ سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں، اگرچہ شروع شروع میں وہاں کسی قسم کی سہولت دستیاب نہ تھی۔ ان اسکیموں کے شروع ہونے کے بعد جلد ہی ان کے اردگرد غیر قانونی آبادیاں بننے لگیں، اور ۱۹۷۰ کے آغاز تک اندازاً تین ہزار خاندان ان اسکیموں کے اردگرد آباد ہو چکے تھے۔ ۱۹۷۱ کے بعد کئی لاکھ بہاری خاندان بنگلادیش سے پناہ گزیں بن کر پاکستان پہنچے۔ یہ لوگ نہ صرف تعداد میں زیادہ تھے بلکہ نسبتاً زیادہ تعلیم یافتہ اور ہنرمند ہونے کے باعث لیبر مارکیٹ میں زیادہ سخت مقابلہ کر سکتے تھے، لہٰذا مقامی آبادی کے کئی گروپوں کے لیے ان کی آمد پریشان کن تھی۔ حکومت نے ان کو پاکستان میں داخلے کی اجازت دی تھی لیکن ان کی کراچی میں آبادکاری اور بحالی کے سلسلے میں کوئی وسیع پروگرام شروع کرنے کو تیار نہ تھی جہاں یہ لوگ اپنے شہری پس منظر کے باعث آباد ہونا چاہتے تھے۔ کئی سمتوں سے ایسی آوازیں اٹھ رہی تھیں کہ کراچی اپنے حصے سے زیادہ مہاجرین کو جگہ دے چکا ہے اس لیے ان لوگوں کو پاکستان میں کسی اور جگہ بسایا جانا چاہیے۔
ایسی صورتِ حال میں جتنے زیادہ غیر سرکاری لوگ اور تنظیمیں بہاریوں کی آبادکاری میں حصہ لے کر ان کو نظروں سے اوجھل کر سکتیں، حکومت کے لیے اُتنا ہی بہتر تھا۔ "میں پٹھانوں سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتا،" کے ڈی اے کے ایک افسر نے کہا؛ اُس کا مطلب یہ تھا کہ وہ آبادکاری کا کام غیر قانونی پلاٹ

بندی کرنے والوں کے لیے چھوڑ دینا زیادہ مناسب سمجھتا ہے جو اکثر پٹھان دلالوں کی وساطت سے کام کرتے ہیں۔ اس طرح زمین کی غیر قانونی تقسیم کے نظام کو بڑی تقویت ملی۔

اس سے پہلے بھی یہ کام کرنے والے آبادکاروں کا دعویٰ تھا کہ وہ شہر میں آنے والے کم حیثیت باشندوں کو کم قیمت پر زمین فراہم کر کے ایک اہم سماجی خدمت انجام دیتے ہیں۔ بہاریوں کے معاملے میں یہ دعویٰ اور بھی قوی ہو گیا کیوں کہ یہ نئے آنے والے نہ صرف غریب تھے بلکہ پناہ گزیں بھی تھے جن کے پاس جانے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ چوں کہ حکومت علی الاعلان اور کم لاگت پر ان کی آبادکاری کا کام کرنے سے قاصر تھی، اس لیے غیر قانونی آبادکاروں کی پوزیشن اور بھی مضبوط ہو گئی اور ان میں سے بہت سوں نے اس صورتِ حال سے پورا فائدہ اٹھایا۔

غیر قانونی آبادکاروں کے لیے پہلا مسئلہ اپنے عمل کے لیے تحفظ حاصل کرنا اور دوسرا مسئلہ اوّلیں خریداروں کو وہاں بسنے پر آمادہ کرنا ہوتا ہے۔ اکثر نئی آبادیوں میں پہلے چند سو پلاٹ برائے نام قیمت پر، اور کبھی کبھی مفت، دیے جاتے ہیں۔ سو پچاس خاندانوں کے وہاں آباد ہو جانے کے بعد بنیادی سہولتوں کے سنگین مسائل ــــ پانی، ٹرانسپورٹ، روزمرہ ضرورت کی چیزوں کی دکانیں وغیرہ ــــ رفتہ رفتہ کم ہونے لگتے ہیں۔ یوں یہ نئی آبادی پلاٹ حاصل کرنے کے خواہش مندوں کے لیے زیادہ پُرکشش ہو جاتی ہے۔ یہ موقع آنے کے بعد سے پلاٹوں کی قیمت متواتر بڑھتی جاتی ہے اور آبادکار کو منافع حاصل ہونے لگتا ہے۔

نئی آبادی شہر سے جتنے زیادہ فاصلے پر ہو، اوّلیں بسنے والوں کو آمادہ کرنا اُسی قدر مشکل ہوتا ہے۔ وہ پلاٹ حاصل کرنے کے لیے بہت کم رقم ادا کرتے ہیں، لیکن اس کے بدلے انھیں شروع شروع کی سخت دشواریاں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ درحقیقت یہی لوگ ایک ویران علاقے کو شہری آبادی میں تبدیل کرتے ہیں جس کے نتیجے میں وہاں زمین کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان دشواریوں کے پیشِ نظر انتہائی غریب اور مجبور لوگ ہی اس کام پر آمادہ ہوتے ہیں، گو کہ یہی وہ لوگ ہیں جو ٹرانسپورٹ کا خرچ برداشت کرنے یا روزگار کی جگہوں سے دور بسنے کی سب سے کم استطاعت رکھتے ہیں۔

ان تمام ابتدائی مشکلات سے یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ شہر کے بیرونی کنارے پر بننے والی آبادیاں اس قدر سست رفتاری سے کیوں بڑھتی ہیں۔ کسی پہلے سے قائم آبادی سے اَور آگے بننے والی آبادی میں آنے کے لیے لوگ تبھی آمادہ ہوتے ہیں جب پہلے والی آبادی کسی قدر مستحکم طور پر قائم ہو چکی ہو اور وہاں کے پلاٹوں کی قیمت نئی قائم کی جانے والی آبادی کے مقابلے میں خاصی بڑھ چکی ہو۔ ۱۹۷۴ تک نئی قائم کی جانے والی غیر قانونی آبادی میں پہلے پہل بسنے والوں کو آمادہ کرنا خاصا دشوار ہو چکا تھا۔ لیکن کئی لاکھ بہاری خاندانوں کے آ جانے سے ایسے لوگ بڑی تعداد میں مہیا ہو گئے جن کے پاس رہنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ علاوہ ازیں، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، سیاست دانوں اور سرکاری اہلکاروں کی جانب سے غیر قانونی آبادکاری کے کام کے لیے تحفظ بھی آسانی سے فراہم ہونے لگا۔

Scanned with CamScanner

ممکن ہے اس موقعے پر کچھ افراد اور تنظیمیں واقعی نیک نیتی سے پناہ گزینوں کی امداد کرنے کے مقصد سے اس کام میں شامل ہوئی ہوں، لیکن عمومی طور پر زمین کی غیر قانونی تقسیم کا پہلے سے موجود نظام قائم رہا۔ پناہ گزینوں کی بڑی تعداد کی آمد سے یہ نظام تبدیل ہونے کے بجائے مزید مستحکم ہوا۔ اس سلسلے میں خاص بات یہ تھی کہ اورنگی میں "بہاری پناہ گزینوں کی بحالی اور آبادکاری" کے مقصد سے متعدد آبادیاں قائم کی گئیں جن میں سے ہر آبادی میں پناہ گزیں خاندانوں کی محدود تعداد ــــ اکثر صورتوں میں صرف چند سو خاندانوں ــــ کو بسایا گیا جب کہ آبادی کا باقی رقبہ خالی رکھا گیا۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ ایک ہی غیر قانونی آبادکار نے بیک وقت کئی آبادیاں قائم کیں۔ اس قسم کی ایک مثال اُس آبادکار کی ہے جس نے دو کالونیاں بنائیں، ایک شہر سے صرف چند کلومیٹر دور اور دوسری دس کلومیٹر کے فاصلے پر۔ آخرالذکر آبادی میں پہلے پہل بسنے والے لوگ انتہائی محتاج تھے۔ اس آبادکار کی نیک نیتی پر یقیناً شبہ کیا جا سکتا ہے جس نے ان چند خاندانوں کو دور دراز اور نہایت دشوار مقام پر بسایا اور یوں مفت فراہم کیے جانے والے پلاٹوں کے ارد گرد کے وسیع قطعۂ زمین پر قبضہ کر لیا۔

دلّال آباد

"دلّال آباد" نامی غیر قانونی آبادی اورنگی سے بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر اور شہر کے صنعتی علاقے سے تقریباً سات کلومیٹر دور واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ ۱۸۰ ایکڑ ہے جسے ۱۲۰ مربع گز کے پانچ ہزار پانچ سو رہائشی پلاٹوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حال تک یہ علاقہ حکومت سندھ کے محکمۂ محصولات کے تحت آتا تھا۔ علاقے کے کچھ حصے پر مقامی باشندوں کو ملکیت کا دعویٰ تھا۔ بقیہ زمین پر مقامی چرواہوں کو مویشی چرانے کا سرکاری پروانہ دیا گیا تھا۔ ۱۹۷۴ میں وہاب نے ایک دلّال (middleman) کو بیچ میں ڈال کر یہ پورا علاقہ غیر قانونی طور پر خرید لیا۔ دلّال نے مقامی باشندوں کو کچھ رقم ادا کی اور فی پلاٹ پولیس کو غیر سرکاری مگر مقررہ رقم دی۔ بعد ازاں اس نے پورے علاقے میں تعمیراتی منصوبہ، مع سڑکوں وغیرہ کے، تیار کیا۔ وہاب کو اس عمل میں سیاسی اور انتظامی عملے کی سرپرستی حاصل تھی۔ انٹرویو کرنے پر اس نے چند نہایت بااثر شخصیتوں کا نام لیا جن میں ایک صوبائی اور ایک وفاقی وزیر بھی شامل تھے۔ دوسرے لوگوں سے بات چیت میں ان ناموں کی تصدیق بھی ہوئی۔ یہ بھی دل چسپ بات ہے کہ دلّال آباد میں ایک اور سیاست داں کے رشتے دار کے کئی پلاٹ ہیں۔

اس پورے عمل میں دلّال کے رول کی تصریح مشکل ہے۔ مقامی سطح کا سیاست داں ہونے کے علاوہ اس کا پیشہ غیر قانونی آبادکاری ہی ہے اور وہاب کی طرح اُسے بھی سیاسی اور انتظامی سرپرستی حاصل ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ علاقے کی پلاٹ بندی اور اور پلاٹوں کی فروخت کا کام اُسی نے کیا۔ جب کہ وہاب کا کہنا ہے یہ تمام کام دلّال نے اُس کے کہنے پر اور اس کی نگرانی میں کیا تھا۔

Scanned with CamScanner

دلال اتنی خودمختاری سے کام کرتے ہیں کہ انھیں اصل آبادکار سمجھنا غلط نہ ہوگا۔ مگر اس خاص وقوعے میں وہاب نے سب سے پہلے یہاں کچھ خاندان آباد کیے، لہٰذا اصل آبادکار وہی سمجھا جائے گا۔ دراصل اس پورے عمل میں فاعل افراد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر کام نہیں کر سکتے۔

کراچی میں بنگلادیش سے آنے والے بہاریوں کی آبادکاری کے لیے متعدد کمیٹیاں بنائی گئی تھیں۔ وہاب ان میں سے ایک کا پُرجوش اور مرکزی اہمیت رکھنے والا عہدے دار تھا۔ ابتدا میں یہاں پچھتر کے قریب بہاری خاندانوں کو سرکنڈوں کی جھگیوں میں آباد کیا گیا۔ بعد میں اُنھیں ایک ایک کمرے کے مکانات دے دیے گئے۔ دلال آباد میں صرف انھیں خاندانوں کے پاس ادائیگی کی رسیدیں ہیں جن پر پانچ روپے کی برائے نام رقم کا اندراج ہے (گو رقم پچیس سے سو روپے تک ادا کی گئی تھی۔) رسید پر آبادکاری کا مقصد "پناہ گزینوں کی بحالی" درج ہے۔

اس کمیٹی کے تیار کیے ہوئے منصوبے میں دلال آباد کے کل رقبے کا صرف ایک بٹا پانچ حصہ شامل ہے۔ اس حصے میں سڑکوں، رہائشی اور تجارتی علاقوں وغیرہ کی نشان دہی کی گئی۔ چوراہوں کی نشان دہی کے لیے پتھر نصب کیے گئے۔ ایک اسکول اور ایک مسجد کے لیے زمین مختص کی گئی۔ (غیرقانونی آبادیوں میں اکثر کسی پیر فقیر کی درگاہ کے لیے بھی زمین رکھی جاتی ہے۔ دلال آباد چوں کہ منگھوپیر کے مزار کے پاس واقع ہے، اس لیے وہاں کسی نئے پیر کی گنجائش نہیں تھی۔) منصوبے میں ایک قبرستان بھی شامل تھا، مگر باغ یا کھیل کے میدان کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی۔

اس عمل میں جو اخراجات ہوئے اس کے بارے میں الگ الگ اور ایک دوسرے سے مختلف اطلاعات فراہم ہوئیں۔ یہاں کے مقامی باشندوں کو فی پلاٹ تین روپے دیے گئے اور پولیس کو دو روپے فی پلاٹ۔ علاقے کو رہائشی اور تجارتی پلاٹوں میں تقسیم کرنے میں مزدوروں اور سامان وغیرہ پر دو روپے فی پلاٹ خرچ ہوئے۔ وہاب نے دلال کو آٹھ روپے سے بیس روپے تک فی پلاٹ ادا کیے۔

۱۹۷۴ ہی میں کچھ زمین سو روپے فی پلاٹ کے حساب سے بیچی گئی۔ یہ معاملہ وہاب کے ایک رشتےدار عبدل کے ہاتھوں طے ہوا جسے کمیٹی نے علاقے میں اپنا نمائندہ بنایا تھا۔ کمیٹی نے عاقل نامی ایک چوکیدار بھی رکھا جس کا کام یہ تھا کہ بلااجازت آبسنے والوں پر نظر رکھے۔ شروع شروع میں عبدل کی سرپرستی میں کچھ پلاٹ عاقل نے بھی بیچے۔

کئی پناہ گزینوں نے دو دو اور تین تین پلاٹ خریدے تھے۔ کچھ عرصے بعد جب ان کی قیمت بڑھ گئی تو انھوں نے زائد پلاٹ منافعے پر بیچ دیے۔ کچھ افراد نے پناہ گزینوں کے گروہ کا دعوےدار بن کر پچیس سے پچاس تک پلاٹ حاصل کر لیے۔ اس طرح کے ایک واقعے میں وہاب نے پولیس کے ذریعے ان افراد کو بےدخل کیا۔

کچھ عرصے بعد وہاب کے ایما پر ایک دلال آباد فلاحی کمیٹی بنائی گئی جس میں دلال آباد کے

سر برآوردہ ساکن اور شہر کے کچھ ممتاز لوگ شامل تھے؛ وہاب بھی ان میں سے ایک تھا۔ جلد ہی اس کمیٹی کے ممبروں نے خود بھی پلاٹ بیچنے شروع کر دیے اور تجارتی پلاٹ آپس میں تقسیم کر لیے۔ یہ تمام خرید وفروخت عاقل، عبدل اور پولیس کی خوشنودی حاصل کرنے کے بعد ہی ممکن ہو سکتی تھی۔ ابتدائی برسوں میں پولیس ہر ہفتے اپنا حصہ وصول کرنے آتی تھی۔ ایک پولیس والے نے بھی کچھ پلاٹ فروخت کیے۔

چوں کہ یہ سارا معاملہ غیر قانونی تھا اس لیے پولیس کو تمام دوسرے فریقوں پر بالادستی حاصل تھی۔ لیکن وہاب اپنے اثرورسوخ سے کام لے کر پولیس کو ایک حد سے بڑھنے سے باز رکھ سکتا تھا۔ وہاب نے ہمیں بتایا کہ "پولیس والوں کے چھوٹی موٹی رقم لے لینے پر تو مجھے اعتراض نہیں کیوں کہ اس ملک میں یہی چلتا ہے۔" لیکن اگر پولیس والے زیادہ پیسے اینٹھنے کی کوشش کرتے تو وہاب ان کا ٹرانسفر کروا دیتا تھا۔

وہاب نے کے ڈی اے کو قائل کر لیا کہ اس آبادی کو پانی فراہم کیا جائے۔ کمیٹی سیمنٹ کے حوض پہلے ہی بنوا چکی تھی۔ کے ڈی اے کے ٹینکر ایک دن چھوڑ کر پانی لاتے ہیں۔ پانی کے حوض سیمنٹ کے بلاکوں سے بنتے ہیں، چناں چہ بلاک بنانے والے پانی کی تقسیم کو کنٹرول کرنے لگے۔ ان کی اہمیت یوں بھی تھی کہ مکان بنانے کا سامان وہ آبادی میں آنے والوں کو قرض پر مہیا کر سکتے تھے۔ ایک معمولی مکان پر آنے والی لاگت کا ۲۰ سے ۵۰ فیصد حصہ اسی سامان پر خرچ ہوتا ہے۔ بلاک بنانے والے بھی پلاٹ بیچنے کا کام کرتے ہیں۔ دلال آباد کا چوکیدار عاقل بلاک بھی بنانے لگا۔

سب سے اوّل بسائے جانے والے خاندانوں کے بعد خرید وفروخت کے تحریری ثبوت مہیا نہیں کیے گئے۔ اس سے چوکیدار کی طاقت میں بے حد اضافہ ہوا کیوں کہ بہرحال سرکاری زمین کے پلاٹ بیچنا اور ان پر مکان بنانا غیر قانونی عمل ہے۔ اب یہ چوکیدار کی مرضی تھی کہ وہ جسے چاہے پلاٹ لینے کا حقدار بتائے اور جسے چاہے غیر قانونی قابض ثابت کر دے۔ اس کی پولیس سے ملی بھگت تھی۔ پولیس کے دباؤ سے اگر معاملہ چوکیدار کی مرضی کے مطابق طے ہو جائے تو وہ ایسے خاندان کو بحالی کا حقدار قرار دے دیتا تھا۔

بعض صورتوں میں پلاٹ خریدنے کے بعد اس پر فوری قبضہ کر کے مکان بنانا شروع نہیں کیا جاتا۔ اس کی دو ممکنہ وجہیں ہوتی ہیں۔ یا تو خریدار نے پلاٹ بعد میں منافعے پر بیچنے کے لیے خریدا ہے، یا پھر اس کے پاس مکان کی تعمیر شروع کرنے کے پیسا بالکل نہیں ہے۔ فوری قبضہ نہ لینے کی صورت میں پلاٹ کے دوبارہ کسی اَور کے ہاتھ فروخت کر دیے جانے کا خطرہ رہتا ہے کیوں کہ لین دین کی کوئی رسید نہیں دی جاتی۔ ہمیں اس طرح کے ایک واقعے کا علم ہوا۔ ایک پان بیڑی سگریٹ کی دکان والے نے ایک پلاٹ خریدا تو خریدتے وقت اپنے پرانے پڑوسی، ایک ریٹائرڈ فوجی افسر، کو اُن کا یونیفارم پہنوا کر ساتھ لے گیا تاکہ وردی پوش عینی شاہد کے ڈر سے اس کا پلاٹ کسی اَور کے ہاتھ دوبارہ نہ بیچا جائے۔

علاقے کا چوکیدار اس عمل میں مرکزی کردار ادا کر رہا تھا۔ یہاں رہنے والوں نے اس کے بارے

Scanned with CamScanner

میں وہاب کو اتنی شکایات بھیجیں کہ آخر کار وہاب کو اسے برطرف کرنا پڑا۔ لیکن اس کی جگہ اس کے بھائی ہی کو رکھا گیا، چناں چہ کاروبار انھیں ہاتھوں میں رہا۔

دلال آباد کا کل ۱۸۰ ایکڑ رقبہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ۳۰ ایکڑ پر مشتمل ایک حصّہ وہ ہے جس کی ابتدا ہی میں پلاٹ بندی کر لی گئی تھی اور اس حصّے کے سرحدی پلاٹوں پر پچھتر اولیں بے گھر خاندانوں کو لا بسایا گیا تھا۔ ان پلاٹوں اور اورنگی کی پرانی آبادیوں کے درمیان کا بہت بڑا رقبہ خالی چھوڑا گیا۔ اسے دلال آباد میں زمین کی قیمت بڑھنے کے بعد پلاٹ بندی کر کے بیچا گیا۔ یہ حصّہ اب جزوی طور پر آباد ہو چکا ہے۔

دلال آباد کا ۱۵۰ ایکڑ پر مشتمل دوسرا حصّہ، جو اول بسنے والے خاندانوں کے پلاٹوں سے آگے واقع ہے، ابتدا میں نہ چھیڑا گیا، سوائے ایک قطعۂ زمین کے جسے قبرستان کے لیے مختص کیا گیا تھا جو بعد میں استعمال کیا جانے لگا۔ اس حصّے کے پلاٹ بعد میں سرمایہ کاروں کے ہاتھ دس سے لے کر سو (یا زائد) پلاٹ فی کس اکٹھے فروخت کیے گئے۔

۱۹۷۴ کے بعد سے دلال آباد کے اس حصّے میں بڑے بڑے پلاٹوں پر مرغی خانے کھلنے شروع ہو گئے۔ اورنگی کے بنجر مضافات میں ڈیڑھ ہزار سے دو ہزار تک مرغی خانے ہیں۔ بڑھتے بڑھتے مرغی خانے رہائشی علاقے میں گھسنے لگے۔ دلال آباد کے ان مرغی خانوں کے مالکان میں سرکاری افسر، وکلا، ٹھیکے دار اور بلاک بنانے والے شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی ایک تنظیم بنا لی ہے اور اس علاقے کو "صنعتی علاقہ" قرار دلوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مرغی خانوں اور آباد رہائشی پلاٹوں کے درمیان واقع علاقہ سب سے زیادہ متنازعہ ہے۔ مرغی خانوں کے مالکان اور رہائشی پلاٹوں کے مکین دونوں اس خالی علاقے پر دعویٰ رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں زور لگا رہے ہیں۔

۱۹۷۷ میں وہاب نے بارش سے متاثر بے گھر خاندانوں کو ۸۰ پلاٹوں کا عطیہ دیا تھا۔ مگر جب یہ خاندان یہاں آ کر بسے تو چوکیدار کو خوش رکھنے کے لیے اُنھیں فی پلاٹ پانچ سو سے ایک ہزار روپے تک چوکیدار کو دینے پڑے۔ پلاٹ کی قیمت بھی اُس زمانے میں کم و بیش اتنی ہی تھی۔

اورنگی کا پورا علاقہ حکومت سندھ کی ملکیت ہے، یعنی بورڈ آف ریوینیو کے تحت آتا ہے۔ کے ڈی اے نے اپنی پلاٹ اونرشپ اسکیموں کے لیے اس کے کچھ رقبے کی منصوبہ سازی اور پلاٹ بندی کی تھی لیکن یہ اسکیمیں ابھی مقامی بلدیہ کے کنٹرول میں نہیں دی گئی تھیں۔ آخر کار جولائی ۱۹۸۱ میں اورنگی کو بلدیہ عظمیٰ کراچی کے سپرد کر دیا گیا۔ دلال آباد کا کچھ رقبہ بلدیہ کی حدود میں اور کچھ اس کے باہر واقع ہے۔ مرغی خانوں والا حصّہ بورڈ آف ریوینیو کے تحت آتا ہے۔ بلدیہ اور بورڈ کے درمیان علاقے کی سرحد متنازعہ تھی۔

مرغی خانوں کے مالکان نے اثر و رسوخ استعمال کر کے اپنے پلاٹوں کو بلدیہ کی حدود سے باہر یعنی بورڈ آف ریوینیو کے حدود میں رکھے جانے کی پُرزور مہم چلائی، کیوں کہ پلاٹوں کی سرکاری لیز ملنے کی

Scanned with CamScanner

صورت میں کے ایم سی کو ادا کی جانے والی لیز کی رقم مقابلتاً خاصی زیادہ ہے۔ جب بلدیہ اور بورڈ آف ریونیو کے درمیان سرحدی تنازعہ کم و بیش طے ہو گیا تو بورڈ کے متعلقہ افسر نے صاف کہہ دیا کہ وہ مرغی خانوں کو ہرگز تسلیم نہیں کرے گا۔ ۱۹۸۳ کے شروع میں اس نے انہدام کے اسکواڈ بھیج کر کئی مرغی خانے تڑوا بھی دیے جو استعمال میں نہیں تھے۔ اس طرح کے ہتھکنڈے عموماً مالکان سے پیسے وصول کرنے کے لیے بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بھاری رشوت دینے کے بعد مرغی خانوں کے مالکان کو تیس تیس برس کی لیز مل گئی۔ لیز کی سرکاری فیس تقریباً چار ہزار روپے فی ایکڑ ہے جب کہ بلدیہ لیز دینے کے لیے اس سے دس گنا سے زائد رقم طلب کرتی ہے۔ حکومت سندھ کی جاری کردہ لیز کی دستاویز میں یہ شق بھی درج ہے کہ لیز پر دی جانے والی زمین کو مرغی خانہ کھولنے کے سوا کسی اور مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکے گا۔ اس شرط کا محرک جو بھی کچھ ہو، اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ تیس برس کی میعاد پوری ہونے سے بہت پہلے یہ تمام پلاٹ شہر کے رہائشی مکانوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ مستقبل قریب میں مرغی خانوں کے مالکان اور سرکاری اہلکاروں کے درمیان لین دین کے متعدد مواقع نکلنے لازمی ہیں۔

۱۹۷۸ میں جاری ہونے والے ایک مارشل لا آرڈر کے تحت یکم جنوری ۱۹۷۸ سے پہلے قائم ہونے والی تمام کچی آبادیوں کا مستقل کیے جانے کا حق تسلیم کر لیا گیا۔ اس حق کی کچھ مستثنیات بھی تھیں لیکن دلال آباد ان کی ذیل میں نہیں آتا تھا۔ اس کے باوجود دلال آباد کے متنازعہ علاقے کے مکینوں کو نوٹس ملے کہ اپنے پلاٹ خالی کر دیں ورنہ ان کے خلاف ۱۹۸۰ کے مارشل لا آرڈر نمبر ۱۳۰ ("تجاوزات کے خاتمے کے حکم") کے تحت کارروائی کی جائے گی۔ جب دلال آباد کے باسیوں پر ان نوٹسوں کا کوئی اثر نہ ہوا تو بل ڈوزر بھیج کر کچھ مکان گرا دیے گئے۔ دلال آباد کے مکینوں کو اپنے رہنماؤں پر بھروسا نہ تھا، نہ انھیں وہاب سے امید تھی کہ وہ ان کی مدد کرے گا۔ چناں چہ انھوں نے خود کو منظم کر کے سرکاری اہلکاروں اور مارشل لا حکام سے رابطہ قائم کیا۔ انھوں نے ایک وکیل کی خدمات حاصل کر کے مقدمہ بھی دائر کر دیا۔ عدالت نے فیصلہ ہونے تک حالات کو جوں کا توں رکھنے کا حکم جاری کر دیا۔

دلال آباد کے غیر متنازعہ علاقے کے مکینوں کو ۱۹۷۸ کے مارشل لا آرڈر سے بے دخلی کے خلاف خاصا غیر دستاویزی تحفظ حاصل ہو گیا تھا۔ لیکن اس آبادی کو اب تک مستقل نہیں کیا گیا ہے۔ مارشل لا کے اس حکم کے تحت جو لوگ اپنے پلاٹوں پر یکم جنوری ۱۹۷۸ سے پہلے سے رہ رہے تھے انھیں لیز حاصل کرنے کا حق دے دیا گیا تھا۔ لیکن حکم میں یہ بات بھی مضمر تھی کہ اس تاریخ کے بعد کسی کو زمین پر غیر قانونی قبضہ کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ۱۹۸۰ کے تجاوزات کے خاتمے کے حکم کے تحت ایسے لوگوں کے خلاف سخت کارروائی کی جاسکتی ہے۔ گویا وہاں پہلے سے آباد لوگوں کے پاس ملکیت کا غیر دستاویزی تحفظ موجود ہے، لیکن تجاوزات والے حکم کے تحت کسی نئے مکان کی تعمیر کو روکا جاسکتا ہے۔ دلال آباد کے ہر پلاٹ پر ملکیت کے دعوے موجود ہیں لیکن بہت بڑی تعداد میں پلاٹ

Scanned with CamScanner

اب بھی غیر استعمال شدہ ہیں۔ ۱۹۷۴ سے ان پلاٹوں پر مکانوں کی تعمیر کا عمل سست رفتاری کے ساتھ چل رہا ہے۔

تجاوزات کے خلاف جاری ہونے والے مارشل لا آرڈر سے پولیس والوں اور بلدیہ کے بعض ملازمین کو ایک نیا موقع ہاتھ آیا اور وہ ہر نئے مکان کی تعمیر کے وقت اپنا حصّہ طلب کرنے کے لیے آوارد ہونے لگے۔ اگر پلاٹ کے مالک انھیں رقم ادا کرنے سے انکار کرتے تو ان کے خلاف مقدمہ درج کیا جاسکتا تھا بلکہ ان کو گرفتار بھی کیا جاسکتا تھا۔ طویل مقدمے پر ضائع ہونے والا وقت اور پیسا ایک خاصا پُراثر محرک ہے جس کے تحت لوگوں کو بھتّے کی ادائیگی پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔

۱۹۸۴ کے وسط تک دلال آباد کے ۳۰ ایکڑ والے اوّلیں حصّے میں تیار اور فروخت کیے گئے ایک ہزار پلاٹوں میں سے آٹھ سو آباد ہو چکے تھے۔ کوئی دو سو خاندان اُس حصّے میں رہ رہے تھے جو بلدیہ اور بورڈ آف ریوینیو کے درمیان متنازعہ تھا۔ ۱۹۷۴ سے ۱۹۸۴ تک دلال آباد کے پلاٹوں کی قیمتیں پچاس روپے فی پلاٹ سے بڑھ کر چھ سے بارہ ہزار روپے فی پلاٹ تک پہنچ چکی تھیں۔ اس طرح قیمت میں اضافے کی مرکب شرح ۷۰ فیصد سالانہ بنتی ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دلال آباد کے مکینوں میں وہاب کی مقبولیت کم ہوتی گئی۔ اس کا فلاحی شخصیت کا امیج کئی برس تک قائم رہا اور بدمعاملگی کی تمام شکایات اس کے خلاف نہیں بلکہ اس کے عملے کے خلاف ہوتی تھیں۔ جیسا کہ چوکیدار عاقل کے معاملے میں ہوا، دلال آباد کے لوگ پہلے پہل یہ شکایات وہاب ہی کے علم میں لاتے تھے۔ لیکن جب عاقل کو ہٹا کر اس کی جگہ اس کے بھائی کو لگا دیا گیا تو لوگوں نے وہاب پر بھروسا کرنا چھوڑ دیا۔ کچھ لوگ البتّہ اب تک یہی رائے رکھتے ہیں کہ "وہاب تو اچھا آدمی تھا، ساری گڑبڑ اس کے چمچوں نے کی۔"

۱۹۷۹ میں بلدیاتی انتخابات کے بعد منتخب کاؤنسلر منظر پر نمودار ہوئے۔ اس وقت سے علاقے میں کچھ سیاسی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ ایک سیاست داں نے مسجد اور اسکول کی تعمیر کے لیے جزوی امداد دی لیکن ان دونوں عمارتوں کی تعمیر کا کام وہاب کے آدمیوں کے ہاتھ میں رہا اور دلال آباد کے بعض لوگوں کو یقین ہے کہ امداد کی رقم کا کچھ حصّہ خرد برد کر لیا گیا۔

اسی دوران دلال آباد کے رہنے والوں نے وہاب کے خلاف خود کو منظم کرنا شروع کیا۔ دوسری باتوں کے علاوہ انھوں نے آبادی کا نام بھی تبدیل کرنا چاہا اور ایک چوراہے کی زیبائش کر کے وہاں نئے نام کی تختی نمایاں کر کے لگا دی۔ انھوں نے وہاب کے خلاف ایک مقدمہ بھی دائر کیا جس کے ممکنہ فیصلے کے بارے میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاب نے غنڈوں کو پولیس کی حفاظت میں بھیج کر چوراہے کی زیبائشی تعمیر کو مسمار کرا دیا۔ اس موقعے پر سنگین لڑائی ہوئی۔ پولیس نے بھی وہاب کے مخالفوں کو بہت تنگ کیا چناں چہ وہ مجبوراً خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

Scanned with CamScanner

یہ نظام ـــــ کچھ تفصیلات

مندرجہ بالا بیان کافی اُلجھا ہوا ہے۔ بہرحال یہ ایک نہایت اُلجھے ہوئے عمل کا بیان ہے تو سُلجھا ہوا کیوں کر ہو سکتا تھا۔ لیکن اس تمام الجھاوے میں ایک قسم کا نظام یقیناً کام کر رہا ہے۔

اس عمل میں جو بنیادی بات پیش آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے تمام فاعل کردار سرکاری ملکیت کو ذاتی منافعے میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کوشش میں سبھی کو ایک دوسرے کی ضرورت ہوتی ہے، ہر ایک کا عمل دوسرے کے عمل کا محتاج ہے اور ہر ایک دوسرے سے اس تعاون کی قیمت وصول کرتا ہے۔

یہ قیمت نقد ادائیگی کی شکل میں بھی ہو سکتی ہے، اور (جیسا کہ اوّلیں بسائے جانے والے خاندانوں کے ساتھ ہوا) مشقت کرنے اور دشواریاں اٹھانے کی صورت میں بھی۔ یہ قیمت کسی کردار کو کسی مشکل سے نجات دلانے کی صورت میں بھی ادا کی جا سکتی ہے اور (جیسا کہ انتظامی اہلکاروں اور سیاست دانوں کا معاملہ ہے) بڑھی ہوئی طاقت کی شکل میں بھی جسے بعد میں نقدی میں تبدیل کیا جا سکے۔ عموماً قیمت کی ادائیگی میں یہ تمام شکلیں ملی جلی ہوتی ہیں۔

وہ سیاست داں اور بڑے افسران جو غیرقانونی آبادکاری کرنے والوں کی سرپرستی کرتے ہیں یا حوصلہ افزائی کا اشارہ دیتے ہیں، اس عمل میں ریاست کی شمولیت کی نشان دہی کرتے ہیں۔ سب سے پہلے یہی لوگ ریاست کی طرف سے دیے گئے اختیارات کو ذاتی منافعے میں تبدیل کرتے ہیں۔ انھیں کسی تگڑے بندے کی ضرورت ہوتی ہے جو یہ کام شروع کرے۔ تگڑے بندے کو مددگاروں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ سرکاری زمین کو ذاتی منافعے میں بدل سکے۔ اس عمل کے دوران انتظامی اہلکار (بشمول پولیس) اپنے اپنے سرکاری اختیار کو ذاتی منافعے میں تبدیل کرتے ہیں۔ اور آخرکار ان تمام فاعل کرداروں کو یہاں بسنے والوں کی ضرورت ہوتی ہے جو تمام ابتدائی دشواریاں اور مشقتیں اٹھا کر صحرا کو شہری محلّے میں بدلتے ہیں۔

یہ اندازہ لگانا ناممکن ہے کہ دلال آباد میں سرکاری زمین کی غیرقانونی فروخت سے کتنا منافع کمایا گیا۔ ایک نہایت سادہ تخمینہ لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ فرض کیا جائے ۱۹۷۴ سے ۱۹۸۴ تک ہر سال دس فیصد پلاٹ فروخت کیے گئے۔ ایک پلاٹ کی اوسط قیمت ۱۹۷۴ میں ۵۰ روپے اور ۱۹۸۴ میں آٹھ ہزار روپے تھی جبکہ اسی عرصے میں مرغی خانوں والے حصّے میں اوسط قیمت ۲۵ روپے سے ایک ہزار روپے تک بڑھی۔ اس تخمینے میں بہت سی چیزیں شامل نہیں ہیں جن کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، مثلاً ۱۰۰ کے قریب تجارتی پلاٹوں کی قیمت، پلاٹوں کی دوبارہ یا سہ بارہ فروخت وغیرہ۔ ان مفروضات سے جو کم از کم تخمینہ لگایا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس آبادی میں سرکاری زمین کی غیرقانونی فروخت سے پچاس لاکھ روپے کمائے گئے۔

Scanned with CamScanner

فائدہ کس کو ہوا؟

دلال آباد کی نشوونما کے بیان سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ کسی ایک فرد یا گروپ کو منافع کمانے کا تنہا ذمے دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا بلکہ مختلف کردار منافع کمانے کی اس کوشش میں نہایت پیچیدہ طور پر باہم اُلجھے ہوئے ہیں۔ نہ یہاں اتفاقِ رائے سے کی جانے والی کسی سازش کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے، اگرچہ دور سے دیکھنے پر محسوس یہی ہوتا ہے کہ یہ نظام کسی رواں مشین کی طرح کام کرتا ہے۔ بسنے والوں کو چھوڑ کر، جن کا مقصد سر چھپانے کی جگہ حاصل کرنا ہے، باقی تمام کرداروں کا مقصد ایک ہی ہے لیکن مشترکہ نہیں ـــــ زیادہ سے زیادہ منافع کمانا۔ لہذا ان کرداروں کا باہمی رشتہ سازباز کا نہیں بلکہ مسابقت کا ہے۔ یہ کردار جب کبھی ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں تو وجہ یہ ہوتی ہے کہ انفرادی کرداروں کو حد سے آگے بڑھنے سے روکا جاسکے۔ ان میں سے تقریباً ہر ایک دوسرے کرداروں پر کسی نہ کسی طرح گرفت رکھتا ہے یا اُن کی گرفت میں ہوتا ہے اور یوں اپنی من مانی نہیں کرسکتا۔

وہاب کا عبدل یا عاقل سے رشتہ اس کی بہترین مثال ہے۔ وہاب اپنے اثرورسوخ کے ذریعے سیاسی اور انتظامی اختیارات رکھنے والوں کا تحفظ حاصل کرسکتا تھا اور اولین بسنے والوں کو یہاں لاسکتا تھا۔ لیکن وہ ایک ایک پلاٹ فروخت کرنے اور آبادی میں روزانہ کی پیش رفت کی نگرانی کرنے سے قاصر تھا۔ اس کے لیے اُسے مددگاروں (عبدل یا عاقل) کی ضرورت تھی جنھوں نے اپنی حیثیت کا بڑی حد تک فائدہ اٹھایا۔ اس حد کا انحصار اس بات پر تھا کہ مددگار تحفظ حاصل کرنے کے لیے کس حد تک وہاب کے محتاج تھے۔ یہ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کے پیر مضبوطی سے پکڑ رکھے ہوں تاکہ دوسرا شخص زیادہ لمبے قدم نہ اٹھاسکے۔

اسی طرح پولیس والوں کی عاقل پر خاصی مضبوط گرفت تھی، کیوں کہ اصولی طور پر وہی قانون کے محافظ تھے۔ لیکن اگر وہ عاقل کو دبانے میں ایک حد سے آگے جاتے تو وہ وہاب کے ذریعے، جسے شہر کے اعلیٰ پولیس افسروں میں اثرورسوخ حاصل تھا، ان کا ٹرانسفر کرواسکتا تھا۔ پولیس کے ہتھکنڈوں سے بچنے کے لیے عاقل وہاب کا محتاج تھا۔

دلال آباد میں رہائش اختیار کرنے والوں کو عاقل کی دھونس میں رہنا پڑتا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی مدد حاصل کرسکیں کیوں کہ ان سرکاری محکموں تک ان کی پہنچ صرف عاقل ہی کے ذریعے ممکن تھی جو سہولتیں (مثلاً پانی) فراہم کرتے ہیں۔ عاقل سے بگاڑ کر رکھنے میں ہمیشہ ان کا نقصان ہوتا تھا۔

دوسری طرف ان کی شکایات پر عاقل کو ہٹا کر اس کے بھائی ہی کو چوکیدار رکھا گیا؛ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عاقل کا خاندان وہاب پر مضبوط گرفت رکھتا ہے۔ عاقل اتنا طاقت ور کیوں کر ہو گیا؟ اس بارے میں صرف قیاس آرائی کی جاسکتی ہے۔ ممکن ہے وہ وہاب کو بلیک میل کررہا ہو۔ اتنے عرصے میں آبادی میں عاقل کی پوزیشن بھی مضبوط ہو چکی تھی؛ اس نے عبدل سے (جو وہاب کا رشتے دار تھا) اور پولیس سے تعلقات پیدا کرلیے تھے؛ پھر اس نے بلاک بنانے کا کام شروع کردیا تھا اور اسے کئی پلاٹوں پر پھیلا لیا

Scanned with CamScanner

تھا۔ ممکن ہے دلال آباد کا قصہ شروع ہونے سے پہلے اُس نے وہاب کا کوئی کام نکلوایا ہو اور اب اس احسان کا بدلہ وصول کر رہا ہو۔ پھر یہ بھی اہم بات ہے کہ عاقل کا ایک اَور بھائی وہاب کے پرائیویٹ دفتر میں کام کرتا ہے۔

عاقل اور اس کے بھائی کو اتنی نفع بخش ملازمتیں کیسے ملیں؟ اسی طرح پولیس کانسٹیبل یا متعلقہ سرکاری محکموں کے اہلکار اپنی پرکشش ملازمتیں یوں ہی حاصل نہیں کر لیتے؛ انھیں یہ ملازمتیں حاصل کرنے یا قائم رکھنے کے لیے سرمایہ کاری کرنی پڑتی ہے، یا انھوں نے بھی پہلے کسی طاقت ور افسر کا کوئی کام نکلوایا ہوتا ہے۔ گویا اس تمام عمل میں لین دین صرف پیسے ہی کا نہیں ہوتا بلکہ سابقہ احسانات بھی لین دین کا وسیلہ بنتے ہیں۔

وہاب کے باپ اور چچا نے ۱۹۵۰ اور ۱۹۶۰ کی دہائیوں میں سرکاری زمین کی غیر قانونی پلاٹ بندی اور فروخت کے ذریعے کئی آبادیاں بسائی تھیں۔ غالباً وہاب کو اپنے اثر و رسوخ کا کچھ حصہ ورثے میں ملا ہے۔ خود وہاب کا پیشہ صحافت ہے۔ صحافی کے طور پر بھی وہ سیاست دانوں اور اعلیٰ سرکاری اہلکاروں کے کام نکلوانے اور انھیں اپنا احسان مند بنانے کی طاقت رکھتا ہے۔ انٹرویو کے دوران اس کے پاس مختلف قسم کے کاموں کے لیے فون آتے رہے اور وہ ہر ایک سے وعدہ کرتا رہا کہ اس کا کام ہو جائے گا۔ لگتا ہے وہاب سے اونچی اور نیچی حیثیت رکھنے والے بہت سے لوگ اس کے احسان مند ہیں۔

احسان مندی اور دباو اس عمل کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ نقد ادائیگی سے سودا نمٹ جاتا ہے اور طویل مدتی اثر و رسوخ پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن منافع کمانا اس کھیل کا اصل مقصد ہے۔ چناں چہ جب نقد رقم وصول بھی کی جاتی ہے تو اس طرح کہ دباو پوری طرح ختم نہیں ہوتا۔ مثلاً پلاٹ خریدنے والوں نے پلاٹ کی قیمت ادا کر دی ہے لیکن انھیں مکان کی تعمیر کے وقت، اور پھر آبادی کے مستقل کیے جانے کے وقت، مزید ادائیگی کرنی ہو گی جس کی رقم نامعلوم ہے۔ ایک اَور مثال مرغی خانوں کے مالکان کی ہے جنھیں اپنی زمین کی قانونی ملکیت حاصل ہو گئی ہے لیکن آگے چل کر جب وہ اس زمین کو رہائشی یا صنعتی استعمال میں لائیں گے، جو ان کا اصل مقصد ہے، تو انھیں دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس طرح اس عمل کے تمام کردار پیچیدہ طور پر ایک دوسرے کے محتاج ہیں اور دوسروں کا منافع کم رکھنے اور اپنا منافع بڑھانے کی متواتر کوشش کرتے ہیں۔ دلال آباد میں وہاب کو اپنے وسیع تعلقات اور اثر و رسوخ کی بدولت مرکزی حیثیت حاصل ہے، لیکن اُس کی آزادی کو بھی دوسرے کردار ایک حد کے اندر رکھتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ان سب کو کسی نہ کسی طرح فائدہ ہوتا ہے۔ زمین کے مقامی دعوے داروں، دلال، وہاب، اس کے ملازموں، ''آزاد'' پلاٹ بیچنے والوں اور سرمایہ کاری کی غرض سے پلاٹ خریدنے والوں کا فائدہ بالکل عیاں ہے۔ سیاسی اور انتظامی اختیارات رکھنے والوں کو پہنچنے والا فائدہ بھی کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔

پلاٹ خرید کر آبادی میں رہائش اختیار کرنے والوں کا معاملہ سب سے زیادہ گمبھیر ہے کیوں کہ ان کی گرفت باقی کرداروں پر سب سے کمزور ہے۔ غیر قانونی کچی آبادی کی نشوونما کے ابتدائی مرحلے میں ان کو ایک طرح کی طاقت حاصل تھی، کیوں کہ ان کے مشقت اٹھائے بغیر یہ ویران علاقہ شہری آبادی کا حصہ نہیں بن سکتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی یہ طاقت زائل ہوتی گئی۔ اب پلاٹ بیچنے والے کم قیمت پر یا مفت پلاٹ فراہم کر کے لوگوں کو یہاں بسنے پر راغب نہیں کرتے بلکہ ایک ایک پلاٹ کو کئی کئی بار فروخت کرتے تھے۔ مزید وقت گزرنے پر انھوں نے خود کو منظم کرنے کی کوشش کی لیکن پوری طرح کامیاب نہ ہوئے۔

تاہم، ان لوگوں کے علاوہ جن کے پلاٹ کسی اور کے ہاتھ دوبارہ فروخت کر دیے گئے، باقی بسنے والے بھی فائدے میں رہے۔ یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ان کے پاس سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی اور سرکاری طور ڈویلپ کی ہوئی زمین کی قیمت ان کی استطاعت سے باہر تھی۔ یہ درست ہے کہ اس عمل میں ان کا استحصال کیا جاتا ہے، انھیں سخت دشواریاں جھیلنی پڑتی ہیں اور تھوڑی تھوڑی کر کے اچھی خاصی رقم غیر قانونی ٹیکسوں (بھتوں) کی شکل میں [illegible] نی پڑتی ہے جو آبادی کی حالت بہتر بنانے کے کام نہیں آتی۔ اس کے باوجود برسوں پر پھیلا ہوا ادائیگیوں کا یہ سلسلہ ان کے مالی حالات سے مطابقت رکھتا ہے۔ پھر وہ اپنے مکان بھی اپنی سہولت سے رفتہ رفتہ تعمیر کر سکتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ ایک سے زیادہ پلاٹ خرید لیتے ہیں اور قیمت بڑھنے پر زائد پلاٹ بیچ کر اپنا مالی بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ زمین کی پلاٹ بندی اور فروخت کا یہ کام قانونی طور پر کیوں نہیں کیا جاتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ باقاعدہ سرمایہ کار اس کاروبار میں اس لیے داخل نہیں ہوتے کہ سرمایہ کاری کے حساب سے اتنے زیادہ منافعے کی امید نہیں ہوتی۔ باقاعدہ اور قانونی طور پر کسی علاقے میں آبادکاری کرنے کے لیے کچھ انفراسٹرکچر بنانا پڑے گا جس پر بہت پیسے خرچ ہوں گے۔ علاوہ ازیں انھیں متعدد قانونی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دلال آباد میں اقتصادی قوانین کے مطابق سرمایہ اکٹھا کرنے کا قدیم طریقہ استعمال ہو رہا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کا اوّلین مرحلہ ہوتا ہے۔

اس عمل میں اصل نقصان ریاست ہی کا ہوتا ہے جو اپنے ایک قیمتی اثاثے، یعنی سرکاری ملکیت کی زمین، سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔

**

Facts & Figures

A monthly compilation of

Urban Resource Centre
613 City Shopping Mall
111 Depot Lines
Karachi.
Tel: 7788021, 7788173

Scanned with CamScanner

کسی شہر کی صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا بھی نہایت ضروری ہے کہ شہر کا انتظام کیسے چلایا جاتا ہے۔ کراچی شہر کی بدانتظامی کے ایک اہم نتیجے کی تفصیل آپ پچھلے چار مضامین میں ملاحظہ کر چکے ہیں۔ عارف حسن کا مضمون "شہری بدانتظامی اور تشدد" کراچی کے ناقص انتظام سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کو غیر ترقی یافتہ دنیا کے دوسرے شہروں سے موازنے میں پیش کرتا ہے۔ عارف حسن اپنی تحقیق کی بنیاد پر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شہری انتظامیہ کی نااہلی اور ناکارکردگی، انتظامی فیصلوں میں مفاد پرست گروہوں کے عمل دخل، تعلیم یافتہ اور روشن خیال شہریوں کی شہر کے اصل مسائل سے بے اعتنائی اور بدانتظامی کا شکار ہونے والے غریب شہریوں کی بے بسی کے باعث تشدد شہر کی زندگی کا ایک ناگزیر جُز بن کر رہ گیا ہے۔

اس مضمون کا متن عارف حسن کے مندرجہ ذیل انگریزی مضامین کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے:

1. "How Does a City Function?"
   (Prepared for UNESCAP, August 1995)
2. "Karachi and the Global Nature of Urban Violence"
   (*The Urban Age*, Urban Violence Issue: Summer 1993)
3. "Asian Overview of Pattern of Violence - Special Focus on Karachi"
   (Paper for the seminar on "Megacities: Crises & Challenges",
   Aga Khan University, 16 November 1995).

علاوہ ازیں، عارف حسن سے انٹرویو کی بنیاد پر مضمون میں کہیں کہیں اضافے بھی کیے گئے ہیں۔

Scanned with CamScanner

عارف حسن

انگریزی سے ترجمہ اور تدوین: اجمل کمال

شہری بدانتظامی اور تشدد

بیشتر ایشیائی شہروں میں شہری ترقیات کی پالیسیاں وفاقی اور صوبائی حکومتیں وضع کرتی ہیں اور ان کو نافذ کرنے کا کام صوبائی یا شہری ترقیاتی ایجنسیوں کے ذمے ہوتا ہے۔ یہ پالیسیاں تیار کرنے والے افراد اونچے درمیانہ طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور عموماً روایتی طور پر تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ ان کی تیار کردہ پالیسیوں میں ان کے طبقے کی مخصوص سوچ اور ترقی یافتہ دنیا (First World) کے تعصبات جھلکتے ہیں۔ تیسری دنیا کی یونیورسٹیوں میں رائج تدریس کے طریقوں کے باعث (جن کا مقامی معاشرتی حالات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا) یہ تعصبات اور زیادہ مضبوط ہوجاتے ہیں اور بیرونی ملکوں میں، یا باہر سے آنے والے کنسلٹنٹوں کے ہاتھوں، تربیت پا کر مزید تقویت حاصل کر لیتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر افراد غریب اور کم آمدنی والے طبقوں کے سماجی اور معاشی حالات اور موقعے (فیلڈ) کی صورتِ حال سے بے خبر ہوتے ہیں۔

پالیسیاں وضع کرنے والوں کے علاوہ شہروں میں معاشی اور سیاسی مفادات رکھنے والے طاقت ور گروپ بھی موجود ہوتے ہیں جو سرکاری پالیسیوں اور فیصلوں پر اثر ڈالتے ہیں۔ جو پالیسیاں ان کے مفادات سے مطابقت نہیں رکھتیں، وہ ان سے عملی طور پر روگردانی کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ ان کے مفادات عموماً شہر کے غریب باشندوں کے مفادات سے متصادم ہوتے ہیں۔ جن ایشیائی شہروں میں اسٹیبلشمنٹ مضبوط ہے اور مال دار اور طاقت ور طبقوں کی علانیہ سرپرستی کرتی ہے، وہاں مفادات رکھنے والے یہ گروپ اسٹیبلشمنٹ کا باقاعدہ حصہ بن کر پالیسی سازی کے عمل میں شامل ہوتے ہیں۔ یہ صورت ملائشیا، تھائی لینڈ اور کوریا میں موجود ہے۔ اس کے برعکس جنوبی ایشیا میں، جہاں کا سیاسی کلچر نسبتاً مقبولیت پسندانہ ہے اور اسٹیبلشمنٹ کی حالات پر گرفت کمزور ہے، وہاں یہ گروپ طاقت ور لابیوں اور مافیاؤں کے طور پر کام کرتے ہیں اور سرکاری پالیسیوں پر باہر سے اثرانداز ہوتے ہیں۔ یہ مافیا ایک

Scanned with CamScanner

طرف اپنی سرگرمیوں پر پابندی لگانے والی پالیسیوں کو بے اثر بناتے ہیں اور دوسری طرف شہر کے اُن غریب اور کم آمدنی والے طبقوں کا استحصال کرتے ہیں جن کی ضروریات پوری کرنے کے لیے سرکاری پالیسیوں میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ان مافیا نما گروہوں کے علاوہ شہروں میں کاروباری اور تجارت پیشہ لوگوں کی طاقت ور انجمنیں ہوتی ہیں جو پالیسی سازی اور ترقیات کے عمل میں ایک مثبت کردار ادا کر سکتی ہیں لیکن اکثر صورتوں میں اپنے محدود روایتی کردار پر قانع رہتی ہیں جو تاریخ نے ان کے لیے متعین کر دیا ہے۔

عمومی طور پر یہ چھ فریق ہیں جن کی ایک دوسرے پر اثرانداز ہونے کی صلاحیت اس امر کا تعین کرتی ہے کہ کسی شہر کا انتظام کیسے چلایا جاتا ہے: (۱) غیر رسمی سیکٹر، (۲) مافیا، (۳) شہر کے غریب اور کم آمدنی والے باشندے، (۴) غیر سرکاری تنظیمیں (NGOs)، (۵) رسمی پرائیویٹ سیکٹر اور (۶) سرکاری ایجنسیاں۔

***

غیر رسمی سیکٹر

شہری منصوبہ بندی اور انتظام کے کام میں انفرااسٹرکچر، شہری سہولتوں، روزگار اور قرضوں، ٹرانسپورٹ اور وسیع تر ماحولیاتی مسائل کا بندوبست شامل ہے۔ تقریباً تمام ایشیائی حکومتیں ان سب شعبوں میں شہری آبادیوں کی ضروریات پوری کرنے کی اہلیت سے محروم ہیں۔ تاہم، شہروں کی آبادی مسلسل بڑھتی رہتی ہے اور یہ سارے کام کسی منصوبہ بندی کے بغیر، بلکہ اس سے پہلے ہی، ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں کہیں منصوبے تیار بھی کر لیے جاتے ہیں، وہاں سرکاری نظام ان کو نافذ کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ رہائشی زمین فراہم کرنے کے سرکاری منصوبوں کا شہر کے غریب باشندوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا، اُس وقت بھی نہیں جب یہ منصوبے غریب باشندوں ہی کی رہائشی ضروریات پوری کرنے کے مقصد سے بنائے جائیں۔ حد سے بڑھے ہوئے غیر ترقیاتی اخراجات اور بدعنوانی کے باعث ان سرکاری منصوبوں پر اتنی لاگت آتی ہے کہ ان کی قیمت غریب اور کم آمدنی والے طبقوں کی استطاعت سے باہر رہتی ہے۔ حکومت کے غیر ترقیاتی اخراجات اتنے بڑھ چکے ہیں کہ اب نہایت قلیل تعداد سے زیادہ روزگار فراہم کرنا پبلک سیکٹر کے بس سے باہر ہے۔ قرض کی سہولتیں ناکافی اور قرض حاصل کرنے کا طریق کار نہایت پیچیدہ ہے، چناں چہ سرکاری اور رسمی پرائیویٹ سیکٹر کے جاری کیے ہوئے قرضے صرف مال دار افراد کے کام آتے ہیں۔

ایشیائی شہروں میں رہائشی سہولتوں کی طلب اور رسد کے درمیان سنگین فرق موجود ہے۔ اس فرق

کے نتیجے میں نئے آنے والے غریب لوگ شہر کے بیرونی کناروں پر کچی آبادیوں میں بسائے جارہے ہیں اور یہ کام غیررسمی سیکٹر کے ہاتھوں انجام پارہا ہے۔ (بعض صورتوں میں شہروں کے مرکزی حصے بھی، جو ماحولیاتی طور پر تباہ ہو چکے ہیں، رفتہ رفتہ غریبوں کے پس ماندہ رہائشی علاقوں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔) یہ پورا عمل قانونی طور پر جائز تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس کے فاعل کردار دلال، قبضہ گیر اور غنڈے ہیں جنھیں بدعنوان سرکاری اہلکاروں اور پولیس والوں کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔ اس عمل کے مالی اخراجات اکثر غیررسمی سیکٹر کے سودخوروں، علاقے کے مال دار لوگوں اور جائیداد کے تاجروں کی معاونت سے پورے کیے جاتے ہیں۔ یہی فاعل کردار بالعموم علاقے کے لیڈر بن کر ابھرتے ہیں اور علاقے کے غریب باشندوں اور ریاستی اداروں کے درمیان واسطہ بنتے ہیں۔ بعد میں یہی لوگ منتخب ہو کر بلدیاتی اداروں اور اسمبلیوں میں پہنچتے ہیں۔ یہ صورت حال شہر کے غریب باشندوں کے لیے سخت غیر منصفانہ ہے لیکن کوئی اور چارہ نہ پا کر وہ اس سے سمجھوتا کر لیتے ہیں۔ اس طرح پورا جمہوری عمل بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔

روزگار، جو لوگوں کے دیہات سے شہروں میں آنے کا بنیادی سبب ہے، بیش تر صورتوں میں غیررسمی سیکٹر ہی فراہم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کراچی میں روزگار کے ۷۵ فیصد مواقع غیررسمی سیکٹر ہی کے فراہم کردہ ہیں۔ یہ سیکٹر ایک طرف غریب باشندوں کی روزگار کی ضرورت پوری کرتا ہے اور دوسری طرف رسمی سیکٹر کے بڑے صنعتی اور تجارتی اداروں کو ٹھیکے پر مزدور مہیا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹے کارخانے اور کاروبار بھی غیررسمی سیکٹر کے ہاتھوں میں ہیں۔ ان کارخانوں کے لیے قرض کی سہولتیں دلال اور پیشہ ور سودخور فراہم کرتے ہیں اور ۱۰ سے ۱۵ فیصد ماہانہ کی شرح سے سود وصول کرتے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کو آدھی یا اس سے بھی کم مزدوری دی جاتی ہے۔

ٹرانسپورٹ کے شعبے میں بھی غیررسمی سیکٹر اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ بسیں اور ٹیکسیاں خریدنے کے لیے قرضے دیتا ہے، ہول سیل مارکیٹوں میں جانوروں سے کھینچی جانے والی گاڑیاں، ٹھیلے اور ریڑھے مہیا کرتا ہے اور جن علاقوں میں پبلک ٹرانسپورٹ کم ہو وہاں سے مزدوروں کو روزگار کی جگہوں تک لانے لے جانے کے لیے ٹھیکے پر ٹرانسپورٹ فراہم کرتا ہے۔

تیسری دنیا کے شہروں میں سوکھے کوڑے کرکٹ کو ٹھکانے لگانے کا انتظام نہایت ناقص اور اکثر صورتوں میں ۳۰ فیصد سے زیادہ ضرورت پوری کرنے سے قاصر ہے۔ تاہم، یہ شہر کوڑے کرکٹ میں دفن نہیں ہو جاتے کیوں کہ غیررسمی سیکٹر اس میں سے ہر کارآمد چیز کو اٹھا کر نہایت کم لاگت پر دوبارہ استعمال کے قابل بنا لیتا ہے۔ اس طرح لوگوں کو روزگار بھی ملتا ہے اور غریب گھرانوں کو تھوڑا بہت مالی فائدہ بھی ہوتا ہے کیوں کہ وہ اپنی استعمال شدہ چیزیں پھینکنے کے بجائے کباڑیوں کے ہاتھ بیچ سکتے ہیں۔ شہری ایجنسیوں کا اٹھایا ہوا کوڑا کرکٹ بھی غیررسمی سیکٹر سرکاری اہلکاروں کو رشوت دے کر خرید لیتا ہے۔ اس طرح شیشے، پلاسٹک، کاغذ اور دھات کی چیزیں ری سائیکل کر لی جاتی ہیں۔ یہ عمل

Scanned with CamScanner

فرسودہ طریقوں سے کیا جاتا ہے جو ماحولیاتی اعتبار سے سخت نقصان دہ ہیں۔ اکثر شہروں کی انتظامیہ ان طریقوں کو بہتر بنانے کے لیے تکنیکی امداد اور قرضے مہیا کرنے کے بجائے اس عمل پر پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

شہروں کے غریب اور کم آمدنی والے علاقوں میں حکومت تعلیم اور علاج کی بھی بیشتر سہولتیں فراہم کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ تعلیمی سہولتیں غیر رسمی سیکٹر کی طرف سے منافع بخش کاروبار یا سماجی خدمت کے طور پر مہیا کی جاتی ہیں جب کہ علاج کے لیے لوگ روایتی طبیبوں وغیرہ سے رجوع کرتے ہیں جو بے ضابطہ اور غیر تسلیم شدہ طریقوں سے کام کرتے ہیں۔ ان سرگرمیوں کو سہارا دے کر بہتر بنانے کی رسمی سیکٹر یا حکومت کی طرف سے کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔ مثلاً کراچی کے تقریباً دس لاکھ کی آبادی کے علاقے اورنگی کے ایک جائزے سے معلوم ہوا کہ وہاں ۷۶ سرکاری اسکول ہیں جب کہ مختلف "ایجوکیشن سوسائٹیاں" ۵۶۹ پرائیویٹ اسکول چلا رہی ہیں۔ ان پرائیویٹ اسکولوں کی فیسیں علاقے کے لوگوں کی مالی حالت کے مطابق ہیں۔ علاوہ ازیں اورنگی میں پانچ سرکاری اسپتال اور چار خاندانی منصوبہ بندی کے مراکز ہیں جب کہ سات پرائیویٹ اسپتال، ۵۹۶ پرائیویٹ کلینک اور ۳۸ پرائیویٹ میٹرنٹی ہوم کام کر رہے ہیں۔ ایشیائی شہروں کی بہت سی غریب آبادیوں میں کم و بیش ایسی ہی صورتِ حال ہے۔

ان تمام شعبوں میں غیر رسمی سیکٹر کی سرگرمیوں کو سرکاری طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا اور نہ انھیں سرکاری اعداد و شمار، پالیسی سازی، منصوبہ بندی اور منصوبوں کے نفاذ کے عمل کا حصہ بنایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود حقیقت یہی ہے کہ غریب باشندوں کی — جنھیں ایشیائی شہروں میں بجائے خود ایک بڑا مسئلہ سمجھا جاتا ہے — بیشتر ضرورتیں اسی سیکٹر کے ذریعے پوری ہوتی ہیں۔ اکثر اوقات یہ سرگرمیاں سرکاری قوانین اور ضوابط کے دائرے سے باہر رہتی ہیں، لیکن اب انھیں مجبوراً برداشت کیا جانے لگا ہے گو کسی قسم کا سہارا اب بھی نہیں دیا جاتا۔ اس سیکٹر کے کرتا دھرتا جارح کاروباری افراد ہیں۔ یہ سیکٹر غریبوں کا سخت استحصال کرتا ہے اور اس کا ترقیاتی کام گھٹیا معیار کا ہوتا ہے۔ لیکن دوسری طرف اس کی سرگرمیاں شہروں کے غریب باشندوں کی ثقافت، معاشرت اور مالی حالت سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ نامناسب طور پر ہی سہی، لیکن یہ غریب اور کم آمدنی والے شہری طبقوں کی ضروریات پوری کرتا ہے جب کہ رسمی سیکٹر یہ کام بالکل نہیں کر سکتا۔ اس سیکٹر کی سرگرمیوں کو بہتر بنانے اور سہارا دینے کے موثر طریقے وضع کیے گئے ہیں جن کے ذریعے اس کے کام کو بہتر بنانا اور اس کے استحصال پر قابو پانا ممکن ہے۔ اس کی ایک مثال کراچی میں اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کا ہاؤسنگ پروگرام ہے جس کے تحت سیمنٹ کے بلاک بنانے والوں کو قرضے اور تکنیکی امداد فراہم کی گئی۔ اس امداد کے نتیجے میں ان کی مصنوعات کا معیار بہتر ہوا، پیداوار بڑھی اور لاگت میں کمی آئی۔

Scanned with CamScanner

مافیا

شہروں کی نااہل اور بدعنوان سرکاری انتظامیہ غریب اور کم آمدنی والے طبقوں کی ضروریات پوری کرنے میں ناکام رہتی ہے اور انھیں کسی طرح کا تحفظ نہیں دے سکتی۔ غیررسمی سیکٹر کے کاروباری لوگ اور دلال اس صورت حال کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ سرکاری زمین پر غریب باشندوں کو بسا کر زمین کی قیمت وصول کرتے ہیں جب کہ اس زمین پر بسنے والے ملکیت کے قانونی تحفظ سے محروم رہتے ہیں۔ وہ غریب باشندوں کو روزگار پر لگواتے ہیں اور اس کے بدلے میں ان سے غیرقانونی ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ وہ انھیں مکان بنانے یا چھوٹا موٹا کاروبار شروع کرنے کے لیے قرض دیتے ہیں اور ظالمانہ شرح پر سود وصول کرتے ہیں۔ وہ انھیں پولیس کی زیادتیوں سے بچانے کے لیے بھتّا وصول کرتے ہیں جس میں پولیس کا باقاعدہ حصّہ ہوتا ہے۔ اپنی ان سرگرمیوں کے لیے وہ غنڈوں کو اُجرت پر رکھتے ہیں اور سرکاری اہلکاروں سے اپنے تعلقات کو استعمال کرتے ہیں۔ اپنی سرگرمیوں کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کی غرض سے وہ منشیات فروخت کرتے ہیں، عصمت فروشی اور قماربازی کے اڈّے چلاتے ہیں اور ہر قسم کی اسمگلنگ اور بلیک مارکیٹنگ کرتے ہیں۔ ان تمام سرگرمیوں کے لیے کارندے شہر کے اُنھیں غریب باشندوں میں سے بھرتی کیے جاتے ہیں جن کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے یہ غیررسمی سیکٹر وجود میں آیا تھا۔

یہ مافیا سرکاری اہلکاروں، خصوصاً پولیس، کی مدد کے بغیر کام نہیں کر سکتے۔ یہ شہر کے خوش حال علاقوں میں بھی کام نہیں کر سکتے کیوں کہ ان علاقوں میں رہنے والے لوگ اقتدار کی مختلف سطحوں تک رسائی رکھتے ہیں۔ اس طرح ان مافیاؤں کو غریب اور کم آمدنی والے علاقوں میں حکومت کا سا اختیار حاصل ہو جاتا ہے اور شہر ان علاقوں اور خوش حال علاقوں کے درمیان تقسیم ہو جاتا ہے۔ غریب علاقوں میں تمام سیاسی جماعتیں اپنی انتخابی مہم کے لیے انھیں مافیاؤں سے مالی اور تنظیمی امداد حاصل کرتی ہیں جس کے بدلے میں ان کی سرگرمیوں کو سیاسی تحفظ بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسے اکادکا موقعوں کو چھوڑ کر جب واقعی کوئی عوامی تحریک موجود ہو، انتخابات میں کامیاب ہونے والے امیدوار بھی یا تو مافیا کے لوگ ہوتے ہیں یا انھیں مافیا کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔

اس طرح شہر کے غریب باشندوں کو روزگار، سہولتیں اور اقتدار تک رسائی فراہم کرنے میں ناکام رہ کر ریاست انھیں انصاف اور تحفظ مہیا کرنے سے بھی قاصر رہتی ہے۔ ریاست کی یہ ناکامی شہری علاقوں میں تشدد، ظلم اور جبری بھتّوں کی وصولی کے نظام کی بنیاد رکھ دیتی ہے۔

Scanned with CamScanner

شہر کے غریب باشندے

یہ باشندے زیادہ تر شہر کی غیر قانونی کچی آبادیوں میں رہتے ہیں۔ اپنی خریدی ہوئی زمین کی ملکیت کا قانونی تحفظ حاصل کرنے کے لیے یہ خود کو منظم کر کے سیاسی اور انتظامی اداروں پر اجتماعی دباو ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاں کہیں ان کی تنظیموں کو قانون، منصوبہ بندی اور تنظیم کے معاملات میں ماہرانہ امداد حاصل ہوتی ہے وہاں وہ خاصی حد تک کامیاب رہتے ہیں۔ ایسی امداد کی غیر موجودگی میں اپنے طور پر کام کرنے میں انھیں ہمیشہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان باشندوں کے عدم تحفظ کی صورتِ حال جس قدر شدید ہو، اتنے ہی زیادہ یہ مافیاؤں اور سرکاری ایجنسیوں —— خصوصاً نفاذِ قانون کی ایجنسیوں —— کے استحصال کی زد میں رہتے ہیں۔ ان کو ماہرانہ امداد دردمند پیشہ ور ماہروں اور غیر سرکاری تنظیموں سے حاصل ہوتی ہے۔ ان کی مداخلت سے ایک طرف غریب باشندوں کو وہ معلومات دستیاب ہوتی ہیں جو سرکاری محکموں سے معاملت کرنے کے لیے ضروری ہے، اور دوسری طرف اقتدار کے مرکزوں تک کسی نہ کسی سطح پر رسائی اور ترقیاتی کاموں کے لیے تکنیکی امداد بھی ملتی ہے۔ تاہم، یہ ماہرین اور تنظیمیں بہت کم تعداد میں ہیں اور ان کی امداد بمشکل پانچ فیصد شہری آبادی تک پہنچ پاتی ہے۔ ان کی تعداد میں اس تیزی سے اضافہ بھی نہیں ہو رہا ہے جس تیزی سے شہروں کی غریب آبادی بڑھ رہی ہے۔

غیر سرکاری تنظیمیں

روایتی طور پر غیر سرکاری تنظیمیں شہری آبادیوں اور سرکاری ایجنسیوں کے درمیان ایک پُل کے طور پر کام کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مفروضہ یہ ہوتا ہے کہ سرکاری ایجنسیاں غیر سرکاری تنظیموں کی حکمتِ عملی کو، جو ان کے عملی تجربے کی بنیاد پر وضع کی گئی ہے، اپنے سرکاری کام کا حصہ بنا سکتی ہیں۔ لیکن چوں کہ سرکاری ایجنسیوں کو وہ عملی تجربہ حاصل نہیں ہوتا، اس لیے اگر وہ غیر سرکاری تنظیموں کی حکمتِ عملی کو قبول کر بھی لیں تو یہ کسی مخصوص علاقے یا پروجیکٹ تک محدود رہتی ہے۔
بعض صورتوں میں ان تنظیموں نے غیر رسمی سیکٹر کا کردار اختیار کر کے غریب شہریوں کو استحصال سے بچانے کی بھی کوشش کی ہے، لیکن اس طرح کی کوئی تنظیم غیر رسمی سیکٹر کا متبادل نہیں بن سکتی اور ایسی کوششیں یا تو غیر اہم رہتی ہیں یا مکمل طور پر ناکام ہو جاتی ہیں۔
حکومت کی منصوبہ بندی کی دستاویزات میں غیر سرکاری تنظیموں کی حوصلہ افزائی اور ان کو ترقیاتی کام میں شامل کرنے کا ذکر آنے لگا ہے۔ حکومت کو امداد فراہم کرنے والے بین الاقوامی ادارے

Scanned with CamScanner

بھی اپنی امداد سے چلنے والے پروگراموں میں ان کی شمولیت پر زور دینے لگے ہیں۔ لیکن انھیں شامل کرنے کی صورت میں ان سے سرکاری پروگراموں کو سرکاری شرائط پر قبول کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ غیر سرکاری تنظیموں کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ غیر رسمی سیکٹر کو استحصالی اور غیر مہذب قرار دے کر اس کے ساتھ مل کر کام کرنے کے تصور کو مسترد کر دیتے ہیں۔ اس سیکٹر کی سرگرمیاں ان کے مطالعے اور تحقیق کا موضوع بھی نہیں بنتیں۔ اگر ان سرگرمیوں کے منفی پہلوؤں پر توجہ مرکوز رکھنے کے بجائے مثبت پہلوؤں کو قریبی مطالعے کے ذریعے سمجھنے اور بہتر بنانے کی کوشش کی جائے تو غیر سرکاری تنظیمیں اپنے وسائل کو زیادہ موثر طور پر استعمال کر سکتی ہیں اور رفتہ رفتہ اس سیکٹر کو غریب باشندوں کے لیے زیادہ کار آمد بنا سکتی ہیں۔

رسمی سیکٹر

ایشیائی شہروں میں رہائشی زمین کے معاملے میں سب سے اہم کردار رسمی سیکٹر کے ڈویلپروں کا ہوتا ہے۔ شہروں میں مقیم درمیانہ طبقے کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے جس کی بدولت کاروباری اور تجارتی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ چوں کہ جائیداد محفوظ ترین سرمایہ کاری ہے، اس لیے درمیانہ طبقے کے لوگ اسے منافع کمانے کی غرض سے خریدتے ہیں۔ ڈویلپر ان کی اسی طلب کو پورا کرتے ہیں اور اس طبقے کی ضرورت سے کہیں زیادہ تعداد میں پلاٹ، مکانات اور فلیٹ تیار کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ زمین کے بڑے بڑے قطعات خریدتے ہیں جنھیں شہر کے غریب باشندوں کو رہائشی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا کیوں کہ یہ زمین روزگار کی جگہوں کے نزدیک واقع ہوتی ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ڈویلپر اس میں سے بیشتر زمین غریب آبادیوں کو بے دخل کر کے حاصل کرتے ہیں۔ یہ بے دخلی عموماً ڈرا دھمکا کر غیر قانونی طریقے سے کی جاتی ہے اور اس میں ڈویلپروں کو سرکاری اہلکاروں اور پولیس کی عملی امداد حاصل ہوتی ہے۔

جائیداد کا لین دین بہت بڑی تجارت ہے اور یہ تاجر اونچے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں سیاست دان، اعلیٰ ترین سرکاری افسر اور پالیسی ساز بھی شامل ہیں۔ جو کچھ انھیں اپنے تعلقات کے بل پر حاصل نہ ہو سکے وہ اسے سیاست دانوں، سرکاری اہلکاروں وغیرہ کو رشوت دے کر حاصل کر لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ بلدیاتی اداروں اور اسمبلیوں کے انتخابات میں مختلف سیاسی پارٹیوں کے امیدواروں کی انتخابی مہم کے اخراجات برداشت کرتے ہیں اور یوں انھیں پالیسی سازی میں خاصا عمل دخل حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی ایسی پالیسی وضع کر لی جائے جس سے ان کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو وہ اسے عملاً بے اثر بنانے کی بھی طاقت رکھتے ہیں۔ بیشتر شہروں میں ڈویلپروں نے اپنی ایسوسی ایشنیں قائم کر

Scanned with CamScanner

رکھی ہیں جو مافیا کے انداز میں کام کرتی ہیں۔ حکومت کی طرف سے دی جانے والی مالی رعایتیں اور قرضوں کی سہولتیں زیادہ تر انہیں کے کام آتی ہیں اور شہری پالیسیاں تیار کرنے والی تقریباً ہر کمیٹی میں ان کا ایک نہ ایک نمائندہ ضرور موجود ہوتا ہے۔ رسمی سیکٹر کے ڈویلپر غریب باشندوں کو رہائشی سہولتیں فراہم کرنے سے دل چسپی نہیں رکھتے کیوں کہ اس کاروبار میں منافعے کی شرح کم ہے۔ پھر ان کے اور غریب باشندوں کے درمیان عناد کا رشتہ ہوتا ہے کیوں کہ وہ اپنے کاروبار کے لیے بیشتر زمین غریبوں کی آبادیاں مسمار کر کے حاصل کرتے ہیں۔ شہروں کے جن علاقوں میں زمین کی قیمت میں تیزی سے اضافہ ہوتا ہے وہاں موجود غریب باشندوں کی جھگیوں میں آگ لگنے کے واقعات ہونے لگتے ہیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ یہ آگ حادثاتی طور پر نہیں بلکہ سرکاری ایجنسیوں، بلڈروں، جائیداد کے دلالوں اور بڑے تجارتی مفادات رکھنے والوں کی سازش کے نتیجے میں لگتی ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ جائیداد کے تاجروں کی لابی کو شہر کی سطح کے مسائل سے دل چسپی نہیں ہوتی۔ شہروں کا معیارِ زندگی بلند کرنے اور ماحول کو بہتر بنانے کے سلسلے میں ان کی تمام کوششوں کا مقصد صرف منافع کمانا ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ فلاحی کاموں پر رقم بھی خرچ کرتے ہیں اور تعلیم، علاج اور تفریح کے مراکز قائم کرتے ہیں لیکن یہ مراکز غریبوں کے کام نہیں آتے اور نہ غریب علاقوں میں واقع ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں جائیداد کے تاجروں اور شہروں کے مافیاؤں کے درمیان خفیہ سیاسی اور اقتصادی تعلقات کی بھی متواتر نشان دہی کی جاتی ہے۔

بڑے صنعت کار اور تاجر اپنے کارخانوں اور تجارتی اداروں کے لیے مزدور اور کارکن غیر رسمی سیکٹر میں کام کرنے والے ٹھیکے داروں کے ذریعے روزانہ اُجرت پر حاصل کرتے ہیں۔ رسمی سیکٹر کے آجر ٹھیکے پر مزدور رکھ کر لیبر قوانین کی پابندیوں سے آزاد اور یونین بننے کے خطرے سے محفوظ رہتے ہیں اور مزدوروں کو ان کے قانونی حقوق سے محروم رکھ کر ان کا سخت استحصال کرتے ہیں۔ ان مزدوروں کو قابو میں رکھنے کے لیے ٹھیکے دار، اُجرتی غنڈے اور پولیس آجروں کی عملی مدد کرتے ہیں۔

بیشتر بڑے شہروں میں ایوانِ صنعت و تجارت ضرور موجود ہوتے ہیں۔ یہ تنظیمیں حکومت کی اقتصادی پالیسیوں اور سرمایہ کاری کی ترجیحات متعین کرنے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ان میں شامل افراد سیاست داں اور وزیر بھی بنتے ہیں۔ تاہم، یہ تنظیمیں اپنی طرزِ فکر میں نہایت قدامت پرست ہوتی ہیں اور شہر کے سماجی مسائل سے کوئی دل چسپی نہیں رکھتیں۔ بیوروکریسی کے اعلیٰ ترین افسروں سے قریبی تعلقات رکھنے کے باعث انہیں ریاستی ڈھانچے میں تبدیلی کی ضرورت کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔

تقریباً ہر شہر میں شہریوں اور پیشہ ور افراد کی بھی باقاعدہ انجمنیں ہوتی ہیں جو ماحول کو بہتر بنانے کے لیے یا صارفین کے مفادات کے تحفظ کے لیے لابی کے طور پر کام کرتی ہیں۔ ان میں سے بہت سی انجمنیں چندے وغیرہ کے ذریعے وسائل جمع کر کے مقامی سطح کا ترقیاتی کام بھی کرتی ہیں۔ اونچے درمیانہ

Scanned with CamScanner

یا صاحبِ اقتدار طبقوں سے تعلق رکھنے کی بدولت انھیں اقتدار کے مراکز تک رسائی بھی حاصل ہوتی ہے۔ تاہم یہ انجمنیں سماجی حالات کو جوں کا توں رکھنے کے حق میں ہوتی ہیں اور ایسی پالیسیاں یا ترقیاتی ترجیحات متعین کرنے کے عمل میں حصّہ نہیں لیتیں جن کا تعلق شہری آبادی کی اکثریت یعنی غریب اور کم آمدنی والے باشندوں کی ضروریات اور مسائل سے ہو۔ ایسی انجمنوں کا شہر کی غریب بستیوں سے رابطہ بھی نہیں ہوتا اور نہ یہ عموماً سیاست سے کوئی نظریاتی دل چسپی رکھتی ہیں۔

ایشیا کے بڑے شہروں میں پیشہ ور ماہروں کی ایسوسی ایشنیں موجود ہیں۔ ان ماہرین میں ڈاکٹر، وکیل، آرکیٹیکٹ، منصوبہ سازی کے ماہر، انجنیئر، سماجی سائنس داں وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے متعدد تنظیموں کو حکومتیں پالیسی سازی کے عمل میں شامل کرتی ہیں۔ لیکن ان تنظیموں کے ارکان اونچے طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور انھوں نے روایتی طور پر تعلیم اور تربیت حاصل کی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں، حکومت کی روایتی ترقیاتی پالیسیوں اور رویّوں کو قائم رکھنے میں ان کا ذاتی مفاد بھی ہوتا ہے کیوں کہ یہ افراد حکومت کے ترقیاتی پروگراموں میں مشیر اور کنسلٹنٹ کے طور پر شامل کیے جاتے ہیں۔ ایشیا کی حد تک یہ پیشہ ورانہ ایسوسی ایشنیں دراصل ٹریڈ یونینوں کے طور پر کام کرتی اور اپنے ارکان کو حاصل مالی اور سیاسی مراعات کے تحفظ کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔ اگر ان کا کوئی رکن انفرادی طور پر یا چند ارکان گروپ کی شکل میں کوئی غیر روایتی کام شروع کریں تو انھیں ان ایسوسی ایشنوں کی جانب سے کوئی عملی امداد نہیں ملتی۔

شہروں میں تدریسی اور تحقیقی ادارے خاصی تعداد میں ہوتے ہیں جن کے کام کا تعلق شہری منصوبہ بندی اور پالیسی سازی کے مختلف پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ لیکن ان اداروں کا اندازِ نظر روایتی ہوتا ہے اور وہ اپنے اردگرد کی دنیا کو اُنھیں اصطلاحات اور تعصبات کی روشنی میں دیکھتے ہیں جو ترقی یافتہ دنیا کے حالات اور تجربات کی بنیاد پر وضع کیے گئے ہیں۔ ان اداروں کو مقامی حالات اور طور طریقوں سے واقفیت نہیں ہوتی چناں چہ وہ ایسے تربیت یافتہ افراد تیار نہیں کرسکتے جو آگے چل کر سرکاری منصوبہ بندی اور پالیسی سازی کا رخ تبدیل کرسکیں۔ جہاں کہیں ان تدریسی اور تحقیقی اداروں نے آبادی کی نچلی سطحوں کی تنظیموں کے ساتھ مل کر کام کیا ہے وہاں صورتِ حال میں خاصی تبدیلی آئی ہے؛ لیکن بدقسمتی سے ایسی مثالیں بہت کم ہیں۔

شہروں کے رہائشی مسائل کے بارے میں پرائیویٹ اور سرکاری دونوں قسم کے تحقیقی ادارے پہلے سے موجود پالیسیوں اور رویّوں کے مطابق صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں اور وہی معلومات جمع کرتے ہیں جن سے ان پالیسیوں اور رویّوں کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ وہ ان طریقوں کا مطالعہ نہیں کرتے جن کے ذریعے غریب اور کم آمدنی والے شہری باشندے کسی سرکاری اعانت کے بغیر اپنے رہائشی مسائل کا حل نکالتے ہیں۔ مثلاً یہ حقیقت نظرانداز کردی جاتی ہے کہ یہ شہری باشندے رفتہ رفتہ اپنی بچت اور کم میعادی اور چھوٹے قرضوں کے ذریعے اپنے مکانوں کو بہتر بناتے رہتے ہیں۔ سرکاری تحقیقی اداروں کے جمع کیے

ہوئے اعداد و شمار بھی مقامی حالات سے ناواقفیت یا بے اعتنائی کے باعث ناقص رہ جاتے ہیں۔

سرکاری ایجنسیاں

شہری منصوبہ بندی اور انتظام سے تعلق رکھنے والی ایجنسیوں کے افسر، جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، اونچے طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں، روایتی تعلیم اور تربیت حاصل کرتے ہیں اور مقامی حالات سے ناواقف ہوتے ہیں۔ شہر کے غریب باشندوں کے بارے میں ان کا رویہ شک اور عداوت پر مبنی ہوتا ہے اور وہ ان باشندوں کے سماجی اور معاشی حالات اور ان میں آنے والی تبدیلیوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ رہائش، قرضوں، ٹرانسپورٹ اور دوسرے شعبوں میں غریب باشندوں کے بارے میں پالیسیاں تیار کرنے کے عمل میں ان باشندوں اور ان کی ضروریات پوری کرنے والے غیر رسمی سیکٹر کی رائے تک طلب نہیں کی جاتی۔ چناں چہ یہ پالیسیاں صورتِ حال کو بہتر بنانے میں ناکام رہتی ہیں۔

پالیسی سازی کے مسائل سے قطعِ نظر، ان پالیسیوں کے نفاذ اور شہری انتظام کے شعبوں میں سرکاری ایجنسیوں (خصوصاً پولیس) کا مافیاؤں، ڈویلپروں اور جرائم پیشہ افراد کے ساتھ گٹھ جوڑ ہوتا ہے جو سرکاری طریقِ کار سے جواب دہی اور شفافیت کے تصور کو بالکل ختم کر دیتا ہے۔ چناں چہ غریب طبقوں کے لیے انصاف حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے اور طبقاتی امتیاز میں اور زیادہ شدت پیدا ہوتی ہے۔ حکومت اگر کوئی ترقی پسندانہ قانون وضع بھی کر لے تو غریبوں سے متصادم مفادات رکھنے والے گروہوں اور سرکاری حکام کا یہ گٹھ جوڑ اس کے عملی نفاذ کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر، پاکستان میں لینڈ ایکویزیشن ایکٹ موجود ہے جس کے تحت حکومت غریب شہریوں کو رہائش فراہم کرنے کے لیے کسی بھی زمین کو ایک معینہ قیمت ادا کر کے (جو مارکیٹ کے نرخ سے خاصی کم ہوتی ہے) جبراً خرید سکتی ہے۔ لیکن یہ قانون صرف کاغذ پر وجود رکھتا ہے اور کبھی عمل میں نہیں لایا گیا۔

عام طور پر محسوس کیا جاتا ہے کہ موثر بلدیاتی ادارے شہری بدانتظامی کی صورتِ حال بدلنے کا ذریعہ ہو سکتے ہیں۔ شہری انتظام میں حصہ لینے والے تمام فاعل کرداروں میں بھی یہ احساس رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے کہ مستحکم اور خود کفیل بلدیاتی اداروں کا قیام موزوں شہری پالیسیوں کے نفاذ، ترقیاتی کام، انفرااسٹرکچر اور شہری سہولتوں کی فراہمی اور دیکھ بھال کے لیے لازمی ہے کیوں کہ وہی شہر کے غریب اور انصاف سے محروم طبقوں کے ساتھ عملی رابطہ رکھ سکتے ہیں۔ حکومت کے پنج سالہ منصوبوں، امداد اور قرض دینے والے بین الاقوامی اداروں کی رپورٹوں اور غیر سرکاری تنظیموں کی مطبوعات میں بھی اس نکتے کا بار بار ذکر آتا ہے۔ لیکن بیشتر شہروں میں بلدیاتی ادارے مالی طور پر دیوالیہ ہیں۔ شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لحاظ سے ان کے محصولات کم ہو رہے ہیں اور غیر ترقیاتی اخراجات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان پر

Scanned with CamScanner

قرضوں کا بوجھ بہت زیادہ ہے اور وہ بیوروکریسی کی سخت گرفت میں ہیں۔ منتخب بلدیاتی اداروں کو صوبائی اور قومی قانون ساز اداروں اور سیاست دانوں کا حریف سمجھا جاتا ہے۔ چناں چہ جب منتخب بلدیاتی ادارے موجود ہوں تب بھی وہ اپنے محدود اختیارات موثر طور پر استعمال نہیں کر پاتے۔

علاوہ ازیں، ایشیائی ملکوں کے حالیہ اقتصادی رجحانات ــــــ پرائیوٹائزیشن، آزاد تجارت کی حوصلہ افزائی وغیرہ ـــ اور شہری انتظام میں مافیاؤں کے بڑھتے ہوئے اثر نے موثر بلدیاتی اداروں کے قیام کو مزید مشکل بنا دیا ہے۔ ان عوامل نے شہری آبادی کو دو الگ الگ دنیاؤں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک طرف غریب اور نچلے درمیانہ طبقے کے لوگ شہروں کی بیرونی سرحدوں کی طرف دھکیلے جا رہے ہیں اور ان کی رہائش اور روزگار کی جگہوں کے درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے، اور دوسری طرف خوش حال لوگوں کے علاقے امیروں کے بند محلوں (ghettos) کی صورت اختیار کر رہے ہیں جہاں وہ مسلح پہرے داروں اور سکیورٹی کے جدید آلات کی حفاظت میں رہتے ہیں۔ نتیجتاً شہروں کے مرکزی علاقوں سے ثقافتی اور تفریحی سرگرمیاں ختم ہو گئی ہیں؛ یہ سرگرمیاں اب صرف چند ایسے مقامات تک محدود ہو چکی ہیں جو غریب اور نچلے طبقے کے شہریوں کی پہنچ سے باہر ہیں۔ امداد اور قرض دینے والے بین الاقوامی ادارے ایشیائی ملکوں کے مالی نظام میں جن تبدیلیوں پر زور دے رہے ہیں ان کے نتیجے میں اس تفریق میں مزید شدت پیدا ہو گی کیوں کہ ان سے پیدا ہونے والی مہنگائی نچلے طبقوں کی زندگی کو اور دشوار بنا دے گی۔

***

* ناموزوں شہری پالیسیاں

* تعلیم یافتہ اور صاحبِ حیثیت طبقات کی شہری معاملات سے بے خبری اور بے اعتنائی، اور

* سرکاری اہلکاروں (خصوصاً پولیس) کا مفادی گروہوں اور مافیاؤں کے ساتھ گٹھ جوڑ

ان تین عوامل کے تحت بہت سے ایشیائی شہروں کا انتظام ایسی مسخ اور غیر منصفانہ شکل اختیار کر لیتا ہے جس میں تشدد ایک لازمی عنصر کے طور پر شامل ہوتا ہے۔ یہ تشدد مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے:

(۱) غیر رسمی سیکٹر کی بسائی ہوئی کچی بستیوں میں مافیا کی حکمرانی ہوتی ہے اور یہ حکمرانی وہاں کے باشندوں کو خوف کے زیرِ اثر رکھنے، منظم ہونے سے روکنے اور تشدد کے استعمال کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ مافیا کا یہ تشدد اُجرتی غنڈوں اور پولیس کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ یہ تمام سرگرمیاں انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے موجود تمام ملکی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کی جاتی ہیں۔ ان بستیوں میں رہنے والی کراچی کی نصف آبادی تشدد کے اسی ماحول میں زندگی بسر کرتی ہے، اور یہ بستیاں شہر کی آبادی میں ہونے والے اضافے کی شرح کے مقابلے میں دگنی رفتار سے بڑھ رہی ہیں۔

(۲) شہر کے نسبتاً خوش حال علاقوں میں زمین کی قیمت میں تیزی سے اضافہ ہوتا ہے اور جائیداد کے تاجر وہاں موجود غریب اور کم آمدنی والی بستیوں کو بُل ڈوزروں کے ذریعے مسمار کروا کے اپنے تعمیراتی منصوبوں کے لیے زمین کے قطعات حاصل کرتے ہیں۔ یہ انہدام اور بے دخلی بھی اُجرتی غنڈوں، انتظامی اہلکاروں اور پولیس کا تعاون حاصل کر کے کی جاتی ہے۔ خوش حال علاقوں کے درمیان قائم جھگیوں میں آگ لگنے کے واقعات بعض دوسرے ایشیائی شہروں کی طرح کراچی میں بھی بڑھتی ہوئی تعداد میں پیش آنے لگے ہیں۔

(۳) ایشیائی شہروں کے مافیا اور جائیداد کے تاجر انتخابات میں سیاسی پارٹیوں کے امیدواروں کی سیاسی مہم کے مالی اخراجات برداشت کرتے ہیں اور تنظیمی کارکن بھی فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی سرگرمیوں کو سیاسی تحفظ بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ پچھلے دنوں ایک اخباری رپورٹ میں انکشاف کیا گیا تھا کہ ہندوستانی پارلیمنٹ کے ۵۴۲ ارکان میں سے ۱۸۰ مجرمانہ ریکارڈ رکھتے ہیں۔ پاکستان کی قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کے بارے میں اس قسم کی تحقیق کی جائے تو خاصے دل چسپ نتائج سامنے آئیں گے۔ سرکاری اہلکاروں اور مافیاؤں کے گٹھ جوڑ میں سیاست دانوں کی شمولیت قانونی عمل، شہری منصوبہ بندی اور پالیسیوں کے نفاذ کو ایک مذاق بنا دیتی ہے۔ طاقت ور تجارتی مفادات رکھنے والوں کی بالادستی کے باعث خوش حال علاقوں کو چھوڑ کر باقی شہر کی ضرورتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اقتدار کی کسی بھی سطح تک رسائی نہ رکھنے والے غیر منظم غریب باشندے مفاد پرست تاجروں اور مافیاؤں، بدعنوان سرکاری ایجنسیوں اور موقع پرست سیاست دانوں کے اس گٹھ جوڑ کے یرغمال بن کر رہ جاتے ہیں۔

(۴) شہری مطالعات کے غیر سرکاری اداروں کی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ایشیا کے بعض بڑے شہروں میں مافیا کی مجرمانہ اور پُرتشدد سرگرمیوں میں منشیات کی تجارت سے حاصل ہونے والا سرمایہ استعمال کیا جاتا ہے۔ کراچی میں ان واقعات کے شواہد موجود ہیں کہ غریب علاقوں میں منشیات کی تجارت کے خلاف شہریوں کی چلائی ہوئی تحریکوں کو پولیس نے تشدد سے کچل ڈالا۔

شہری بدانتظامی اور تشدد کی یہ صورتِ حال شہر کی غریب بستیوں کے حالات پر ہولناک اثرات مرتب کرتی ہے۔ علاوہ ازیں ان آبادیوں کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد شہریوں کی دوسری یا تیسری نسل کے نوجوانوں پر مشتمل ہے جن کا ملک کے دیہی علاقوں کی معیشت اور کلچر سے تعلق ختم ہو چکا ہے۔ اس تعلق کی جگہ لینے والی شہری اقدار ریاست کے ساتھ اُن کے رشتے کو تبدیل کر رہی ہیں۔ خاندان اور برادری کے قدیم نظام سے ٹوٹ کر شہری نوجوان ایسے اداروں سے تعلق قائم کرنے کے ضرورت مند ہیں جو ان کی نئی امنگوں اور قدروں کی عکاسی کر سکیں۔ وہ ریاستی اداروں سے یہ اہم کردار ادا کرنے کی توقع کرتے ہیں مگر انھیں ہمیشہ مایوسی ہوتی ہے۔ اس طرح ان میں اجنبیت اور علیحدگی کا احساس جڑ پکڑ لیتا ہے۔ اس پورے عمل میں ان کے والدین کا کنٹرول بھی کمزور پڑ جاتا ہے اور بغاوت کے رجحان کو

Scanned with CamScanner

تقویت ملتی ہے۔

ایک اور اہم عنصر بے روزگاری ہے۔ اوپر بیان کیے گئے حالات میں جوان ہونے والا فرد شہر کی سیاسی اور سماجی زندگی سے کوئی تعلق پیدا نہیں کر پاتا۔ بے روزگاری اس بے تعلقی اور اجنبیت کے احساس کو اور شدید کر دیتی ہے جس کے نتیجے میں یا تو متبادل سیاسی نظام کی جستجو پیدا ہوتی ہے یا پھر شہروں میں سرگرم مافیا کی زیرزمین دنیا سے وابستہ ہو کر، یا انفرادی طور پر، جرم کا رجحان جنم لیتا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ فرد شہری تشدد میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ کراچی ڈویلپمنٹ پلان ۲۰۰۰ کے مطابق ۱۹۸۹ میں کراچی میں بے روزگاری کی شرح ۱۲.۸ فیصد تھی۔ بے روزگاری کو اسی سطح پر برقرار رکھنے کے لیے ۱۹۸۹ کے بعد آنے والے پانچ برسوں میں روزگار کے ۱۱ لاکھ نئے مواقع پیدا کرنا ضروری تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ اس کے برعکس، شواہد بتاتے ہیں کہ رسمی سیکٹر میں روزگار کے مواقع کم ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، کراچی میں ۷۵ فیصد روزگار غیر رسمی سیکٹر فراہم کرتا ہے۔ ۱۹۷۴ میں غیر رسمی سیکٹر کے مہیا کیے ہوئے روزگار کے مواقع کی تعداد ۵۸ فیصد تھی۔ ان اعداد و شمار سے صورتِ حال کی بخوبی نشان دہی ہو جاتی ہے۔ جن شہروں میں ریاستی ادارے مکمل طور پر تباہ نہیں ہوئے ہیں اور نسلی، لسانی یا مذہبی تفریق نے سیاسی رخ اختیار نہیں کیا ہے، وہاں تشدد اور جرائم نے سرکاری ایجنسیوں اور سیاسی نظام کے لازمے کی حیثیت اختیار نہیں کی ہے؛ ایسے شہروں میں تشدد پر قابو پانا ممکن ہوا ہے۔ کراچی میں ایسا نہیں ہوا۔

کراچی میں موجود لسانی یا نسلی گروہوں کے تنازعات کو شہر میں آنے والی مہاجرت کی دو بڑی لہروں کا جائزہ لیے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ ۱۹۴۷ کے بعد کے چار برسوں میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے چھ لاکھ مہاجر شہر میں آئے جس کے باعث شہر کی آبادیاتی صورتِ حال بالکل بدل کر رہ گئی۔ ۱۹۴۷ سے ۱۹۸۵ تک کے اڑتیس برسوں میں کراچی اور سندھ کے دوسرے شہروں کی مہاجر آبادی نے ایک کے بعد ایک آنے والی وفاقی حکومتوں اور ایسی سیاسی پارٹیوں کا ساتھ دیا جو مضبوط مرکز کی حامی تھیں۔ ان کا یہ طرزِ عمل صوبے کی سندھی اکثریت کی امنگوں سے متصادم تھا، چناں چہ صوبے کے دیہی اور شہری علاقوں کے درمیان سیاسی تقسیم گہری ہوتی گئی جس نے صوبے کی، اور خصوصاً کراچی کی، سیاست پر گہرا اثر ڈالا۔ صوبائی اسمبلی میں دیہی علاقوں کے نمائندے اکثریت میں ہیں، اور کراچی کے باشندے محسوس کرتے ہیں کہ وہ شہر کے بنیادی مسائل سے واقفیت اور ان مسائل کو حل کرنے سے دل چسپی نہیں رکھتے۔ ۱۹۵۰ اور ۱۹۶۰ کی دہائیوں میں شمال مغربی سرحدی صوبے اور وسطی پنجاب سے لوگ بڑی تعداد میں کراچی منتقل ہوئے؛ بعد کے برسوں میں کراچی آنے والوں میں پنجاب کے سرائیکی علاقے کے لوگ زیادہ ہیں۔ اس طرح شہر میں مہاجروں کی آبادی کی فیصد شرح کم ہوئی ہے اور متواتر کم ہو رہی ہے۔ صوبہ سرحد اور پنجاب سے آنے والوں نے شہر کے ٹرانسپورٹ، ہول سیل مارکیٹ،

Scanned with CamScanner

تعمیرات اور صنعت کے شعبوں میں مختلف پیشے اختیار کیے، جبکہ مہاجروں کی بڑی تعداد سفید کالر ورکروں پر مشتمل ہے۔ کراچی کے نسلی گروہوں کے درمیان تنازعات کی کوئی حقیقی معاشی بنیاد موجود نہیں ہے۔ تاہم، سیاسی موقع پرستی، مختلف حکومتوں کی طرف سے جمہوری اداروں کی حوصلہ شکنی اور شہر کے نسلی گروہوں کے درمیان مسلسل رابطے اور مکالمے کے فقدان نے ان گروہوں کے درمیان گہری تقسیم پیدا کر دی ہے۔ جو لوگ اس تقسیم کے مخالف ہیں وہ اب شہر کے سیاسی دھارے میں شامل نہیں رہے۔

ایسا کیوں کر ہوا؟ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اس صورتِ حال کا خام مواد قیامِ پاکستان کے وقت سے مسلسل تیار ہو رہا تھا۔ لیکن حالیہ بحران کی شدت اور اس بحران سے نمٹنے میں انتظامیہ کی بے بسی کراچی میں ۱۹۸۰ کی دہائی میں ہونے والے واقعات کا نتیجہ ہے۔ افغان جنگ کے دنوں میں کراچی منشیات اور اسلحے کے مافیا کا علاقائی ہیڈکوارٹر بن گیا تھا۔ اس مافیا نے بہت کم عرصے میں شہر میں موجود مافیاؤں کو اپنے اندر جذب کر لیا اور ان سب کا سرغنہ بن کر شہر کی سیاست اور معیشت میں اہم حیثیت حاصل کر لی۔ اسے اُس دور کے حکمرانوں کی مضبوط سرپرستی حاصل تھی۔ اسی زمانے میں حکومت نے تمام انتہاپسند سیاسی، لسانی، نسلی اور مذہبی گروہوں کو، جو اُس وقت تک شہر کی سیاسی اور ثقافتی زندگی کی خارجی سرحدوں پر وجود رکھتے تھے، مالی امداد اور اسلحہ فراہم کیا تاکہ آمریت کے خلاف کسی متحد اور منظم مزاحمت کا سدباب کیا جا سکے۔ علاوہ ازیں سیاسی وفاداریاں خریدنے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو جبر اور تشدد کے ذریعے حاصل کرنے کے عمل کو رواج کی شکل دے دی گئی اور یہ رواج شہر کی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو گیا۔ اس عمل کے نتیجے میں سیاسی تشدد اور بے رحم ہتھکنڈوں کے استعمال کو استحکام حاصل ہوا اور شہر کی انتظامی اور شہری ایجنسیاں اس عمل کی مددگار بن گئیں۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ مارشل لا کے خاتمے کے بعد بھی یہ عمل جاری رہا اور کراچی کے ڈرامے کے تمام فاعل کردار، اپنے اعلانات کے برعکس، وہی رول ادا کرتے رہے جو مارشل لا دور میں ان کے لیے وضع کیا گیا تھا۔

اس صورتِ حال کا نتیجہ شہر کی معاشرتی زندگی کی شکست و ریخت، ریاستی اداروں کی ناکارکردگی، مافیاؤں پر دانستہ یا نادانستہ انحصار کرنے والی سیاسی پارٹیوں، اور انتظامی اور سیاسی نظام پر جرائم پیشہ گروہوں کی سخت گرفت کی صورت میں نکلا ہے، اور شہر کی آبادی کا بہت بڑا حصہ روزگار، سر چھپانے کی جگہ، تحفظ اور سیاسی نمائندگی سے محروم ہو گیا ہے۔ تاہم، ایسے حالات میں جہاں کہیں شہروں کے باشندے اپنے مسائل کے حل کے لیے منظم ہوئے ہیں وہاں وہ رفتہ رفتہ بحرانی صورتِ حال کے ہولناک نتائج پر قابو پانے میں کامیاب رہے ہیں۔ ایسی تنظیموں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور بہت سے موقعوں پر اس کے باعث تشدد میں مزید اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

**

Scanned with CamScanner

ضمیر نیازی

کی معروف اور اہم کتاب

The Press in Chains

کا اردو ترجمہ

صحافتِ پابندِ سلاسل

مجلد ۳۷۵ صفحات　　　قیمت: ۱۰۰ روپے

آج کی کتابیں

اے ۱۶، سفاری ہائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

Scanned with CamScanner

اگلے دو مضامین کراچی کی صورت حال کے دو نمایاں پہلوؤں ــــ سندھی مہاجر تنازعہ اور شہر میں مہلک ہتھیاروں کی بہتات ــــ کے تجزیے پر مبنی ہیں۔

ایس اکبر زیدی کراچی یونیورسٹی کے اپلائیڈ اکنامکس ریسرچ سنٹر (AERC) سے ریسرچ اسکالر اور استاد کے طور پر وابستہ ہیں۔ آئندہ صفحات میں ان کے جس مضمون کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے وہ پہلی بار بمبئی سے نکلنے والے جریدے Economic and Political Weekly کے ۱۸ مئی ۱۹۹۱ کے شمارے (جلد ۲۶، شمارہ ۲۰) میں شائع ہوا تھا اور بعد میں انھیں کی مرتب کردہ کتاب Regional Imbalances & the National Question in Pakistan میں شامل کیا گیا۔ یہ کتاب لاہور سے وین گارڈ بکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ نے ۱۹۹۲ میں شائع کی۔

یہ مضمون اگرچہ کئی برس پہلے لکھا گیا تھا، اور کراچی میں حالات کی رفتار اتنی تیز ہے کہ موجودہ صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے اس مضمون پر مکمل انحصار کرنا مناسب نہیں ہوگا؛ تاہم یہ مہاجر اور سندھی آبادی میں قوم پرستی کی سیاست کے آغاز کا بڑی خوبی سے احاطہ کرتا ہے اور اگست ۱۹۹۰ میں پہلی بے نظیر حکومت کی برطرفی سے پہلے تک کی صورتِ حال کو سمجھنے میں خاصا کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ مضمون کا ترجمہ کرتے ہوئے اس کے کئی وضاحتی نوٹس مناسب مقامات پر، قوسین کے ساتھ، متن میں شامل کر دیے گئے ہیں۔

اس مضمون کے بعد جو متن "چھوٹے ہتھیار" کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے وہ راسیل میموریل لیکچر (۱۹۹۵) کی تدوین اور تلخیص شدہ شکل ہے جو معروف ریڈیائی صحافی اور سیاسی تجزیہ نگار مارک ٹلی (Mark Tully) نے ۲۲ فروری ۱۹۹۵ کو چرچل کالج، کیمبرج یونیورسٹی، میں دیا تھا۔ لیکچر کا عنوان The Arms Trade and Political Instability in South Asia تھا۔ یہ مضمون جنوبی ایشیا میں حالیہ پُرتشدد تنازعات کے نمایاں مراکز کی صورتِ حال کا ایک مجموعی تناظر میں جائزہ لیتا ہے، اور یہ ایک ایسا زاویۂ نظر ہے جو کراچی کی صورتِ حال کا تجزیہ کرنے والے دیگر ماہرین کی تحریروں میں اتنے واضح انداز میں نہیں ملتا۔

کلکتے میں پیدا ہونے اور انگلستان میں تعلیم پانے والے مارک ٹلی ۱۹۶۴ میں بی بی سی سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۷۲ میں دہلی میں بی بی سی کے بیورو کے سربراہ بنے۔ انھوں نے برصغیر میں ہونے والے تقریباً تمام اہم سیاسی واقعات کی رپورٹنگ کی ہے۔ ۱۹۹۴ میں ٹلی نے بی بی سی سے استعفیٰ دے دیا کیوں کہ وہاں متعارف کرایا جانے والا نیا نظام انھیں ریڈیائی صحافیوں کی آزادیِ اظہار کے منافی محسوس ہوا۔ مارک ٹلی کی مطبوعہ کتابوں میں *Amritsar: Mrs Gandhi's Last Battle* اور (۱۹۹۱) *No Full Stops in India* (۱۹۸۵) شامل ہیں۔ موخرالذکر کتاب انھوں نے بی بی سی کے ایک اور نامہ نگار ستیش جیکب کے ساتھ مل کر تحریر کی۔ ان کی تازہ ترین کتاب *The Heart of India* ۱۹۹۵ میں وائکنگ پینگوئن نے دہلی سے شائع کی ہے۔ یہ کتاب اُترپردیش کے دیہات اور قصبوں میں رہنے والے عام لوگوں کی بدلتی ہوئی زندگی کی نو کہانیوں پر مشتمل ہے جنھیں مارک ٹلی نے صحافیانہ تحریروں کے طور پر لکھنا شروع کیا تھا اور مکمل ہوتے ہوتے انھوں نے فکشن کی صورت اختیار کر لی۔

Scanned with CamScanner

اکبر زیدی

انگریزی سے ترجمہ: فہمیدہ ریاض

سندھی بمقابلہ مہاجر

تضادات، ٹکراؤ اور سمجھوتا

پاکستان میں قومی اور نسلی (ethnic) تشخص کا اظہار جس طرح اس دور کے سیاسی عمل پر حاوی ہو گیا ہے ماضی میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آزادی کے بعد سے ملک کے سیاسی اور اقتصادی ڈھانچے پر پہلے مہاجروں اور پنجابیوں کے حکمراں طبقوں کی گرفت تھی، گو رفتہ رفتہ اب یہ بڑی حد تک صرف پنجابیوں کے قبضے میں آ گیا ہے۔ اس بالادستی کے باعث ملک میں گزشتہ چالیس برس کے دوران دوسری قومیتوں کی مزاحمتی یا علیحدگی کی تحریکیں اٹھیں، جن میں سے ایک کامیاب ہو کر بنگلادیش کے قیام پر منتج ہوئی۔ دوسری تحریکیں جو علیحدگی یا وسیع تر صوبائی خود مختاری حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوئیں ان میں ایوب اور بھٹو دور میں چلائی گئی بلوچ تحریک کے علاوہ سندھیوں کی متعدد تحریکیں شامل ہیں۔ سندھیوں کی یہ تحریکیں ۱۹۴۸ میں کراچی کی سندھ سے علیحدگی کے خلاف مہم سے شروع ہو کر جنرل ضیاالحق کی مارشل لا حکومت کے خلاف چلنے والی تحریکوں تک پہنچیں۔ ماضی میں پختونوں نے بھی گاہے بگاہے اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھائی، مگر (سندھ اور بلوچستان کے برعکس) صوبہ سرحد میں زیادہ ترقیاتی کاموں کے باعث اب وہ وفاقِ پاکستان میں زیادہ بہتر طور پر ضم ہو چکے ہیں۔ فی الوقت سندھیوں اور بلوچوں کی مرکز میں، اور خود اپنے اپنے صوبے میں، پنجابی بالادستی کے خلاف جدوجہد جاری ہے جبکہ پٹھانوں نے اپنے صوبے پر اقتصادی اور سیاسی کنٹرول حاصل کرنے میں جزوی کامیابی حاصل کر لی ہے، اور یوں "پختون مسئلے" نے ایسی شکل اختیار کر لی ہے جو دوسری قومیتوں کے مسئلے کی نسبت بہت مختلف ہے۔

پاکستان میں مختلف قومیتوں کے درمیان موجود اس صف بندی (polarisation) کی ایک بڑی وجہ نمائندہ اداروں کا فقدان اور فوجی حکمرانی کا تسلسل ہے جس نے سیاسی اور اقتصادی ترقی پر اپنی گرفت قائم رکھی ہے۔ فوج چوں کہ زیادہ تر پنجابیوں پر مشتمل ہے، اور فوجی حکمرانی پاکستان کی عمر کے نصف سے زیادہ حصے پر محیط رہی ہے، لہذا علاقائی اور قومیتی عدم توازن کی صورت حال اور بگڑ گئی ہے۔ حکومتی نظام میں مرکز کے نہایت طاقتور ہونے اور اقتدار سے محروم گروہوں کو ان کی شکایات رفع کرنے کا

Scanned with CamScanner

موقع نہ ملنے کے باعث محروم اقتدار قومیتی یا نسلی گروہوں نے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کی ہے۔ البتہ جمہوریت، خواہ کتنی ہی مختصر اور کیسی ہی مسخ حالت میں ہو، اس ملک کے لوگوں کی صورتِ حال میں ایک تبدیلی ضرور پیدا کرتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جمہوری عمل کے ذریعے برسرِ اقتدار آنے والی حکومتیں ریاست کے دوسرے اداروں کی طاقت کو کم یا ختم نہیں کر سکیں، تاہم جمہوریت کے آنے سے نظام کی بساط پر تھوڑے بہت ردوبدل کی گنجائش ضرور پیدا ہوئی۔ یہ بات سندھیوں پر سب سے زیادہ صادق آتی ہے جو واحد قومیت ہیں جن میں سے ۱۹۷۰ کے بعد سے تین افراد وزیرِ اعظم ہوئے۔ ۱۹۸۵ کے انتخابات کے بعد جنرل ضیا نے ایک بالکل غیر معروف سیاست داں کو، جس کی واحد خوبی اس کا سندھی ہونا تھا، وزیرِ اعظم نامزد کرنے پر خود کو مجبور پایا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان کی موجودہ سیاست میں سندھ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

سندھ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں کی آبادی ۱۹۴۷ سے لے کر نسلی بنیادوں پر سب سے زیادہ منقسم رہی ہے۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد مہاجروں کے سیلاب نے اس صوبے کے سیاسی رنگ کو دائمی طور پر تبدیل کر دیا۔ گزشتہ برسوں میں ان دونوں گروہوں کا تنازعہ کئی گنا بڑھ گیا ہے اور قومی حقوق کے نام پر ہونے والے تشدد نے بربریت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس مضمون میں میرا مقصد اس تصادم کی وجوہ بیان کرنا اور ان کی تشریح کرنا ہے۔ اس کے لیے میں پہلے مہاجر تشخص کی مختصر تاریخ پیش کروں گا، پھر سندھی قوم پرست تحریک کے خدوخال پر روشنی ڈالوں گا، اور بعد ازاں اس تنازعے میں ریاست کے کردار اور سندھی مہاجر تصادم میں تشدد کے درجات زیرِ بحث آئیں گے۔ آخر میں صوبے کی موجودہ صورتِ حال کا ذکر ہو گا۔

مہاجر تشخص کا ارتقا

۱۹۴۷ میں اردو بولنے والے بیش تر مہاجر صوبۂ سندھ کے مقامات، کراچی، حیدرآباد، میرپور خاص، اور سکھر، میں رہائش پذیر ہوئے۔ (سندھ میں آ کر بسنے والوں میں ان کے علاوہ میمن، گجراتی، بوہرے، کاٹھیاواڑی وغیرہ بھی شامل تھے۔) ان میں اور مشرقی پنجاب سے آ کر مغربی پنجاب میں بس جانے والوں میں یہ فرق تھا کہ پنجابیوں کے برعکس یہ لوگ ایک بالکل اجنبی صوبے میں وارد ہوئے تھے۔ تہذیبی، لسانی، سماجی اور اقتصادی لحاظ سے یہ لوگ اپنے "میزبان" علاقے کے باسیوں سے بالکل مختلف تھے۔ اس طرح سندھ آناً فاناً ایک اجنبی تہذیب کی یلغار کا شکار ہو گیا جس نے نہ صرف اس صوبے بلکہ پورے ملک پر غلبہ پانا شروع کر دیا۔ بعض مبصّرین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ مہاجر "قابض" ذہنیت

Scanned with CamScanner

لے کر آئے تھے اور مقامی باشندوں سے حقارت کا سلوک کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ سندھ پر مہاجروں کا غلبہ ہو گیا تھا، لیکن اس کے پیچھے کوئی سازش یقیناً نہیں تھی جیسا کہ زیادہ تر سندھی مبصرین اصرار کرتے ہیں۔ اس غلبے کے چند ٹھوس مادی اور فطری اسباب تھے۔

سندھ کی معیشت غالب طور پر زرعی اور جاگیردارانہ تھی؛ یہاں چند تجارتی مراکز تھے اور صنعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ سندھ کے ممتاز سیاست داں جاگیردار طبقے کے نمائندے تھے، کیوں کہ بورژوا اور نچلا بورژوا طبقہ ہنوز ارتقا کے ابتدائی مراحل میں تھا۔ (سندھ میں ایک شہری بورژوا طبقہ موجود تھا، مگر یہ بڑی حد تک ہندوؤں پر مشتمل تھا، جو تقسیم کے وقت ہجرت کر کے ہندوستان چلے گئے۔ سندھ کے مسلمانوں میں اُس وقت تک یہ طبقہ پیدا نہ ہوا تھا۔) اس کے مقابلے میں باہر سے آنے والے ایک ترقی یافتہ شہری سرمایہ دارانہ کلچر کے نمائندے تھے۔ ان میں نہ صرف زیادہ بڑا سرمایہ کار طبقہ تھا بلکہ زیادہ تعلیم یافتہ متوسط منتظم طبقہ اور بہتر تربیت یافتہ ہنر مند مزدور طبقہ بھی موجود تھا۔ اس طرح ان میں اور ان کے سندھی "میزبانوں" میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ مہاجروں کا یہ بھی خیال تھا کہ پاکستان کی تخلیق اُن کی بدولت ممکن ہوئی ہے اور انھوں نے اس کے قیام کے لیے تمام قربانیاں دی ہیں ـــــ اور ان میں سیاسی جوڑ توڑ کی صلاحیت اور ریاستی مشینری کو بنانے اور چلانے کی مہارت بھی زیادہ تھی ـــــ چناں چہ انھوں نے پاکستان میں اقتصادی اور سیاسی اقتدار سنبھال لیا۔ مہاجروں کے بالادست طبقے نے جناح اور لیاقت کی رہنمائی میں بیوروکریسی کی باگ ڈور سنبھالی جبکہ ان کے سرمایہ کاروں اور مزدوروں نے بقا کے لیے لازمی صنعت کاری کی داغ بیل ڈالنی شروع کی۔ کراچی کے پاکستان کا دارالحکومت بننے اور انتظامی طور پر سندھ سے علیحدہ کر دیے جانے نے ان کی (حقیقی اور خیالی دونوں قسم کی) طاقت کو مزید بڑھاوا دیا۔ اس طرح مہاجر تشخص نئے ملک میں تیزی سے وجود میں آگیا اور مہاجر پاکستان کا حکمراں نسلی گروہ بن کر اُبھرے۔

مہاجروں کے نزدیک سندھ ہمیشہ ملک کا ایک پس ماندہ اور کم ترقی یافتہ صوبہ رہا جس کا اُس زیادہ نفیس شہری تمدن سے چنداں واسطہ نہ تھا جس کی وہ خود نمائندگی کرتے تھے۔ مہاجروں کا یہ متکبرانہ اور احساسِ برتری سے مملو رویہ سندھیوں کے لیے ہمیشہ باعثِ توہین رہا اور اب بھی ہے۔ غیر نمو یافتہ سرمایہ دارانہ رشتوں میں اُلجھے ہونے اور بورژوا طبقے کی غیر موجودگی کے باعث سندھیوں میں سیاسی، اقتصادی یا ثقافتی اقتدار حاصل کرنے کے لیے مہاجروں کو چیلنج کرنے کی سکت نہ تھی۔ بلاشبہ مہاجر ان سرمایہ دارانہ رشتوں کی نشوونما یافتہ صورت کا مظہر تھے، لیکن یہ صورت اِس سرزمین سے ارتقا پذیر نہیں ہوئی تھی بلکہ باہر سے آ کر پیوند ہوئی تھی۔

مہاجر صنعت کار اور تاجر، خصوصاً کوریا کی جنگ کے بعد، اور ایوب حکومت کے اقتصادی پروگرام کے تحت، ملک کی معیشت پر حاوی ہو گئے۔ جب لیاقت علی خاں کی موت کے بعد مطلق اقتدار بیوروکریسی کے ہاتھ میں آگیا، اُس سیاسی افراتفری کے دور میں بھی مہاجروں کی حیثیت برقرار رہی اور حکومت کے اداروں میں ان کی نمائندگی، ان کی آبادی کے تناسب (ملک کی کل آبادی کے محض ۳ فیصد) سے کہیں

زیادہ رہی۔ وہ ریاستی طاقت اور وسائل میں پنجابیوں کے بڑھ چڑھ کر حصے دار بنتے گئے، جبکہ سب سے بڑے قومیتی گروہ (یعنی بنگالیوں) کو، جنھیں ریاستی امور میں زیادہ حصہ ملنا چاہیے تھا، دانستہ طور پر نظرانداز کیا گیا۔ پیداواری رشتوں کے اس مخصوص تحرک کے باعث سندھیوں اور بلوچوں کو، اور بڑی حد تک پختونوں کو بھی، بہت کم نمائندگی ملی۔ پاکستان جس علاقے میں قائم ہوا، وہ بیش تر ـــــ بنگال اور پنجاب کے استثنیٰ کے ساتھ ـــــ متحدہ ہندوستان کے پس ماندہ ترین خطوں پر مشتمل تھا۔ لہٰذا ان علاقوں میں خواندہ (خصوصاً اہمیت رکھنے والی زبانوں میں خواندہ) افراد، اور انتظامی شعبوں میں مہارت رکھنے والے لوگ نہایت قلیل تعداد میں تھے، اور بورژوازی کم زور تھی۔ اس طرح ریاست کے اداروں میں مذکورہ گروہی تناسب ناگزیر بن گیا۔ علاوہ ازیں، انگریزوں کے نوآبادیاتی ورثے نے بھی بھرتی کے پرانے طریقِ کار کو جاری رکھنے میں مدد دی جو ان دونوں نسلی گروہوں کے حق میں جاتا تھا۔ مہاجروں کے لیے ـــــ جو وفاقی دارالحکومت کے دامن میں محفوظ تھے ـــــ سندھی کبھی بھی سیاسی یا اقتصادی اقتدار کے لیے مسابقت کرنے والا گروہ نہیں تھے۔ اس کے برعکس، انھیں پنجابیوں کی جانب سے مسابقت کا سامنا تھا۔ لیاقت علی خاں کی موت کے بعد مہاجروں کے پاس اُن جیسا یا جناح جیسا کوئی لیڈر نہ رہا۔ اس طرح پاکستان کے نسلی یا قومی گروہوں کے مابین سیاسی اقتدار کے توازن میں وہ تبدیلی رونما ہونی شروع ہوئی جو ۱۹۵۸ میں غیر مہاجر فوج کے اقتدار پر قابض ہوجانے کے بعد زیادہ شدت کے ساتھ جاری رہی۔

مہاجر بالادستی کو سب سے بڑی زک ۱۹۶۰ کی دہائی میں پہنچی جب یہ یقینی نظر آنے لگا کہ پنجاب میں سبز انقلاب (Green Revolution) کے اثرات کے باعث پاکستان کے اقتصادی، آبادیاتی (demographic) اور سیاسی منظرنامے میں اہم تغیر آنا ناگزیر ہے۔ پنجاب میں سرمایہ دارانہ پیداواری رشتوں نے گہری جڑیں پکڑنی شروع کیں اور اس کے ساتھ ساتھ مستقبل کی بالادست قومیت، اقتصادی گروہ اور سیاسی قوت کی حیثیت سے، شدومد کے ساتھ اُبھرنے لگی۔ پنجابیوں میں نہ صرف زیادہ فعال سرمایہ کار پیدا ہوئے بلکہ دیہات سے شہروں کی سمت مہاجرت کرنے والوں کے تعلیم پانے کے باعث سرکاری ملازمتیں کمیاب تر اور ان کے لیے مسابقت سخت تر ہوتی گئی۔ ہندوستان سے آنے والے مہاجر جو پہلے اس معاملے میں نسبتاً آگے تھے، اب اپنی پوزیشن کو خطرے میں محسوس کرنے لگے۔ یہ خطرہ نہ صرف سرکاری سیکٹر کے ہر درجے پر تھا بلکہ دیہات سے زراعت چھوڑ کر آنے والے پنجابی کسان زیادہ متحرک (mobile) ہو کر سندھ کے شہروں میں بھی داخل ہوئے جو اب تک مہاجروں کے قبضے میں تھے، اور ملازمتوں کے سلسلے میں ان سے کامیابی کے ساتھ مسابقت کرنے لگے۔ مزید برآں، ایوب خاں کے دور میں بہت سے اعلیٰ سرکاری اور فوجی افسروں کو (جو بیشتر پنجابی تھے) سندھ میں زمینیں دی گئیں جس سے صورتِ حال اور بگڑ گئی کیوں کہ یہ نیا زمیندار طبقہ کسان بھی پنجاب سے درآمد کرنے لگا۔ اُسی دور میں پختون مزدوروں نے بھاری تعداد میں شمالی علاقوں سے کراچی کی جانب ہجرت کی۔ تاہم، پٹھان مزدوروں اور مہاجروں کے درمیان تضاد کم تھا کیوں کہ پٹھان جن کاموں میں مشغول ہوئے وہ

Scanned with CamScanner

مہاجر نہیں کرتے تھے۔ اس طرح سندھ اور باقی پاکستان میں سرکاری شعبے اور نجی کاروبار پر مہاجروں کا غلبہ ختم ہو گیا۔ سندھ کے شہر خالص مہاجروں کا علاقہ نہیں رہ گئے: سرمایہ دارانہ نظام کے مزید ارتقا کے ساتھ ساتھ پنجاب نے، اپنی مضبوط معیشت کے بل پر، رفتہ رفتہ نہ صرف صنعت، زمینداری اور ملازمتوں میں فوقیت حاصل کر لی بلکہ اندرونِ ملک نقل مکانی کرنے والے مزدوروں میں بھی پنجابیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔

مہاجر لیڈر اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ مہاجروں نے ہمیشہ حکومت سے باہر رہ جانے والی جماعتوں کے حق میں ووٹ دیا ہے یعنی حزبِ اختلاف کی حمایت کی ہے۔ ۱۹۶۴ میں ان کے رہنماؤں نے ایوب خاں کے مقابلے میں فاطمہ جناح کا ساتھ دیا؛ ۱۹۷۰ میں، جب پورا ملک [مغربی پاکستان] بھٹو کی لائی ہوئی سوشلزم کی لہر کے زیرِ اثر تھا، انھوں نے اسلامی پارٹیوں کے حق میں ووٹ ڈالا؛ ۱۹۷۷ میں بھی انھوں نے بھٹو کے خلاف پی این اے کے رجعتی اتحاد کی حمایت کی، اور اب، ۱۹۸۸ میں، انھوں نے اپنی جماعت کو ووٹ دیا، جسے ان کے علیحدہ تشخص کے احساس کا نقطۂ عروج کہا جا سکتا ہے۔ ہر چند کہ مہاجر تشخص نے واضح طور پر ۱۹۸۶ میں مہاجر قومی موومنٹ کے باقاعدہ قیام، اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے پُرتشدد واقعات، کے بعد ہی ٹھوس شکل اختیار کی، مگر اس کی ایک صورت مہاجروں کے ایک اکائی کے طور پر یکساں سیاسی رجحانات رکھنے کے باعث طویل عرصے سے ارتقا پذیر تھی۔

مہاجروں نے ماضی میں ہمیشہ بنیاد پرست اسلامی تنظیموں کی حمایت کی جو صوبجاتی رنگ رکھنے کے بجائے پاکستانیت کی دعوے دار تھیں، اور خود اپنی تنظیم بنا لینے تک خود کو تمام تقسیم پسند گروہوں سے دور رکھا۔ اس کی وجوہ سمجھ میں آنے والی ہیں، کیوں کہ مہاجر پاکستان میں مسلمان اور پاکستانی ہی کی حیثیت سے وارد ہوئے تھے اور یہاں اُنھیں احساسِ تحفظ کے لیے انھیں نظریات کی ضرورت تھی۔ ابتدائی برسوں میں اُنھیں ملازمتوں اور دیگر مواقعوں کی کمی نہ تھی، اور پاکستان کے ریاستی اور معاشی ڈھانچے میں ان کی حیثیت مسلّم تھی، چناں چہ یہ نظریات ان کے لیے نہایت آرام دہ بھی تھے۔ لیکن جب اقتدار اور وسائل پر مقابلہ زیادہ شدید ہو گیا تب انھیں بھی ایک نئے تشخص کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسلامی تنظیمیں ان نئی حقیقتوں کا سامنا کرنے کی اہلیت نہ رکھتی تھیں، اور جوں جوں پنجابیوں کی جارحانہ گرفت، پاکستان پر مضبوط ہوتی گئی، ایک جداگانہ مہاجر شعور پروان چڑھتا گیا۔ پہلے سندھی وزیرِ اعظم کے انتخاب کے ساتھ شہروں اور سرکاری ملازمتوں میں ایسے سندھیوں کی ایک بڑی لہر آئی جو اپنے دیہاتی پس منظر سے پوری طرح جدا نہ ہوئے تھے۔ ۱۹۷۲ میں سندھی کو صوبے کی سرکاری زبان بنانے کی کوشش اسی نو ترقی یافتہ درمیانہ اور نچلے درمیانہ طبقے کی جانب سے اپنے تشخص کو، جسے ٹھوس شکل اختیار کرنے میں بہت سال لگے تھے، تسلیم کروانے کی کوشش تھی۔ سندھی قوم پرستی کے اس اُبھار کا مہاجروں کی امنگوں اور تصوّرِ دنیا سے یہ غالباً پہلا براہِ راست ٹکراؤ تھا۔ ۱۹۷۷ کے انتخابات دوسرا موقع تھے جب ان دونوں گروہوں کے سیاسی تصوّرات ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے؛ مہاجروں نے دائیں بازو کی بنیاد پرست جماعتوں کا

Scanned with CamScanner

اور سندھیوں نے پیپلز پارٹی کا ساتھ دیا۔ ۱۹۸۳ اور ۱۹۸۶ کی بحالی جمہوریت کی تحریک (MRD) کے دوران بھی دونوں گروہوں کی سیاسی امنگیں واضح طور پر مختلف نظر آئیں۔ تاہم مہاجر تشخص کا واضح ترین اظہار ۱۹۸۶ کے کچھ بعد، اور پھر ۱۹۸۷ میں ہوا جب ایم کیو ایم نے بلدیاتی انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کی۔

ایم کیو ایم کے اجزائے ترکیبی بنیادی طور پر نچلے درمیانہ طبقے پر مشتمل ہیں؛ اس تنظیم میں کارکنوں کے مدارج بہت واضح اور "نظم و ضبط" کا کردار نہایت بنیادی ہے؛ یہ تنظیم مقبولیت پسند (populist) ہے اور اپنے لوگوں کو دہشت اور مراعات کے ذریعے قابو میں رکھتی ہے؛ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس نے مہاجروں کو احساسِ تشخص دیا ہے اور ایسی شاونزم بھی پیدا کی ہے جسے کسی نہ کسی دشمن کی ضرورت ہوتی ہے ــــــ یہ تمام خصوصیات وہ ہیں جو کسی بھی فاشسٹ تنظیم کی بنیاد ہوتی ہیں۔

اس میں ذرا بھی شک نہیں کیا جا سکتا کہ ایم کیو ایم نے اپنے حامیوں (مہاجروں) کے متعدد حقیقی مسائل اٹھائے ہیں۔ بے روزگاری اور شہری سہولتوں کا فقدان ایسے مسئلے ہیں جن سے نہ صرف کراچی اور حیدر آباد کے مہاجر بلکہ پورے پاکستان کے لوگ دوچار ہیں۔ مگر ایم کیو ایم کے پاس ان مسائل کو قومی یا وسیع تر سطح پر حل کرنے کا تناظر یا اس سے دل چسپی موجود نہیں۔ "ہم ایسی کسی چیز کی حمایت نہیں کرتے جس میں لفظ مہاجر نہ آتا ہو۔" اپنے حامیوں کے مسائل کی سمجھ بوجھ بھی ایم کیو ایم کی نہایت محدود بصیرت کی غماز ہے۔ اپنے رہنماؤں کے اس مخصوص ادراک اور مسائل کو وسیع تر پس منظر میں دیکھنے کی اہلیت کے فقدان ہی کے باعث یہ تنظیم ایک ایسی بند گلی میں جا پہنچی ہے جہاں قطعی مایوسانہ اضطراب کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ کار دکھائی نہیں دے رہا۔ چوں کہ ایم کیو ایم مہاجروں کی حالت میں کوئی بہتری نہیں لا سکی ہے، اس لیے اس کے حامیوں میں تھوڑی بہت بددلی پیدا ہوئی ہے۔ اس سیاسی ناکامی کے بعد ایم کیو ایم کے پاس اپنی بقا کا واحد راستا یہ ہے کہ اپنے حامیوں کو شدید دہشت میں مبتلا کر کے اپنا ساتھ دینے پر مجبور کرے۔ ایم کیو ایم کا مسلح بازو، بلیک ٹائیگرز، جو چند سو نوجوانوں پر مشتمل ہے جنھوں نے مہاجر کاز کی خاطر جان دینے کا حلف اٹھا رکھا ہے، اس حکمتِ عملی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ جیسا کہ خدشہ تھا، یہ تنظیم فاشسٹ ثابت ہوئی۔

اس موقعے پر موضوع سے ذرا ہٹ کر پاکستان کے مجموعی تناظر میں کراچی شہر کی اہمیت کا ذکر کرنا اور یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ شہر ایم کیو ایم کے منصوبے میں کیا کردار ادا کر سکتا ہے۔ کراچی کی آبادی پورے ملک کی آبادی کا دسواں حصہ ہے، مگر ملک کا ایک تہائی معاشی اور صنعتی سرمایہ یہاں لگا ہوا ہے۔ ایم کیو ایم اس بات کا پورا احساس رکھتی ہے اور سودے بازی میں اس کی پوزیشن مضبوط ہے۔ کراچی کو بقیہ سندھ سے الگ کرنے کا سوال بھی ایم کیو ایم نے اٹھایا ہے، اور اس علیحدگی کا امکان مہاجروں کے پاکستان کی پانچویں قومیت ہونے کے دعوے کی بنیادی دلیل ہے۔ (چند پنجابی دانشور بھی کراچی کی سندھ سے علیحدگی کی حمایت کرتے رہے ہیں۔)

Scanned with CamScanner

کراچی نے ہمیشہ سماجی، سیاسی اور تمدنی اعتبار سے باقی پورے ملک، خصوصاً سندھ، سے الگ شناخت قائم رکھی ہے۔ (یہاں اُن سندھی دانشوروں کے موقف سے اتفاق کرنا دشوار ہے جن کا کہنا ہے کہ کراچی ایک سندھی شہر تھا جہاں سندھیوں کو اجنبیوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ تاریخی حقائق اس دعوے کی تصدیق نہیں کرتے۔) اسے انگریزوں نے ۱۸۳۹ میں فتح کیا جس سے پہلے یہ ایک چھوٹا سا غیر اہم قصبہ تھا؛ اور ۱۸۴۳ میں حیدر آباد کو فتح کرنے کے بعد ہی پورا سندھ انگریزوں کے قبضے میں آ سکا۔ انگریزوں نے کراچی کو سندھ سے الگ ایک کاسموپولیٹن شہر کے طور پر ترقی دی جہاں پوری برطانوی سلطنت سے لوگ آ کر جمع ہوئے۔ تقسیم ہند نے بھی اس رجحان کو برقرار رکھا جب مہاجروں نے اس شہر پر یلغار کی۔ ۱۹۴۸ میں اسے نیا دارالحکومت بنا کر حکومتِ پاکستان نے اس علیحدگی کو باقاعدہ شکل دے دی۔ کراچی کی نشوونما سندھ سے مختلف طور پر ہوتی رہی، ملک کے تمام صوبوں کے لوگ کھنچ کر اس شہر میں آتے رہے اور صوبہ سندھ میں ضم نہیں ہوئے جس کی سرمایہ دارانہ معیشت پوری طرح ترقی یافتہ نہیں تھی۔

تاہم، گزشتہ برسوں میں حالات میں تبدیلی آتی رہی ہے: اب کراچی سندھ سے اس حد تک جُڑ چکا ہے جتنا ماضی میں کبھی نہیں تھا۔ ملک کے دیہی علاقوں میں سرمایہ داری کے رفتہ رفتہ مضبوط ہونے کے باعث پورے ملک کی معیشت ایک تیز رفتار تبدیلی سے گزر رہی ہے۔ زرعی اجناس اور صنعتی پیداوار کی مارکیٹ کے وسیع ہونے کے نتیجے میں سندھ کے دور اُفتادہ خطے بھی اب قریب آ رہے ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ بننے کے عمل میں ہیں۔ زراعت میں صنعتی طریقوں کے بڑھتے ہوئے استعمال سے پیشوں، قدروں اور سماجی رشتوں میں تبدیلی آ رہی ہے۔ سندھ میں زرعی مشینوں کے استعمال کے باعث جتنے لوگ اب بے روزگار ہو رہے ہیں اتنے پہلے کبھی نہیں ہوتے تھے۔ روزگار کی تلاش میں اب وہ شہروں کی طرف آ رہے ہیں، مہاجر اکثریت کے شہروں میں ان کی موجودگی کو واضح طور پر محسوس کیا جانے لگا ہے۔ تعلیم یافتہ اور پیشہ ور سندھی اب زیادہ تعداد میں ملازمتوں کے میدان میں داخل ہو رہے ہیں اور سب سے خوشحال شہر کراچی کا رخ کر رہے ہیں۔ اس شہر سے سندھیوں کے معاشی مفادات اس سے پہلے کبھی اس قدر وابستہ نہیں تھے۔ علاوہ ازیں، صوبے میں منتخب حکومت کی موجودگی، اور بدعنوانی کے عام چلن، کے باعث کراچی سے سندھیوں کی مضبوط مالی وابستگی پیدا ہو گئی ہے جہاں انہیں جائیداد، لائسنس، پرمٹ وغیرہ سب رعایتی نرخوں پر مل جاتے ہیں۔ اس طرح کراچی سندھیوں کے لیے رقم فراہم کرنے کا ایک اہم ذریعہ بن گیا ہے اور یہ رقم دیہی معیشت میں واپس جا کر دوسرے سندھیوں کو بھی فائدہ پہنچا رہی ہے۔ مزید براں، سندھ کے تمام ٹیکسوں کا ۶۵ فیصد حصہ کراچی سے حاصل ہوتا ہے جس کے عوض اسے بہت کم رقم حاصل ہوتی ہے۔

سندھ کی کراچی میں شمولیت (نہ کہ کراچی کی سندھ میں شمولیت) کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ایم کیو ایم کی جانب سے کراچی کو سندھ سے علیحدہ کرنے اور ایک مہاجر صوبہ قائم کرنے کا مطالبہ اب بے موقع ہو چکا ہے۔ اس نئی حقیقت کا احساس مہاجروں میں سخت بے چینی پیدا کرے گا کیوں کہ وہ اپنی "قوم

پرستی" کو کسی زمینی ملکیت کے دعوے سے سہارا نہیں دے سکیں گے۔ یہ بات مستقبل میں ایم کیو ایم کی حکمتِ عملی پر کچھ نہ کچھ اثر ڈال سکتی ہے۔

سندھی قوم پرستی

سندھی قوم پرستی کا ارتقا مہاجر تشخص کے احساس کی طرح ڈرامائی نہیں بلکہ ایک طویل عرصے پر محیط ہے۔ سندھ کی تاریخ پانچ ہزار سال قدیم بیان کی جاتی ہے، اور یہ خطہ ہمیشہ آزاد اور اپنی منفرد ثقافت کا حامل رہا ہے۔ تشخص کے اس احساس کو اس علاقے میں قائم سماجی اور معاشی نظام نے بے اثر بنائے رکھا۔ قومی تشخص سماجی اور معاشی ارتقا کے زیادہ ترقی یافتہ مدارج میں اپنا اظہار کرتا ہے جب ایک وسیع درمیانہ اور نچلا درمیانہ طبقہ قومی جدوجہد کی تنظیم اور رہنمائی کرنے کے لیے موجود ہو۔ (ویسے جاگیردارانہ قوم پرستی بھی وجود رکھ سکتی ہے، جیسی کہ ماضی میں سندھ میں موجود رہی ہے، مگر یہ عموماً ترقی یافتہ بورژوا قوم پرستی کے مقابلے میں کم منظم اور کم موثر ہوتی ہے۔ قوم پرستی بنیادی طور پر درمیانہ طبقے ہی کا مسئلہ ہوتی ہے۔) چوں کہ یہ طبقہ غیر موجود یا کمزور رہا ہے، اس لیے اسے سندھ کی سیاست پر کبھی غلبہ حاصل نہیں رہا اور اس کا نسبتاً پرزور سیاسی اظہار ابھی شروع ہی ہو رہا ہے۔

۱۹۴۸ میں کراچی کی سندھ سے علیحدگی کے خلاف "تحریک" کامیاب نہیں ہو سکتی تھی کیوں کہ مٹھی بھر سندھی جاگیردار اور دانشور سیاسی اور ریاستی طور پر غالب مہاجروں سے مقابلہ کرنے کے قابل نہ تھے۔ ۱۹۵۲ میں بنگالیوں کی جانب سے اپنی زبان کو اردو کے مساوی درجہ دلوانے کی کامیاب مہم کے بعد سندھیوں کی طرف سے سندھی کو صوبائی زبان بنانے کا مطالبہ سندھیوں کی امنگوں کو بہتر طور پر تقویت دے سکتا تھا، لیکن ان کا بے حد قلیل نچلا درمیانہ طبقہ اپنے سے کہیں زیادہ زور آور گروہ پر اپنی زبان نافذ کرنے کا حق حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ ون یونٹ کے خلاف جدوجہد نے سندھی تشخص کے احساس کو زیادہ وسیع اور واضح شکل دی، جسے بھٹو نے پہچانا اور استعمال کیا۔ یہ طبقہ بھٹو دور ہی میں اتنا طاقت ور ہو سکا کہ اردو بولنے والوں کو چیلنج کر کے سندھی کو صوبے کی سرکاری زبان تسلیم کرانے کی کوشش ـــ گو ناکام کوشش ـــ کر سکے۔

بھٹو نے سندھی شعور کو ٹھوس شکل دینے میں یقیناً اہم ترین کردار ادا کیا، اور بھٹو دور میں سندھیوں کو ایسی ملازمتیں ملیں جن کے ذریعے ان کی مالی وسائل اور اسلام آباد تک رسائی ممکن ہوئی۔ صوبے میں دولت آئی جس سے جدید طبقوں کی تشکیل کا عمل تیز ہوا۔ جو لوگ زرعی حب مراتب کی سب سے نچلی سیڑھی پر تھے، انھیں زمین چھوڑنے کا موقع ملا اور یوں ایک وسیع درمیانہ اور نچلا درمیانہ طبقہ وجود میں آیا۔ ٹھوس سندھی شعور کی جڑیں مضبوط ہونے لگیں۔ بھٹو کی موت، اور ہمیشہ غدار ٹھہرائے جانے

Scanned with CamScanner

والے قوم پرستوں کے ساتھ پنجاب اور اس کی فوج کے سلوک، نے سندھی قوم پرستی کو مزید مضبوط کیا۔ ۱۹۸۳ کی تحریک ان واقعات کا اہم ترین ردعمل تھی جس کے دوران سندھی قوم پرستی اپنے عروج پر تھی اگرچہ ابھی تک منظم نہ ہو پائی تھی۔ سندھ کے اس ردعمل کا ایک نتیجہ ۱۹۸۵ میں محمد خان جونیجو جیسے بے اثر سندھی کی وزیراعظم کے طور پر نامزدگی کی صورت میں برآمد ہوا۔ جونیجو نے بھی سندھیوں کو خوش رکھنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ظاہری طور پر وہی انداز اپنایا جو بھٹو نے اپنایا تھا۔ آج سندھی قوم پرستی صوبے کا غالب سیاسی فلسفہ بن چکی ہے اور رفتہ رفتہ زیادہ پختہ ہو رہی ہے۔ البتہ تنظیم اس تحریک کا مسئلہ معلوم ہوتی ہے، اور اس شعور کی نمائندگی کرنے والی کوئی واحد جماعت سامنے نہیں آسکی ہے۔

ریاست کا کردار

پاکستانی تناظر میں ریاست کے کردار کا جائزہ لیے بغیر قومیتوں کے سوال کو پوری طرح نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس کی ضرورت سے زیادہ ترقی یافتہ نوعیت اور ہمہ گیری ہی سے مختلف قومیتی گروہوں کے اختیار کردہ معاشی اور سیاسی راستوں کا تعین ہوتا ہے۔

ریاست ملک میں سب سے زیادہ ملازمتیں فراہم کرتی ہے اور اپنے اداروں کے ذریعے نجی سرمایہ کاری کی سمت متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ پاکستانی ریاست نے آزادی کے بعد ابتدا ہی سے نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کرنے کی بہت کوشش کی؛ نہ صرف کئی طرح کی رعایتیں، ٹیکس اور محصول میں چھوٹ وغیرہ، سرمایہ داروں کو دی گئیں بلکہ ریاست نے خود صنعتی کارخانے قائم کر کے انھیں رعایتی قیمت پر نجی سرمایہ کاروں کے حوالے کیا۔ ایوب خاں کے دور میں بھی ریاست کی جانب سے سرمایہ داروں کو تحفظ اور بونس واؤچر اسکیم کی شکل میں مراعات اور حوصلہ افزائی کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ زراعت کے میدان میں کاشتکاری کے جدید طریقوں کو فروغ دینے کی غرض سے ریاست نے انفرااسٹرکچر اور مشینی آلات فراہم کیے۔ اگرچہ اُس دور میں نجی شعبے نے خود کو رفتہ رفتہ مضبوط بنایا، تاہم ریاست اور بیوروکریسی کا عمل دخل بہت بڑھ گیا۔ لائسنس، پرمٹ، زرمبادلہ کے قواعد و ضوابط، کوٹا وغیرہ ایسے معاملات تھے جن پر ریاست کا کنٹرول تھا اور وہ نجی سرمایہ داری کی سمت اپنی مرضی سے متعین کرنے پر قادر تھی۔

بھٹو دور میں معیشت کے تمام شعبوں پر ریاست کا کنٹرول اور بھی واضح ہو کر ابھرا، کیوں کہ اس دور میں نیشنلائزیشن کی پالیسی اختیار کی گئی اور معیشت پر سرکاری گرفت زیادہ سخت ہو گئی۔ جمہوری تجربے نے اُن طبقوں کو فائدہ پہنچانے کا ایک کارآمد موقع فراہم کیا جنھوں نے برسرِاقتدار آنے میں

Scanned with CamScanner

اس حکومت کی مدد کی تھی، اور اُن کو جو مستقبل میں خطرے کا باعث ہو سکتے تھے، مراعات دے کر اپنے ساتھ ملانے کی گنجائش پیدا کی۔ کارخانوں کے علاوہ بینکوں، انشورنس کمپنیوں، اسکولوں، اسپتالوں وغیرہ کے ریاستی ملکیت بن جانے سے سرکاری شعبہ اتنا وسیع ہو گیا کہ یہ کام آسانی سے کیے جا سکتے تھے۔ سرکاری شعبے کے پہلے کی نسبت بہت وسیع ہو جانے کی بدولت اُس درمیانہ اور نچلے درمیانہ طبقے کو روزگار فراہم کرنا آسان ہو گیا جو نیا نیا وجود میں آیا تھا، اور حکومت کے لیے سرکاری شعبے کے ممکنہ استعمال کی صلاحیت بہت بڑھ گئی۔

ضیاالحق کے دور میں ڈی نیشنلائزیشن کی کوششوں کے باوجود سرکاری شعبے کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوا۔ فوج اور بیوروکریسی ہی دو ایسے ادارے تھے جن کی طرف سے ضیا کو خطرہ ہو سکتا تھا، لہٰذا اُنھیں خوش رکھنا اور اُن کی طاقت اور اختیارات کو بڑھانا ضروری اور کارآمد تھا۔ ریاستی ملکیت کے بیشتر اداروں میں حاضر ڈیوٹی اور ریٹائرڈ فوجی افسروں کو پُرکشش ملازمتیں دی گئیں، یا انھیں ضیا کے مشیروں، وزیروں اور بیرونِ ملک متعین سفیروں میں شامل کیا گیا۔ اسلامی نظام کے پردے میں سرکاری سرمائے سے شروع کی جانے والی متعدد اسکیموں کا مقصد دراصل ایسے لوگوں کو ملازمتیں فراہم کرنا تھا جو اسلام اور فوج کی خدمت کر سکیں۔ ۱۹۸۸ کے انتخابات میں صوبۂ سندھ اور مرکز میں پیپلز پارٹی کی فتح کے نتیجے میں سرکاری شعبوں میں پارٹی کے حامیوں کی ایک اَور بڑی لہر داخل ہوئی، جب کہ پنجاب میں اسلامی جمہوری اتحاد کی صوبائی حکومت نے بھی اپنے حامیوں کو وزارتوں وغیرہ سے نوازا۔ پاکستان کے نجی شعبے کی روزگار کے کثیر مواقع پیدا کرنے میں ناکامی کی وجہ سے (جسے بہرحال اُس کی ذمےداری بھی قرار نہیں دیا جا سکتا)، سرکاری شعبہ بڑھتی ہوئی تعداد میں بےروزگاروں کو ملازمتیں فراہم کر رہا ہے اور یوں حکومتوں کے لیے اپنے حامیوں کو انعام دینے کا موثر ذریعہ ہے۔ تاہم اب یہ گنجائش ختم ہوتی جا رہی ہے اور بحران ناگزیر ہو گیا ہے۔

سندھ کے اندرونی علاقوں میں ریاستی اداروں کی موجودگی اَور زیادہ نمایاں ہے کیوں کہ وہاں روزگار کے متبادل ذرائع نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سرکاری ملازمت تک رسائی کو پورے ملک کی طرح یہاں بھی ہر فرد کا پیدائشی حق سمجھا جاتا ہے۔ حکومت فی الوقت بےروزگاروں کو ملازمت دینے سے قاصر ہے، مگر اس حقیقت کا احساس بھی سندھی باشندوں کو کوئی دوسرا روزگار تلاش کرنے کے بجائے انتظار کرنے یا سفارش اور رشوت کا آسرا ڈھونڈنے پر اکساتا ہے۔ بڑے شہروں کو چھوڑ کر، جن پر مہاجروں کا غلبہ ہے، سندھ کے اندرونی قصبوں میں بہت کم کارخانے موجود ہیں جو مقامی سندھیوں کو روزگار فراہم کر سکیں۔ علاوہ ازیں، سندھ میں زیادہ تر کارخانوں کے مالک پنجابی ہیں اور انھوں نے اپنے یہاں پنجابی مینیجر، کاریگر اور مزدور بھرتی کیے ہیں۔ اس سے سندھی بےروزگاروں کا مسئلہ اَور سنگین ہو گیا ہے۔ (میں نے کہیں اَور اس نکتے کے حق میں بحث کی ہے کہ پنجاب کی موجودہ خوش حالی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسے اپنی فاضل لیبر فورس کو دوسرے صوبوں میں بھیجنے اور یوں پنجاب میں بےروزگاری کی شدت کم رکھنے کا موقع حاصل

ہے۔) سندھی سرمایہ دار ہنوز زراعت سے منسلک ہیں۔ وہ زرعی پیداوار کے طریقوں میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر رہے ہیں لیکن صنعت کاری کے میدان میں سست رفتار ہیں۔ اس طرح سندھیوں کے لیے روزگار کے نئے مواقع بہت کم پیدا ہو رہے ہیں جبکہ زراعت میں مشینوں کے بڑھتے ہوئے استعمال سے کھیت مزدور زیادہ تعداد میں بے روزگار ہو رہے ہیں۔ اس طرح ریاست پر ان کے انحصار میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

سندھی قوم پرستوں میں طلبا، استاد، ڈاکٹر، پیشہ ور ماہرین وغیرہ شامل ہیں جن کی ایک وسیع تعداد بے روزگار ہے۔ ایک مضبوط بورژوازی کی غیر موجودگی میں، نچلے درمیانہ طبقے کی بے روزگاری کا مسئلہ سندھی قوم پرستی کا محور بن گیا ہے۔ ان کی بیشتر قیادت جاگیردار طبقے سے تعلق رکھتی ہے، مگر اب اس میں درمیانہ طبقے کے افراد کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ سندھ کے اندرونی علاقوں میں گزشتہ چند برسوں میں اُبھرنے والے نچلے درمیانہ طبقے نے جو دباو ڈالا ہے اس کے باعث انھیں بعض ریاستی اداروں (مثلاً پولیس، ضلعی انتظامیہ، گورنمنٹ ڈپارٹمنٹ، پبلک کارپوریشنوں وغیرہ) میں ملازمتیں حاصل ہوئی ہیں۔ ضیاالحق کے دور میں بھی، جب اندرونِ سندھ پنجابیوں کے مفادات کو فوج کا تحفظ حاصل تھا، جونیجو حکومت ۱۹۸۵ سے ۱۹۸۸ تک کے عرصے میں سندھیوں کو ملازمتیں دینے پر مجبور ہوئی، جس سے سندھ میں قومی حقوق کی تحریک کا جوش کچھ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ کراچی میں بھی ۱۹۸۷ سے، جب ایم کیو ایم نے بلدیاتی انتخابات جیتے تھے، بلدیاتی اداروں میں مہاجروں کو ملازمتیں زیادہ تعداد میں دی گئیں۔ لیکن چوں کہ بے روزگاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے، اس لیے ریاستی اداروں کی ملازمتیں بے روزگاری کے مسئلے کو پوری طرح ہرگز حل نہیں کر سکتیں۔

جوں جوں سندھ کا نچلا درمیانہ طبقہ زمین سے آزاد ہو کر ملازمتوں کی تلاش میں شہروں کا رخ کر رہا ہے، اس کی توقعات ریاست سے اور زیادہ وابستہ ہوتی جا رہی ہیں۔ سندھی بورژوا طبقہ اندرونِ سندھ صنعتوں کے قیام میں سرمایہ کاری نہیں کر رہا ہے، چناں چہ بھی شعبے کو نشوونما پانے میں طویل عرصہ لگے گا، اور کم از کم اُس وقت تک تمام تر انحصار ریاستی شعبے پر رہے گا۔ چوں کہ ریاست بڑی تعداد میں ملازمتیں فراہم کرنے سے قاصر ہے، اس لیے بے روزگاروں کی بے اطمینانی اور اشتعال میں اضافہ ہو گا۔ فی الوقت اس معاملے میں ایک الجھاوا ہے ــــ حکومت کو سندھیوں کے ہاتھ میں سمجھا جاتا ہے (اور بہت سے سندھیوں کو اس دورِ حکومت میں ملازمتیں ملی بھی ہیں)، چناں چہ کسی غیر سندھی حکومت کی نسبت اس حکومت کے خلاف اس اشتعال کی شدّت کم ہے۔ لیکن بے روزگاری بڑھ رہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ قوم پرستوں کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کا ایک فطری نتیجہ، کم از کم فی الحال، یہ ہے کہ سندھی قوم پرست مسئلے کی جڑ تک پہنچنے کے بجائے اس اشتعال کا رخ مہاجروں اور پنجابیوں ہی کی طرف رکھیں گے۔

تشدد

گزشتہ چند برسوں کے واقعات کی ایک اہم خصوصیت سیاسی مخالفین پر کیے جانے والے تشدد کی نوعیت اور شدّت ہے۔ ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے ایک دوسرے پر جو ہولناک تشدد کیا، اُس کا سندھیوں یا مہاجروں کے قومی حقوق کی "جدوجہد" سے کوئی تعلق نہیں۔ تشدد کی یہ صورتیں قومی حقوق کی جدوجہد سے الگ وجود رکھتی ہیں اور ایک دبے ہوئے کلچر اور غیر متوازن ترقی کا شاخسانہ ہیں جن سے معاشرے کے تمام حصے یکساں متاثر ہوئے ہیں۔ درحقیقت اس تشدد کی ہولناکی ایک بڑا عنصر ہے جس کے باعث سندھی مہاجر تنازعے کو اس قدر شہرت حاصل ہوئی، اور ان دونوں گروہوں کے درمیان حقیقی تنازعے کی شدّت میں بہت مبالغہ کیا گیا۔

پاکستانی معاشرے میں ہر قسم کے احتجاج اور تنازعے میں تشدد کا عنصر کارفرما رہتا ہے۔ صرف سندھی مہاجر تنازعے پر بس نہیں، جمہوری اداروں تک میں تشدد کی خاصی بڑی مقدار شامل ہو چکی ہے۔ خواہ قومی انتخابات ہوں، طلبا یا ٹریڈ یونینوں کے باہمی اختلافات ہوں یا فرقہ وارانہ تنازعات، حساب چکانے کا واحد طریقہ تشدد ہی کو سمجھا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک جھگڑے مار پیٹ سے، یا بہت ہوا تو چاقو چھری کے استعمال یا پتھراؤ سے، طے ہو جاتے تھے۔ اب کلاشنکوف استعمال کی جاتی ہے۔ ہر قسم کا اسلحہ اور گولا بارود پاکستان بھر میں اتنی فراوانی سے دستیاب ہے کہ اگر کوئی فریق اس کا استعمال نہ کرے تو اسے خاطر میں لانے کے قابل ہی نہیں سمجھا جاتا۔ سیاسی جماعتوں کی اسلحے تک رسائی کے باعث، ان سے وابستہ طلبا تنظیمیں، مزدور یونینیں اور "سماجی" ادارے بھی مسلح ہو چکے ہیں۔ آج ملک بھر میں (اور خصوصاً کراچی میں) اسلحے کی اتنی افراط ہے کہ جو لوگ سیاسی ذرائع سے ہتھیار حاصل نہ کر سکتے ہوں وہ انہیں آدھے دن کے لیے کرائے پر لے سکتے ہیں ــــ اور ان کا کرایہ رینٹ اے کار کے کرایوں سے بھی کم ہے۔ ممتاز اصفہانی نے لکھا ہے:

> "پاکستان میں اندرونِ ملک تشدد میں اضافے کا ایک بالواسطہ سبب یہ ہے کہ پاکستان نے افغان مجاہدین کی کارروائیوں کے لیے زمین اور ان تک اسلحے کی ترسیل کا راستا فراہم کیا۔ ایک طرف کابل انتظامیہ نے اپنے حامی پٹھان قبیلوں کے ذریعے پاکستان میں ہتھیار بھیجے، دوسری طرف افغان مجاہدین کے لیے بھیجے جانے والے اسلحے کا چالیس فیصد حصہ چوری چھپے پاکستان ہی میں رہ گیا۔ پاکستانی فوجی افسروں اور افغان مجاہدین کی بابت کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ہتھیار پاکستان کے کھلے بازار میں فروخت کیے... منشیات کے تاجروں، دائیں

Scanned with CamScanner

> بازو کی اسلام پسند جماعتوں اور سرحدی اور دیہی ڈاکوؤں نے کلاشنکوف سے لے کر راکٹ لانچر اور ٹینک شکن میزائل تک حاصل کر لیے۔
> (Pakistan: Dimensions of Insecurity , p.27)

گزشتہ دہائی میں فوجی تسلّط کے زیرِ نگیں پاکستان ایک بربریت زدہ معاشرہ بن چکا ہے۔ نہ صرف سیاسی گھٹن کے باعث دبے ہوئے جذبات نے تشدد کی ہولناک صورت میں اپنا اظہار پایا بلکہ ثقافتی، تدریسی اور سماجی شعبوں میں فوجی جبر کے سبب معاشرے میں تشدد کی لہر پھیل گئی ہے۔ اپنے تسلّط کا جواز پیش کرنے اور عوام کو قابو میں رکھنے کے لیے فوج نے اسلام کو استعمال کیا اور صحت مندانہ اظہار کی تمام صورتوں پر پابندی لگا دی۔ موسیقی، کھیل، فنون، ثقافت، ہر چیز کے لیے قرونِ وسطیٰ کے اسلامی ضابطوں کی مطابقت ضروری ٹھہرائی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ بدعنوانی اور رشوت کی جڑیں معاشرے میں گہری ہوتی گئیں اور ہیروئن اور اسلحے کے تاجروں کو ریاستی حوصلہ افزائی اور تحفظ حاصل ہوا۔ شکایت یا اس کے ازالے کے لیے کوئی پلیٹ فارم میسّر نہ تھا، اور ملکی معاملات میں عوام کی شمولیت یا احتساب کا دور دور تک نشان نہ تھا۔ فوجی وردی کے بہروپ میں طاقت کی حکمرانی اخلاق اور انصاف ہر چیز کی مالک بن بیٹھی۔

اسلام کے نام پر اس جبر کے ساتھ ساتھ زیریں سطح پر ایک اور متوازی عمل رونما ہو رہا تھا۔ اسمگلنگ (خصوصاً اسلحے اور ہیروئن کی اسمگلنگ اور فروخت) کے علاوہ، مشرقِ وسطیٰ کی آمدنی سے جو دولت پیدا ہو رہی تھی اُس سے شہروں میں ایک ایسے درمیانہ طبقے کو فروغ ملا جس کی اقدار معاشرے کی مروّجہ اقدار سے الگ تھیں۔ اس نئی اسرافیت (consumerism) نے، جسے متبادل ذرائع ابلاغ کی بدولت وسیع تر دنیا تک رسائی حاصل تھی، سرکاری سطح پر پیش کیے جانے والے نقطۂ نظر سے الگ ایک اور منظر نامہ پیش کیا۔ خاص کر بڑے شہروں میں اس تازہ، جدید، مائیکل جیکسن اور سری دیوی وڈیو کلچر نے ایک ایسا نقطۂ نظر پیدا کیا جو سرکاری پروپیگنڈے میں پیش کیے گئے فرسودہ خیالات کو تحقیر کی نظر سے دیکھتا تھا۔ علاوہ ازیں، شہروں کے پھیلاؤ کا عمل بہت تیزی سے جاری تھا، جس کے باعث پرانی اقدار کو ایک نئی، بالکل مختلف دنیا کا سامنا کرنا پڑا۔ جب مشرقِ وسطیٰ سے پیسے کی آمد میں کمی واقع ہوئی تو اُبھرتے ہوئے درمیانہ طبقے کو داخلوں، ملازمتوں، مہنگائی اور عدم تحفظ کے مسائل نے زیادہ شدّت سے ستانا شروع کیا۔ بے گانگی کی شکار، بے روزگار نوجوان نسل اسی غصے اور بے بسی کی نمائندہ تھی اور اسے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے کوئی راستا میسّر نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تضادات کا رخ اندر کی جانب ہو گیا اور اس گھٹن کا اظہار تشدد کی صورت میں ہوا۔ سیاسی جماعتوں میں سے ایم کیو ایم غصے، مایوسی اور تشدد کے اس شہری مظہر کی سب سے نمایاں علامت ہے۔ (سماجی علوم کے ایک ممتاز ماہر عارف حسن کا خیال ہے کہ شہروں کے پھیلاؤ سے جنم لینے والا یہ تشدد پنجاب کے شہروں میں بھی ظاہر ہو گا۔)

Scanned with CamScanner

انتخابات اور اس کے بعد

۱۹۸۸ کے انتخابات کے بعد ایک نہایت مسخ شدہ جمہوری عمل کا آغاز ہوا۔ جنرل ضیا کی موت کے بعد سے اب تک فوج کے سیاسی عزائم اور منصوبوں کے بارے میں قیاس آرائی کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ پاکستان میں کسی نہ کسی بہانے سے فوج کے ہاتھوں سویلین سیاسی عمل کے معطل کر دیے جانے کا امکان ہمیشہ نمایاں رہتا ہے، لیکن سویلین حکومتیں فوج سے مفاہمت قائم رکھنے کے لیے جس حد تک جانے کو تیار رہنے لگی ہیں اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہ جمہوری تجربہ ابھی کچھ عرصے اور چلنے دیا جائے۔

سندھ میں انتخابات کے نتائج نے صوبے کی نسلی اور شہری دیہی تقسیم کے بارے میں کسی مغالطے کی گنجائش نہ چھوڑی۔ ایم کیو ایم نے سندھ کے شہری علاقوں میں رہنے والے مہاجروں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ کیا اور پیپلز پارٹی نے سندھی اکثریت کے دیہی علاقوں میں سندھی قوم پرستوں اور ضیا حکومت کی باقیات کو واضح شکست دی۔

سندھ میں قوم پرستوں کی انتخابی شکست کی تعبیر غلط اور گمراہ کن طور پر قوم پرستی کے استرداد اور وفاقی نظام کی تائید کی صورت میں کی گئی ہے، اور اس نقطۂ نظر کو پنجاب اور ریاستی اسٹیبلشمنٹ کی طرف سے بڑھاوا دیا گیا ہے۔ یہ خیال درست نہیں ہے۔ پیپلز پارٹی کے سندھی امیدوار اپنے مخالف امیدواروں سے کم قوم پرست نہیں تھے۔ انتخابی مہم کے دوران دونوں فریقوں نے ایک جیسے نعرے لگائے اور سندھ کے لیے خود مختاری کا مطالبہ کیا، دونوں نے بہاریوں کو لانے اور کالاباغ ڈیم تعمیر کرنے کی مخالفت کی۔ پیپلز پارٹی کے امیدواروں کی فتح کا سبب نہ صرف یہ تھا کہ وہ خاصے قوم پرست تھے بلکہ یہ بھی کہ پارٹی کو وفاقی سطح پر بھی اتنی حمایت حاصل تھی کہ مرکز میں حکومت بنانے کی صورت میں وہ صوبۂ سندھ اور سندھیوں کی محرومیوں کا کچھ نہ کچھ ازالہ کر سکتی تھی۔ قوم پرستوں کے مقابلے میں پیپلز پارٹی کو دو اعتبار سے اَور بھی فوقیت حاصل تھی: بھٹو کی موت سے پیدا ہونے والا جذبۂ انتقام، اور قوم پرست جماعتوں کا انتشار۔ چناں چہ ان انتخابات میں قوم پرستی سندھ میں ایک اہم سیاسی قوت کی حیثیت رکھتی تھی، گو وہ فیصلہ کن انتخابی قوت نہیں تھی۔ مگر، جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہوگا، حالات رفتہ رفتہ تبدیل ہو رہے ہیں۔

ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کے درمیان ہونے والا معاہدہ اس تشدد کے شکار صوبے میں امن کے قیام کا حقیقی امکان رکھتا تھا۔ اس معاہدے کی ناکامی کی بڑی ذمے داری پیپلز پارٹی، خصوصاً بے نظیر بھٹو، کے تنگ نظر رویّے پر عائد ہوتی ہے۔ ایم کیو ایم، اور دوسرے پارلیمانی اتحادیوں کے ساتھ کچھ زیادہ افہام و تفہیم کا رویہ اختیار کرنے سے سندھ کے تناؤ میں کمی واقع ہوتی اور حکومت پر خود بے نظیر کی گرفت بھی زیادہ مضبوط ہو سکتی تھی۔ اپنے اتحادیوں کے ساتھ پیپلز پارٹی کا سلوک واقعی نامناسب تھا۔ دوسری جانب ایم کیو ایم اس اتحاد سے نکل کر متحدہ اپوزیشن کے ساتھ دوسرے اتحاد میں شامل ہوئی، جو اس کی بہت

بڑی غلطی تھی۔ سندھ میں تشدد کی تاریخ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے بعد ہونے والے واقعات کی پیش گوئی کی جاسکتی تھی۔

پیپلز پارٹی سے معاہدہ ختم کرنے کے بعد ایم کیو ایم ملک کے سیاسی عمل سے کٹ گئی اور اپنے حامیوں سے بھی اس کا رابطہ نہ رہا، اور یہ صورتِ حال اپوزیشن سے معاہدہ ہوجانے کے بعد بھی قائم رہی۔ نومبر ۱۹۸۹ میں بے نظیر کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کی ناکامی ایم کیو ایم کے لیے سخت مایوسی کا سبب بنی کیوں کہ اسے یقین دلایا گیا تھا کہ یہ تحریک کامیاب ہوجائے گی۔ دوسری جانب اپوزیشن کی اس تحریک سے سندھ میں پیپلز پارٹی کی مقبولیت پر مثبت اثر پڑا۔ پیپلز پارٹی میں سخت گیر قوم پرست عناصر کو پارٹی کے ایم کیو ایم کے ساتھ معاہدے پر شدید اعتراض تھا۔ وہ اسے سندھی کاز سے بے وفائی سمجھتے تھے اور ان کی ناخوشی اتنی زیادہ تھی کہ انھوں نے عدم اعتماد کی تحریک میں بے نظیر کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ عدم اعتماد کی تحریک غالباً کامیاب ہوجاتی اگر اپوزیشن اور ایم کیو ایم کے معاہدے کا اعلان غلط وقت پر نہ ہوا ہوتا۔ جب یہ واضح ہوگیا کہ پنجابی اور مہاجر اکٹھے ہوگئے ہیں تو اپنی ناخوشی کی شدّت سے قطع نظر، سندھی اُن نسلی گروہوں کا ساتھ ہرگز نہیں دے سکتے تھے جو سندھی "قوم" کو "نیست و نابود" کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔ چناں چہ نئی سیاسی صف بندی ہوئی اور قوم پرست عناصر نے مخالفت ترک کرکے بے نظیر کے حق میں ووٹ دیا۔ عدم اعتماد کی تحریک کے ناکام ہونے کے بعد سندھ میں پیپلز پارٹی پہلے سے زیادہ متحد ہو کر اُبھری اور اس نے قوم پرست جماعتوں کو خاصی زک پہنچائی کیوں کہ اب اس کا تاثر ایک اصلی سندھی پارٹی کا تھا جو ایم کیو ایم کی سخت مخالف تھی۔

موجودہ صورتِ حال

اس مضمون میں مَیں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ سندھی مہاجر تنازعہ صوبہ سندھ میں بنیادی تضاد ہرگز نہیں ہے، اور یہ تنازعہ جو آج تشدد کے محور پر گھوم رہا ہے، بڑی حد تک مصنوعی طور پر پیدا کردہ ہے جس کی بڑی ذمے داری ایم کیو ایم پر عائد ہوتی ہے۔ ایم کیو ایم ایک فاشسٹ تنظیم ہے اور اس کے نزدیک تشدد سندھ کے مہاجروں کو اپنے قابو میں رکھنے کا ایک اہم ذریعہ بن گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملک کے دوسرے گروہوں کی طرح مہاجر بھی روزافزوں معاشی اور سماجی مسائل کا شکار ہیں۔ ایم کیو ایم کو انتخابات میں واضح مقبولیت بھی حاصل ہوئی، اور یہ مہاجروں کی واحد نمائندہ تنظیم ہے کیوں کہ اس نے اس نسلی گروہ کو درپیش مسائل کے لیے آواز اٹھائی۔ اس کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مہاجر سندھ کے چند علاقوں (شہروں اور قصبوں) تک محدود ہیں چناں چہ دوسرے گروہوں کی نسبت انھیں منظم کرنا آسان ہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ تشخص کے بحران میں بھی مستقل طور پر مبتلا ہیں۔ اپنی گرفت قائم رکھنے

Scanned with CamScanner

کے لیے تشدد کے استعمال کا سبب یہ ہے کہ ایم کیو ایم ۱۹۸۷ کے بلدیاتی انتخابات میں کامیاب ہونے کے بعد سے اب تک اپنے حامیوں کے مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کر سکی ہے۔ قومی انتخابات میں اس کی کامیابی سے نئی توقعات پیدا ہوئیں، لیکن منتخب نمائندوں کے کوئی ٹھوس فائدہ حاصل نہ کر پانے کے نتیجے میں سرد ہو گئیں۔ ایم کیو ایم کی قیادت اپنے لاکھوں حامیوں پر اپنی گرفت ڈھیلی کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہے، چناں چہ کبھی پختونوں، کبھی پنجابیوں اور کبھی (جیسے آج کل) سندھیوں کی صورت میں اپنے فرضی دشمن ایجاد کرتی اور اُن کی جانب سے خطرے کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ ایم کیو ایم کی سیاست میں تشدد کا عنصر ہمیشہ غالب رہا ہے، اور مزید تشدد کے خوف اور تحفظ کی ضرورت کے احساس نے لوگوں کو اس کی حمایت پر اب تک مجبور کر رکھا ہے۔ (تعلیم یافتہ اور اعلیٰ تربیت یافتہ مہاجر افراد بھی ایم کیو ایم کی پُرتشدد حکمت عملیوں کا جواز یہ کہہ کر پیش کرتے ہیں کہ اگر ایم کیو ایم نہ ہوتی تو مہاجروں پر اور زیادہ سختیاں کی جاتیں۔)

تاہم یہ تشدد اپنی الگ جدلیات رکھتا ہے۔ محدود پیمانے کا تشدد خواہ سیاسی طور پر سودمند سمجھا جائے، ایک بار اس کے ہاتھ سے نکل جانے پر حکمت عملی میں تبدیلی پیدا کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ سندھ میں تشدد کی لہر نے اپنی ہی ایک دہشت ناک منطق اختیار کر لی ہے اور اب تشدد کرنے والوں کے حامیوں کو اپنی زد میں لے رہی ہے۔ حیدر آباد ستمبر ۱۹۸۸ کے بعد سے معاشی طور پر مفلوج ہو کر رہ گیا ہے اور اس کے نتائج حیدر آباد اور اس سے منسلک قصبوں میں سب سے زیادہ مہاجر آبادی کو برداشت کرنے پڑ رہے ہیں۔ کراچی کو بھی کرفیو اور تشدد کے واقعات کے باعث سخت نقصان اٹھانا پڑا ہے، اور اگرچہ پنجاب کی جانب سرمائے کی منتقلی کے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں، اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ ("انڈیا ٹوڈے" نے ایوان صنعت و تجارت کے ایک ترجمان کے حوالے سے لکھا کہ گزشتہ سال قائم ہونے والی ۶۳ نئی ٹیکسٹائل ملوں میں سے صرف دو سندھ میں لگیں۔) لہٰذا مہاجروں کی جماعت کے شروع کیے ہوئے تشدد سے سندھ کے دوسرے گروہوں کے مقابلے میں مہاجر ہی زیادہ متاثر ہو رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یا تو مفاہمت کی صورت میں نکل سکتا ہے یا پھر انارکی کی شکل میں۔ ایم کیو ایم کو اپنا امیج اور سیاسی زاویۂ نظر تبدیل کرنا ہو گا اور حقیقی مسائل سے زیادہ پختگی کے ساتھ نبرد آزما ہونا ہو گا۔ سندھیوں کا قتل مہاجروں کے کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔

مہاجروں کا تضاد اگر کسی نسلی گروہ سے ہے تو پنجابیوں سے ہے۔ چوں کہ سندھی سندھ کی معیشت میں بنیادی اہمیت نہیں رکھتے، اس لیے مہاجروں کو سندھیوں کے اُبھرتے ہوئے اقتصادی چیلنج سے خوف زدہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ پنجابیوں کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ ان کے اور مہاجروں کے درمیان نہ صرف سندھ بلکہ پورے پاکستان میں ملازمتوں، داخلوں اور معاشی اور سیاسی اقتدار کے معاملات میں حقیقی مسائل موجود ہیں۔ یہ حقیقت کہ ایم کیو ایم اس حقیقی تنازعے کا سامنا کرنے سے گریز کر رہی ہے، ملکی سیاست میں اس کے اصل کردار کے بارے میں متعدد سوالات کو جنم دیتی ہے۔

Scanned with CamScanner

سندھی قوم پرست بھی اپنی جدوجہد کے رخ کے بارے میں غلطی پر ہیں؛ انھیں مہاجروں کے ساتھ مل کر مرکز پر پنجابی غلبے کے خلاف جدوجہد کرنی چاہیے، کیوں کہ اپنے بل پر وہ کچھ بھی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ سندھی قوم پرستوں کی سب سے بڑی نظری غلطی ان کا مہاجر مخالف ہونا ہے۔ سندھی قوم پرستی کی سیاسی طور پر درست اور سب سے زیادہ سودمند صورت ریاست اور مرکز کے خلاف ان کا مہاجروں سے اتحاد ہے۔ بلاشبہ، موجودہ صورت حال عقل اور منطق کی بالادستی کے لیے سازگار نہیں ہے، کیوں کہ سیاست پر جذبات کی حکمرانی ہے۔ ایم کیو ایم کے احساسِ عدم تحفظ سے پیدا ہونے والے تشدد سے سندھی قوم پرستوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے جو پیپلز پارٹی کے مقابلے میں مقبولیت حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ اس کے نتائج مرکز میں پیپلز پارٹی کے لیے خطرناک ہو سکتے ہیں کیوں کہ پارٹی کے کمزور ہونے سے اقتدار پر اس کی گرفت بھی مزید کمزور ہو جائے گی۔ پیپلز پارٹی کو ایک کیچ ٹوئنٹی ٹو (Catch 22) قسم کی صورت حال کا سامنا ہے: اگر وہ ایم کیو ایم سے سمجھوتا کر کے موجودہ پُرتشدد سیاست کا کوئی حل نکالنے کی کوشش کرتی ہے تو پارٹی میں موجود اور اس کے باہر کے سندھی قوم پرست اس سے ناخوش ہو جاتے ہیں۔ ایم کیو ایم کو نظرانداز کرنے یا اس سے ٹکراو کا طرزِ عمل اختیار کرتی ہے (جیسا کہ اس نے گزشتہ کچھ عرصے سے اختیار کر رکھا ہے) تو خواہ اسے سندھی قوم پرستوں کی ہمدردیاں حاصل ہو جائیں، مگر صوبۂ سندھ کو زبردست اقتصادی نقصان پہنچ سکتا ہے جس سے خود اس کے حامی بھی شدید طور پر متاثر ہوں گے۔ مگر فی الوقت پیپلز پارٹی کے کوتاہ اندیش مفادات معاملات کو سلجھانے کے بجائے موخرالذکر طرزِ عمل اختیار کرنے کے حق میں ہیں۔

سندھیوں اور ایم کیو ایم کے مابین ایک بڑا نکتۂ اختلاف ایم کیو ایم کا یہ مطالبہ ہے کہ مہاجروں کو پاکستان کی پانچویں قومیت تسلیم کیا جائے۔ چوں کہ تمام سندھی قوم پرست قومی حقوق کا اور "قومی" بنیادوں پر صوبے قائم کرنے کا مطالبہ کرتے رہے ہیں، اس لیے مہاجروں کو قومیت مان لینے کا مطلب مہاجر صوبہ قائم کرنے کا مطالبہ ہو گا۔ سندھ کی تقسیم سندھیوں کے مفاد میں نہیں ہے، چناں چہ وہ اس کی مخالفت کریں گے۔ (گو سندھی قوم پرست سرائیکیوں کو پاکستان کی پانچویں قومیت مانتے ہیں اور پنجاب کی زمین کے ایک حصے پر ان کا حق تسلیم کرتے ہیں، لیکن وہ سرائیکی صوبے کے قیام کے لیے سندھ کی زمین کا کوئی حصہ دینے کو ہرگز تیار نہیں۔) دوسری طرف ایم کیو ایم کے وجود کا جواز ہی مہاجر قوم پرستی ہے، اور اگرچہ اس بات کے اشارے موجود ہیں کہ اس کی قیادت رفتہ رفتہ مہاجر قومیت اور مہاجر صوبے کا مطالبہ ترک کر دے گی، تاہم یہ عمل ایم کیو ایم کے اندر بہت سست رفتاری سے رونما ہو گا۔ اُس وقت تک سندھ میں موجودہ تنازعہ متواتر چلتا رہے گا۔

چند سوالات ایسے ہیں جنھوں نے صوبے میں "نظریۂ سازش" پر یقین رکھنے والوں کو ہمہ وقت مصروف رکھا ہے، اور ان سوالات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اگر گزشتہ صفحات میں پیش کیا گیا بنیادی خیال یہ ہے کہ سندھ میں بنیادی تضاد سندھیوں اور مہاجروں کے درمیان نہیں بلکہ سندھ کے باشندوں

Scanned with CamScanner

اور ریاست کے مرکز (یعنی پنجابیوں) کے درمیان ہے، تو مندرجہ ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں: سندھ میں اتنا سنگین مہاجر سندھی تنازعہ پیدا کیوں کر ہوا؟ کیا اس کی پشت پر کچھ قوتیں کام کر رہی ہیں، اور کیا یہ تشدد ان کے مفاد میں جاتا ہے؟ صوبے میں مہاجر پنجابی یا سندھی پنجابی تنازعہ کیوں موجود نہیں؟

جیسا کہ بہت سے لوگوں کی خواہش ہو گی، دو ریاستی اداروں ـــــ فوج اور بیورو کریسی ـــــ کو اس صورت حال کا ذمے دار ٹھہرانا بہت آسان ہے، مگر ان میں سے کسی کے ملوث ہونے کا کوئی بیّن ثبوت نہ ہونے کی صورت میں ان پر براہ راست الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ تاہم جتنی شہادتیں موجود ہیں، اور جو مخصوص رجحانات پیدا ہوئے ہیں، ان کی بنا پر قیاس آرائی کرنا اور مزید سوالات اٹھانا ضرور ممکن ہے، جو کہ فی الوقت تشنۂ جواب ہیں۔

سندھ میں گزشتہ ایک سال کے عرصے میں ایک ہزار سے زیادہ لوگ مارے جا چکے ہیں، لیکن کسی ایک فرد کو بھی سزا نہیں دی گئی۔ گرفتار شدگان کو بارسوخ افراد کی ایما پر فی الفور رہا کر دیا گیا۔ اس سے ان قیاس آرائیوں کو تقویت مل رہی ہے کہ سندھ میں تشدد کے واقعات کسی ایسے طاقتور ادارے کی ایما پر کرائے جا رہے ہیں جسے اس تشدد سے فائدہ پہنچنے کا امکان ہے ـــــ یعنی فوج، آئی ایس آئی یا دوسری جمہوریت مخالف قوتیں۔

فوج اب اس پوزیشن میں ہے کہ جمہوریت کے تجربے کو کسی بھی وقت منسوخ کر سکے، اور عوام کے بعض حلقوں کی طرف سے یہ مطالبہ بھی زور پکڑتا جا رہا ہے کہ وہ ملک کا اقتدار سنبھال لے۔ ضیاالحق کے مارشل لا میں فوج کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا تھا، اس لیے اس کی براہ راست حکومت کرنے کی خواہش کو خارج از امکان قرار دینا دشوار ہے۔ اگر جمہوری قوتوں اور اداروں کے خلاف واقعی کوئی سازش کی جا رہی ہے تو اس میں فوج کے بعض حلقوں کے شامل ہونے کا امکان بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ سندھ کے موجودہ خون خرابے سے فائدہ اٹھانے والا دوسرا ممکنہ عنصر بیورو کریٹ ہو سکتے ہیں جو پیپلز پارٹی کی حکومت سے عناد رکھتے ہیں۔ پنجاب کے حکمراں حلقوں کو بھی اس صورت حال، خصوصاً کراچی میں ہونے والے تشدد، سے فائدہ پہنچ رہا ہے، کیوں کہ کراچی سے سرمائے کی منتقلی چونیاں اور پنجاب کے دیگر حصوں کی سمت ہو رہی ہے۔ اگرچہ سندھ کی صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے والے کسی بھی فریق کو براہ راست ذمے دار ٹھہرانا ممکن نہیں، پھر بھی بہت سے سوالات موجود ہیں۔

(جمہوری دور کے چند مثبت نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ پریس نسبتاً آزاد ہے جس کے باعث ایسے تجزیے شائع ہو سکتے ہیں جن میں نہ صرف حکومت پر، بلکہ کبھی کبھی فوج پر بھی، تنقید کی جاتی ہے۔ سندھ کے تشدد کے تناظر میں کئی مواقع پر فوج کے ملوث ہونے پر بالواسطہ، اشارتاً اور براہ راست اظہار خیال کیا گیا ہے۔ کراچی کے انگریزی ماہ ناموں، "نیوز لائن" اور "ہیرلڈ"، نے ایسے کئی اشارتی مضامین شائع کیے ہیں۔ حیدر آباد میں تشدد کے ہولناک واقعات میں ایک حاضر ڈیوٹی کرنل کو نام لے کر ملوث ٹھہرایا گیا۔ اسی طرح لاہور کے انگریزی ہفتہ وار "فرائیڈے ٹائمز" نے اپنے ۱۴ تا ۲۰ جون

۱۹۹۰ کے اداریے میں تحریر کیا: "پاکستان پیپلز پارٹی کے اس الزام میں تھوڑی بہت صداقت یقیناً معلوم ہوتی ہے کہ سندھ میں اس کی حریف جماعت ایم کیو ایم کو جنرل ضیا کے دور میں آئی ایس آئی کی حمایت حاصل رہی ہے۔)

نتائج

سندھ میں خصوصاً اور ملک میں عموماً انتہائی غیر یقینی حالات کے باعث مستقبل میں کئی امکانات حقیقت بن کر رونما ہو سکتے ہیں۔ سندھ اور اسلام آباد میں سندھی درمیانہ طبقے کی نشوونما سندھی قوم پرستی کی قوتوں کو مضبوط اور پختہ کر سکتی ہے۔ سندھ کی اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ، اور قوم پرستی کے باوجود، اس صوبے کا ملک کے باقی حصوں سے رابطہ مضبوط اور پیچیدہ تر ہوتے چلے جانے کا امکان ہے۔ سندھی قوم پرستی کا علیحدگی پسند رجحان، اپنے تمام رومانی اور غیر حقیقی خیالات سمیت، اپنی فطری موت مر جائے گا۔ سندھ کے درمیانہ طبقے کو رفتہ رفتہ اس حقیقت کا احساس ہو گا کہ پنجاب اور کراچی کے ساتھ معاملہ کرنا اس کے مفاد میں ہے اور سندھ کی علیحدگی کی تحریک چلانے کے بجائے استحصالی نسلی گروہوں کے ساتھ کسی سمجھوتے پر پہنچنا زیادہ سود مند ہے۔ مگر پیداواری قوتوں کی نشوونما کی موجودہ سطح کو مدنظر رکھتے ہوئے اس حکمتِ عملی سے سندھی درمیانہ طبقہ مہاجر اور پنجابی سرمایہ داروں کے زیردست ہو جائے گا۔ (واضح فرق کے باوجود، پختون مسئلے میں ایک دل چسپ مماثلت موجود ہے جو سندھ کے واقعات کی نوعیت کو سمجھنے میں کچھ مدد کر سکتی ہے۔ پختونوں میں بھی ایک قوم پرست درمیانہ طبقہ موجود تھا جو سخت مرکز مخالف اور پنجابی مخالف تھا جس کے ترجمانوں نے متعدد موقعوں پر پاکستان سے علیحدگی کی بات کی تھی۔ آج یہ طبقہ پختون معاشرے پر بورژوا طبقے کے غلبے، اور پنجابیوں اور مرکز کے ساتھ پختونوں کے اتحاد، سے فائدہ اٹھانے والوں میں سرِ فہرست ہے۔ اب کوئی پختون مشکل ہی سے ملک سے علیحدگی کی بات کرتا ہے۔ قومی حقوق کو پاکستان کے وفاقی ڈھانچے کے تناظر میں دیکھا جانے لگا ہے اور اب پختون موجودہ وفاق میں رہتے ہوئے اپنے لیے زیادہ بڑا حصہ حاصل کرنے میں دل چسپی رکھتے ہیں۔) دوسری طرف اگر سندھیوں نے سندھ کے اندرونی علاقوں میں بالادستی حاصل کرنی چاہی ـــــ شہروں میں، جو مہاجروں اور پنجابیوں کے قبضے میں ہیں، وہ بالادستی حاصل نہیں کر سکیں گے ـــــ تب انھیں مہاجروں کے ساتھ اتحاد کر کے صوبے اور مرکز میں پنجابیوں کے غلبے کے خلاف جدوجہد کرنی ہو گی۔

اوّل الذکر امکان ـــــ یعنی سندھی قوم پرستی کی مضبوطی کے باوجود باقی ملک کے ساتھ اتحاد کا راستا اختیار کرنے کا امکان ـــــ صرف اس صورت میں حقیقت پذیر ہو سکتا ہے کہ سندھ اور مرکز میں پیپلز پارٹی کا اقتدار قائم رہے۔ اگر فوج یا غیر سندھی اپوزیشن نے پیپلز پارٹی کی حکومت ختم کرنے میں کامیابی حاصل

Scanned with CamScanner

کرلی تو دوسرا امکان ـــ جو پہلے امکان کے بالکل برعکس ہے ـــ رو بہ عمل آسکتا ہے۔ اس صورت میں سندھی معاشرے پر بورژوا طبقے کے غلبے کی رفتار سست پڑجائے گی اور ان حقائق کے پیشِ نظر کہ سندھی اپنے صوبے میں اقلیت میں تبدیل ہو چکے ہیں، معاشی طور پر کمزور ہیں اور ان کو مہاجروں اور پنجابیوں کی طرف سے سخت مسابقت کا سامنا ہے، ایک بہت دور کا امکان یہ بھی ہے کہ دوسرے نسلی گروہوں کے برعکس سندھیوں میں طاقت ور درمیانہ طبقہ پیدا ہی نہ ہوسکے اور سندھی، سیاسی اور اقتصادی اکائی کے طور پر، اپنا وجود ہی کھو بیٹھیں۔ یہ سندھی قوم کے نابود ہونے کی ابتدا ہو گی۔ ایسی صورت میں سندھ میں ہونے والی تمام تر معاشی ترقی مہاجروں اور پنجابیوں کے قبضے میں آجائے گی جو صوبے پر اپنی گرفت اور مضبوط کرلیں گے۔ یہ عمل، اگر پیش آیا تو، بہت طویل عرصے میں وقوع پذیر ہو گا، لیکن اگر اس قسم کا رجحان پیدا ہوتا ہے تو اس کے قلیل میعادی اثرات کی پیش گوئی کی جا سکتی ہے: مایوسی کا شکار ہو کر سندھی قوم پرست تشدد کا سہارا لیں گے اور صوبے میں رہنے والے مہاجروں اور پنجابیوں پر حملے کریں گے۔ بلاشبہ یہ امکان سندھ کے باشندوں کے لیے نہایت المناک ہو گا۔

اگر جمہوری عمل جاری رہا تو چند برس کے عرصے میں قوم پرست تحریک میں اعتدال پیدا ہو سکتا ہے اور ہوش مندانہ سیاست کو تقویت حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن اس عرصے میں سندھ کا تقسیم ہونا یا مہاجروں کا اپنے موجودہ حقوق سے زیادہ کوئی حقوق حاصل کرنا خارج از امکان ہے۔ اس کا نتیجہ نسبتاً غیر اہم مسائل پر وسیع تر خون خرابے کی صورت میں نکلے گا جس کے بعد دونوں گروہوں کے مفادات مرکز کی بالادستی کے خلاف ایک ہو سکتے ہیں۔ سیاسی شراکت اور احتساب کے فقدان نے پاکستان میں صرف ایک قسم کے ضابطے کی گنجائش چھوڑی ہے: طاقت اور جبر کا پُرتشدد اظہار۔ آج ملک کے تمام نسلی گروہ تاریخ کے سکھائے ہوئے اسی سبق پر عمل پیرا ہیں۔ اگر دوسرے قسم کے ضابطے، مثلاً جمہوریت، کی جڑیں مضبوط ہو پائیں تو شکایات کے ازالے کی دوسری راہیں دریافت کی جا سکتی ہیں۔ جوں جوں سندھی درمیانہ طبقے کا دباو بڑھے گا، مرکز کے لیے اسے اقتدار میں زیادہ حصہ دینا لازم ہو جائے گا، اور پنجاب کو اپنی گرفت اُسی طرح ڈھیلی کرنی ہو گی جس طرح اس نے پختونوں کے معاملے میں کی ہے۔ طویل عرصے میں، زیادہ خود مختاری، اقتدار میں زیادہ شراکت اور زیادہ عملیت پسند اور احتساب کی قائل حکومت کا قیام سندھ کے مسائل کے حل کے لیے بنیادی شرط ہے۔ ان مسائل کا کوئی قلیل میعادی حل نہیں ہے۔

**

Scanned with CamScanner

مارک ٹلی

انگریزی سے ترجمہ اور تلخیص : اجمل کمال

چھوٹے ہتھیار

میں بیک وقت دو ملکوں کا شہری ہوں: میں ایک انگریز کی حیثیت سے ہندوستان میں پیدا ہوا، برطانیہ میں تعلیم پائی اور اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا بڑا حصہ واپس جا کر ہندوستان میں گزارا۔ میں اپنے دونوں ملکوں کے بارے میں بہت حساس ہوں۔ ہندوستان سے میری گہری وابستگی کے باعث بعض برطانوی حلقوں میں میری یہ شہرت قائم ہو گئی ہے کہ میں اس ملک سے ضرورت سے زیادہ ہمدردی رکھتا ہوں؛ کچھ لوگ تو مجھے "نیٹو بننے" کا بھی طعنہ دیتے ہیں۔ اس طعنے سے یہ المناک حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہم انگریزوں میں نوآبادیاتی روح اب تک پوری طرح ختم نہیں ہوئی ہے۔ مجھے اپنے طرزِ عمل پر کسی معذرت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیوں کہ میں ہمیشہ اس بات کا قائل رہا ہوں کہ کسی خطّے کی خبر نگاری کرنا، جیسے میں برصغیر کے واقعات کی خبر نگاری کرتا رہا ہوں، اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک آپ کو اس سے ہمدردی نہ ہو۔ میں اسلحے کی روک تھام کے موضوع پر کچھ ایسے خیالات پیش کرنے کے سلسلے میں بھی کوئی معذرت نہیں کرنا چاہتا جو برصغیر میں پائے جاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ لوگ، جو مغرب میں ذہنوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ان خیالات سے واقف ہو کر اس بات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے کہ جنوبی ایشیا کے رہنے والے ہماری (یعنی مغرب کی) پالیسیوں کو کس طرح دیکھتے ہیں۔ اس سے شاید اُن دو موضوعات پر ایک نئے زاویے سے سوچنے کا موقع پیدا ہو جو میرے نزدیک ایک دوسرے سے قریبی طور پر منسلک ہیں — یعنی ایٹمی ہتھیاروں کی روک تھام اور چھوٹے ہتھیاروں کا پھیلاو۔

مغرب کے قابلِ تعریف مقاصد، یعنی وہ مقاصد جن سے مجھے ذرا بھی اختلاف نہیں، عموماً ایسے انداز سے پیش کیے جاتے ہیں کہ ترقی پذیر ملکوں میں ان کی بابت شک و شبہ، بلکہ منفی ردِعمل پیدا ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر تجارت کے نئے عالمی نظام کے سلسلے میں ہونے والے مذاکرات کے دوران "سماجی شرائط" [مثلاً مزدور بچوں کے بارے میں شرائط] شامل کرنے سے ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملکوں میں ایسے شبہات کا پیدا ہونا ہرگز حیرت انگیز نہیں کہ شاید عالمی اقتصادی میدان میں ان کی سب سے فائدہ مند خصوصیت — سستی لیبر — کو بے اثر بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اسی طرح انسانی حقوق

Scanned with CamScanner

کے بارے میں اپنی فکرمندی کے اظہار کے ساتھ اقتصادی پابندیاں لگانے کی دھمکیوں سے تیسری دنیا کی حکومتوں کے لیے ایمنسٹی انٹر نیشنل جیسی بلندپایہ تنظیموں کی تحقیقات کے نتائج کو مغرب کے اقتصادی مفادات کا نتیجہ قرار دے کر رد کرنا ممکن ہوجاتا ہے۔

مغرب کی کوششوں کے اصل محرکات کی بابت یہ شبہات سب سے زیادہ ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاو کو روکنے کے معاملے میں سامنے آتے ہیں۔ انھیں شبہات کے باعث ترقی پذیر ملک بین الاقوامی ایجنڈے میں چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاو کو روکنے کا معاملہ شامل کرنے پر اصرار نہیں کرتے۔ ناوابستہ ملکوں کی تحریک (NAM) میں یہ خوف پایا جاتا ہے کہ اگر چھوٹے ہتھیاروں کے معاملے پر زیادہ زور دیا گیا تو ایٹمی طاقتوں کو موقع مل جائے گا کہ دنیا کی توجہ ایٹمی ہتھیاروں سے (جن کے وہ مالک ہیں) دوسری طرف پھیر دیں۔

ایٹمی کلب کے رکن بڑے ممالک دنیا میں ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاو کے بارے میں تشویش محسوس کرنے میں حق بجانب ہیں ___ خصوصاً جنوبی ایشیا میں، جہاں ہندوستان اور پاکستان دونوں کے پاس ایٹمی دھماکا کرنے کی صلاحیت موجود ہے ___ لیکن مجھے گمان ہے کہ وہ ان ملکوں کے احساسات کو سمجھنے کی کچھ زیادہ کوشش نہیں کرتے۔ ابھی پچھلے مہینے میں نے ایک اخباری مضمون پڑھا جس کے مصنف کا موقف یہ تھا کہ بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہمیشہ بے گناہ لوگوں کے خلاف استعمال کیے گئے ہیں، چناں چہ "ایٹمی ہتھیاروں سے محروم ملکوں کا یہ خوف بالکل بجا ہے کہ ایٹمی ہتھیار اُنھیں کے خلاف استعمال کیے جانے کے لیے ذخیرہ کیے جا رہے ہیں، جیسے جرمنوں نے یہودیوں کے خلاف ہائیڈروجن سائنائیڈ کا استعمال کیا تھا۔ ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاو کو روکنے کے معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے چھوٹے ملکوں کو مجبور کرنا بالکل ویسا ہی ہے جیسے جرمنوں نے یہودیوں کو ستارہ داوَد کی علامت پہننے پر مجبور کیا تھا تاکہ وہ آسانی سے پہچانے جا سکیں۔" یہ سخت الفاظ، جنھیں آپ میں سے بہت سے لوگ بالکل نامناسب قرار دیں گے، "ٹائمز آف انڈیا" کے ادارتی صفحے پر چھپنے والے ایک مضمون میں لکھے گئے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان جیسے ملکوں میں مغربی موقف کے بارے میں کس قسم کے احساسات پائے جاتے ہیں۔

ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاو کو روکنے کے سلسلے میں ہماری انتھک کوششیں ایک اَور مسئلے کی جانب سے ہماری توجہ بالکل ہٹادیتی ہیں ___ یعنی چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاو کا مسئلہ۔ مجھے ایسی کوئی شہادت نہیں ملی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ مغرب کو اس مسئلے سے کوئی خاص دل چسپی ہے۔ جنوبی ایشیا کے بہت سے لوگ اس عدم دل چسپی کو اس امر کا ثبوت سمجھتے ہیں کہ مغرب کو بڑے بڑے مسائل پر صرف اُس وقت تشویش محسوس ہوتی ہے جب یا تو اُسے خود نقصان پہنچ رہا ہو یا وہ تیسری دنیا پر کسی معاملے میں فوقیت حاصل کرنا چاہتا ہو۔ میں خود سے بھی یہ سوال کرتا ہوں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہمیں ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاو کے بارے میں اس قدر تشویش ہے اور چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاو کی کوئی خاص پروا نہیں۔

Scanned with CamScanner

میرے نزدیک اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاو سے خود ہمیں خطرہ محسوس ہوتا ہے جبکہ چھوٹے ہتھیاروں کی پھیلائی ہوئی تباہی یوروپ کے سرحدی علاقوں اور ترقی پذیر ملکوں ــــ خصوصاً افریقا اور جنوبی ایشیا کے ملکوں ــــ تک محدود رہتی ہے۔ بلاشبہ ہم انگریزوں کو شمالی آئرلینڈ میں چھوٹے ہتھیاروں کی فراہمی روکنے کی سخت فکر ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے ۷۷ ہلاکت خیز تنازعات میں سے ۶۵ تنازعات ترقی پذیر ملکوں میں پیش آ رہے ہیں۔ جنگ کے ان حالیہ میدانوں میں سپاہیوں اور شہریوں کو ہلاک اور زخمی کرنے والے ہتھیار ایٹمی نہیں بلکہ غیر ایٹمی، چھوٹے ہتھیار ہیں۔ ایٹمی ہتھیاروں کا خطرہ کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو، دوسری جنگِ عظیم میں جاپان کے خلاف استعمال کیے جانے کے بعد سے اس کی حیثیت ایک "امکانی" (potential) خطرے کی رہی ہے۔ اُس جنگ کے بعد سے اصل (actual) ہلاکت چھوٹے ہتھیاروں کے استعمال سے ہوئی ہے، جن کی ہلاکت خیزی کی تکنیکی صلاحیت مسلسل بڑھتی جارہی ہے، اور یہ ہلاکت آج بھی جاری ہے۔ اگر ہم انگریزوں کو اپنے ہم وطنوں کے اسی طرح ہلاک ہونے کا خطرہ ہوتا، جیسے کشمیر، سری لنکا، سومالیا، کمبوڈیا اور تیسری دنیا کے متعدد دوسرے ملکوں کے باشندے ہلاک ہو رہے ہیں، تو کیا تب بھی ہم چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاو کے سلسلے میں اتنے ہی بے پروا اور بے عمل رہتے؟ کیا تب بھی ہم جنوبی ایشیا میں مسائل پیدا کرنے والی امریکی پالیسیوں کی اسی شدومد سے حمایت کرتے؟

اس مقام پر مجھے ان ہتھیاروں کی تعریف متعین کر دینی چاہیے جن کے پھیلاو پر مجھے اس قدر تشویش ہے۔ ناٹو (NATO) کی وضع کردہ تعریف کی رو سے چھوٹے ہتھیار وہ ہیں جن کا بور ۵۰ ملی میٹر سے کم ہو۔ لیکن اس سے زیادہ موزوں تعریف مجھے ایک ہندوستانی دفاعی ماہر نے بتائی تھی: چھوٹے ہتھیار وہ ہیں جنھیں کوئی شخص اکیلا اٹھا کر چل سکے۔

ان ہتھیاروں کی پھیلائی ہوئی تباہی کا اندازہ کیوں کر کیا جا سکتا ہے؟ حال ہی میں "سیو دَ چلڈرن فنڈ" (Save the Children Fund) نے تخمینہ لگایا ہے کہ پچھلے دس برسوں میں ہونے والی جنگوں میں ایک کروڑ بچے جسمانی یا نفسیاتی طور پر متاثر ہوے ہیں، اور پانچ لاکھ بچے ہلاک ہوے ہیں۔ اس انجمن کا کہنا ہے کہ "دولت مند ملکوں کو ان ہتھیاروں کی فراہمی قطعی طور پر روک دینی چاہیے جن کے ذریعے یہ جنگیں ممکن ہوتی ہیں۔" یہ تمام بچے چھوٹے ہتھیاروں سے نہیں ہلاک ہوے، لیکن ان کی بہت بڑی تعداد یقیناً انھیں ہتھیاروں کا شکار ہوئی ہے۔

آیئے اب جنوبی ایشیا پر نظر ڈالیں۔ سکھ علیحدگی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں ہندوستان کے صوبۂ پنجاب میں ایک سال کے عرصے میں ۲۴۴۷ شہری ہلاک ہوے، تقریباً تمام چھوٹے ہتھیاروں سے۔ کشمیر میں بغاوت کے پہلے سال میں کم از کم پندرہ سو لوگ مارے گئے۔ اس بغاوت کے آغاز کے دو سال کے عرصے میں سات ہزار کلاشنکوفیں، ڈیڑھ سو مشین گنیں، پانچ سو راکٹ لانچر، ڈیڑھ ہزار راکٹ گرینیڈ اور کئی ٹن گولا بارود برآمد ہوا۔ سری لنکا کی خانہ جنگی کے ایک سال میں دو ہزار لوگ ہلاک ہوے۔

حال ہی میں پاکستانی وزیرِاعظم بے نظیر بھٹو نے اپنے ملک کے سب سے بڑے صنعتی شہر اور واحد بندرگاہ کراچی میں تشدد اور لاقانونیت کی صورتِ حال کو "چھوٹے پیمانے کی بغاوت" ("mini-insurrection") کی اصطلاح میں بیان کیا ہے۔ ایک پاکستانی جریدے کی رپورٹ کے مطابق "کراچی ایسے چھوٹے چھوٹے قبائلی علاقوں میں تقسیم ہو چکا ہے جن پر مختلف سیاسی اور مذہبی جماعتوں سے ٹوٹے ہوئے دہشت گرد ٹولوں کا راج ہے، اور ان کی باہمی رقابتیں بے حد پیچیدہ ہو چکی ہیں اور حکام کے بس میں صرف اتنا رہ گیا ہے کہ شہر بھر میں گھوم پھر کر لاشیں جمع کر لیا کریں۔"

اس بات میں کم ہی لوگوں کو شبہ ہوگا کہ ہندوستان اور پاکستان میں تشدد کی ہولناک سطح براہ راست اُس عمل کا نتیجہ ہے جسے مَیں امریکا کی طرف سے افغان مجاہدین کو نہایت غیرذمےدارانہ طور مسلح کرنے کا عمل سمجھتا ہوں؛ اور اس عمل میں امریکا کو سعودی عرب اور برطانیہ کی بھی اعانت حاصل رہی ہے۔ لندن یونیورسٹی کے سنٹر فار ڈیفنس اسٹڈیز کے ڈاکٹر کرس اسمتھ نے ایک مقالہ لکھا ہے جس کا عنوان ہے: "پاکستان اور شمالی ہندوستان میں چھوٹے اور ہلکے ہتھیاروں کا پھیلاو۔" اس مقالے میں وہ لکھتے ہیں: "گزشتہ برسوں میں ہونے والی ہولناک ترین بات افغان مجاہدین کو مسلح کرنے کے لیے امریکا کی قائم کی ہوئی اسلحے کی پائپ لائن تھی۔ اس خطّے [جنوبی ایشیا] میں آنے والے اسلحے کے سیلاب نے پچھلے دس سال میں امن و امان کی بگڑی ہوئی صورتِ حال پیدا کرنے میں نمایاں ترین حصّہ لیا ہے۔" امریکا نے افغانستان میں سوویت یونین کو شکست دینے کا عزم کر رکھا تھا، لیکن ساتھ ہی یہ عزم بھی کر رکھا تھا کہ ویت نام کی غلطی کو دُہرانے، یعنی جنگ میں براہ راست ملوّث ہونے سے گریز کرے گا۔ چناں چہ اس نے پاکستان کو اس جنگ میں اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ امریکا ہتھیار فراہم کرتا تھا اور پاکستان ان ہتھیاروں کی تقسیم کو کنٹرول کرتا تھا۔

اس اسلحے کی مقدار کیا ہے؟ اس سلسلے میں کئی تخمینے لگائے گئے ہیں، جن میں سے کوئی بھی پوری طرح درست نہیں سمجھا جا سکتا کیوں کہ افغان مجاہدین کو اسلحے کی فراہمی ایک خفیہ آپریشن تھا۔ لیکن یہ تمام تخمینے مہلک ترین ہتھیاروں کے ایک عظیم سیلاب کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کرس اسمتھ کا خیال ہے کہ ۱۹۸۷ میں یہ مقدار ۶۵ ہزار ٹن سالانہ تک جا پہنچی تھی۔ ایک ہندوستانی دفاعی ماہر، جس نے پاکستان کے توسط سے افغان مجاہدین کو اسلحے کی فراہمی کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے، ان ہتھیاروں کی قیمت کا تخمینہ چھ ارب ڈالر لگاتا ہے۔

یہ کس قسم کے ہتھیار تھے؟ چین اور دوسرے ملکوں سے خریدی ہوئی آسالٹ رائفلیں، جنھیں پاکستان بھیجا گیا — ۱۹۹۱ تک ان کی تعداد، ایک اندازے کے مطابق، چار لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی۔ چین سے خریدے ہوئے دوسرے ہتھیاروں میں بھاری اور ہلکی مشین گنیں، ۱۲۲ ملی میٹر کے لانچر اور زمین سے زمین پر مار کرنے والے راکٹ شامل تھے۔ سام سیون میزائل مصر سے، ۱۲۲ ملی میٹر کی توپیں اسپین سے اور ۲۰ ملی میٹر کی طیارہ شکن توپیں سوئٹزرلینڈ سے خریدی گئیں۔ ہمارے ملک برطانیہ

نے زمین سے ہوا میں مار کرنے والے میزائل فراہم کیے۔ امریکا نے ان ہتھیاروں کی خریداری کے اخراجات برداشت کرنے اور انہیں پاکستان تک پہنچانے کے آپریشن کی نگرانی کرنے کے علاوہ خود بھی پاکستان کو کچھ مہلک ترین ہتھیار فراہم کیے: کلسٹر بموں والے راکٹ، کیمیائی گرینیڈ اور اسٹنگر میزائل۔ رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ افغان جنگ کے دوران ۳۴۰ اسٹنگر میزائل چلائے گئے جن سے ۲۶۹ طیارے گرائے گئے ــــ یعنی کامیابی کی شرح ۷۰ فیصد رہی جبکہ انہیں چلانے والے نشانہ باز پوری طرح تربیت یافتہ بھی نہیں تھے۔

امریکا کو اب اس بات کی بہت فکر ہے کہ حرارت کا پیچھا کرنے والے یہ مہلک ترین اسٹنگر میزائل، جو افغان مجاہدین کو فراہم کیے گئے تھے، کہیں دہشت گردوں کے قبضے میں نہ پہنچ جائیں جو ان کے ذریعے سویلین طیاروں کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ امریکی ان ہتھیاروں کو واپس خریدنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اس میں انہیں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ ایک معتبر ذریعے کے مطابق سو اسٹنگر کچھ ملکوں کے ہاتھ فروخت کیے جا چکے ہیں جن میں لیبیا، عراق، ایران اور شمالی کوریا شامل ہیں۔ چناں چہ امریکا کی تشویش سمجھ میں آتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ پاکستانی فوج کے قبضے میں بھی کچھ اسٹنگر میزائل ہیں، جبکہ ان کی خریداری کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔

اسٹنگر میزائلوں کی گم شدگی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مجاہدین کو مسلح کرنے کا عمل کس قدر غیر ذمےداری سے انجام دیا گیا۔ امریکا ہتھیاروں کے کنٹرول سے مکمل طور پر دست بردار ہو گیا، اور یہ کنٹرول آئی ایس آئی کے پاس رہا۔ یہ ادارہ حکومت کو بلکہ فوج کو بھی پوری طرح جواب دہ نہیں اور بجائے خود ایک قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ فیصلہ کہ کون سے ہتھیار افغان مجاہدین کے کس گروپ کو دیے جائیں بڑی حد تک آئی ایس آئی کے ہاتھ میں تھا۔ افغانستان کی موجودہ المناک صورت حال کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ گلبدین حکمت یار کو اس کے تناسب سے کہیں زیادہ امریکی ہتھیار دیے گئے۔ اس سے بھی بدتر بات یہ تھی کہ آئی ایس آئی نے امریکی ہتھیاروں کی ایک بڑی مقدار ــــ شاید ۴۰ فیصد مقدار ــــ خود اپنے استعمال کے لیے رکھ لی۔ جب تک فوجی ڈکٹیٹر ضیاالحق کا دور رہا، تب تک آئی ایس آئی پر حکومت کا کنٹرول کسی حد تک قائم رہا؛ اس کے بعد سے یہ کنٹرول تقریباً بالکل ختم ہو چکا ہے۔ افغان جنگ کے دوران پاکستان میں امریکی سفیر اور ہتھیاروں کی فراہمی میں نمایاں کردار ادا کرنے والے رابرٹ اوکلے نے پچھلے سال ایک انٹرویو میں کہا: "ضیاالحق کے بعد پاکستانی فریق پر کوئی کنٹرول باقی نہیں رہا۔ خصوصاً آئی ایس آئی نہ تو فوج کو جواب دہ ہے نہ وزیر اعظم کو اور نہ صدر کو... نتیجہ یہ ہے کہ آئی ایس آئی کی نگرانی کرنے والا کوئی نہیں۔ بدعنوانی، منشیات اور بے پناہ دولت نے صورت حال کو بے حد پیچیدہ کر دیا ہے۔"

امریکا نے ان ہلاکت خیز ہتھیاروں کو جنوبی ایشیا میں بے لگام چھوڑ دینے کے بعد وقتاً فوقتاً ان کا کنٹرول حاصل کرنے کی تھوڑی بہت کوششیں ضرور کیں لیکن ان میں اسے آئی ایس آئی کی طرف سے

Scanned with CamScanner

کسی قسم کا تعاون نہیں ملا۔ ۱۹۸۸ میں امریکا نے پاکستان میں اسلحے کے ذخیرے کا معائنہ کرنے پر اصرار کیا۔ چند ہی روز بعد اسلام آباد اور راولپنڈی کی شہری آبادی کے قریب اوجڑی میں واقع ہتھیاروں کے ذخیرے میں زبردست آگ بھڑک اٹھی۔ اس آگ سے ہونے والے دھماکوں میں سیکڑوں لوگ ہلاک اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ پاکستانی ایرفورس کے ایک ریٹائرڈ ایرمارشل نے لکھا ہے: "اوجڑی، حکام کے دعووں کے برخلاف، ہتھیاروں کی سپلائی کا کوئی معمولی ٹرانزٹ ڈپو نہیں تھا۔ آتش زدگی اور دھماکوں کے بعد، بم ڈسپوزل اسکواڈ نے تیس ہزار ایم بی آر ایل، سام میزائل، آر پی جی، ۱۵۵ اور ۱۲۲ ملی میٹر کے شیل، اور مختلف اقسام کے بم جمع کیے۔ ان کی پانچ گنی تعداد آگ اور دھماکوں میں تباہ ہو چکی تھی۔" ممکن ہے یہ تخمینہ ذرا عجلت میں لگایا گیا ہو، لیکن اس سے اوجڑی کے افغان ہتھیاروں کے ایک نہایت اہم ذخیرہ ہونے کی تصدیق ضرور ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ آگ دانستہ لگائی گئی تھی تاکہ امریکیوں کو معلوم نہ ہو سکے کہ ان کے دیے ہوئے ہتھیاروں کا کیا بنا۔

لیکن ہمیں اپنی رائے میں توازن برقرار رکھنا چاہیے۔ جنوبی ایشیا میں عدم استحکام پیدا کرنے کا پورا الزام امریکا کی طرف سے افغان مجاہدین کو ہتھیاروں کی فراہمی پر نہیں رکھا جا سکتا۔ ہندوستان اور پاکستان بھی اس سلسلے میں یقیناً قصوروار ہیں۔ اوّل تو ان دونوں ملکوں نے ایسے سیاسی مسائل پیدا کیے جن سے مقامی عدم استحکام پیدا ہوا اور ایسے گروپوں نے جنم لیا جنھوں نے ان ہتھیاروں کو استعمال کیا۔ ہندوستان میں اب یہ بات مسلّمہ طور پر مانی جاتی ہے کہ اندرا گاندھی، ان کے بیٹے سنجے، اور اُس وقت کے وزیراعلیٰ پنجاب ذیل سنگھ، تینوں سنت جرنیل سنگھ بھنڈراں والے کو ایک گمنام سکھ مبلغ کے مقام سے ایک بڑی سیاسی شخصیت کے رتبے تک پہنچانے کے ذمے دار تھے۔ اندرا گاندھی کو پنجاب میں اپنی حریف سکھ مذہبی جماعت اکالی دل سے مقابلہ کرنے کا بہترین طریقہ یہی معلوم ہوا کہ اکالی دل کے اس سے بھی زیادہ کٹر فرقہ پرست دھڑے کو مستحکم کیا جائے ــــ اس امر کے باوجود کہ اُن کی کانگریس پارٹی سیکولر ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ بھنڈراں والے کے گولڈن ٹمپل پر قبضے اور اس پر فوج کی چڑھائی کی صورت میں نکلا۔ خود اندرا گاندھی کو بھی ان کے سکھ محافظوں نے دربار صاحب کی بے حرمتی پر طیش میں آکر قتل کر دیا۔ اس طرح پنجاب کے مسئلے کی جڑ ایک بے اصول سیاسی حکمتِ عملی تھی جو اندرا گاندھی نے اپنی سیاسی حریف جماعت کو زک پہنچانے کے لیے اختیار کی۔

کشمیر کا بھی یہی قصہ ہے۔ وہاں بھی اندرا گاندھی کے اپنے سیاسی حریفوں کو برداشت نہ کر پانے سے بحران پیدا ہوا۔ انھوں نے اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا کہ کشمیر میں شیخ عبداللہ کے خاندان کی جماعت نیشنل کانفرنس کی فطری حمایت موجود ہے، اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو معزول کرنے کی مہم چلائی۔ راجیو گاندھی نے فاروق عبداللہ کی مزید تذلیل کرتے ہوئے اصرار کیا کہ وہ کانگریس کے ساتھ سیاسی اتحاد کے معاہدے پر دستخط کریں۔ اس سے کشمیری قوم پرست کے طور پر عبداللہ کا اعتبار خاک میں مل

Scanned with CamScanner

گیا۔ ہندوستانی نقطۂ نظر سے یہ اعتبار اس خاندان کا سب سے قیمتی سیاسی اثاثہ تھا۔ اس سے جو سیاسی خلا پیدا ہوا اُسے اُن اسلامی جماعتوں نے پُر کیا جو کشمیر کے ہندوستان میں شامل رہنے کے خلاف ہیں۔

کراچی میں ہونے والے تشدد کی بیشتر ذمے داری جنرل ضیاالحق پر عائد ہوتی ہے۔ جنرل نے پیپلز پارٹی کی سیاسی قوت کو توڑنے کی کوشش کی جس کی حمایت سندھی عوام میں مستحکم ہے۔ انھوں نے سندھ کے صدر مقام کراچی میں مہاجر قومی موومنٹ کے قیام کی حوصلہ افزائی کی جس نے تقسیم ہند کے وقت پاکستان آنے والے مہاجروں کے مسائل کے لیے آواز اٹھائی۔ جنرل ضیا نے ایک ایسے موقعے پر سندھی مہاجر تفریق پیدا کرنے والی جماعت کی تشکیل میں مدد دی جب صوبہ سرحد سے بڑی تعداد میں آنے والے پٹھانوں کے اس شہر کی خوش حالی میں زیادہ حصہ طلب کرنے کے باعث مہاجروں اور پٹھانوں کے درمیان تناو بڑھ رہا تھا۔ جنگجو پٹھانوں کے پاس امریکا کا فراہم کیا ہوا اسلحہ اور منشیات کی تجارت سے حاصل کردہ دولت تھی جس کے بل پروہ کراچی کی جرائم کی دنیا کا ایک اہم عنصر بن گئے تھے۔

ایم کیو ایم کے انتشار، پٹھانوں اور پنجابیوں کے باقی تمام گروہوں کے خلاف اتحاد، شیعہ اور سنّی جماعتوں کے باہمی کشت و خون اور اپنے مفادات کا تحفظ کرنے والے ڈرگ مافیا اور نام نہاد "سماج دشمن عناصر" کی سرگرمیوں کے باعث اب کراچی کی صورتِ حال انتہائی پیچیدہ ہو چکی ہے۔ لیکن اس صورت حال کا آغاز جنرل ضیا کے اُس اقدام سے ہوا جس کے ذریعے انھوں نے بھٹو خاندان کے خلاف نسلی فرقہ پرستی کا ہتھیار استعمال کیا۔

اگرچہ سری لنکا میں ہونے والے تنازعے کے افغان ہتھیاروں سے تعلق کی کوئی واضح شہادت موجود نہیں، تاہم ان میں سے کچھ ہتھیاروں کے وہاں پہنچ جانے کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مگر اس خطے کے دوسرے تنازعات کی ایک قدرِ مشترک وہاں بھی موجود ہے، یعنی نسلی اور مذہبی نفرتوں کو غیر ذمے داری سے ہوا دینا تاملوں اور سنہالیوں کی خانہ جنگی کا ایک اہم سبب ہے۔ صدر جے وردھنے پہلے سربراہ نہیں تھے جنھوں نے اکثریتی سنہالی گروہ میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے تامِل کارڈ استعمال کیا۔ لیکن ۱۹۷۷ میں ایک محفوظ اکثریت کے ساتھ اقتدار میں آ جانے کے بعد، جب وہ آسانی سے مدبرانہ طرزِ عمل اختیار کر سکتے تھے، انھوں نے تامل یونائیٹڈ لبریشن فرنٹ کو، جو تشدد کے خلاف تھا اور انتخابات میں حصہ لے چکا تھا، خلافِ قانون قرار دے دیا۔ اس اقدام سے تامل ٹائیگرز کو براہ راست فائدہ پہنچا جو یقینی طور پر تشدد پر عمل پیرا ہیں اور اپنے جغرافیائی علاقے کے سری لنکا سے علیحدہ ہونے سے پہلے انتخابات میں شریک ہونے کے قائل نہیں۔

جنوبی ایشیائی ملکوں کے لیڈروں کا سیاسی عزائم میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے شارٹ کٹ استعمال کرنے کا رجحان ہی اس خطے میں عدم استحکام پیدا کرنے کے سلسلے میں ان لیڈروں کا واحد قصور نہیں۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں سرحد پار کے تشدد کو ہوا دینے میں یقینی طور پر ملوث رہے ہیں۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستان نے خالصتان کی تحریک کی امداد کی تھی اور کشمیر میں بھی اس کی امداد

Scanned with CamScanner

موجود ہے، اگرچہ اس امداد کی مقدار کے بارے میں ہندوستان کے دعووں کو جوں کا توں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات بھی شک شبہے سے بالا ہے کہ مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسندوں کو تربیت دینے میں ہندوستان نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا، اور یہ تربیت اُس وقت سے بہت پہلے سے دی جا رہی تھی جب دونوں ملکوں کے درمیان بھرپور جنگ کا آغاز ہوا اور اس کے نتیجے میں نیا ملک بنگلادیش قائم ہوا۔ پاکستان کا دعویٰ ہے کہ ہندوستانی انٹیلیجنس ایجنسی "را" کراچی اور سندھ کے دوسرے حصّوں میں سرگرم ہے، اگرچہ پاکستان کے انسانی حقوق کے کمیشن نے پچھلے سال اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اس دعوے کو کبھی ثابت نہیں کیا گیا ہے۔ پاکستانی وزیرِداخلہ کا بیان یہ تھا کہ "مختلف نسلی اور سیاسی فریقوں کے ہندوستان سے روابط کی کافی شہادتیں ریکارڈ پر موجود ہیں۔" سری لنکا کے سلسلے میں بھی عام طور پر مانا جاتا ہے کہ تامل ٹائیگرز کو ابتدائی تربیت اور اسلحے کی فراہمی میں ہندوستان ملوّث تھا، جس کے بعد انھوں نے سری لنکا کے شمالی علاقوں پر سے حکومت کا کنٹرول ختم کر دیا۔

پاکستان کے انسانی حقوق کے کمیشن نے سرحد پار دہشت گردی کی امداد اور عدم استحکام کے فروغ کے سلسلے میں ایک اَور بھی اہم نکتہ بیان کیا۔ کمیشن کا تبصرہ تھا: "بیرونی ایجنٹ محض کسی تنازعے کی صورتِ حال کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر معاشرے میں ہم آہنگی موجود ہو تو کسی بھی قسم کی بیرونی مداخلت ایسے حالات پیدا نہیں کر سکتی جس سے نمٹنا معقول کارکردگی رکھنے والی امن و امان قائم رکھنے کی مشینری کے لیے ممکن نہ ہو۔" یہی بات، میرے نزدیک، ہتھیاروں کے سلسلے میں بھی درست ہے۔ جنوبی ایشیا میں ہتھیاروں کی موجودگی عدم استحکام اور تشدد کا سبب نہیں بلکہ اس صورتِ حال کا محض ایک عنصر ہے۔

لیکن یہ عنصر نہایت اہم ہے۔ بے گناہ شہریوں کو کس سطح کے تشدد سے گزرنا پڑے گا، اس کا انحصار بڑی حد تک انھیں ہتھیاروں پر ہوتا ہے۔ ہندوستانی پنجاب میں کلاشنکوف کی آمد کے بعد سے ہلاک ہونے والوں کی سالانہ تعداد ۹۱۰ سے ۲۵۰۰ تک جا پہنچی۔ چند ماہ پہلے کشمیر کے صدرمقام سری نگر میں مَیں رات کے وقت ایک گاڑی میں سابق وزیرِاعلیٰ فاروق عبداللہ کے گھر جا رہا تھا۔ پیرا ملٹری پولیس کے مورچوں کے سوا سڑکیں بالکل سنسان تھیں۔ ناگن جھیل کے کنارے پر ایک جنگل کے پاس سے گزرتے ہوئے ہمیں ایک نوجوان کاندھے پر راکٹ لانچر اٹھائے کھڑا دکھائی دیا۔ خوش قسمتی سے ہمیں اس نے نشانہ بنانے کے قابل نہ سمجھا۔ اس قسم کے ہتھیار ہیں جو شہری ہنگاموں (civil strife) کو خانہ جنگی (civil war) کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں۔

سندھ کی پُرتشدد صورتِ حال ۱۹۸۰ کی دہائی کے درمیانی برسوں میں ہولناک حد تک ابتر ہو گئی جب امریکی ہتھیاروں کی سپلائی لائن کے شگاف اس قدر بڑھ گئے کہ بے حد ترقی یافتہ ہتھیار شہر میں کھلے بندوں دستیاب ہونے لگے۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد میرا ایک دوست کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے ملنے گیا۔ اُس نے وائس چانسلر کو "نہایت خطرناک دکھائی دینے والے مسلح غنڈوں" میں گھرا ہوا

پایا۔ میرے دوست کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ لوگ وائس چانسلر کے ہتھیار بند محافظ تھے یا جو بھی سیاسی جماعت اُس وقت یونیورسٹی کو کنٹرول کر رہی تھی اُس کے بھیجے ہوئے تھے۔ خود وائس چانسلر دہشت کے مارے اس موضوع پر بات کرنے سے قاصر تھا۔

یہاں میں ایک بار پھر مشورہ دوں گا کہ ہمیں اپنی رائے قائم کرنے میں احتیاط برتنی چاہیے۔ تشدد، بغاوت اور دہشت گردی کے بارے میں جتنی خبریں ہم دیکھتے، پڑھتے اور سنتے ہیں، ان سے جنوبی ایشیا کے علاقے کے استحکام کے بارے میں ایک حد درجہ منفی تاثر پیدا ہوتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ وی ایس نائپال نے، جو ہندوستان کے نہایت قنوطیت پسند مبصر رہے ہیں، اپنی نئی کتاب India: A Million Mutinies Now میں ان لاکھوں بغاوتوں میں امید کی ایک جھلک دیکھی ہے۔ وقتاً فوقتاً میں بہت سے سیانوں کو ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کی پیش گوئیاں کرتے سنتا ہوں۔ گیارہ سال پہلے طارق علی نے اپنے پیدائشی وطن کے بارے میں Can Pakistan Survive? کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس کا ذیلی عنوان The Death of a State تھا۔

حقیقت میں ہندوستان خاصا مستحکم معلوم ہوتا ہے۔ دو سال پہلے ہندو مذہبی جنونیوں کے ہاتھوں ایودھیا کی بابری مسجد کی تباہی، اور اس کے بعد پھوٹ پڑنے والے ہندو مسلم فسادات کے بعد بہت سے لوگوں کی یہ رائے تھی کہ اب مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے پُرامن طور پر ساتھ رہنا ناممکن ہو جائے گا، کہ مسلمان ہتھیار اٹھا لیں گے، اور یہ کہ ہندوستان میں اس بار اس قدر شدید فرقہ وارانہ تنازعہ پیدا ہو گا کہ یہ ملک باقی نہیں رہ سکے گا۔ پھر بمبئی میں دھماکے ہوئے اور بڑی تعداد میں ہتھیار برآمد بھی ہوئے۔ لیکن یہ دھماکے مسلمانوں کے کسی خاص جرائم پیشہ گروہ نے کیے تھے، شاید بابری مسجد کی تباہی کا بدلہ لینے کی غرض سے، شاید ملک کے اقتصادی صدر مقام میں انتشار پیدا کر کے حکومت کی نئی اقتصادی اصلاحات کو زک پہنچانے کے مقصد سے۔ ان اصلاحات نے بیرونی زرمبادلہ کی آزادانہ خرید و فروخت کو ممکن بنا کر اُس زیرزمین ہنڈکاری کے نظام کی کمر توڑ دی ہے جسے بمبئی کے جرائم پیشہ لوگ چلاتے ہیں۔ جن تنازعات میں ترقی یافتہ چھوٹے ہتھیار استعمال ہو رہے ہیں وہ ہندوستان کے دو سرحدی علاقوں ـــــ کشمیر اور شمال مشرقی ریاستوں ـــــ تک محدود ہیں۔ پنجاب میں امن بحال ہو چکا ہے۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہندوستان توقع سے کہیں زیادہ مستحکم ہے۔ اس کو ایسے شدید سانحوں سے گزرنا پڑا ہے جو اس وسیع و عریض اور انتہائی متنوع آبادیوں والے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکتے تھے ـــــ مہاتما گاندھی کا قتل، ۱۹۶۲ کی جنگ میں چین کے ہاتھوں شکست، گولڈن ٹمپل پر فوجی حملہ، اندرا گاندھی کا قتل اور اس کے فوراً بعد سکھوں کا قتلِ عام، راجیو گاندھی کا قتل، اور حال ہی میں ایودھیا میں مسجد کی تباہی کا واقعہ اور اس کے نتیجے میں بھڑک اٹھنے والے فسادات۔ اس ملک کو صوبہ پنجاب میں دس برس طویل پُرتشدد بدامنی کا سامنا کرنا پڑا ہے اور کشمیر کی بغاوت کا اب تک سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ آسام میں اب نسبتاً امن ہے، مگر یہ بات جنوب مشرقی ہندوستان کی دو چھوٹی ریاستوں، منی پور اور ناگالینڈ، کے

Scanned with CamScanner

بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن ہندوستان تباہ نہیں ہوا۔ یہ کسی بحری جہاز کی طرح ہے جس پر طوفانی لہروں کی یلغار کبھی کبھی اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ لگتا ہے بس ڈوبنے ہی کو ہے، لیکن وہ پھر سیدھا ہو کر تیرنے لگتا ہے۔ چوں کہ ہندوستان نے ہر موقعے پر اتنی سخت جانی دکھائی ہے، ہندوستان کے لوگ ان صدمات کے اصل اسباب پر زیادہ غور نہیں کرتے۔ جہاں تک سیاست دانوں اور منتظموں کا تعلق ہے، انھوں نے "چلنے دو" کا فلسفہ وضع کر لیا ہے، جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ آخر میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔

پاکستان کو اس سے بھی زیادہ خطرناک حالات سے، یعنی اپنے مشرقی حصے کی علیحدگی سے، گزرنا پڑا ہے۔ اس کی سیاسی زندگی بھی ہندوستان سے زیادہ متلاطم رہی ہے؛ بےپردہ یا باپردہ فوجی حکمرانی طویل مدتوں تک قائم رہی ہے۔ ایک صوبے، پنجاب، کی بالادستی نے ملک کی ترقی کو سخت غیر متوازن رکھا ہے، جس سے باقی تین صوبوں میں زبردست کشیدگی پیدا ہوئی ہے۔ مگر پاکستان قائم رہا ہے اور "چلنے دو" کے فلسفے کا وہاں بھی خوب دور دورہ ہے۔

کیا میرا یہ تبصرہ میری اپنی ہی بات کی نفی نہیں کر دیتا؟ یعنی کیا میرے اس تبصرے کا یہ مطلب نہیں نکلتا کہ چھوٹے ہتھیاروں کا پھیلاؤ جنوبی ایشیا کے استحکام کے لیے کوئی حقیقی خطرہ نہیں ہیں؟ میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میں نے اپنی طرف سے صورت حال کا ایک متوازن نقشہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ ہندوستان یا پاکستان کی ریاستوں کے ٹوٹنے کا کوئی فوری خطرہ نہیں، تاہم چھوٹے ہتھیاروں کے پیدا کیے ہوئے خطرے آخر کار ایسے کسی سانحے کا سبب یقیناً بن سکتے ہیں۔

سب سے پہلے تو یہی خطرہ ہے کہ اس قدر آسانی سے دستیاب ہتھیار دور دور تک پھیل جائیں گے۔ پاکستان میں تو یہ ہتھیار کراچی اور صوبۂ سندھ سے باہر پھیل چکے ہیں۔ اب پاکستانی صوبۂ پنجاب میں شیعوں اور سنیوں کے درمیان سخت خوں ریز جھڑپیں اور ایک دوسرے کی عبادت گاہوں پر مسلح حملے ہونے لگے ہیں۔ پچھلے سال صوبۂ سرحد کے مالاکنڈ نامی علاقے میں ایک مذہبی لیڈر مولانا صوفی محمد نے بیشتر سرکاری عمارتوں اور ایک ایرپورٹ پر قبضہ کر لیا تھا اور دو ججوں اور ایک سرکاری اہلکار کو یرغمال بنا لیا تھا۔ پاکستان میں بی بی سی کے رپورٹر ظفر عباس نے عینی شاہدوں کے حوالے سے بتایا کہ بغاوت کی خبر پھیل جانے پر "سیکڑوں افراد پہاڑوں پر سے اُترنے لگے جن میں اکثر نے کالی پگڑیاں باندھ رکھی تھیں اور پستول اور کاربائن سے لے کر کلاشنکوف (AK 47) رائفلوں تک، ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس تھے۔" نیم فوجی دستوں کی کئی ہزار کی نفری کو علاقے کا کنٹرول واپس لینے میں ایک ہفتے سے زیادہ وقت لگا، اور اس پر بھی انھیں مولانا کا مطالبہ ماننا پڑا کہ علاقے میں پاکستانی قانون کی جگہ اسلامی یا شرعی قانون نافذ کیا جائے۔

پاکستان کے وفاقی وزیر انصاف و قانون نے حال ہی میں کہا کہ "غیر قانونی ہتھیاروں نے ہمارے معاشرے کے ہر شعبے کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔" اب حکومت نے وفاقی دارالحکومت اسلام آباد میں ہتھیار لے کر چلنے پر پابندی لگا دی ہے، مگر قومی اسمبلی کے ارکان، جو ہمیشہ ہتھیاروں کے لیس محافظوں

Scanned with CamScanner

کے گھیرے میں نکلتے ہیں، اس پابندی کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔ میرا خیال ہے اس سلسلے میں بھی "چلنے دو" کے فلسفے پر عمل کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں یہ خوف پایا جاتا ہے کہ ہتھیار مسلمانوں ___ خصوصاً نیپال کی ڈھیلی ڈھالی سرحد پر واقع ریاستوں، اترپردیش اور بہار کی وسیع مسلمان برادریوں ___ کے ہاتھ نہ آجائیں۔ میں اترپردیش میں نیپال کی سرحد کے آس پاس کے علاقے میں بہت گھوما پھرا ہوں؛ مجھے مسلمان انتہاپسندوں کی سرگرمی کی کوئی شہادت نہیں ملی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ خطرہ موجود نہیں ہے۔ بہار اور اترپردیش دونوں اب بھی اپنی لاقانونیت کے لیے بدنام ہیں اور ان ریاستوں میں عادی مجرموں کے سیاسی پارٹیوں سے روابط کے باعث پولیس کا مورال تباہ ہوچکا ہے۔ اگر نوجوان مسلمانوں نے ہتھیار اٹھا لیے تو پولیس ان پر قابو پانے میں ناکام رہے گی۔ اگر ایسا ہوا تو یہ دونوں ریاستیں ___ جنھیں کسی بھی طرح کشمیر یا شمال مشرقی ریاستوں کی طرح سرحدی ریاستیں قرار نہیں دیا جاسکتا ___ سرکاری سکیورٹی فورسز، بشمول فوج، اور مسلح انتہاپسندوں کا میدانِ جنگ بن جائیں گی۔

ہندوستانی فوج کو ابھی تک عموماً بدعنوانی سے پاک، غیرجانبدار اور موثر سمجھا جاتا ہے۔ فسادزدہ شہروں یا قصبوں میں محض فوج کا سڑکوں پر مارچ بعض اوقات امن قائم کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ لیکن شمال مشرقی ریاستوں اور کشمیر میں فوج کا محض مارچ موثر ثابت نہیں ہوا بلکہ اسے علیحدگی پسندوں سے مقابلے کے لیے براہِ راست ملوّث ہونا پڑا۔ اس میں فوج کو سوفیصد کامیابی نہیں ہوئی ہے، اور ایسی ناکامیاں فوج کے مورال کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ شہری انتظامیہ کی مدد کے لیے فوج کے باربار استعمال سے سپاہیوں کے بدعنوانی میں ملوّث ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ دس سال پہلے احمد آباد کے فسادات میں گجرات پولیس اور ہندوستانی فوج دونوں ناکام رہے، اور ایک اور ریاست کے ایک ممتاز پولیس افسر کو صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے بھیجنا پڑا۔ فوج کی کمان کرنے والے افسر نے التجا کی کہ فوج کے جوانوں کو سڑکوں پر سے واپس بلوانے کی اجازت دی جائے کیوں کہ "وہ پولیس کی طرح بدعنوان ہوتے جارہے ہیں"۔ چھوٹے ہتھیاروں کا پھیلاؤ جس قدر بڑھتا جائے گا، ہندوستانی شہروں کی سڑکوں پر فوج زیادہ دکھائی دینے لگے گی، اور زیادہ تعداد میں فوجیوں کے بدعنوانی میں ملوّث ہونے کا خطرہ ہوگا۔

جیسا کہ ہیومن رائٹس واچ نامی تنظیم نے نشان دہی کی ہے، کشمیر اور پنجاب کے انتہاپسندوں کی جانب سے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی سنگینی میں چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوا۔ لیکن ساتھ اس تنظیم نے اپنی رپورٹ میں ہندوستانی حکومت کے انسانی حقوق کے ریکارڈ کو بھی ہولناک قرار دیا ہے۔ اگرچہ ہندوستانی فوج پر لگائے گئے اس قسم کے تمام الزامات ثابت نہیں کیے جاسکے ہیں، پھر بھی اس امر کی کافی شہادتیں موجود ہیں کہ متعدد موقعوں پر ہندوستانی فوج نے سخت بربریت کا مظاہرہ کیا، اور اگر اس بربریت کو جاری رہنے دیا گیا تو یہ فوج کے ڈسپلن کے لیے نہایت خطرناک ہوگا۔

Scanned with CamScanner

سفا کی کے واقعات حکم عدولی کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان واقعات کو برداشت کر جانے والے سینیئر افسر کسی فوج کے لیے اچھے افسر ثابت نہیں ہو سکتے۔ تاہم یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یہ بربریت اس جانی نقصان کے رد عمل میں ہوتی ہے جو پولیس یا فوج کو اس باعث اٹھانا پڑتا ہے کہ ان کے حریفوں کے پاس ترقی یافتہ ہتھیار موجود ہیں۔

پاکستانی فوج غیر سیاسی فوج نہیں ہے۔ یہ تین موقعوں پر اقتدار پر قبضہ کر چکی ہے۔ جمہوریت کی واپسی کے بعد سے یہ سیاسی اسٹیج پر دکھائی نہیں دیتی لیکن ایک پس پردہ عنصر کے طور پر اب بھی فعال ہے۔ تاہم، سیاسی کردار اختیار کرنے کے ساتھ ملنے والی طاقت اور دیگر فوائد نے اس کو ابھی اتنا بدعنوان نہیں بنایا ہے جتنی بدعنوان فوجیں تیسری دنیا کے متعدد دوسرے ملکوں میں موجود ہیں۔ اس منظم فوج میں ڈسپلن اب بھی باقی ہے۔ پاکستانی فوج اس بات پر نازاں ہے کہ جہاں کہیں سیاست داں اور پولیس ناکام ہو جائیں وہاں یہ امن بحال کرنے میں کامیاب رہتی ہے۔ لیکن کراچی میں وہ امن قائم کرنے میں ناکام ہوئی اور اسے واپس بلانا پڑا۔ پاکستان کے انسانی حقوق کے کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ "کراچی کی سڑکوں پر اُن لوگوں نے خونیں انداز میں فوج کا تمسخر اڑایا جن پر قابو پانے کے لیے فوج کو بھیجا گیا تھا۔" پاکستانی فوج کے مورال کے لیے اس سے زیادہ نقصان دہ بات کوئی اور نہیں ہو سکتی۔

جوں جوں غیر قانونی ہتھیار پھیلتے جاتے ہیں، نیم فوجی پولیس اور فوج کے لیے بھی ہتھیاروں کی مانگ بڑھتی جاتی ہے۔ کشمیری انتہاپسندوں کی اسلحے کی قوت کا مقابلہ کرنے کے لیے ہندوستان نے حال ہی میں ایک لاکھ کلاشنکوفیں اور گولابارود کے پانچ کروڑ راؤنڈ خریدے ہیں۔ ممتاز صحافی مارٹن وُولاکاٹ نے پچھلے دنوں دنیا کے ملکوں میں فوج کی بڑھتی ہوئی طاقت پر تبصرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "اسلحے کی بین الاقوامی تجارت کے باعث خریدنے اور بیچنے والے ملکوں میں فوج کی انتظامیہ کی اہمیت بڑھ رہی ہے اور ایسی فوجیں جب کنٹرول سے باہر ہو جائیں تو جنگل کے دور کی طرف واپسی کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ یہ خطرہ پوری دنیا میں موجود ہے۔" ہندوستان یا پاکستان کی فوجیں ابھی تک کنٹرول سے باہر نہیں ہوئی ہیں، لیکن اندرونِ ملک دہشت گردوں کی اسلحے کی طاقت میں اضافے کے ساتھ ساتھ ان کی ڈسپلن کی روایات پر سخت دباؤ پڑ رہا ہے۔ ایک طرف کشمیر اور دوسری طرف سندھ میں ان فوجوں کے بربریت آمیز طرزِ عمل میں اس کی شہادت موجود ہے۔

چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ منشیات بھی ناگزیر طور پر پھیلتی ہیں۔ یہ بات پاکستان کے معاملے میں یقینی طور پر درست ہے۔ پاکستان کا شمال مغربی سرحدی صوبہ اور افغانستان دونوں کی زمین اور موسمی حالات افیون کی کاشت کے لیے انتہائی موزوں ہیں، اور ان دونوں خطوں پر ان کی مرکزی حکومتوں کا کنٹرول مضبوط نہیں رہا ہے۔ یہاں کا قانون قبائلی سرداروں کے تابع ہے۔ افغان مجاہدین کو اپنی سرگرمیوں کے لیے آمدنی کے ذریعے کی تلاش تھی، اور یوں "گولڈن کریسنٹ" کے اس علاقے نے

Scanned with CamScanner

منشیات کی پیداوار میں بہت تیزی سے ہندوستان کے مشرق میں واقع "گولڈن ٹرائنگل" کے برابر اہمیت حاصل کرلی۔ ایک دفاعی مبصّر کے الفاظ میں "افغانستان کی آدھی زرعی زمین افیون کی فصل سے اور باقی آدھی بارودی سرنگوں سے بھری ہوئی ہے۔" ممتاز پاکستانی صحافی الطاف گوہر کا کہنا ہے کہ مجاہدین کی منشیات کی تجارت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے امریکی انٹیلیجنس نے انھیں مشینی آلات اور بین الاقوامی تاجروں سے تعارف کے سلسلے میں مدد دی تھی۔ ہتھیاروں اور منشیات کی تجارت کا باہمی تعلق افغان سرحد پر منشیات کے اسمگلروں سے پاکستانی سکیورٹی فورسز کی شدید جھڑپوں کی خبروں سے واضح ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے ایک واقعے کے بعد ۱۴ مشین گنیں، مختلف اقسام کی رائفلیں، ۳۵ راکٹ لانچر، ایک میزائل لانچر اور گولیوں کے چھ ہزار سے زائد راؤنڈ برآمد ہوئے۔ ہندوستان میں امریکا کے فراہم کردہ ان ہتھیاروں کے پھیلاو اور منشیات کی تجارت کے درمیان تعلق اس بات سے ثابت ہوا کہ گولڈن ٹمپل پر فوج کے قبضے کے بعد وہاں سے دس کلو گرام ہیروئن بھی برآمد ہوئی۔

ہندوستان میں سرکاری نگرانی میں افیون کی تیاری برطانوی دور سے چلی آرہی ہے۔ پہلے یہ افیون چین بھیجی جایا کرتی تھی؛ اب اسے دواؤں میں استعمال کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ میرے پردادا اترپردیش اور بہار کے سرحد کے قریب واقع غازی پور کے قصبے میں افیون کے کارخانے کے نگراں تھے۔ اس کارخانے سے افیون پہلے بھی لیک ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے۔ آج بھی آپ غازی پور جائیں تو کارخانے کی دیوار پر بیٹھے بندروں کو نشے میں جھومتے دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن جب تک چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاو اور منشیات کی تجارت نے اتنا زور نہیں پکڑا تھا، تب تک برطانوی حکومت کو اس سلسلے میں ہندوستانی قوانین کی خلاف ورزیوں پر کوئی خاص تشویش نہیں تھی۔ آج ہندوستان کو گولڈن کریسنٹ میں تیار ہونے والی منشیات کی اسمگلنگ کا ایک بڑا راستا سمجھا جاتا ہے۔

افغان جنگ سے پہلے پاکستان میں ہیروئن کے نشئی تقریباً ناپید تھے؛ اب وہاں دس لاکھ سے زیادہ رجسٹرڈ افراد ہیروئن کی عادت کا شکار ہیں۔ ہم انگریزوں کو پاکستان میں منشیات کے بڑھتے ہوئے مسئلے پر لازماً فکرمند ہونا چاہیے۔ پچھلے سال برطانوی کسٹم کی پکڑی ہوئی کل ہیروئن میں سے ۴۰ فیصد پاکستان سے اسمگل ہو کر آئی تھی، اور کسٹم والوں کا تخمینہ ہے کہ برطانیہ میں داخل ہونے والی تمام منشیات کا ۹۰ فیصد حصہ وہیں سے آتا ہے۔ چھوٹے ہتھیار بھی، منشیات کی طرح، سرحدوں سے بے نیاز ہوتے ہیں، اس لیے اس بات کا معقول عملی جواز موجود ہے کہ جنوبی ایشیا میں اسلحے کی خطرناک بہتات پر بھی ہمیں تشویش ہونی چاہیے۔ یہ ہتھیار بڑی آسانی سے بین الاقوامی دہشت گردوں کے ہاتھ لگ سکتے ہیں۔

بموں اور بندوق کی گولیوں سے ہلاک ہونے والے لوگ، منشیات سے تباہ ہو جانے والی زندگیاں، ملکوں کا عدمِ استحکام، افواج کے مورال کی تباہی، ہمارے اپنے مفادات کو پہنچنے والے نقصانات ___ مجھے امید ہے ان سب کے پیشِ نظر آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ امریکا نے افغان مجاہدین کو مسلّح کرنے کے

Scanned with CamScanner

طریقِ کار میں سخت غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل اختیار کیا، اور جنوبی ایشیا کے دو بڑے ملکوں کے استحکام کو ان ہتھیاروں سے سخت خطرہ لاحق ہے۔ اب جو فوری سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان ہتھیاروں کے سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے جو اب پھیل چکے ہیں۔ سب سے پہلے تو اس الزام کی تحقیقات ہونی چاہیے کہ افغانستان بھیجے جانے ہتھیار غیر قانونی طور پر فروخت کیے گئے، اور اس کے ذمے دار پائے جانے والے افراد کے خلاف قانونی کارروائی کی جانی چاہیے۔ امریکی تنظیم ہیومن رائٹس واچ نے بھی امریکی اور پاکستانی حکومتوں سے یہ مطالبہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ تنظیم کا خیال ہے کہ ان ہتھیاروں کو واپس حاصل کر کے تباہ کرنے کی موثر کوشش کی جانی چاہیے۔ یہ بات بہت معنی خیز ہے کہ امریکی حکومت نے صرف اسٹنگر میزائلوں کو واپس حاصل کرنے کے لیے عملی قدم اٹھایا ہے کیوں کہ ان سے خود امریکا کے شہریوں اور ہوائی مسافروں کو خطرہ ہو سکتا ہے۔

اب اس خطے میں پاکستان کے راستے اسلحے کی ایک نئی لہر، بلکہ مجھے کہنا چاہیے کہ دو لہروں، کے داخل ہونے کا خطرہ ہے۔ ۱۹۹۲ میں کابل میں مجاہدین کے پہلے صدر کی آمد پر نوجوانوں نے کلاشنکوفوں سے اس قدر شدید ہوائی فائرنگ کی تھی کہ میرے کانوں کے پردے پھٹتے پھٹتے بچے تھے۔ مگر میں جانتا تھا کہ بہت جلد یہ کلاشنکوفیں اپنا رخ انسانی نشانوں کی طرف کرنے والی ہیں اور مسرت کا یہ سیلاب آنسوؤں میں تبدیل ہونے والا ہے۔ یہ موقع فوراً ہی بعد آ پہنچا۔ چینی، ایرانی، تاجک، اُزبیک اور پاکستانی، سب کے سب افغان خانہ جنگی میں اپنے اپنے پسندیدہ گروپ کو اسلحہ فراہم کر رہے ہیں۔ اس اسلحے کا کچھ حصّہ ضرور پاکستان واپس پہنچے گا اور افغان پاکستان سرحد کے دونوں جانب موجود ڈرگ مافیا کے مفادات کی حفاظت اور پرداخت کے لیے استعمال ہوگا۔ جنوبی ایشیا میں چھوٹے ہتھیاروں کی دوسری لہر سابق سوویت وسطی ایشیا کی سمت سے متوقع ہے جہاں اسلحے کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اور اپنی مارکیٹ کی تلاش میں ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، ان دونوں متوقع خطرات کے سدِباب کے سلسلے میں اب تک کچھ بھی نہیں کیا گیا ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یوروپی اتحادی ممالک جنوبی ایشیا میں چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاو کے سلسلے میں کوئی موثر کردار ادا نہیں کر سکتے۔ جب ہم لیبیا کی جانب سے آئرش لبریشن آرمی کو ہتھیاروں کی ترسیل روکنے میں کامیاب نہیں ہوے تو بھلا دور دراز جنوبی ایشیا میں ہتھیاروں کے پھیلاو کے کہیں زیادہ گمبھیر مسئلے کو حل کرنے کی کیا امید کر سکتے ہیں، خصوصاً جبکہ وہاں دو ملکوں کی خود مختاری کا معاملہ بھی درپیش ہوگا۔ لیکن ہم کم سے کم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ اس مسئلے کو بین الاقوامی ایجنڈے میں شامل کرنے پر اصرار کریں۔ اگر چھوٹے ہتھیاروں کے مسئلے کو بھی اُسی قدر بین الاقوامی توجہ حاصل ہو جائے جتنی ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاو کے مسئلے کو حاصل ہے تو کچھ اقدامات ایسے ہیں جن پر غور کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ چھوٹے ہتھیاروں کو بھی اقوام متحدہ کے روایتی جنگی ہتھیاروں کے رجسٹر میں شامل کیا جائے۔ اس رجسٹر سے بڑے ہتھیاروں کی خفیہ نقل و حمل کا بھی انسداد ممکن نہیں ہوا ہے، اور ممکن ہے چھوٹے ہتھیاروں کے

Scanned with CamScanner

معاملے میں یہ اس سے بھی کم موثر ثابت ہو، لیکن اس کے ذریعے سے کچھ نہ کچھ کنٹرول ضرور حاصل کیا جا سکے گا۔ ابھی تک تو ہم نے اس مسئلے کی سنگینی اور پھیلاؤ کا تخمینہ لگانے تک کی زحمت نہیں کی ہے۔

سرد جنگ کے خاتمے سے امریکا اور یوروپی اتحادیوں کی طرف سے جنگ میں ان کی قائم مقامی کرنے والے کسی ملک کو ہتھیاروں کی فراہمی کا امکان کم ہو گیا ہے، اس لیے اب غالباً افغان جنگ کی طرح کی اسلحے کی پائپ لائن قائم نہیں ہو گی۔ اب، جبکہ یہ خطرہ دور ہو گیا ہے کہ کسی طرح کا کنٹرول عائد ہونے سے دشمن عالمی طاقت کی فتح کے امکانات بڑھ جائیں گے، یہ موقع ہے کہ چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے مسئلے پر بھرپور توجہ دی جائے۔

ایک طریقہ ایسا ہے جس سے یوروپی ملک انفرادی طور پر اور براہ راست دنیا میں ہتھیاروں کی تعداد کم کرنے میں حصہ لے سکتے ہیں: اپنے کارخانوں میں تیار ہونے والے ہتھیاروں کی پیداوار اور فروخت کم کر کے۔ اگر ــــ اور یہ بہت بڑا اگر ہے ــــ ہتھیار تیار کرنے والے بڑے ملک اپنی پیداوار کم کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو دنیا میں ہتھیاروں کی کم تعداد دستیاب ہو گی۔ گولا بارود کی فروخت کم کرنا اس سے بھی زیادہ موثر طریقہ ثابت ہو سکتا ہے، کیوں کہ اس سے دنیا میں پھیلے ہوئے کچھ ہتھیار بے کار ہو جائیں گے ــــ ظاہر ہے، کلاشنکوف کو کارتوسوں کے بغیر نہیں چلایا جا سکتا۔ لیکن موجودہ اقتصادی ماحول میں، جہاں منافع باقی تمام مقاصد پر حاوی رہتا ہے، اس بات کا امکان بہت کم ہے۔ برطانیہ میں ہتھیار بنانے والی کمپنیاں خریدنے والوں کے سرٹیفکیٹ کی قانونی پابندی کو بڑی آسانی سے بے اثر کر لیتی ہیں۔ امریکا کی نیشنل رائفل ایسوسی ایشن کے دباؤ نے اس ملک کو ایک عظیم اسلحہ بازار بنا رکھا ہے۔ حال ہی میں وائٹ ہاؤس کے ترجمان نے بیان دیا کہ روایتی ہتھیاروں کی فراہمی امریکی پالیسی کا ایک جائز حصہ ہے۔ اس پالیسی بیان کا مطلب رائٹر نیوز ایجنسی کے خیال میں یہ ہے کہ امریکی اہلکار اور سفارت کار اسلحہ تیار کرنے والی امریکی کمپنیوں کی پیداوار کو سمندر پار ملکوں میں فروخت کرنے میں مدد دینے کے لیے ایک پُرزور مہم شروع کرنے والے ہیں۔ میرے نزدیک مغربی ملکوں کا صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ اگر ہم اسلحہ نہیں بیچیں گے تو کوئی اَور بیچ لے گا۔

ابھی تک میں نے جنوبی ایشیا میں پیش آنے والے تنازعات میں کارفرما نسلی اور مذہبی عداوتوں کا جائزہ لیا ہے جو چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ سے سنگین شکل اختیار کر چکی ہیں۔ لیکن میں اس امکان کا ذکر کیے بغیر اپنی بات پوری نہیں کر سکتا کہ ان تنازعات کی تہہ میں ایک کہیں زیادہ سنگین بحران موجود ہے جسے حل کرنے پر توجہ نہ دی گئی تو جنوبی ایشیا کے ممالک انتشار کے ایک ایسے عظیم سیلاب کی لپیٹ میں آ جائیں گے جس کے سامنے موجودہ تنازعات محض مون سون سے پہلے کی ہلکی بارش معلوم ہوں گے۔ میں اُس صورتِ حال کی بات کر رہا ہوں جو افریقا کے کچھ حصوں میں ظاہر ہو چکی ہے جہاں کثیر آبادی، پانی، خوراک اور ایندھن کی قلت، اور سب سے بڑھ کر بے روزگاری ایسے تشدد کو جنم دے رہی ہے جس کے

Scanned with CamScanner

سامنے حکومتیں محض انارکی کے بے بس تماشائی بن کر رہ گئی ہیں۔ سرحدیں بے معنی اور دیہات بنجر ہو چکے ہیں، اور شہر نقلِ مکانی کر کے آنے والوں کی یلغار کے بوجھ تلے دم توڑ رہے ہیں۔ امریکی مصنّف رابرٹ کیپلن نے لکھا ہے: "مغربی افریقا دنیا بھر کے آبادیاتی (demographic)، ماحولیاتی اور معاشرتی، ہر قسم کے دباو کی علامت بن چکا ہے جہاں مجرمانہ انارکی ایک حقیقی جنگی خطرہ بن کر اُبھر رہی ہے۔" ظاہر ہے، اس صورت حال میں آپ جتنے زیادہ چھوٹے ہتھیار شامل کرتے جائیں گے، یہ اتنی ہی زیادہ خطرناک ہوتی جائے گی۔ کیپلن کے خیال میں یہ ماحولیاتی قلت کا مسئلہ ہے۔ اور اس بحرانی مسئلے پر امریکی ردِ عمل کیا ہے؟ کیپلن نے اس پر یہ تبصرہ کیا ہے: "خارجہ پالیسی کے حلقوں میں ذرا ماحول کا یا ختم ہوتے ہوئے قدرتی وسائل کا ذکر تو چھیڑ کر دیکھیے، آپ کو محسوس ہو گا کہ سامنے بوریت اور تشکیک کی ایک پتھریلی دیوار کھڑی ہے۔"

جنوبی ایشیا ابھی مغربی افریقا کی اس مذکورہ بالا صورت حال سے کچھ دور ہے، اگرچہ کیپلن نے برصغیر کے سلسلے میں بھی ایسی ہی مایوس کن پیش گوئی کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ پیش گوئی غلط ثابت ہو گی، لیکن انتباہ کے اشارے بہر حال دیکھے جا سکتے ہیں۔ حکومتیں کم موثر ہوتی جا رہی ہیں، تشدد بڑھ رہا ہے، سرحدوں کی، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ہتھیاروں اور منشیات کی نقل و حمل کے سلسلے میں کوئی اہمیت نہیں رہ گئی، قدرتی ماحول تنزل پذیر ہے، آبادی تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہے، اور شہروں کے محفوظ ترین رہائشی علاقوں تک میں کچی آبادیاں پھیلتی جا رہی ہیں۔ اور ہم، مغربی ممالک، کیا کر رہے ہیں؟ ہم سٹیلائٹ ٹیلی وژن پروگرام نشر کر رہے ہیں جن میں ہماری پُرآسائش زندگی کی جھلکیاں دیکھ دیکھ کر محروم لوگوں کا احساسِ محرومی اور شدید ہوتا جا رہا ہے؛ ہم جنوبی ایشیا کے ملکوں سے ایسے اقدامات کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ اُن کے ہاں کی ماحولیاتی آلودگی ہمیں تکلیف نہ پہنچائے؛ اور انھیں مغرب جیسا طرزِ زندگی اختیار کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں جو ایندھن کے استعمال کے اعتبار سے بے حد مہنگا ہے۔ جہاں تک جنوبی ایشیا میں چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاو کے مسئلے کا تعلق ہے، جو انسانی حقوق کی ان خلاف ورزیوں کا اصل سبب ہے جن کی بابت ہم بالکل جائز طور پر فکرمند ہیں، اور جس کے باعث ان ملکوں کی سلامتی کو شدید خطرات لاحق ہیں ـــــ یہی وہ مسئلہ ہے جو بظاہر ہمارے ایجنڈے پر وجود نہیں رکھتا۔

**

خصوصی شمارہ

سرائیوو سرائیوو

شمارہ ۱۷ : خزاں ۱۹۹۴

۵۲۶ صفحات قیمت ۱۰۰ روپے

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

کراچی کی صورتِ حال اُس سنگین بحران کی نشان دہی کرتی ہے جس سے پورا پاکستان دوچار ہے، اور جس کی سنگینی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ شہری بدانتظامی، تشدد، لسانی اور نسلی گروہوں کے باہمی تنازعات اور مہلک ہتھیاروں کی فراوانی جیسے عوامل کا الگ الگ جائزہ لینے کے بعد ضروری ہے کہ اس بحران کا پورے ملک کے سماجی اور سیاسی حالات کے تناظر میں تجزیہ کیا جائے۔

اس شمارے کے اہم ترین تجزیاتی مضمون میں، جو آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے، عارف حسن نے اپنے تجزیے اور تحقیق کی بنیاد پر چند نہایت اہم نتائج اخذ کیے ہیں جو شہر اور ملک کے مسائل کو درست پس منظر میں سمجھنے اور ان کے حل کی سمت متعین کرنے میں بہت کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں۔

اس مضمون کا متن عارف حسن کے ۱۹۸۶ سے ۱۹۹۵ تک لکھے ہوئے مضامین اور ان کے ساتھ کیے گئے انٹرویو کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے۔ ان مضامین کی تفصیل یہ ہے:

1. "The Twilight of the Waderas" (*Herald*, August 1986),
2. "Karachi's Godfathers" (*Hearld*, September 1986),
3. "The Profits of Doom" (*Herald*, January 1987),
4. "The MQM Factor" (*Herald*, March 1987),
5. "A Generation Comes of Age" (*Herald*, October 1987),
6. "Power and Powerlessness" (*Herald*, February 1988),
7. "The MQM: An Uncertain Future?" (*Herald*, December 1988),
8. "The Grand Compromise" (*Herald*, May 1989),
9. "The Sindh Cauldron" (*Herald*, June 1989),
10. "The Unresolved Conflict" (*Dawn*, 1992),
11. "Karachi and the Global Nature of Urban Violence" (*The Urban Age*, USA, Summer 1993),
12. "Is There a Way Out?" (*Herald*, March 1995),
13. "Agreeing to Disagree", (*Herald*, April 1995),
14. "What is Karachi Really Fighting for?" (*Herald*, September 1995),
15. "The State Structure and the Processes of Socio-Economic Change" (Habitat II NGO Country Report 1995).

کئی برس کے عرصے میں لکھے گئے ان مضامین میں جا بجا مختلف اعداد و شمار بھی پیش کیے گئے ہیں۔ ہماری درخواست پر عارف حسن نے، جہاں تک ممکن ہوا، ان اعداد و شمار کو زمانۂ حال کے مطابق کر دیا ہے۔ لیکن بہت سے مقامات پر ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ ان میں اہم ترین حقائق وہ ہیں جو مردم شماری ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں اور نجی یا غیر سرکاری طور پر کی گئی کوئی بھی تحقیق اس کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ اس نظرِ ثانی کے دوران یہ بھی انکشاف ہوا کہ شہر سے متعلق بہت سے سرکاری اعداد و شمار، جو چند سال پہلے تک بعض سرکاری محکموں کی لائبریریوں میں موجود تھے، اب دستیاب نہیں ہیں۔

Scanned with CamScanner

عارف حسن

انگریزی سے ترجمہ اور تدوین : افضال احمد سید

کراچی کی صورتِ حال ــــ تناظر اور تجزیہ

۱۹۴۷ کے بعد سے، جب پاکستان وجود میں آیا، اس ملک میں بے حد اہم آبادیاتی (demographic)، معاشرتی اور اقتصادی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ یہ تبدیلیاں اتنے بڑے پیمانے پر ہوئی ہیں کہ انھیں انقلابی تبدیلیاں کہا جاسکتا ہے۔ تاہم، ان تبدیلیوں کو اب تک اداروں کی صورت نہیں دی گئی، بلکہ انھیں سیاسی عمل میں بھی شامل نہیں کیا گیا جو معاشرتی سائنس دانوں کے مطابق کسی معاشرے میں آنے والی تبدیلی کو ادارے کی صورت دینے کی شرطِ اوّل ہے۔ نتیجتاً، جس انداز میں ہمارے ملک کی تعمیر ہوئی ہے، جس طرح ہماری حکومتیں چلائی جاتی ہیں، ہمارا مالیاتی نظام کام کرتا ہے اور ترقیاتی منصوبوں کو نافذ کیا جاتا ہے، اس میں تبدیل شدہ آبادیاتی، معاشرتی، ثقافتی اور اقتصادی حقائق کی عکاسی نہیں ہوتی۔ ان تبدیل شدہ مگر غیر تسلیم شدہ حقائق کے دباو سے، ریاستی قوانین اور ضوابط کے باوجود، حکمرانی کے متوازی، غیر سرکاری نظام وجود میں آ گئے ہیں، ملکی آبادی کے بہت بڑے بڑے حصے سیاسی اور ثقافتی بے گانگی کا شکار ہو گئے ہیں، معاشرتی انتشار پھیل گیا ہے، انتظامیہ اور عدلیہ اپنے کام انجام دینے میں خود کو بے بس محسوس کرنے لگی ہیں، اور ہمارے پیوستہ مفادات رکھنے والے طبقوں کو یقین ہو چلا ہے کہ وقت بہت کم رہ گیا ہے چناں چہ لوٹ کھسوٹ اور ایڈہاک اقدامات کا کلچر پاکستانی زندگی کے ہر پہلو میں سرایت کر گیا ہے۔

پاکستان میں رونما ہونے والی معاشرتی اور اقتصادی تبدیلیوں کے دو نمایاں ترین مظاہر ہیں: اوّل، جاگیرداری نظام کا ریاستی اسٹیبلشمنٹ کے موثر آلۂ کار کی حیثیت سے برقرار نہ رہنا، اور دوم، شہروں کا تیزی سے پھیلنا۔

***

Scanned with CamScanner

جاگیرداری نظام کا زوال

جن علاقوں پر پاکستان کی موجودہ ریاست مشتمل ہے، وہاں انگریزوں کی آمد سے پہلے جاگیرداری نظام موجودہ خطوط پر قائم نہیں تھا۔ برطانوی حکومت نے زرعی زمین کے بڑے قطعات کی موروثی ملکیت کا وسیع نظام قائم کیا، اور اس نئے جاگیرداری نظام اور اپنے بنائے ہوئے بیوروکریسی کے ڈھانچے کے درمیان باہمی مفادات پر مبنی قریبی تعلق کی بنیاد رکھی جس کے تحت جاگیردار اور انتظامی اہلکار دونوں مل کر کام کرنے لگے۔

جاگیرداری نظام کی طاقت ور گرفت کا ایک اہم سبب دیہی معاشرے کا ذاتوں اور برادریوں میں بٹا ہوا ہونا بھی تھا۔ مختلف دیہی ذاتوں کے درمیان تعلق نقد لین دین کا نہیں بلکہ مال، اجناس اور محنت کے باہمی تبادلے (barter) کا تھا۔ دیہی آبادی مجموعی طور پر دو گروہوں میں منقسم تھی: زراعت پیشہ ذاتیں اور کاریگر ذاتیں۔ دیہی کاریگر صرف زراعت پیشہ لوگوں کی خدمت کے لیے تھے؛ مکان یا زمین کی ملکیت ان کے لیے ممنوع تھی اور وہ اپنے موروثی پیشے کے علاوہ کوئی اَور کام نہیں کرسکتے تھے۔ ہر گاؤں کی زمین ہوتی تھی جس کا انتظام گاؤں کے مقتدر لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ کسی تنازعے کی صورت میں ذاتوں اور برادریوں کے نمائندے اس کا تصفیہ کراتے تھے اور تنازعے کے بڑھ جانے پر جاگیرداری نظام کے سرکردہ افراد مداخلت کرتے تھے۔

آزادی کے وقت پاکستان کو یہی نظام ورثے میں ملا۔ جاگیرداری نظام ان علاقوں میں مندرجہ ذیل کام سرانجام دیتا تھا:

(۱) طبقات اور برادریوں کے نظام کو بحال رکھنا؛

(۲) زرعی پیداوار کو منظم کرنے، اور زراعت کے لیے درکار انفرااسٹرکچر کو قائم رکھنے اور ترقی دینے، میں معاونت کرنا؛

(۳) زرعی پیداوار کی فروخت کو براہِ راست یا بالواسطہ کنٹرول کرنا؛

(۴) ریاستی اداروں کی مدد سے اپنے علاقے میں نظم و ضبط قائم رکھنا؛

(۵) سرکاری محصولات کی وصولی کے لیے حالات سازگار رکھنا، اور

(۶) ریاستی انتظامیہ کو سیاسی عمل یا انتخابات میں مطلوبہ نتائج کی ضمانت فراہم کرنا۔

جاگیرداری نظام یہ تمام کام ماضی میں نہایت موثر طور پر سرانجام دیتا رہا ہے، لیکن ملکی معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کے باعث اب اس کا اہل نہیں رہا۔ اور اس کے غیر موثر ہوجانے سے ریاستی ڈھانچا، جس کا یہ ایک بنیادی جز تھا، تیزی سے اپنی طاقت سے محروم ہوتا جارہا ہے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ پاکستانی معاشرے میں یہ تبدیلیاں بعض اہم ریاستی اقدامات ہی کے

Scanned with CamScanner

منطقی نتائج کے طور پر رونما ہوئیں۔ آبپاشی کے نہری نظام کی توسیع، سبز انقلاب (Green Revolution) کی ٹیکنولوجی، زراعت میں مشینوں کے استعمال، سڑکوں اور ٹرانسپورٹ کی سہولتوں کی فراہمی ــــ ان عناصر نے پاکستان کے دیہی علاقوں کو بنیادی طور پر تبدیل کر دیا۔ ان اقدامات کے نتیجے میں ہونے والی اضافی پیداوار اور بیجوں، کیمیائی کھاد وغیرہ کی نقد خرید و فروخت کی بدولت گاؤں کی سطح پر بارٹر کے نظام کی جگہ نقدی کی معاشیات نے لے لی اور یوں دیہی آبادی کے لوگوں کے لیے معاشرتی اور اقتصادی طور پر اپنے طبقے، ذات اور برادری سے نکل کر ترقی کرنا ممکن ہو گیا، جس سے قبیلے، برادری اور ذات پات کا پرانا نظام ٹوٹ گیا اور خود کفیل گاؤں کا تصور ختم ہو گیا۔ کاریگر ذاتوں کے لوگ گاؤں سے نکل کر شہروں کی طرف آنے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کے شہروں میں صنعتیں قائم ہونا شروع ہوئیں جنھوں نے دیہات سے شہروں کو نقل مکانی کرنے والوں کو روزگار فراہم کیا۔ اضافی زرعی پیداوار کی فروخت کی ضروریات کے تحت چھوٹے شہروں اور منڈی قصبوں میں توسیع ہوئی۔ ۱۹۷۰ کے عرصے میں زرعی پیداوار کی نقل و حمل کے لیے سوزوکی پک اپ کا استعمال شروع ہوا جو بجائے خود ایک انقلابی پیش رفت تھی۔ اس نے زرعی اجناس کی فروخت کے قدیم طریق کار کو بدل کر رکھ دیا؛ اور منڈیوں کا محلِ وقوع بھی تبدیل کر دیا۔ منڈیوں کے پہلے کی بہ نسبت دور دور واقع ہونے سے دیہی آبادی کے افراد نے بڑے فاصلوں تک سفر کرنا شروع کیا۔

زرعی پیداوار اور نقل و حمل کے نئے ذرائع کو ایک جدید اور موثر سروس سیکٹر درکار تھا، جو جاگیرداری نظام اور ریاست مہیا کرنے کے اہل نہیں تھے۔ چناں چہ یہ ضرورت پوری کرنے کے لیے ایک غیر رسمی (informal) سروس سیکٹر وجود میں آیا جو ٹریکٹر اور سوزوکی ڈرائیوروں، مکینکوں، کیمیائی کھاد، بیج اور کیڑے مار دوائیں فراہم کرنے والوں، زرعی اجناس کے آڑھتیوں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ پرانے دیہی نظام میں خدمت گزار دکاندار اور ہنرمند کاریگر تھے، مگر اب اپنے نئے کاموں کی نوعیت کے باعث شہری معیشت سے زیادہ سے زیادہ وابستہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس نئے طبقے کی قوت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۷۲ فیصد کاشتکار نقد، اشیا اور خدمات کی شکل میں ان سے قرض حاصل کرتے ہیں، اور زرعی پیداوار سے ان کا منافع کاشتکاروں کے منافعے کے مقابلے میں تین سے دس گنا تک زیادہ ہوتا ہے۔ نہری آبپاشی کے تحت آنے والے علاقوں کے سروے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۶۸ فیصد چھوٹے کاشتکار اپنی کھاد، کیڑے مار دواؤں، مشینی آبپاشی اور مشینی کاشت کاری کی ضروریات پوری کرنے کے لیے مقامی غیر رسمی لائٹ انجینیرنگ انڈسٹری اور کیمیائی انڈسٹری کی مصنوعات پر انحصار کرتے ہیں۔ بدلے ہوئے دیہی نظام میں یہ لوگ، جو پرانے دیہی نظام میں وجود نہیں رکھتے تھے، ایک نئے طاقتور عنصر کے طور پر اُبھرے ہیں، گو انھوں نے اپنی طاقت کا مظاہرہ ابھی پوری طرح نہیں کیا ہے۔

ان تبدیلیوں کے نتیجے میں جو نئے طبقے وجود میں آئے ہیں اُن کے پاس کوئی قومی نظریہ اور سیاسی فلسفہ نہیں ہے۔ وہ صرف مادّی فوائد اور معاشی ترقی کے لیے متحرک ہوئے ہیں۔ وہ قومی اور صوبائی

انتخابات میں حصہ نہیں لیتے، مگر لوکل کاؤنسلوں کے انتخابات میں سرگرم ہیں اور کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ وہ اس مقصد کے لیے کوشاں ہیں کہ ضلعی انتظامیہ کا اقتدار ان کے حوالے کر دیا جائے۔

***

عام خیال کے برخلاف، پنجاب کا معاشرہ جاگیردارانہ نہیں ہے۔ اس صدی کے آغاز میں انگریزوں نے وسطی پنجاب میں دنیا کا سب سے بڑا آبپاشی کا نظام قائم کیا جس نے لاکھوں ایکڑ بنجر ریگستانی زمینوں کو سبز کھیتوں میں تبدیل کر دیا۔ پنجاب کے زیادہ گنجان آباد مشرقی حصے کے کسان حکومت کی ترغیب پر وسطی پنجاب کو منتقل ہوئے؛ ان کی واحد وفاداری حکومت کے ساتھ تھی۔ اتنی بڑی زرعی برادری کے پیدا ہونے سے ٹرانسپورٹ کا نظام، منڈیاں، آڑھتی، مالیاتی ادارے اور ریونیو کی وصولی کرنے اور سرکاری نظم و ضبط قائم رکھنے والے ادارے وجود میں آئے۔ تعلیمی اداروں کے فروغ کی ذمے داری حکومت نے خود لی۔ اگرچہ برادریوں کے "چودھری" موجود تھے، مگر لوگوں پر ان کے اقتدار کی نوعیت سندھ کے وڈیروں، سرحد کے ملکوں اور بلوچستان کے سرداروں سے مختلف تھی جو پیداواری ذرائع پر بھی مکمل کنٹرول رکھتے تھے۔

آبپاشی کے اس عظیم نظام کی تعمیر کے لیے مشرقی پنجاب سے انجینئر اور ہنرمند کاریگر بلوائے گئے اور مقامی لوگوں کے لیے تکنیکی تربیت کے مراکز قائم کیے گئے۔ بیس سال کے عرصے میں ایک لاکھ سے زیادہ ہنرمند افراد مہیا ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم پنجاب کے کاریگروں، بالخصوص ویلڈروں اور فیبری کیٹروں کو ۱۹۲۰ کے عشرے میں ہندوستان بھر میں کام کرتے ہوئے پاتے ہیں۔

ان حالات کے تحت، اور کسی مضبوط سیاسی پروگرام کی غیر موجودگی میں، یہ فطری عمل تھا کہ پنجاب نے نئے ملک پاکستان کی سول انتظامیہ پر، اور یہاں کے سرکاری اہلکاروں، بیوروکریٹوں اور پولیس افسروں نے چھوٹے صوبوں کی انتظامیہ پر بھی، کنٹرول حاصل کر لیا۔ ۱۹۳۰ کے عشرے میں سکھر بیراج کی تعمیر کے وقت پنجابی ٹھیکے دار، کاریگر اور انتظامی اہلکار سندھ میں بھی داخل ہو چکے تھے اور آبپاشی کے نظام کی نگہداشت کے لیے یہیں رہ گئے تھے۔ بیراج بننے کے بعد پنجاب کے کاشتکاروں کی ایک بڑی تعداد بیراج کے علاقے میں آباد ہوئی تھی۔

۱۹۶۰ کے عشرے میں ایوب خاں کے سبز انقلاب کا پنجاب پر بہت اہم اثر پڑا۔ دھان اور گیہوں کی نئی اقسام کی کاشت، ڈھائی ہزار ٹیوب ویلوں کی تنصیب اور زراعت میں مشینوں کے استعمال کی بدولت ترقی کی مرکب سالانہ شرح (جو ۱۹۵۰ کے عشرے میں ایک فیصد سے کچھ ہی اوپر تھی) ۱۹۶۰ کے عشرے میں پانچ فیصد تک جا پہنچی۔

سبز انقلاب کے نتیجے میں زراعت پر بڑے زمینداروں کی اجارہ داری قائم ہوئی، کیوں کہ زرعی

Scanned with CamScanner

پیداوار میں استعمال ہونے والے اجزا کے لیے قرضے صرف بڑے زمینداروں ہی کو میسّر تھے۔ چھوٹے کاشتکاروں کی مالی حالت خراب ہوتی گئی اور انھیں اپنی زمینیں بڑے کاشتکاروں کو فروخت کرنی پڑیں۔ مشینوں کے استعمال کے باعث بے زمین کسانوں اور دیہی بے روزگاروں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ زراعت کی اجارہ داری سے بڑے زمین داروں کو بھاری منافع ہوا، اور انھوں نے اس کا خاصا بڑا حصّہ شہری معیشت میں لگایا۔ صرف ۶۵-۱۹۶۴ کے سال میں ساڑھے تین ارب روپے سے زیادہ سرمایہ دیہی علاقوں سے شہروں کو منتقل ہوا۔ ان اسباب کی بنا پر لوگوں کو پنجاب کے دیہات سے نکل کر شہروں کا رخ کرنا پڑا۔

لیکن سبز انقلاب کے نتیجے میں پنجاب کی سیاست میں جو تبدیلی واقع ہونی چاہیے تھی، وہ نہیں ہوئی۔ اس کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں:

(۱) دیہی علاقوں میں آمدنی میں اضافے کے ساتھ ساتھ پنجاب کے تاجروں اور ہنرمند کاریگروں نے اپنی سرگرمیوں کو وسیع کیا اور مشینی زراعت کی مختلف ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لائٹ انجینیئرنگ کی صنعتیں قائم ہوئیں۔ ان صنعتوں کا دائرہ بڑھنے لگا اور رفتہ رفتہ آلات جراحی، الیکٹرونکس کی اشیا اور دوسری صارفانہ مصنوعات کے کارخانے وجود میں آئے۔ یہ تمام چھوٹے پیمانے کی صنعتیں حکومت کی جانب سے کسی قسم کی حوصلہ افزائی یا امداد کے بغیر قائم ہوئیں۔

(۲) پاکستانی فوج کی نفری میں اضافہ ہوا اور پنجاب کے لوگوں کی بڑی تعداد کے لیے فوج میں گنجائش نکلی۔

(۳) پنجاب سے ہنرمند کاریگروں نے بڑی تعداد میں یوروپ اور مشرقِ وسطیٰ کو نقل مکانی کی۔

(۴) پنجاب کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد روزگار کی تلاش میں سندھ منتقل ہوئی۔

***

سندھ کا دیہی معاشرہ ۱۹۶۰ کے عشرے کے وسط سے پہلے تک مکمل طور پر جاگیردارانہ تھا۔ وڈیرے اور جاگیردار تمام زرعی زمینوں کو کنٹرول کرتے تھے۔ پنجاب کے برعکس، سندھ میں خودمختار کسان نہ ہونے کے برابر تھے۔ بڑھئی، حجام، چٹائیاں بنانے والے، چمڑا صاف کرنے والے وغیرہ اپنی خدمات کی اجرت گاؤں کے دوسرے لوگوں سے چاول یا گیہوں کی صورت میں حاصل کرتے تھے۔ کپڑا دیہات میں کھڈیوں پر بُنا جاتا، بیل گاڑیوں پر لاد کر قصبوں تک لایا جاتا اور دوسری اشیا کے بدلے فروخت کیا جاتا۔ جوتے کسی کسی کو میسّر تھے اور پینے کا پانی کھلے کنوؤں اور نہروں سے حاصل کیا جاتا تھا۔

زمین دار ہاریوں کی زندگی اور موت پر اختیار رکھتا تھا۔ وہ ان سے اپنی ضرورت کے لیے بیگار لیتا، ان کے پاس صرف اتنی پیداوار رہنے دیتا جس سے وہ صرف بمشکل زندہ رہ سکیں۔ اس کے علاوہ تمام پیداوار ہاریوں سے لے لی جاتی۔ مزاحمت کرنے والوں کو سخت سزائیں ملتیں اور جرمانے بھرنے پڑتے۔

Scanned with CamScanner

زمینداروں کے علاوہ قبائلی سردار اور مذہبی پیر بھی استحصال میں شریک تھے۔ قبائلی سردار اپنی برادری کے لوگوں سے سالانہ ٹیکس وصول کرتے، اور اس کے عوض ان کے باہمی تنازعوں کا فیصلہ کرتے اور قصوروار فریق کو سزائیں دیتے۔ پیر دیہاتیوں کے توہمات کو ہوا دے کر ان کا استحصال کرتے۔ مرید اپنے پیروں کو باقاعدگی سے نذریں دیتے اور تمام مذہبی اور نجی معاملات میں ان سے مشورہ لیتے۔ بیشتر پیر مذہبی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ زمیندار بھی تھے، اور اس طرح ان کے اقتدار کے خلاف آواز اٹھانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

دیہی علاقوں کی زندگی کے ہر شعبے پر جاگیرداری نظام کے موثر کنٹرول کی وجہ سے ریاستی انتظامیہ نے خود کو نظم و ضبط قائم کرنے کی ذمے داری سے بری کر رکھا تھا۔ حکومت کے تمام معاملات میں مقامی وڈیروں سے مشورہ اور امداد طلب کی جاتی اور اس کے عوض وڈیروں کی قانون شکنی کو نظرانداز کیا جاتا۔ یہ قانون شکنی زیادہ تر ہاریوں کو بے دخل کرنے، حق شفعہ غصب کر لینے، انھیں سزائیں دینے اور جن انسانی حقوق کی ملک کے آئین میں ضمانت دی گئی تھی ان کی خلاف ورزی کرنے پر مشتمل ہوتی تھی۔ وڈیرا ریاستی انتظامیہ کو علاقے میں جرائم اور شورش نہ ہونے کی ضمانت فراہم کرتا اور یوں مٹھی بھر پولیس ایک پورے ضلعے کو کنٹرول کر سکتی تھی۔ آبپاشی اور نکاس کی نہریں وڈیروں کے مہیا کردہ بیگار کے مزدوروں کی مدد سے چلائی جاتیں۔ سرکاری محکموں کے لیے مقامی مزدوروں کو براہ راست کام دینا ممکن نہیں تھا۔ وڈیرا نہیں چاہتا تھا کہ نقد رقم کے عوض اور دوسروں کے کنٹرول میں کام کرنے سے اس کے ہاریوں کی عادتیں خراب ہوں، اس لیے اکثر اوقات سرکاری محکموں کو ملک کے دوسرے حصوں سے مزدور منگوانے پڑتے۔

وڈیرا ہاریوں کے ووٹوں کو کنٹرول کرتا اور ریاستی انتظامیہ کو انتخابات میں مطلوبہ نتائج فراہم کرتا۔ دیہی آبادی کے اکثریت میں ہونے کے باعث شہری علاقوں میں مخالفانہ نتائج بے اثر ہو جاتے۔ دیہی علاقوں میں وڈیرے کی مرضی کے خلاف ووٹ دینا ممکن نہیں تھا۔ نظام سے بغاوت کرنے والے کو بے دخل کر دیا جاتا اور اس کے پاس سوائے اس کے کوئی راستا باقی نہ رہتا کہ جنگل میں جا کر ڈاکو بن جائے۔

سندھ میں نیشنل ہائی وے کے سوا کوئی سڑکیں نہیں تھیں اور نقل و حمل کا انحصار بیل گاڑیوں اور اونٹوں کے کاروانوں پر تھا۔ اس طرح شہری منڈیوں تک رسائی کم تھی اور فاضل زرعی پیداوار کے لیے کوئی مارکیٹ نہیں تھی۔ مثال کے طور پر کراچی کے لیے اجناس دادو یا لاڑکانہ کی بہ نسبت پنجاب سے حاصل کرنا زیادہ آسان تھا۔ کاٹن جننگ اور دھان چھڑنے کے کام بڑے شہری مراکز میں مشینی طور پر کیے جاتے تھے۔ شہری مصنوعات دیہی منڈیوں تک نہیں پہنچ پاتی تھیں۔ دیہات میں اسکول، اسپتال اور ڈسپنسریاں نہیں تھیں اور ٹیلی کمیونی کیشنز کی سہولتیں بہت کم تھیں۔

ان حالات میں درمیانہ طبقے کا دیہی علاقوں سے اُبھرنا اور شہری معیشت سے تعلق قائم کرنا ناممکن

نہیں تو سخت دشوار تھا۔ اس خلا کو مہاجر اور پنجابی کاروباری طبقوں نے پُر کیا اور وڈیروں اور ریاستی انتظامیہ کے ساتھ مل کر دیہی سندھ کی صورت حال کو برقرار رکھنے میں مدد دی۔

ایوب خاں کے دور میں کئی نئے تصوّرات اور ادارے سندھ میں متعارف کرائے گئے: خاندانی منصوبہ بندی، ویلیج ایڈ پروگرام، ٹیلی کمیونی کیشن، سڑکوں کی تعمیر، بینڈ پمپوں کی تنصیب، زرعی ترقیاتی بینک وغیرہ۔ چوں کہ دیہی آبادی کے شعور کو بلند کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی، ان پروگراموں کا جو حصّہ جاگیرداروں کے حق میں جاتا تھا اس پر عمل ہوا اور دوسرے حصّے رد کر دیے گئے۔ پھر بھی ان پروگراموں کا دیہی معاشرت پر کچھ اثر ضرور پڑا۔ جاگیردار خاندانوں کے لڑکے بڑی تعداد میں تعلیم حاصل کرنے کراچی، لاہور اور حیدر آباد گئے۔ ہاریوں کو سرکاری محکموں میں کام ملا۔ بہت سے لوگ کراچی کی ملوں میں کام کرنے آئے اور ٹریڈیونین تحریکوں سے متعارف ہوئے۔ ۱۹۶۵ کی پاک بھارت جنگ نے ٹرانزسٹر انقلاب برپا کیا اور دیہات کے بہت سے لوگ باہر کی دنیا سے آگاہ ہوئے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام اور ذوالفقار علی بھٹو کی ۱۹۶۷ سے ۱۹۷۱ تک چلائی ہوئی سیاسی تحریک نے سندھ کے دیہی علاقوں میں ایک بڑی تبدیلی کی بنیاد رکھی۔ اب وڈیرے کو "باپ اور محافظ" کی جگہ "ظالم" سمجھا جانے لگا۔ ان "ظالموں" کی بڑی تعداد نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ بھٹو کے اقتدار میں آنے کے بعد سندھ میں اہم ترقیاتی منصوبے شروع کیے گئے اور کسان طبقے کو سہولتیں اور روزگار فراہم ہوا۔ نئے اسکول اور کالج قائم ہوئے۔ دیہی سندھ کے بہت سے طلبا انجینئر اور ڈاکٹر بنے۔ دیہی سندھ کے لوگوں کو روزگار کے مواقع ملے اور دیہی اور شہری علاقوں کے لوگ ایک دوسرے پر اثرانداز ہوئے۔ ان تبدیلیوں کی وجہ سے سندھ کا درمیانہ طبقہ وسیع ہوا اور اس نے رفتہ رفتہ طاقت حاصل کی۔ یہ تبدیلیاں جاگیرداری نظام کے لیے مہلک تھیں۔

ان وسیع اور اچانک تبدیلیوں کے نتیجے میں تنازعات کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ بھٹو دور میں یہ اختلافات دو عوامل کی وجہ سے دب گئے تھے۔ پہلا یہ کہ ان تبدیلیوں کے طویل مدّتی مضمرات ان سے متاثر ہونے والوں کی پوری طرح سمجھ میں نہیں آئے تھے، اور دوسرا یہ کہ حکومت میں شامل جاگیردار ان تبدیلیوں کو اپنی نگرانی میں پروان چڑھا رہے تھے۔ ۱۹۷۷ میں ضیاالحق کے مارشل لا نافذ کرنے کے بعد سے یہ عوامل کارگر نہیں رہ گئے۔ جولائی میں فوج کے اقتدار پر قبضہ کرنے اور اکتوبر میں اعلان کردہ انتخابات کو ملتوی کرنے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اب وڈیرے ریاستی انتظامیہ کو انتخابات میں مطلوبہ نتائج فراہم کرنے کے اہل نہیں رہے تھے اور، چند ایک کو چھوڑ کر، اپنے ہاریوں کے سیاسی یرغمال بن چکے تھے۔

مارشل لا کے تحت سندھ کے وڈیرے اپنی سیاسی قوّت اور ہاریوں پر کنٹرول کھو بیٹھے تھے اور انھیں ریاستی انتظامیہ سے نئے رشتے قائم کرنے کی جستجو تھی۔ مارشل لا سے سندھ کا درمیانہ طبقہ بھی متاثر ہوا تھا کیوں کہ اسے ریاست کی سرپرستی حاصل نہیں رہی تھی۔ ۱۹۶۰ کے عشرے کے وسط میں شروع ہونے والی تبدیلیاں اپنے راستے پر آگے بڑھ رہی تھیں، لیکن سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کے

Scanned with CamScanner

باعث مختلف طبقوں اور انتظامیہ کے درمیان عملی رابطہ مفقود تھا چناں چہ انتظامیہ نے ان تبدیلیوں کو سمونے کے لیے اپنے نظام میں کوئی ترمیم نہ کی۔ عوام کا ریاست سے فاصلہ بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ ناکار کردگی، بدعنوانی، بےروزگاری اور لاقانونیت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ۱۹۸۳ کی بحالیِ جمہوریت کی تحریک اس کشیدگی کا نقطۂ عروج تھی۔ اس تحریک میں جاگیردار اور درمیانہ طبقوں نے مل کر حصہ لیا، اور جوں جوں تحریک آگے بڑھتی گئی یہ بات ظاہر ہوتی گئی کہ درمیانہ طبقے کو توقع سے زیادہ سیاسی حمایت حاصل ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ اس تصادم کی شدت سب سے زیادہ مورو اور قاضی احمد کے پھیلتے ہوئے سندھی قصبوں میں، یا پھر دادو اور میہڑ جیسے روایتی طور پر پس ماندہ مقامات پر نظر آئی جہاں معاشرتی تبدیلی کی رفتار سب سے زیادہ تیز تھی۔ اس تحریک سے ریاستی انتظامیہ میں بدامنی پر قابو پانے کی صلاحیت کا فقدان کھل کر سامنے آگیا؛ اس کے اقدامات اُن علاقوں میں بھی بےاثر ثابت ہوئے جہاں کے جاگیرداروں کی حمایت اس کے ساتھ تھی۔ اس کے بعد سندھ کے کچھ علاقوں میں فوجی ایکشن ہوا جس نے متعدد سیاسی کارکنوں کو جنگلوں میں ڈاکوؤں کے ساتھ پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ڈاکوؤں کو بھی سیاسی طور پر متحرک کرنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں یا تو اُن کے ہاتھوں مارے گئے یا خود بھی ڈاکو بن گئے۔

انتظامیہ کی بےاثری، درمیانہ طبقے کی بڑھتی ہوئی طاقت اور بدامنی کی صورتِ حال نے سندھ کے وڈیروں میں عدمِ تحفظ کا احساس پیدا کیا اور ان کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ اپنے لیے مسلح محافظ پہلے سے زیادہ تعداد میں رکھیں۔ چوں کہ انتظامیہ کی بےاثری ثابت ہو چکی تھی، دیہی زندگی کے روایتی تنازعات اب اسلحے کے زور پر طے کیے جانے لگے۔ بعض علاقوں میں آبپاشی کی نہروں سے پانی لینے کا مروّجہ "وارو" (باری) کا نظام ختم ہو گیا اور زیادہ بندوقوں کے مالک زمیندار اپنی من مانی کرنے لگے۔ اس طرح زمین داروں کے درمیان اسلحے کی دوڑ شروع ہو گئی۔ اسلحے کی یہ بڑھتی ہوئی طلب افغان جنگ کے لیے فراہم کیے ہوئے ہتھیاروں نے پوری کی اور اس طرح افغانی تعلق سے دستیاب ہونے والی کلاشنکوفیں سندھ میں عام نظر آنے لگیں۔ بہت سے مسلح گروہ جو زمین داروں نے اپنی حفاظت کے لیے قائم کیے تھے، ڈکیتیوں میں ملوث ہو کر آبادی کو دہشت زدہ کرنے لگے۔ صورتِ حال یہاں تک بگڑ گئی کہ صوبائی اسمبلی کے مقامی ارکان کی گاڑیوں کے آگے پیچھے مسلح محافظوں سے بھری جیپیں چلتی دکھائی دینے لگیں۔

ان حالات میں سرکاری اہلکاروں کے لیے محصولات وصول کرنا مشکل ہو گیا۔ عام خیال یہ ہو گیا کہ سرکاری اہلکاروں نے سندھ کی نئی طاقت یعنی ڈاکوؤں سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے ہیں۔ چھوٹے زمیندار، تاجر اور پیشہ ور افراد جو اسلحے کے ذریعے اپنی حفاظت کرنے سے قاصر تھے، اغوا کر لیے جاتے اور انھیں تاوان لے کر چھوڑا جاتا۔ نتیجتاً وہ اس علاقے سے نقل مکانی کرنے لگے۔ تاہم، کسانوں کے لیے کہیں جانا ناممکن ہے۔ جاگیردارانہ نظام جو ان کے اور ریاست کے درمیان ایک رابطے کی حیثیت رکھتا تھا، اپنی یہ حیثیت کھو چکا ہے۔ چناں چہ پرانے اداروں کے ختم ہونے سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر

Scanned with CamScanner

کرنے کے لیے متعدد دیہات میں لوگوں نے اپنی تنظیمیں بنالی ہیں اور انھیں فلاح و بہبود کی تنظیموں کے طور پر رجسٹر کرایا ہے۔ ان کے منتخب عہدے دار اسکولوں اور ڈسپنسریوں کے قیام، سڑکوں اور پُلوں کی تعمیر اور پانی اور نکاس کی سہولتوں کی فراہمی کے لیے مقامی سرکاری محکموں پر دباؤ ڈالتے ہیں۔ وہ غیر سرکاری تنظیموں اور پیشہ ور لوگوں سے رابطہ قائم کر کے تکنیکی مشورے اور اعانت حاصل کرتے ہیں اور گاؤں میں اور اس کے ارد گرد امن قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض تنظیموں نے اپنے طور پر علاج اور تعلیم کے ادارے قائم کیے ہیں۔ چند مقامات پر انھوں نے یونین کاؤنسلوں کے انتخابات میں علاقے کے وڈیروں کو شکست بھی دی ہے۔

یہ دیہی تنظیمیں ابھی تعداد میں کم ہیں لیکن رفتہ رفتہ ان میں اضافہ ہونا ناگزیر ہے، کیوں کہ فی الوقت سندھ کی معاشرتی تبدیلیوں کے اظہار کا کوئی اور طریقہ دستیاب نہیں۔ انھیں اس کا پورا شعور ہے کہ ان کی کامیابی کی کلید یونین کاؤنسلوں پر اقتدار حاصل کرنا ہے۔

اس اثنا میں سندھ کی صورتِ حال مسلسل خراب ہوتی چلی جائے گی جب تک جاگیرداری نظام کے خاتمے کو اداروں کی شکل نہیں دی جاتی اور اقتصادی اور معاشی تبدیلیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نئے طبقوں کو ان کی قوت کے مطابق سیاسی عمل میں شامل نہیں کیا جاتا۔

***

شہری مراکز میں تبدیلیاں

ملک کے بڑے اور چھوٹے شہری مراکز میں بھی تبدیلیوں کی رفتار دیہی علاقوں سے مختلف نہیں تھی۔ ۱۹۵۱ میں پاکستان کی کل آبادی کے ۱۸ فیصد (۶۵ لاکھ) لوگ شہروں میں رہتے تھے۔ ۱۹۹۱ میں آبادی کے شہری تناسب کا تخمینہ ۳۰ فیصد (چار کروڑ) تک پہنچ چکا ہے، اور ۲۰۱۱ میں اس کے ۵۰ فیصد (۹ کروڑ ۸۴ لاکھ) تک جا پہنچنے کی توقع ہے۔ تاہم، ایک طرف پینے کے پانی کی فراہمی، گندے پانی کے نکاس، کوڑے کرکٹ (solid waste) کو اٹھانے کے بندوبست، ٹرانسپورٹ، تعلیم اور علاج کی سہولتوں، اور دوسری طرف مکان بنانے کے لیے زمین، قرضے اور تکنیکی معاونت کی منظم فراہمی میں شہری آبادی کے بڑھنے کی رفتار سے اضافہ نہیں ہوا۔ شہروں میں کم وسائل رکھنے والے طبقے کی (جو شہری آبادی کا ۸۰ فیصد ہے) بڑی اکثریت کی رہائش، ٹرانسپورٹ، تعلیم اور علاج کی ضروریات دلالوں اور تاجروں پر مشتمل غیر رسمی سیکٹر پوری کرتا ہے۔ یہ غیر رسمی سیکٹر چھوٹے کاروبار کے لیے (گراں شرحِ سود پر) قرضے بھی دیتا ہے اور (سرکاری اور غیر سرکاری) رسمی سیکٹر کے مقابلے میں زیادہ روزگار بھی فراہم کرتا ہے۔

Scanned with CamScanner

۱۹۷۷ میں سندھ اور پنجاب کے بڑے اور چھوٹے شہری مراکز کے اسی غیر رسمی سیکٹر کی تائید کی وجہ سے پی این اے پہیا جام ہڑتالیں کرانے میں کامیاب ہوا تھا جن کے نتیجے میں آخرکار بھٹو کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا تھا۔ اس سیکٹر کی ضیا مخالف تحریکوں سے عدم دلچسپی کی وجہ سے فوج گیارہ سال تک اقتدار میں رہی۔ پاکستان کی سیاسی جماعتوں کو ــــ اگر وہ جمہوری اداروں کے فروغ میں دلچسپی رکھتی ہیں ــــ اس طبقے کے معاشرتی پس منظر اور سیاسی میلان کو سمجھنا ہوگا اور اس کے تقاضوں کو اپنے سیاسی عمل میں جگہ دینی ہوگی، یا پھر ایک ایسا قابلِ عمل متبادل پیدا کرنا ہوگا جو ملک کی معیشت میں وہ کردار ادا کر سکے جو یہ غیر رسمی سیکٹر ادا کرتا ہے۔

آڑھتیوں، دلالوں، چھوٹے تاجروں وغیرہ پر مشتمل یہ طبقہ جاگیرداری نظام کے (جو کچھ عرصہ پہلے تک پاکستان کی سماجی اقتصادیات کو کنٹرول کرتا تھا) کاریگروں اور دیہی تاجروں سے اُبھرا ہے۔ اس نوزائیدہ طبقے کے افراد کی شعور، تعلیم اور ہنر کی سطح دیہی اور شہری پرولتاریہ سے بلند ہے۔ اس طبقے کے افراد پیداواری عمل اور طریقوں میں امکانی تبدیلیوں سے آگاہ ہیں اور انھیں اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ صلاحیت انھیں بیسویں صدی سے منسلک کر کے ان کے لیے تیز رفتار سماجی اور معاشی ترقی کو ممکن بنا دیتی ہے۔ یہ تمام خصوصیات انھیں اُسی جاگیرداری نظام کے مقابل لا کھڑا کرتی ہیں جس سے ان کا ظہور ہوا تھا۔ اگرچہ اس طبقے کے افراد ابھی تک محنت کش طبقے کے مخالف نہیں ہیں، لیکن یہ بات وہ کبھی گوارا نہیں کریں گے کہ محنت کش طبقہ منظم ہو جائے کیوں کہ اس طرح ان دونوں کے درمیان غیر مساوی رشتہ متاثر ہوگا اور اُن کے لیے پرولتاریہ کا معاشی استحصال دشوار ہو گا۔

اب تک اس طبقے نے سیاست میں براہ راست حصّہ نہیں لیا ہے لیکن وہ قومی سطح کی سیاسی تحریکوں کے لاحقے کے طور پر سامنے آیا ہے۔ اس طبقے کے افراد مقامی معاشرتی زندگی میں سرگرم ہیں اور اُن ہزاروں سماجی بہبود کی تنظیموں اور کاروباری تنظیموں کے وجود میں آنے کے ذمے دار ہیں جو ملک کی ضلعی اور بلدیاتی سطح کی سیاست میں حصّہ لیتی ہیں۔ اس طبقے نے بلدیاتی انتخابات میں بھرپور حصّہ لیا ہے اور اکثر اپنے علاقے کے جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں کے نمائندوں کو شکست دی ہے۔ اب تقریباً تمام ضلعی اور بلدیاتی کاؤنسلیں اور ٹاؤن کمیٹیاں ان کے کنٹرول میں ہیں۔

بلدیاتی اداروں کے یہ منتخب نمائندے زیادہ تر "کاروباری" ہیں اور ملک کی پارلیمانی جمہوریت سے ناخوش ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پس منظر میں چلے گئے ہیں اور قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے اراکین، جن میں سے بیشتر جاگیردار یا مغرب نواز لبرل افراد ہیں، اقتدار میں ہیں۔ نوزائیدہ طبقے کے افراد اعتماد، قومی سطح کی بصیرت اور سرمائے کی کمی کے باعث قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں حصّہ نہیں لے پاتے۔ قومی سیاست میں اظہار کا موقع نہ پانے کے باعث یہ طبقہ ممکنہ طور پر پاکستان کی پارلیمانی جمہوریت کا سب سے طاقتور مخالف ہے۔

Scanned with CamScanner

اس طبقے کو پاکستانی جمہوریت کے سانچے میں ڈھالنے کا واحد طریقہ اسے بااختیار بنانا ہے۔ معاشرے میں ہونے والی ہمہ گیر اور وسیع تبدیلیوں کا تقاضا ہے کہ ضلعی انتظامیہ کے فرائض اس طبقے کے منتخب نمائندوں کے سپرد کیے جائیں اور کاؤنسلیں اپنے محصولات وصول کرنے اور استعمال کرنے میں آزاد ہوں۔ اسی طرح ان تبدیلیوں کے پیشِ نظر یہ ضروری ہو گیا ہے کہ شہری علاقوں میں مقامی انتظامیہ، ترقیاتی اداروں، ریوینیو کے محکموں، پولیس وغیرہ کو شہروں کی منتخب میونسپل کمیٹیوں اور کارپوریشنوں کا ماتحت بنایا جائے۔ ملکی سطح پر یہ ضروری ہے کہ اس طبقے کی معاشی اور معاشرتی سرگرمیوں کو سہولت اور ترقی دینے کی پالیسیاں اور قوانین بنائے جائیں۔ مختصر یہ کہ وقت کا تقاضا ہے کہ پاکستانی معاشرے میں آ چکنے والی ان تبدیلیوں کو تسلیم کیا جائے اور قومی سیاسی نظام اور اداروں کا حصہ بنایا جائے۔ البتہ اب تک اس کے آثار نظر نہیں آتے۔ ریاست کے اداروں کا رویہ ہنوز ان تبدیلیوں کی راہ روکنے کا رہا ہے، جس سے تشدد اور غیر جمہوری رجحانات کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ اس رویے کی دو واضح مثالیں قومی مردم شماری اور بلدیاتی انتخابات کے مسلسل التوا سے ملتی ہیں۔ گزشتہ مردم شماریوں کے نتائج اور آبادیاتی رجحانات (demographic trends) پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگلی مردم شماری (جسے ۱۹۹۱ میں ہونا تھا اور اب تک نہیں ہوئی ہے) کے نتائج سے پاکستان کے، بالخصوص صوبۂ پنجاب کے، شہری اور دیہی علاقوں کے درمیان اسمبلیوں کے حلقوں کی تقسیم وسیع پیمانے پر تبدیل ہو گی جس سے قومی اور صوبائی سطح کی سیاست پر جاگیردار طبقے کی گرفت کمزور ہو جائے گی۔ اس کا ایک اور اہم نتیجہ سالانہ ترقیاتی پلان (Annual Development Plan) میں بنیادی تبدیلی کی صورت میں برآمد ہو گا، اور ترقیاتی رقمیں، جو اب تک قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے اراکین کے کنٹرول میں رہتی ہیں، بڑی حد تک بلدیاتی اداروں کی تحویل میں چلی جائیں گی۔

***

پاکستان کے بڑے شہروں میں بھی معاشرے کی ان تبدیلیوں کے مظاہر واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اِس وقت شہری آبادی کی اکثریت غیر رسمی، کچی آبادیوں میں رہتی ہے۔ یہ آبادیاں کسی سرکاری منصوبہ بندی کے بغیر بنی ہیں اور انھیں شہری سہولتیں ـــ پینے کا پانی، گندے پانی کا نکاس، بجلی، ٹرانسپورٹ، کوڑے کرکٹ کے انتظام، تعلیم، علاج، قرضہ وغیرہ ـــ سرکاری یا پرائیویٹ رسمی سیکٹر کی طرف سے فراہم نہیں کی گئی ہیں۔ مافیا کے انداز میں کام کرنے والا ایک غیر رسمی سیکٹر کم آمدنی والے اس شہری طبقے کو رہائشی زمین، مکان بنانے اور چھوٹا کاروبار کرنے کے لیے سودی قرضے، ٹرانسپورٹ اور روزگار فراہم کرتا ہے، جب کہ صحت اور تعلیم کی خدمات ایک غیر معیاری پرائیویٹ سیکٹر کی طرف سے مہیا ہوتی ہیں۔ جائزوں کے مطابق ۷۰ فیصد شہری آبادی بے ضابطہ

(unregularised) سیکٹروں میں کام کرتی ہے جہاں کم از کم اُجرت اور لیبر قوانین و ضوابط کا اطلاق نہیں ہوتا۔ پاکستان کی شہری آبادی میں اضافے کی شرح ۴.۸ فیصد سالانہ تصوّر کی جاتی ہے، مگر غیر رسمی سیکٹر ۹ فیصد سالانہ کی شرح سے ترقی کر رہا ہے اور یہ شرح بھی مسلسل بڑھ رہی ہے۔

شہری علاقوں میں ہونے والا یہ اضافہ ایک اہم معاشرتی انقلاب ہے جس کے باعث برادری اور قبیلے کے روایتی تعلقات کی جگہ مقامی سطح کے جدید رشتے پیدا ہو رہے ہیں۔ معاشی دباؤ اور شہری کلچر نے عورتوں کو، خاص طور پر کچی آبادیوں میں، گھروں کے باہر کام کرنے پر مائل کر دیا ہے۔ ایک عوامیت پسند کلچر اشراف کے کلچر کی جگہ لے رہا ہے۔ کچی آبادیوں سے آنے والے کاؤنسلر میونسپل اداروں میں اہم طاقت کے طور پر اُبھر رہے ہیں۔ دوسری طرف حکومت، سیاسی جماعتیں اور مافیا ان تبدیلیوں کا ساتھ دینے اور اپنے طرزِ عمل میں ان تبدیلیوں کے لحاظ سے ترمیم کرنے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ پس ماندہ بستیوں میں رہنے والوں کی دوسری نسل (اور بعض صورتوں میں تیسری نسل) جوان ہو چکی ہے۔ یہ نسل اپنے جاگیردارانہ ماضی سے تعلق ختم کر چکی ہے اور شہری مراکز پر اپنا دعویٰ رکھتی ہے۔ موجودہ نظام ان نئے شہری تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر رہا ہے۔ اگر اس صورتِ حال کی مناسبت سے نئے ادارے قائم نہیں ہوئے تو انارکی پھیلنا ناگزیر ہے۔

***

ریاست کی ناکامی

پاکستانی معاشرے میں آنے والی یہ اہم تبدیلیاں صرف نچلی سطحوں پر ظاہر ہوئی ہیں۔ اہلِ اقتدار طبقوں، ریاستی اداروں، دانش وروں، سیاست دانوں، سیاسی پارٹیوں وغیرہ نے ان ہمہ گیر معاشرتی تبدیلیوں کو سمجھنے اور اپنی سرگرمیوں میں سمونے کی کوشش نہیں کی ہے۔ نتیجتاً معاشرے کی بدلی ہوئی حقیقت اور ریاست کے روایتی ڈھانچے کے درمیان ایک بڑی خلیج پیدا ہو گئی ہے جو روز بروز وسیع ہوتی جا رہی ہے۔

پاکستان کے عوام میں اس سرگرمی سے بیزاری بڑھتی جا رہی ہے جو ملک میں سیاست کے نام پر جاری ہے۔ سیاسی حلقوں میں رجعت پسندی اور استحصال کے خلاف جدوجہد کی جگہ اثر و رسوخ استعمال کر کے ذاتی فوائد اور عمدہ عہدے حاصل کرنے کی کوششوں نے لے لی ہے، جبکہ رجعت پسندی اور استحصال پہلے ہی کی طرح موجود ہیں۔ دانش ور حلقوں میں ملک کے سماجی اور اقتصادی مسائل کی بحث کی حیثیت ثانوی ہو گئی ہے اور اس کے بجائے اسلام آباد کے نئے حکمرانوں کی ذاتی زندگیوں اور سرگرمیوں کے بارے میں گپ شپ نے زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے۔ جمہوری دور کے آغاز کی تسکین اور توقعات ہوا ہو

Scanned with CamScanner

چکی ہیں اور حکمرانوں کے طور طریقے مارشل لا دور کی یاد دلانے لگے ہیں۔ عوام کی بڑھتی ہوئی بے گانگی اور بیزاری کا سبب ملک کے معاشرتی حقائق اور سیاسی سرگرمی کے درمیان بہت بڑی خلیج ہے۔ سیاسی مبصر اس خلیج کے وجود کے مختلف اسباب بیان کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ منتخب حکومت کے پاس ناکافی اختیارات ہیں اور اس کے باوجود اسے یوں ظاہر کرنا پڑ رہا ہے جیسے اسے تمام اختیارات حاصل ہوں۔ مگر وہ یہ نہیں بتاتے کہ منتخب حکومت کو ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے پر کون مجبور کر رہا ہے۔ بعض لوگ اس صورتِ حال کا سبب حکومت کے کلیدی عہدوں پر فائز شخصیات کی ناتجربہ کاری اور خام کاری کو ٹھہراتے ہیں جس کے باعث انھیں بیوروکریسی پر قابو پانے میں مشکل ہو رہی ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ منتخب حکومت اپنی کمزوری کے باعث جان بوجھ کر ایسے فیصلے کرنے سے گریز کر رہی ہے جو طاقتور مفادات رکھنے والے حلقوں کی برہمی کا سبب بنیں۔

موجودہ سیاسی حالات کا فوری سبب کچھ بھی بیان کیا جائے، ایک بات یقینی ہے: اس صورتِ حال کی جڑیں مارشل لا کے گیارہ سالہ دور، اس دور میں بحالیِ جمہوریت کی تحریک کی نوعیت اور نتائج، اور جنرل ضیا کی موت کے بعد انتخابات کرانے اور منتخب حکومت کو جزوی اختیارات سونپنے کے فیصلے کی وجوہ میں تلاش کرنی ہوں گی۔ روایتی طور پر پاکستان کی فوجی اور سول بیوروکریسی کو جاگیرداری نظام کی حمایت اور اعانت حاصل رہی ہے؛ اور ان تینوں کے اتحاد سے وہ شے ظہور میں آئی جسے اسٹیبلشمنٹ کہا جاتا ہے۔ چوں کہ دیہی آبادی غالب اکثریت رکھتی تھی اس لیے شہری علاقوں میں اٹھنے والی اختلافی آوازوں کو آسانی سے دبا لیا جاتا رہا۔ ۱۹۷۰ کے انتخابات کے نتیجے میں ایک نئی صورتِ حال سامنے آئی جب دو مقبولیت پسند (populist) پارٹیاں ـــ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی ـــ منتخب ہوئیں۔ عوامی لیگ اور اسٹیبلشمنٹ کے درمیان مفاہمت نہ ہو پانے کے باعث ۱۹۷۱ میں پاکستان کا اکثریتی صوبہ علیحدہ ہو گیا۔ البتہ "نئے" پاکستان میں پیپلز پارٹی کی مقبولیت پسندانہ سیاست نے اسٹیبلشمنٹ کو قانونی اور اخلاقی جواز کا وہ پردہ فراہم کرنے کی ذمے داری قبول کر لی جس کے پیچھے فوجی اور سول بیوروکریسی اور جاگیرداری نظام کا یہ اتحاد اپنے اختیارات کا استعمال پوری طرح جاری رکھ سکے۔ کسی مقبولیت پسند سیاسی قوت اور روایتی طور پر قدامت پسند (اور ملکی وسائل کے بڑے حصے پر قابض) اسٹیبلشمنٹ کے درمیان مفاہمت بہترین حالات میں بھی زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوتی۔ جولائی ۱۹۷۷ میں لگائے جانے والے مارشل لا کو، زیادہ سامنے کے عناصر سے قطع نظر، اس تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔

جنرل ضیا کے گیارہ سالہ دورِ حکومت میں پاکستان کی سیاست اسٹیبلشمنٹ اور مقبولیت پسند سیاسی قوت کے درمیان ایک متواتر کش مکش کے سوا کچھ نہیں تھی۔ مقبولیت پسند قوت حکومت کا تختہ الٹنے کے درپے تھی، جبکہ اسٹیبلشمنٹ اس قوت کو غیر اہم بنا کر اپنے آپ کو جائز حکومت ثابت کرنے کے لیے کوشاں تھی۔ دونوں فریق اپنا اصل مقصد حاصل کرنے میں ناکام رہے، اور اس کش مکش کے ہر قدم

پر دونوں کو اپنے اپنے اصل موقف میں تھوڑی بہت ترمیم کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۸ میں جونیجو حکومت کی برطرفی کے ساتھ یہ تعطل اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ ۱۹۷۷ کے بعد کی سیاست میں جنرل ضیا کے ذاتی کردار کے باعث اس تعطل کا کوئی حل نکالنا ناممکن تھا، چناں چہ اگست ۱۹۸۸ کے ہوائی حادثے نے یہ موقع فراہم کیا کہ ۱۹۷۱ کے بعد کے پاکستان کی ان دو بڑی قوتوں کے درمیان کسی طرح کا تصفیہ ہو سکے۔ اسٹیبلشمنٹ اور مقبولیت پسند سیاسی قوت کے درمیان اس مفاہمت کی تفصیلات کے بارے میں صرف قیاس آرائی کی جاسکتی ہے، لیکن اس مفاہمت کے نتیجے میں ان دونوں قوتوں کے درمیان تعطل کو تسلیم کر کے ملک کے سیاسی نظام کا حصہ بنایا گیا اور نومبر ۱۹۸۸ کے انتخابات کے ذریعے اسے قانونی حیثیت دے دی گئی۔ اس مفاہمت میں دونوں قوتوں کو اپنی طاقت اور کمزوری کے اسی تناسب سے حصہ دیا گیا ہے جس کے باعث یہ تعطل پیدا ہوا تھا۔ تاہم، ان دونوں قوتوں کے درمیان یہ رشتہ جامد نہیں ہے بلکہ دونوں ایک دوسرے کو کمزور کر کے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے مسلسل کوشاں ہیں۔ آنے والے برسوں میں پاکستان کی ملکی سیاست کے خدوخال متعین کرنے میں یہی کش مکش سب سے زیادہ اہم عنصر رہے گی۔

مارشل لا کے گیارہ سالہ دور میں ان دونوں قوتوں کو اپنا اپنا مقصد حاصل کرنے میں جو ناکامی ہوئی اس کے اسباب پر نظر ڈالنا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ گزشتہ چند عشروں کے دوران پاکستانی معاشرے میں آنے والی ان اہم تبدیلیوں کے باعث جن کا خاکہ اوپر پیش کیا گیا ہے، جاگیرداری نظام اسٹیبلشمنٹ کی موثر اعانت کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے۔ ملک کی شہری آبادی میں نمایاں اضافہ ہو گیا ہے اور اسی تناسب سے دیہی علاقوں کی قوت میں کمی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ زراعت کے پیداواری طریقوں میں ہونے والی تبدیلیوں کے باعث دیہی علاقوں میں بھی کاریگروں، چھوٹے تاجروں اور دلالوں پر مشتمل ایک درمیانہ طبقہ وجود میں آچکا ہے۔ ان معاشرتی تبدیلیوں کے باعث مجلسِ شوریٰ میں نامزد ہونے اور غیر جماعتی انتخابات میں منتخب ہونے والے جاگیردار اسٹیبلشمنٹ کو وہ موثر حمایت فراہم نہیں کر سکے جو روایتی طور پر ان کا خاصہ رہا ہے۔ مقبولیت پسند قوت کی ناکامی کی وجوہ اس سے زیادہ پیچیدہ ہیں۔ اس قوت کی قیادت ایسے افراد کے ہاتھوں میں تھی جن کے مادی اور طبقاتی مفادات اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ جلد از جلد کسی قابلِ عمل مفاہمت پر پہنچنے کا تقاضا کرتے تھے، اور اگر اسٹیبلشمنٹ کی بعض کلیدی شخصیات نے بھٹو کے مقدمے اور سزائے موت کے سلسلے میں ذاتی طور پر نمایاں کردار ادا نہ کیا ہوتا تو یہ مفاہمت، جو ۱۹۸۸ میں ہوئی، بہت پہلے ہو چکی ہوتی۔ دوسری وجہ مقبولیت پسند قوت میں اتحاد کی کمی تھی، اور اس عدم اتحاد کو ہوا دینے کے سلسلے میں اسٹیبلشمنٹ نے بہت کوششیں اور بہت رقم خرچ کی۔ یہ کوششیں اس حد تک تھیں کہ ہم نے اسلام آباد کی فوجی حکومت کو علاقائی قوم پرستوں تک کی حمایت کرتے ہوئے دیکھا۔ ان دونوں وجوہ نے کسی وسیع تر جمہوری اتحاد کے قیام کی راہ مسدود کر دی اور ایم آر ڈی اپنے ابتدائی چار نکاتی ایجنڈے سے آگے کبھی نہ جا سکی۔ چناں چہ ضیا حکومت کے خلاف

Scanned with CamScanner

تحریک صرف انتخابات کے مطالبے تک محدود رہی اور ملک کے معاشی مسائل کبھی اس ایجنڈے کا حصہ نہ بن سکے۔ اس پس منظر میں یہ تعجب کی بات نہیں کہ پاکستان میں گیارہ سالہ آمریت مخالف تحریک نے ہمیں ہیومن رائٹس کمیشن اور ویمن ایکشن فورم جیسی تنظیمیں تو ضرور دیں لیکن وہ مزدوروں، کسانوں اور چھوٹے تاجروں کو سیاسی طور پر منظم اور متحرک کرنے میں ناکام رہی۔ اور یہ بھی فطری بات تھی کہ جب ۱۹۸۸ میں مقبولیت پسند قوت اور اسٹیبلشمنٹ کے درمیان مفاہمت کا موقع آیا تو اس کے نکات انھیں مسائل تک محدود رہے جو بحالیِ جمہوریت کی تحریک کے ایجنڈے میں شامل رہے تھے، اور معاشی مسائل کو ترجیح حاصل نہ ہو سکی۔

اس مفاہمت کی ترجیحات سے قطع نظر، اس وقت پاکستان کو جن مسائل کا سامنا ہے وہ بنیادی طور پر معاشی نوعیت ہی کے مسائل ہیں۔ آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ ضروریات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے جبکہ وسائل تیزی سے کم ہو رہے ہیں۔ ہر سال قومی آمدنی میں سے کیے جانے والے ترقیاتی اخراجات کا تناسب کم ہو رہا ہے اور اسٹیبلشمنٹ پر کیے جانے والے غیر ترقیاتی اخراجات بڑھ رہے ہیں۔ ۱۹۷۷ میں محصولات کا ۲۹ فیصد حصہ ترقیاتی اخراجات کے لیے رکھا گیا تھا، جبکہ ۱۹۸۷ میں یہ شرح گھٹ کر صرف ۱۳ فیصد رہ گئی۔ اسٹیبلشمنٹ کی ان ترجیحات کے پیشِ نظر ملک میں آنے والی ہمہ گیر معاشرتی تبدیلیوں کو سیاسی نظام کا حصہ بنانا ناممکن ہے، اور اس صورت حال کا نتیجہ سماجی انار کی میں اضافے اور انتظامیہ کے رفتہ رفتہ غیر موثر ہوتے چلے جانے کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ یہی ترجیحات ہماری خارجہ پالیسی اور قرض دینے والے ممالک سے ہمارے تعلقات کی نوعیت کو بھی متعین کرتی ہیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے اسٹیبلشمنٹ سے مفاہمت کر کے خود کو پاکستانی عوام کی سیاسی رہنمائی کرنے اور ملک میں آنے والی معاشرتی اور اقتصادی تبدیلیوں کو اداروں کی شکل دینے کے عمل سے دست کش کر لیا ہے۔ شاید اس پارٹی کے پاس اس کے سوا کوئی راستا بھی نہیں تھا۔ پیپلز پارٹی کی قیادت، بشمول اراکینِ پارلیمنٹ، خود کو ان فوائد سے محروم کرنے کو ہر گز تیار نہیں جو اقتدار میں آنے سے حاصل ہوتے ہیں، خواہ یہ اقتدار جزوی ہی کیوں نہ ہو۔

***

سندھ کے شہروں کی صورتِ حال

کراچی اور حیدر آباد کی موجودہ صورت حال کا عمرانیات اور معاشیات کے ماہروں، سیاسی لیڈروں اور حکومتی کمیشنوں نے اپنے اپنے طور پر تجزیہ کیا ہے۔ ان تجزیوں کے نتائج مختلف ہیں۔ سب سے زیادہ

Scanned with CamScanner

عام تصور یہ ہے کہ کراچی کے تنازعے کا باعث شہری سہولتوں ـــــ مثلاً ٹرانسپورٹ، پانی، رہائشی زمین، مکانوں کے لیے قرضے، نکاسیِ آب، علاج اور تعلیم ـــــ کا فقدان ہے۔ اس تجزیے میں یہ محسوس کیا گیا ہے کہ اگر حکومت یہ سہولتیں فراہم کرسکے تو یہ تنازعہ اور لسانی یا نسلی نوعیت کے دیگر مسائل ختم ہو جائیں گے۔

ایک اَور خیال یہ ہے کہ کراچی اور حیدر آباد میں بے چینی اور بدامنی کا بڑا سبب بے روزگاری ہے جو شمالی صوبوں کے لوگوں کے نقلِ مکانی کر کے ان شہروں میں آنے سے پیدا ہوئی ہے۔ اس تنازعے کا باعث پنجابی غلبہ رکھنے والی انتظامیہ اور پولیس کو بھی ٹھہرایا جاتا ہے۔ سیاسی لیڈروں کا کہنا ہے کہ کراچی اور حیدر آباد کی شورش مارشل لا کے گیارہ برسوں کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ ایک گروہ یہ سمجھتا ہے کہ تصادم کی یہ فضا کچھ شرپسندوں کی پیدا کی ہوئی ہے اور کراچی اور حیدر آباد کی زیادہ تر آبادی "امن پسند شہریوں" اور "نیک مسلمانوں" پر مشتمل ہے۔ یہ گروہ ان شرپسندوں کو بیرونی ایجنٹ سمجھتا ہے۔

اگر حکومت کی جاری کی ہوئی سالانہ رپورٹ (Yearbook)، مردم شماری کی رپورٹوں، اعداد و شمار اور غیر جانبدار ماہرین کی ریسرچ پر اعتبار کیا جائے تو سندھ کے شہروں کی عمومی صورتِ حال بہتر ہوئی ہے۔ ۷۲-۱۹۷۱ کے مقابلے میں بے روزگاری کم ہے، ٹرانسپورٹ کی سہولتیں موجود ہیں اور لوگوں کو بس یا ٹیکسی رکشا کے لیے، دس سال پہلے کے برعکس، اب گھنٹوں انتظار نہیں کرنا پڑتا۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ کچی آبادیاں ـــــ جہاں کراچی کے ۴۰ فیصد سے زیادہ شہری رہتے ہیں ـــــ ریگولرائزیشن کا حق تسلیم کرا چکی ہیں۔ اسکول جانے والے بچوں کی تعداد ۱۹۷۰ کے عشرے کے مقابلے میں بڑھی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹروں، نرسوں اور اسپتالوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ مکانوں میں پانی، بجلی اور نکاسیِ آب کی سہولتیں بہتر ہوئی ہیں اور پختہ سڑکیں تعمیر ہوئی ہیں۔

اگرچہ کراچی اور حیدر آباد کے بہت سے علاقوں میں صورت حال آج کے مقابلے میں پہلے کہیں زیادہ خراب تھی مگر احتجاج کی کوئی لہر نہیں اٹھتی تھی۔ بجلی کی معطلی، ٹرانسپورٹ کی کمی، کچی آبادیوں کے ڈھائے جانے، پانی کی شدید قلت یا انتظامیہ کے پروردہ غنڈوں کے مظالم کے خلاف کوئی خاص ردِ عمل نہیں تھا۔ کراچی اور حیدر آباد میں احتجاج ملک گیر سیاسی تحریکوں کے دوران قومی سطح کے مسائل پر ہوا کرتا تھا۔ ان تحریکوں میں قومی سطح کے لیڈر (اکثر معاوضہ یافتہ کارکنوں کے ذریعے جو علاقے کے "داداگیر" کہلاتے تھے) عوام کو سڑکوں پر لے آتے تھے؛ اس ہجوم کا اتحاد تحریک کے ختم ہو جانے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا تھا۔ مگر آج ہجوم اپنے لیڈر خود پیدا کرنے لگا ہے اور لیڈرشپ تبدیل ہو جانے کے بعد بھی متحد رہتا ہے۔ عوامی احتجاج سے نمٹنے کے لیے حکومت کے روایتی طریقے، جو ۱۹۸۰ کے عشرے تک نہایت کارآمد تھے، موجودہ شورش کو غیر مؤثر بنانے میں قطعی ناکام ہو چکے ہیں۔ اس تبدیلی کے پسِ منظر کو بہت احتیاط کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

Scanned with CamScanner

کراچی میں ہونے والے شہری تشدد کی وجوہ دنیا کے بہت سے ترقی پذیر اور ترقی یافتہ شہروں میں پائے جانے والے تشدد کے اسباب سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں: شہروں کی آبادی میں تیز رفتار اضافہ، شہری باشندوں کی ایک نئی، نوجوان نسل، شہری انتظامیہ کی نااہلی اور بدعنوانی، اور اس کے نتیجے میں ایک بہت بڑی آبادی کی بنیادی شہری سہولتوں سے محرومی۔ شورش پیدا کرنے والے ان اسباب کو ایک دوسرے سے الگ رکھ کر نہیں سمجھا جاسکتا، کیوں کہ یہ تمام ایک دوسرے سے پیوست ہیں۔ مثلاً کراچی کے موجودہ تنازعات کو سمجھنے کے لیے ۱۹۴۰، ۱۹۵۰ اور ۱۹۶۰ کے عشروں میں نقل مکانی کر کے شہر میں آنے والی آبادیوں کی تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔ ۱۹۴۷ اور ۱۹۴۹ کے درمیانی عرصے میں اردو بولنے والے چھ لاکھ مہاجر تقسیم ہند کے نتیجے میں شہر میں آئے، جس کے باعث نہ صرف شہر کی زبان اور کلچر بدل کر رہ گیا بلکہ پہلے سے مقیم آبادی پیش منظر سے ہٹ گئی۔ ۱۹۵۰ کے عشرے کے آخر اور ۱۹۶۰ کے پورے عشرے میں سبز انقلاب کے نتیجے میں شہر میں آنے والوں کی ایک اور بڑی لہر پیدا ہوئی جو شہر کے مزدور طبقے میں شامل ہوئے۔ یہ لوگ پنجابی اور پشتو بولتے تھے اور ان کی سیاسی وفاداریاں سندھ کی مقامی آبادی کے بجائے اپنے آبائی صوبوں کے ساتھ تھیں۔ شہری زندگی کے دباؤ سے ان تمام آبادیوں کے باہم اختلاط کے مظاہر دنیا کے دوسرے بڑے شہروں کے مظاہر سے مشابہ ہیں۔ اس اختلاط سے مختلف قسم کے تناؤ پیدا ہوئے جن کی نوعیت طبقاتی اور معاشی ہونے کے علاوہ لسانی، نسلی اور ثقافتی بھی تھی۔ کراچی کی صورت حال کا ایک خاص عنصر یہ ہے کہ نقل مکانی کر کے شہر میں آنے والوں کی دوسری نسل اب جوان ہو چکی ہے۔ یہ نسل کراچی ہی کو اپنا شہر اور شہر کی سیاست اور انتظام میں شمولیت کو اپنا حق سمجھتی ہے۔ شہر کی انتظامی ایجنسیاں شہر میں آنے والوں کو بنیادی سہولتیں فراہم کرنے میں ناکام رہی ہیں۔[۱۱] کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ تخمینے کے مطابق شہر کی آبادی کا تقریباً نصف حصہ کچی آبادیوں میں رہتا ہے جو کسی سرکاری منصوبہ بندی کے بغیر غیر رسمی سیکٹر کے ہاتھوں وجود میں آئی ہیں۔ اس صدی کے آخر تک اس تناسب کے ۷۰ فیصد تک جا پہنچنے کی توقع ہے۔ ان کچی آبادیوں میں رہنے والے رہائشی زمین، پانی، نکاس کے نظام، تعلیم، روزگار اور علاج کی سہولتوں کے سلسلے میں شہری انتظامیہ کی توجہ اور اعانت سے محروم ہیں اور ان تمام شعبوں میں غیر رسمی سیکٹر پر انحصار کرتے ہیں جس کا دائرۂ اثر، اور نتیجتاً اس کی طاقت، شہری انتظامیہ کے مقابلے میں مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ شہری انتظامی ایجنسیاں نااہل ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت بدعنوان بھی ہیں اور غیر رسمی سیکٹر کے کارندوں کے ساتھ سرکاری اہلکاروں کے تعاون نے شہر میں جبری رشوت اور بھتے کی وصولی کا ایک سخت استحصالی نظام قائم کر رکھا ہے جس کی گرفت شہر کی غریب اور نچلی درمیانہ آمدنی کے باشندوں کے لیے روز بروز ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہے۔

1995 کے غیر سرکاری تخمینے کے مطابق سندھ کی شہری آبادی صوبے کی آبادی کا ۴۸.۰۵ فیصد حصہ ہے۔ سندھ کی آبادی کا تقریباً ۴۰.۶ فیصد حصہ کراچی اور حیدر آباد میں رہتا ہے۔ ملک کی کل دیہی (زرعی) پیداوار کے ۶۸ فیصد حصے کی کھپت شہری علاقوں میں ہوتی ہے، جبکہ صوبۂ سندھ کی کل دیہی پیداوار کا ۷۷ فیصد حصہ شہری آبادی استعمال کرتی ہے۔ بینکوں میں جمع کی جانے والی رقم کا ۸۷ فیصد حصہ شہری علاقوں سے، اور شہری علاقوں سے جمع کرائی جانے والی رقم کا ۷۰ فیصد صرف کراچی شہر سے آتا ہے۔

صوبہ سندھ کا ٹرانسپورٹ کا نظام پچھلے بیس سال میں انقلابی طور پر تبدیل ہو چکا ہے۔ بار برداری کے لیے اونٹ گاڑیوں، گدھا گاڑیوں اور بیل گاڑیوں کی جگہ سوزوکی اور ڈاٹسن پک اپ اور لوگوں کے سفر کرنے کے لیے بسوں نے لے لی ہے۔ ان میں سے بیشتر گاڑیاں صوبے کے شہری مراکز میں رہنے والوں کی ملکیت ہیں اور وہی ان کو چلانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ اسی طرح صوبے کی زرعی پیداوار کے لیے کیمیائی کھاد ایک لازمی جُز بن گئی ہے؛ اگرچہ یہ کھاد دیہی علاقوں میں تیار کی جاتی ہے، اس صنعت کی تکنیکی مہارت، انتظام اور فروخت وغیرہ کا انحصار شہری علاقوں پر ہے۔ زرعی پیداوار میں مشینوں کے استعمال نے بھی اس پیداواری عمل کا شہری علاقوں پر انحصار بڑھا دیا ہے۔

شہری اور درآمد کردہ مصنوعات ــــ مثلاً کپڑوں، جوتوں، چائے، سگریٹ، الیکٹرونکس کی مصنوعات وغیرہ ــــ کی دیہات میں فروخت کے ذریعے ہر سال ۴ ارب روپے شہروں میں آتے ہیں، اور دیہی زمینیں شہری صنعت کار خرید رہے ہیں۔

***

شہریوں کی نئی نسل

ان تمام حقائق سے، خصوصاً سندھ میں، جو تصویر اُبھرتی ہے، اس کی عکاسی حکومت کے ترقیاتی پروگراموں، ریاست کے انتظامی طریقوں، یا بڑی سیاسی جماعتوں کے رویئے، پروگرام اور تنظیمی ساخت سے نہیں ہوتی۔ پاکستان کے موجودہ سیاسی بحران کا یہ ایک بڑا سبب ہے۔ کراچی اور حیدر آباد میں پائی جانے والی شورش اور سندھ کے قصبوں میں جاگیردارانہ کلچر سے تصادم (لسانی مسئلے سے قطعِ نظر) ان معاشرتی اور اقتصادی تبدیلیوں کی علامت ہیں۔ اس اضطرابی تحریک کے ہراول دستے میں ۱۴ سے ۳۰ سال تک کی عمر کے لوگ شامل ہیں۔ اس نسل کے لوگ ماضی، اس کی لفظیات، روِیّوں اور سوچ سے اپنا تعلق توڑ کر تیزی سے جدید شہری تصورات اپناتے جا رہے ہیں۔

Scanned with CamScanner

کراچی کی تقریباً ۳۶ فیصد آبادی ۱۴ سے ۳۰ سال تک عمر کی اسی نسل پر مشتمل ہے۔ اس نسل کے ۸۰ فیصد لوگ کراچی ہی میں پیدا ہوئے ہیں، اور ان میں سے بیشتر کے والدین کی نوجوانی کا زمانہ کراچی میں گزرا ہے۔ اس عمر کے ۷۲ فیصد افراد خواندہ ہیں، جبکہ کراچی میں مجموعی طور پر خواندگی کی شرح ۵۵ فیصد اور پورے پاکستان میں تقریباً ۲۶ فیصد ہے۔ اس نسل میں لڑکیوں کی خواندگی کی شرح لڑکوں سے صرف ۶ فیصد کم ہے، جبکہ عورتوں اور مردوں میں خواندگی کی شرح کا فرق کراچی میں ۱۲ فیصد (لاہور میں ۱۵ فیصد) اور پورے ملک میں یہ فرق تقریباً ۱۹ فیصد ہے۔ کراچی کی اس خواندہ نئی نسل کے تقریباً ۲۸ فیصد افراد میٹرک پاس اور ۲۲ فیصد سے زیادہ گریجویٹ ہیں۔ اس نسل کا جاگیرداری نظام اور اس کی معیشت اور ثقافت سے کوئی تعلق نہیں ہے ___ ان لوگوں نے جاگیرداروں اور ان کے نظام کو صرف ٹیلی وژن پر یا فلموں میں دیکھا ہے۔

اس نئی نسل کی لفظیات بدل چکی ہیں۔ ۱۴ سے ۳۰ سال تک کے اس گروپ میں کوئی خود کو "تابعدار" یا "نیازمند" نہیں کہتا، ان میں سے کسی کے "مائی باپ" نہیں ہیں (لیاری کے علاقے میں بھی نہیں)، یہ لوگ "مصاحب" یا "مرید" نہیں ہیں۔ "سفارش"، جسے روایتی طور پر ایک معاشرتی اعزاز سمجھا جاتا ہے، ان کی لفظیات میں ایک گندا لفظ ہے۔ وہ اپنے لیڈروں کو "صاحب"، "حضور" یا "سائیں" نہیں بلکہ "بھائی" اور "چاچا" کہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں محبوب واضح طور پر صنفِ مخالف سے تعلق رکھتا ہے۔

دوسری طرف جن انتظامی ایجنسیوں، خصوصاً نفاذِ قانون کی ایجنسیوں، سے اس نسل کے افراد کا ہر قدم پر سابقہ پڑتا ہے، اُن کے اہلکار "تابعدار" اور "نیازمند" ہیں، اُن کے "مائی باپ" بھی ہیں اور وہ "سفارش" کو اعزاز سمجھتے ہیں۔ اس طرح جنگ کی صف بندی قطعی طور پر واضح ہو گئی ہے۔

ماضی میں سرکاری انتظامیہ امن و امان قائم رکھنے کے لیے محلّے کے موذنوں اور عزت داروں کو بلا کر ان سے امن کے برقرار رہنے کی ضمانت حاصل کر لیا کرتی تھی۔ لسانی اور نسلی طور پر ہم آہنگ علاقوں میں (مثلاً کراچی کی ابتدائی کچی آبادیوں میں) پنچایت یا برادری کے بزرگ، اور نئی مخلوط آبادیوں میں زمین پر قبضہ کر کے ان آبادیوں کے باشندوں کو پلاٹ فراہم کرنے والے لوگ اس سلسلے میں موثر ثابت ہوتے تھے۔ کراچی کے مشرقی علاقے کی غریب بستیوں میں ۸۷-۱۹۸۶ کی کشیدگی سے یہ بات عیاں ہو گئی کہ روایتی موذنوں اور عزت داروں کا علاقے کے نوجوانوں پر کنٹرول باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اُن کی بزرگی اور مقام کو اسی طرح حقارت سے دیکھا جاتا ہے جیسے زمینوں کے قبضہ گیر اور ڈویلپر استحصالی اور سرکاری انتظامیہ کے دلّال سمجھے جاتے ہیں۔ جہاں تک پنچایتوں اور برادریوں کا تعلق ہے، وہ کراچی کے مقامی لوگوں کے لیے بہت عرصہ ہوا ختم ہو چکی ہیں۔ البتہ شمالی علاقوں سے آنے والوں میں قبائلی نظم و ضبط، برادری کے بزرگ اور جرگہ جیسے ادارے اب تک موجود ہیں۔

کراچی میں ۱۴ سے ۳۰ برس تک کے نوجوانوں کی اکثریت صنعتی مزدوروں یا یومیہ اُجرت حاصل کرنے والوں پر نہیں بلکہ سفید کالر ورکروں اور ہنرمند کاریگروں پر مشتمل ہے جن کا تعلق

ٹرانسپورٹ انڈسٹری یا سروس سیکٹر سے ہے۔ اس نسل کے افراد کی ایک بڑی تعداد کا اپنا ذاتی روزگار ہے، جن میں دکان دار، چھوٹی مصنوعات بنانے والے اور کنٹریکٹر شامل ہیں۔ وہ بستیاں جہاں یہ لوگ رہتے ہیں، ۱۹۶۰ کے عشرے کی ابتدائی کچی آبادیوں اور رہائشی محلوں کی طرح طبقاتی طور پر ہم آہنگ نہیں ہیں۔ ڈاکٹر، بینک ملازم، یومیہ اُجرت پر کام کرنے والے، مزدور اور صنعتی کاریگر سب ایک ہی گلی میں رہتے ہیں، کیوں کہ مکان بنانے کے لیے باقاعدہ پلاٹ کی قیمت نچلی درمیانہ آمدنی کے ان خاندانوں کی استطاعت سے باہر ہے۔

مختلف طبقوں اور پیشوں کے ایک دوسرے پر اثرانداز ہونے کی بدولت ان محلوں میں ہر قسم کی بے شمار تنظیمیں قائم ہوئی ہیں۔ ان میں سماجی بہبود کی تنظیمیں، لائبریریاں، اسپورٹس اور ہیلتھ کلب، ڈرامیٹک سوسائٹیاں، نعت خواں گروپ، تعلیمی ادارے، تاجروں اور کاریگروں کی تنظیمیں اور ۱۹۸۰ کے عشرے کے نصف آخر کی منشیات مخالف تنظیمیں شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر تنظیموں کا انتظام نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے۔

شہر کے نچلی درمیانہ آمدنی والے علاقوں میں سیاسی طنزیہ ڈرامے اور ورائٹی پروگرام ہوتے ہیں؛ یہ ڈرامے وغیرہ اپنے مواد، پیشکش اور مکالموں میں کراچی کی متموّل سوسائٹیوں کے سنجیدہ اور فکرافروز ڈراموں سے مختلف ہیں۔ پاپ سنگر لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد ان تنظیموں سے نکلی ہے؛ اسی طرح کامیڈین اور اداکار بھی ان تنظیموں سے آئے ہیں۔ کچی آبادیوں میں اسپورٹس کلب ہیں جنھوں نے اپنے قلیل وسائل کے باوجود قومی سطح کے کھلاڑیوں کی کوچ کی حیثیت سے خدمات حاصل کیں اور بعض دفعہ قومی کھلاڑیوں پر مشتمل فٹ بال اور ہاکی ٹیموں کو شکست دی۔ اس گروپ میں موسیقار، قوال، شاعر اور پیشہ ور مقرر بھی شامل ہیں۔

ان تنظیموں سے نکلنے والے کھلاڑیوں اور آرٹسٹوں کو حکومت کی سرپرستی حاصل نہیں ہے، چناں چہ ان کی سرکاری میڈیا تک رسائی یا کھیلوں کی قومی ٹیموں میں شمولیت تقریباً ناممکن ہے۔ ان تنظیموں کی تعلیمی سوسائٹیوں کو، خواہ وہ متعدد اسکولوں کو چلا رہی ہوں، حکومت کی طرف سے کوئی اعانت نہیں ملتی۔ اس کے اسباب بتاتے ہوئے کراچی میں رہنے والے ایک ٹیچر حامد حسین نے کہا: "ہم نچلی درمیانہ آمدنی والے طبقے کے لوگ ہیں۔ ہمارا جاگیرداروں یا سرمایہ داروں سے، یا کلفٹن، سوسائٹی یا ڈیفنس میں رہنے والے ان کے خدمت گاروں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پاکستان پر حکمرانی یہی لوگ کرتے ہیں۔ اگر ہم ان کے منظورِ نظر ہوتے تو ہماری بھی سرپرستی کی جاتی۔ صرف ہمارے درمیان سے اٹھنے والی قیادت ہی ہمیں ہمارے حقوق دلوا سکتی ہے۔"

آرٹسٹوں، کھلاڑیوں اور مدرسوں کے علاوہ وہ طالب علم بھی دل شکستہ ہیں جو امتحانوں میں عمدہ نتائج حاصل کرنے کے باوجود پیشہ ورانہ کالجوں میں داخلے حاصل نہیں کر سکتے، اور اسی طرح وہ گریجویٹ بھی جو کوٹا سسٹم کے باعث بے روزگار ہیں۔ "ہمیں علم ہے کہ کوٹا سسٹم کچھ عرصے کے لیے ہمارے

Scanned with CamScanner

سندھی بھائیوں کو درکار ہے، "ایک بے روزگار انجنیئر کمال زیدی کہتا ہے، "لیکن اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ داخلہ یا ملازمت جاگیردار کے لڑکے کو دینی ہے اور ہاری کے لڑکے کو نہیں، تو ہماری قربانی بے کار گئی۔" وہ یہ بھی کہتا ہے کہ "ہمارے لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ سرکاری ادارے، خاص طور پر پولیس، باصلاحیت اور ایمان دار ہوں۔ ہم نہ امیروں کی طرح انھیں رشوت دے سکتے ہیں نہ اپنے تعلقات کے ذریعے ان پر دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ اگر ہماری نمائندگی ہم جیسے لوگوں نے نہیں کی تو حالات کبھی تبدیل نہیں ہوں گے۔ دیہی علاقوں کے لوگ اپنی دیہی اقدار کے ساتھ شہری معاشرے کا نظم و نسق چلانے کے اہل نہیں ہیں۔ تجربے نے ہمیں یہی سکھایا ہے۔"

کراچی کے فعال لوگوں میں ایسے نوجوانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو محلّہ تنظیموں سے منسلک رہے ہیں۔ انھوں نے کسی نہ کسی شکل میں اپنے علاقے اور اپنے معاشرے کی ترقی کے لیے جدوجہد کی ہے۔ انھوں نے پولیس کو منشیات مخالف تنظیموں کو کچل کر ختم کرتے دیکھا ہے۔ انھوں نے سرکاری اداروں کی بد عنوانی، نااہلی اور ظلم کا سامنا کیا ہے اور اس کے پیچھے اصل طاقتوں کو پہچانا ہے۔ یہاں تک کہ کراچی کی روایتی تاجر سوسائٹیوں کے نوجوانوں نے بھی اپنے قدامت پرست والدین کے خلاف بغاوت کی ہے اور ہجوم کا حصّہ بن گئے ہیں۔ مقامی انتظامیہ کے ساتھ ان کی جنگ نہ صرف طاقت کے حصول کی بلکہ اقدار کی جنگ بھی ہے۔

لیاقت آباد کے ایک نوجوان کی نظم اس صورتِ حال کو بہت اچھی طرح پیش کرتی ہے:

وردی والے دیہاتی درندے نے ہم کو روکا
اور پوچھا کہ کون ہے موٹر سائیکل پر
پیچھے بیٹھی ہوئی
میرا خون کھولا
جی چاہا کہ اپنا خنجر اس کے پیٹ میں ڈبو کر
اس کی آنتوں کا ہار اس کی گردن میں ٹانگوں
پر تیرے ہاتھ کے اشارے نے مجھ کو روکا
اور میں نے کہا "میری بہن ہے"
ذلّت کے آنسو بہاتا میں گھر کو لوٹا

کرفیو، پولیس کے بہیمانہ رویّے، بلاجواز گرفتاریوں اور تشدد نے نوجوانوں اور انتظامیہ کے درمیان تصادم کو بڑھا دیا ہے۔ تاہم ناظم آباد کی ایک نوعمر شاعرہ کرفیو لگنے کا خیر مقدم کرتی ہے۔ اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر وہ کہتی ہے:

Scanned with CamScanner

میں تمہاری ماں سے باتیں کر رہی تھی
اور تم گلی میں میرا انتظار
کرفیو لگا
تمہارے گھر رکنے کا بہانہ مل گیا

کراچی کی یہ مضطرب نئی نسل ملک بھر میں آج تک سڑکوں پر آنے والے ہجوموں میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور باشعور ہے۔ یہ ہجوم اپنے لیڈر، نظریہ ساز اور حکمتِ عملی کے ماہر خود پیدا کر رہا ہے۔ ۱۹۸۰ کے عشرے کے آخری برسوں میں شہر کے مختلف علاقوں میں اُبھرنے والی امن کمیٹیوں اور محلہ کمیٹیوں کے رہنماؤں کے بیانات سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ہجوم اپنے مسائل کو قومی اور طبقاتی مسائل کے تناظر میں دیکھنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔

اس ہجوم کا سب سے متشدد حصہ ایم کیو ایم کی لیڈرشپ کی حمایت کرتا ہے۔ ایم کیو ایم کے وجود میں آنے سے جہاں ایک طرف کراچی، حیدرآباد اور صوبے کے چھوٹے شہروں کے مہاجر نوجوانوں کو تشخص کا احساس ملا ہے، وہیں دوسری طرف اس سے شہروں کی آبادی لسانی گروہوں میں تقسیم بھی ہو گئی ہے۔ ایم کیو ایم کے حامیوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ تقسیم پہلے سے موجود تھی کیوں کہ شمال سے نقل مکانی کر کے آنے والوں کا ریاستی انتظامیہ سے رشتہ مقامی آبادی کے رشتے سے مختلف ہے۔ شہری آبادی میں مزید تقسیم ایم کیو ایم کی "مہاجر" کی تعریف سے پیدا ہوئی۔ ایم کیو ایم نے مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آنے والوں کو ــــ جن کی بڑی تعداد اردو بولتی ہے اور معاشرتی اور ثقافتی طور پر دوسرے مہاجروں سے مختلف نہیں ــــ علیحدہ کر دیا۔ ایم کیو ایم کی تعریف کے مطابق مہاجر وہ لوگ ہیں جو ہندوستان کے non-agreed علاقوں سے آئے ہیں۔ اس تعریف کے باعث شہری تحریکیں کمزور پڑ گئی ہیں کیوں کہ مشرقی پنجاب سے آنے والوں کی ایک بڑی تعداد سندھ میں موجود ہے۔

دیہی سندھ کی سیاست پر سندھی قوم پرستی کا غلبہ ہے اور اس بات سے قطع نظر کہ سندھی بولنے والا نوجوان کس پارٹی سے تعلق رکھتا ہے، مکمل صوبائی خودمختاری اور اپنی ثقافت، تاریخ اور زبان سے اس کی وابستگی مقدم ہے۔ بھٹو حکومت کی پالیسیوں کے نتیجے میں ایک خاصا بڑا سندھی بولنے والا درمیانہ طبقہ اُبھرا جس کا سندھ کے چھوٹے شہروں میں مہاجر اور پنجابی مفادات سے تصادم ہوا۔ ۱۹۸۳ میں بحالیِ جمہوریت کی تحریک کی ناکامی کے بعد اس درمیانہ طبقے کو احساس ہوا کہ شہر کے مہاجر باشندوں کی شمولیت کے بغیر کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔

تاہم، پنجاب سے آنے والے تیس لاکھ کے لگ بھگ آبادکار بھی سندھ میں رہ رہے ہیں۔ وہ صرف "آبادکار" نہیں بلکہ کنٹریکٹر، تاجر اور ہنرمند کاریگر ہیں اور زرعی پیداوار کی ضروریات پوری کرنے والی مصنوعات بھی فراہم کرتے ہیں۔ سندھ کے کئی ضلعوں میں دیہی معیشت کا ان پر بہت زیادہ انحصار

Scanned with CamScanner

ہے۔ ایم کیو ایم کی "مہاجر" کی تعریف انھیں ایم کیو ایم سے باہر رکھتی ہے، اور یوں "آدھا تمھارا آدھا ہمارا" کا نعرہ لگانا ممکن ہو جاتا ہے۔ اسی باعث "مہاجر" کی کوئی ایسی تعریف جس میں سندھ کے مشرقی پنجابی بھی شامل ہوں، سندھی قوم پرستوں کو بھی قبول نہیں ہے۔

***

سندھ میں ہونے والا تاریخی عمل انوکھا نہیں ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں دنیا کے بیشتر بڑے شہر آبادی میں کثیر اضافے کے بعد اس دور سے گزرے ہیں۔ پرانا شہری نظام، جو اپنی اصل میں جاگیردارانہ تھا، اپنے فرسودہ اور بوسیدہ اداروں کی وجہ سے نئے شہری مسائل اور رویّوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تھا۔ جن ریاستوں میں حکومتوں نے ان تبدیلیوں کو سمجھا اور ان کی طرف مثبت توجہ دی وہاں پرانے ریاستی نظام میں وقت کے تقاضے کے مطابق ترامیم کی گئیں اور وہ جاری رہ سکا۔ جہاں ان تبدیلیوں کو نظرانداز کرنے یا دبانے کی کوشش کی گئی وہاں نہ صرف شہروں سے پرانا نظام اکھاڑ پھینکا گیا بلکہ پورے ملک کی سیاست مکمل طور پر تبدیل ہو گئی۔

سندھ کی شہری تحریک اس وقت لسانی اور نسلی تصادم کا شکار ہے، پھر بھی کراچی کے شورش زدہ علاقوں میں اس کا حل تلاش کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ان میں سے ایک تجویز، جس کی بہت پذیرائی ہوئی ہے، یہ ہے کہ کراچی میں ۱۰۰ کی جگہ ۳۰۰ منتخب کاؤنسلر ہونے چاہییں؛ شہر کی حکومت میونسپل کاؤنسل کے پاس ہونی چاہیے اور شہر کے تمام ترقیاتی اور انتظامی اداروں اور پولیس کو اس کے ماتحت ہونا چاہیے۔

"اگر ہمارے محلّے کے منتخب لوگوں کے پاس اقتدار ہو تو ہم انھیں اپنی فلاح و بہبود کے کام کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں،" نذیر احمد کہتا ہے۔ وہ ایک موٹر مکینک ہے اور محمود آباد میں رہتا ہے۔ "ہم تمام بدعنوانیوں اور نااہلیوں کو اکھاڑ کر پھینک سکتے ہیں۔ کسی پنجابی تھانےدار کی جگہ مہاجر تھانےدار کو لگا دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ تھانےدار ہمیں، اور اُس کا ایس پی ہمارے نمائندوں کو، جواب دہ ہو۔"

جو لوگ یہ حل پیش کر رہے ہیں اُنھیں یہ اندازہ نہیں ہے کہ اتنی بڑی بنیادی تبدیلی حکومت کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو گی، کیوں کہ اس طرح محلّوں کو بےپناہ طاقت حاصل ہو گی اور بیوروکریسی کو ان کے ماتحت آنا پڑے گا۔ مزید یہ کہ یہ عمل صرف کراچی تک محدود نہیں رہے گا۔

کراچی اور حیدرآباد کی شہری تحریک کو اس کے مخالفین نے کامیابی کے ساتھ لسانی بنیادوں پر تقسیم کر کے فی الوقت غیر موثر کر دیا ہے۔ لیکن جب اسی طرح کی تحریک مستقبل قریب میں پنجاب کے شہری مراکز میں شروع ہو گی (جیسا کہ آبادیاتی اعداد و شمار واضح طور پر پیش گوئی کرتے ہیں) تو اُسے

Scanned with CamScanner

غیر موثر کرنا دشوار ہوگا۔

***

شہری انتظام میں مافیاؤں کا دخل

کراچی میں رہائشی علاقے قائم کرنے کے لیے زمین کی ڈویلپمنٹ ـــــ زمین کی نقشہ بندی، اس کی پلاٹوں میں تقسیم، پانی اور نکاسی کی سہولتوں کے لیے بنیادی تعمیرات، پلاٹوں کی فروخت وغیرہ کا کام ـــــ ادارۂ ترقیات کراچی (KDA) کے پاس ہے۔ کے ڈی کی ڈویلپ کی ہوئی زمین، اس کے حد سے بڑھے ہوئے اخراجات کے باعث، ہمیشہ مقدار میں نچلی درمیانہ آمدنی والے طبقے کی ضرورت سے کم اور قیمت میں اس طبقے کی قوتِ خرید سے باہر رہی ہے۔ نتیجتاً کے ڈی اے کے فروخت کیے ہوئے پلاٹ درمیانہ طبقے کے قبضے میں چلے جاتے ہیں اور سرمایہ کاری اور سٹے (speculation) کی نذر ہو جاتے ہیں، جب کہ نچلے درمیانہ طبقے کے لوگوں کو کچی بستیوں میں، ملکیت کے تحفظ کے بغیر، رہنا پڑتا ہے۔

موقع شناس سرکاری افسروں نے اس صورت حال کو جلد از جلد امیر بن جانے کے لیے استعمال کیا۔ انھوں نے سرکاری زمینوں پر قبضہ کر کے ان کے چھوٹے چھوٹے پلاٹ کم آمدنی والے افراد کے ہاتھ فروخت کرنے والے قبضہ گیروں اور دلالوں کی ہمت افزائی اور پشت پناہی کی۔ یہ دلال افسروں کو زمین کی فروخت میں ان کا حصہ دینے کے علاوہ اس قسم کی نئی بستیوں میں عمدہ موقعے کے پلاٹ بھی ان کے لیے مخصوص رکھتے، اور بستیوں کے آباد ہو جانے اور قیمت بڑھ جانے کے بعد یہ افسر ان پلاٹوں کو فروخت کر کے بہت دولت کماتے۔

پلاٹ خریدنے والے کم آمدنی والے لوگوں کے ان پلاٹوں پر منتقل ہونے کے بعد بھی ان کی ضروریات دلالوں کے ذریعے پوری ہوتیں۔ دلال نئی آبادی کے لیے پانی کے ٹینکر جاری کرانے، ٹرانسپورٹ شروع کرانے اور بے دخلی سے محفوظ رکھنے کے لیے حکام سے معاملت کرتا۔ ان خدمات کے عوض وہ آبادی کے باشندوں سے بھتا وصول کرتا جس کا بڑا حصہ سرکاری افسروں اور پولیس کو دیا جاتا۔ اس طرح دلالوں نے سہولتوں اور تحفظ کی طلبگار کچی آبادیوں اور حکومت کے درمیان رابطہ بن کر سیاسی طاقت حاصل کر لی۔ ۱۹۶۰ اور ۱۹۷۰ کے عشروں میں بننے والی آبادیاں ان دلالوں کے ہاتھوں میں رہیں؛ ان کی ڈویلپمنٹ اُنھیں کے ہاتھوں ہوئی اور بیشتر دلال ان علاقوں سے کاؤنسلر منتخب ہوئے۔

۱۹۷۰ کے عشرے میں مرکز اور سندھ میں پیپلز پارٹی اقتدار میں آئی۔ شہر کی بیوروکریسی کے بجائے دلالوں کی پشت پناہی کا کام بڑی حد تک پارٹی کے مقامی رہنماؤں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بہت سے قبضہ گیر اور دلال خود برسرِ اقتدار پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ایسی بھی مثالیں موجود ہیں کہ نئی غیر قانونی

Scanned with CamScanner

کچی آبادیوں کو ڈویلپ کرنے کے لیے سرکاری وسائل ـــــ گاڑیاں، بُل ڈوزر اور آلات ـــــ استعمال کیے گئے۔

زمین حاصل کرنے کے بعد کم آمدنی والے طبقے کا دوسرا اہم مسئلہ مکان بنانے کے رقم کا انتظام کرنے کا ہوتا تھا۔ زمین کا قانونی قبضہ نہ رکھنے کے باعث انھیں کسی سرکاری ادارے سے قرض کی سہولت نہ مل سکتی تھی۔ یہاں بھی غیر رسمی سیکٹر ان کی مدد کرتا۔ ٹھلے والے ـــــ سیمنٹ کے بلاک وغیرہ بنانے والے ـــــ انھیں قرض پر تعمیراتی سامان فراہم کرتے۔ اس قرض کی وصولی کی ضمانت کے لیے سماجی دباؤ کو استعمال کیا جاتا۔ مکان بنانے یا کاروبار کرنے کے لیے نقد رقم سود خوروں سے قرض لی جاتی؛ ان قرضوں پر سود کی شرح ۲۰ سے ۳۰ فیصد ماہانہ ہوتی۔ سود خور اپنے مقروضوں کو کرائے کے غنڈوں کے ذریعے قابو میں رکھتے۔

کچی آبادیوں کے اس ڈرامے کے کردار ـــــ قبضہ گیر، دلّال، پولیس والے، سرکاری افسر، ٹھلے والے، سود خور اور غنڈے ـــــ مختلف لسانی گروہوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس "لینڈ مافیا" میں اکثریت مہاجروں اور پنجابیوں کی تھی۔

کراچی میں نجی ملکیت کی پبلک ٹرانسپورٹ میں ایوب حکومت کے دور میں اضافہ ہوا۔ کراچی میں آنے والے پٹھان ایوب خاں کے اہم سیاسی حمایتی تھے اس لیے بسوں کے بیشتر روٹ پرمٹ اُنھیں دیے گئے، گو مہاجروں اور پنجابیوں کو بھی روٹ پرمٹ ملے۔ اُس زمانے میں ڈرائیوروں اور کلینروں کی بڑی تعداد بھی انھیں دونوں لسانی گروہوں سے آتی تھی، مگر وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد کم ہوتی چلی گئی اور پٹھانوں نے ان کی جگہ لے لی۔ بسوں کے مالکان اس کی جو وجہیں بتاتے ہیں ان میں پٹھانوں کی کم اُجرت پر زیادہ دیر تک کام کرنے پر آمادگی، ٹریڈ یونینوں اور سوداکاری کی ایسوسی ایشنوں سے عدم دل چسپی، مالی معاملات میں دیانت داری اور مالک سے وفاداری شامل ہیں۔ بسوں کے ڈرائیور اور کلینر مالکان کے تنخواہ دار ملازم ہوتے تھے اور بسوں کی مرمت وغیرہ کی ذمے داری مالکان پر ہوتی تھی۔

منی بسیں کراچی میں بھٹو دور کے ابتدائی برسوں میں متعارف ہوئیں۔ ان کے روٹ پرمٹ سیاسی رشوت کے طور پر بالخصوص غیر پٹھان افراد کو دیے گئے؛ تاہم ان میں سے بیشتر نے یہ پرمٹ پٹھانوں کے ہاتھ بیچ دیے۔ منی بسیں بھی ابتدا میں تنخواہ دار ڈرائیوروں سے چلوائی جاتی تھیں۔ بعد میں رفتہ رفتہ یہ نظام قائم ہوا کہ روٹ پرمٹ رکھنے والا شخص ڈرائیور کو منی بس خریدنے کے لیے قرض دے دیتا اور سود کی بہت اونچی شرح پر ماہانہ قسطوں میں یہ قرض وصول کرتا۔ پرمٹ کے مالک کے لیے اس نظام کا فائدہ یہ تھا کہ اسے مالی معاملات پر ڈرائیور اور کلینر سے بحث نہ کرنی پڑتی اور وہ دھوکا کھانے کے خطرے سے محفوظ رہتا۔ اس کے علاوہ سود کی بدولت اس کی آمدنی بھی بہت بڑھ گئی۔ تنخواہ دار ڈرائیوروں کی جگہ سودی قرضے سے منی بس حاصل کر کے چلانے والے ڈرائیوروں نے لے لی ـــــ اس طرح کراچی کا "منی بس مافیا" وجود میں آیا۔ اس مافیا کے سرکردہ لوگ، قرض فراہم کرنے والے، ڈرائیور اور کلینر پٹھان تھے۔

Scanned with CamScanner

تاہم، ابتدا میں اس مافیا کی طاقت محدود تھی، کیوں کہ پبلک ٹرانسپورٹ اور پرائیویٹ بس کمپنیاں شہر کی ضروریات کے خاصے بڑے حصے کو پورا کرتی تھیں۔ اس کے باوجود، اگرچہ مزید منی بسوں کی گنجائش موجود تھی، لیکن ٹرانسپورٹروں کی جانب سے اتنی بڑی مقدار میں قرض دستیاب نہ تھا۔ تخمینے کے مطابق ۱۹۷۳ سے ۱۹۷۹ تک کے سات سال میں سود خور ٹرانسپورٹروں نے صرف ۶۰۰ منی بسوں کے لیے قرضے دیے، اور ان قرضوں کی مجموعی رقم صرف نو کروڑ روپے تھی۔

چوں کہ اُس وقت تک منی بس والے شہر کا پہیا جام کرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے اور مالی دشواری کی وجہ سے منی بسوں کی تعداد بڑھانے سے قاصر تھے، اس لیے انتظامیہ کے لیے کسی خطرے کا باعث نہ تھے؛ اور ریاستی اداروں سے اُن کا رشتہ ان کی اسی حیثیت کے مطابق متعین ہوتا تھا۔ چناں چہ اُس وقت اندھادھند تیز رفتاری اتنی عام نہ تھی جتنی اب ہے؛ حادثات بھی کم ہوتے تھے کیوں کہ غالباً ڈرائیونگ لائسنس اتنی آسانی سے خریدے نہیں جاسکتے تھے جیسے آج خریدے جاسکتے ہیں؛ ٹریفک قوانین کی پابندی آج کل کے مقابلے میں بہتر تھی اور مسافروں سے بدسلوکی نہیں کی جاتی تھی۔

۱۹۷۰ کے عشرے کے آخری اور ۱۹۸۰ کے عشرے کے ابتدائی برسوں میں کراچی کی معیشت میں ہیروئن کا پیسہ داخل ہوگیا اور اس نے ان تمام حالات کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اس دولت کے بل پر زمینوں کی قبضہ گیری، غیر قانونی ڈویلپمنٹ اور فروخت ایک نئے انداز میں شروع ہوئی؛ غیر سرکاری بینکاری (سودخوروں کے قرضوں) کا نیا نظام وجود میں آیا، اور ٹرانسپورٹ مافیا نے شہر کی سڑکوں پر کنٹرول حاصل کر لیا۔

اب کراچی میں بننے والی کچی آبادیاں پرانی کچی آبادیوں سے مختلف ہیں۔ زمینوں پر سرکاری افسروں کی شراکت کے بغیر قبضہ کیا جانے لگا ہے اور افسروں کے لیے عمدہ پلاٹ محفوظ رکھنے کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اب افسران کو اس سرگرمی میں رخنہ نہ ڈالنے کے لیے مقررہ رقم پیشگی ادا کردی جاتی ہے۔ اس طرح انتظامیہ کے اہلکار اب زمین کی غیر قانونی آبادکاری میں غالب حصے دار نہیں رہے بلکہ ان دلّالوں کے ملازم بن چکے ہیں جن کو انھیں کی پشت پناہی سے معاشی اور سیاسی طاقت حاصل ہوئی تھی۔ آج کل قبضہ شدہ زمین پر پلاٹوں کی فروخت شروع ہونے سے پہلے آنے والی آبادی کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک مسلح گروہ زمین کے سرحدی پلاٹوں پر قبضہ کرلیتا ہے۔ چند علاقوں میں قبضہ گیر پلاٹوں کو فروخت کرنے کے بجائے کرائے پر دینے لگے ہیں۔ ان نئی آبادیوں میں مکان بنانے کے لیے قرض نسبتاً کم شرحِ سود پر مل جاتا ہے۔ نادہندگان کی جائیداد یا دکان مسلح غنڈے چھین لیتے ہیں یا انھیں قرض ادا نہ کرپانے کی صورت میں بیگار کرنی پڑتی ہے۔ پرانی آبادیوں پر بھی کنٹرول کے لیے جنگ ہو رہی ہے۔ ان آبادیوں کی بیرونی سرحدوں پر واقع مکان آبادی سے باہر کے لوگ خرید رہے ہیں۔ مکان کے مالک کو جائیداد کی دگنی چوگنی قیمت پیش کی جاتی ہے، اور اگر وہ اس پر بھی مکان بیچنے پر

Scanned with CamScanner

آمادہ نہ ہو تو طاقت کا استعمال ہوتا ہے۔ اورنگی میں بنارس چوک اور میٹرو سنیما کے درمیانی علاقے اور علی گڑھ کالونی کے وسط میں ایک اہم محلّے کو باہر کے لوگوں نے خرید لیا۔ ان کچی آبادیوں کے رہنے والے، جو باقاعدہ قرار دی جانے والی تھیں، یہ سمجھتے ہیں کہ یہ باہر کے لوگ اور دلّال انتظامیہ کے ساتھ مل کر ریگولرائزیشن کے عمل کو معطّل کرانے کے ذمے دار ہیں تاکہ ان آبادیوں کے باشندے قانونی تحفظ سے محروم رہیں۔

تخمینہ لگایا گیا ہے کہ کراچی میں سالانہ ۱۶ ہزار ۸ سو پلاٹ غیر قانونی طور پر قبضہ کرکے ڈویلپ کیے جاتے ہیں۔ اگر انتظامیہ کو رشوت دینے، غنڈوں کو بسانے اور مکان کی تعمیر کے لیے قرض فراہم کرنے کے اخراجات ایک ہزار روپے فی پلاٹ بھی رکھے جائیں تو مجموعی رقم ۱۶ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے بنتی ہے۔

ٹرانسپورٹ مافیا اور حکومت کے درمیان بھی رشتہ تبدیل ہوا ہے۔ کراچی کی سڑکوں پر ۱۹۷۸ سے لے کر ۱۹۸۷ تک نو سال کی مدّت میں پانچ ہزار منی بسوں کا اضافہ ہوا۔ صرف ۱۹۷۹ میں گنتی کے چند ٹرانسپورٹروں نے منی بسیں چلانے والوں کو ڈیڑھ ارب روپے قرض دیے تھے۔ ان منی بسوں کی قانونی ملکیت قرض ادا ہوجانے تک ٹرانسپورٹر کے نام رہتی ہے۔ حادثے وغیرہ کی صورت میں گاڑی کی مرمّت کے اخراجات ڈرائیور خود برداشت کرتا ہے۔ اگر وہ گرفتار ہوجائے تو ٹرانسپورٹر اپنا اثر و رسوخ استعمال کرکے اُسے چھڑاتا ہے اور اس کا معاوضہ نقد یا کسی اَور صورت میں وصول کرتا ہے۔ بعض صورتوں میں ان منی بسوں کو چلانے کے لیے بیگار کے مزدور (bonded labourers) بھی شہر میں لائے گئے ہیں۔

لینڈ مافیا اور اس کے شریکوں کے موجودہ طریقِ عمل اور ٹرانسپورٹ میں اچانک اور بے تحاشا اضافے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ان دونوں سرگرمیوں میں کثیر سرمایہ لگایا گیا ہے۔ یہ سرمایہ منشیات کے کاروبار سے حاصل ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ دونوں سرگرمیاں پٹھانوں کے ہاتھ میں ہیں بلکہ، ماضی کے برعکس، زمین کی قبضہ گیری کے ڈرامے کے کردار بھی اب بیشتر صوبہ سرحد سے آتے ہیں۔

ہر ڈرگ مافیا کا پہلا مقصد سیاسی طور پر طاقت حاصل کرنا ہوتا ہے تاکہ حکومت اس کے خلاف قدم نہ اٹھا سکے۔ سیاسی طاقت حاصل کرنے کا سب سے موثر طریقہ کم آمدنی والے علاقوں پر ــــ جہاں شہری انتظامیہ کی گرفت سب سے کمزور ہوتی ہے ــــ قبضہ کرنا ہے۔ اسلحے کی اسمگلنگ اور فروخت کے ذریعے عدمِ استحکام پیدا کرنا بھی ڈرگ مافیا کی اسٹریٹیجی کا حصہ ہوتا ہے۔ کراچی کی نئی کچی آبادیاں اس مافیا کے قبضے میں ہیں اور پرانی کچی بستیوں پر قبضے کی جنگ جاری ہے۔ اس کے علاوہ شہر میں ہونے والی ہر بدامنی کے بعد ہتھیاروں کی تعداد مسلسل بڑھتی رہی ہے۔

شہر کی انتظامیہ ان مافیاؤں کا مقابلہ کرنے کی سکت یا ارادہ نہیں رکھتی۔ یہ بات نہ صرف انتظامیہ

Scanned with CamScanner

کے عمومی رویّے سے، بلکہ بعض مخصوص واقعات سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ نومبر ۱۹۸۵ میں ٹرانسپورٹروں نے حکومت کو یہ مطالبہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ حادثے میں کسی شخص کے ہلاک ہونے کی صورت میں ڈرائیور پر محض دفعہ ۳۰۴ (الف) ــــ یعنی حادثاتی موت ــــ کے تحت مقدمہ درج کیا جائے، خواہ حادثے کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ اُسی سال کے شروع میں لیاری میں منشیات کے خلاف مہم چلانے پر پولیس کی فائرنگ اور آنسو گیس سے دو سو پُرامن مظاہرین زخمی ہوئے تھے اور منشیات کے خلاف مہم کا ایک کارکن عبدالواحد گولی لگنے سے ہلاک ہوا تھا۔ تحقیقاتی ٹربیونل نے اپنی تحقیقات مکمل کر لی تھی لیکن اس رپورٹ کو کبھی ظاہر نہیں کیا گیا۔ اس دوران منشیات کے خلاف تحریک چلانے والوں کو پولیس کی دھمکیاں ملنے اور بعض کو قید کیے جانے سے تحریک کا زور ٹوٹ گیا۔ کچی آبادیوں میں کام کرنے والے سماجی کارکنوں اور فلاح و بہبود کی تنظیموں کا تجربہ ہے کہ اس کام کے دوران منشیات یا اسلحے کے مسائل اٹھائے جائیں تو پولیس کی مداخلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کارکنوں کو دھمکیاں دی جاتی ہیں اور بہت سوں کو سبق سکھانے کے لیے حوالات میں بند بھی کیا گیا ہے۔

چوں کہ افیون کی کاشت صوبہ سرحد میں ہوتی ہے اور ہتھیار افغان جنگ کے سلسلے میں ملک میں داخل ہوئے ہیں، اس لیے یہ تعجب کی بات نہیں کہ ڈرگ مافیا کے بیشتر لوگ پٹھان ہیں۔ چناں چہ کراچی کی بعض پٹھان بستیاں مافیا کی سرگرمیوں کے مرکز بن چکی ہیں۔ ان میں سے کئی بستیاں ٹرانسپورٹ کے کاروبار کی پیداوار ہیں اور اس باعث شہر کے کئی اہم علاقوں میں داخلے کے راستے پر واقع ہیں۔ ۱۹۸۰ کی دہائی کے آخری برسوں میں پرانی کچی آبادیوں کی سرحدوں پر بسا کر مافیا نے انھیں اپنے لیے اور محفوظ کر لیا۔ کراچی میں داخلے کے ایک راستے سُپر ہائی وے پر سہراب گوٹھ اور دوسرے راستے نیشنل ہائی وے پر قائد آباد کو اپنے قابو میں کر کے اس مافیا نے ان دونوں سڑکوں پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ تاہم، اس بات کی شہادتیں موجود ہیں کہ پاکستانی ڈرگ مافیا کو منشیات کی بین الاقوامی مارکیٹ سے منسلک کرنے والے بیشتر افراد غیر پٹھان ہیں۔ اس سلسلے کے اہم ناموں میں متعدد مہاجروں کے نام بھی لیے جاتے ہیں۔

ہر سال اربوں ڈالر مالیت کی ہیروئن کراچی سے گزر کر بیرونِ ملک جاتی ہے۔ اس طرح مافیا کا کراچی شہر اور اس کی انتظامیہ پر کنٹرول حاصل کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس مافیا کو بین الاقوامی مافیا کی مدد بھی حاصل ہے۔ یہ سب کو علم ہے کہ امریکا کے ڈرگ مافیا کو لاطینی امریکا کے کئی ممالک میں سیاسی عدم استحکام پیدا کرنے اور امریکی مفادات کے فروغ کے لیے استعمال کیا گیا۔

مافیا کے افعال سے سب سے بُری طرح متاثر ہونے والے کراچی کے پٹھان ہیں۔ شہری انتظامیہ سے ان کا رابطہ ہمیشہ دلالوں کی وساطت سے ہوتا ہے۔ کراچی میں زمین کی کھدائی کرنے والے مزدور تقریباً تمام پٹھان ہیں، اور ان میں سے بیشتر بیگار کرنے کے لیے صوبہ سرحد سے لائے گئے ہیں۔ تعمیراتی مزدور اُس ٹھیکے دار کو بھتا دیتے ہیں جو انھیں کام دلواتا ہے تاکہ وہ انھیں پولیس سے محفوظ رکھے اور دوسرے معاملات میں ان کی مدد کرے۔ یہاں تک کہ بوٹ پالش کرنے والوں کے بھی ٹھیکے دار ہیں جو

Scanned with CamScanner

انھیں پولیس سے بچانے کے لیے باقاعدگی سے بھتا وصول کرتے ہیں۔ اس بات کا پورا امکان موجود ہے کہ جرائم کی دنیا کے یہ ٹھیکے دار اور دلال (پٹھان اور غیر پٹھان دونوں) مافیا کے ہاتھوں استعمال ہو رہے ہوں۔

پٹھان برادری کے اس بند ماحول کی ذمے دار کراچی کی بد عنوان اور غیر موثر انتظامیہ ہے۔ سرحد کے کسی گاؤں سے آنے والا پٹھان مزدور شہر کے انتظام، کام حاصل کرنے اور انصاف پانے کے طریقوں میں اپنے لیے گنجائش نہیں دیکھتا۔ کراچی میں قیام کے ابتدائی دنوں میں اسے زبان کی دقت کا بھی سامنا ہوتا ہے۔ پٹھان قبائلی روابط اور ٹھیکے داری کا نظام اسے اس اجنبی اور مخاصمانہ شہر میں تحفظ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی مثالیں شاذونادر ہی سننے میں آتی ہیں کہ کسی پٹھان نے انصاف حاصل کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کیا ہو یا کسی تنازعے کو نمٹانے کے لیے کسی ریاستی ادارے کی یا پولیس کی مدد حاصل کی ہو۔ یہ تمام تنازعات ٹھیکے داروں کی یا جرگے کی وساطت سے طے کیے جاتے ہیں۔

کراچی کے مقامی باشندوں کی صورتِ حال پٹھانوں سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے پاس کوئی روایتی نسلی یا قبائلی تنظیم نہیں ہے جس سے وہ خود کو وابستہ کر سکیں۔ برادری کا جو نظام وہ ہندوستان سے یا پاکستان کے دیہی علاقوں سے ساتھ لائے تھے، شہری زندگی کے دباؤ کے باعث ختم ہو چکا ہے۔ ان کی فی کس اوسط آمدنی باقی پاکستانیوں کے مقابلے میں ڈیڑھ گنا ہے اور خواندگی کی شرح بھی زیادہ ہے۔ علاوہ ازیں اب ان باشندوں کی دوسری نسل جوان ہو چکی ہے، جس میں کسی شہر میں نئے آکر بسنے والوں کی سی مفاہمت پسندی اور قوّت برداشت موجود نہیں ہے۔ اس نسل کے لوگ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے کچھ حقوق ہیں اور وہ ان حقوق کے لیے جدوجہد کرنے پر آمادہ ہیں۔ انفرادی طور پر شہر کی انتظامیہ سے روز کا واسطہ پڑنے کے باعث وہ انتظامی اہلکاروں کی بد عنوانی اور نااہلی سے واقف ہو چکے ہیں۔ انتظامیہ کے خلاف بغاوت کرنے پر انھیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس بغاوت سے مافیا کے مفادات کو بھی ٹھیس پہنچ رہی ہے۔ غیر مسلح اور غیر منظم ہونے کے باعث وہ بہت جلد خاموش کر دیے جاتے ہیں اور حالات جوں کے توں برقرار رہتے ہیں۔

شہری سہولتوں کے اس فقدان اور مافیا کے مفادات کے علاوہ ایک اہم عنصر بے روزگاری میں اضافے کا بھی ہے۔ مارشل لا دور میں نو سال تک سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کے باعث شہر کی سیاسی قوتیں باقی ملک سے کٹ کر رہ گئیں۔ کراچی کی کچی آبادیوں میں اس بات کا شعور بڑھتا جا رہا ہے کہ انتظامیہ کی بے اثری اور مافیا کے پھیلاؤ کے درمیان گہرا تعلق موجود ہے۔ یہ احساس بھی شدید ہو رہا ہے کہ ملک کے ۲۵ فیصد محصولات کراچی شہر سے جمع کیے جاتے ہیں جب کہ ان محصولات کا صرف ڈیڑھ فیصد حصہ کراچی پر خرچ کیا جاتا ہے۔

کراچی کی پٹھان اور غیر پٹھان آبادی کی صورتِ حال، مافیا کے کردار اور انتظامیہ کی ناکارکردگی کے پیشِ نظر اس پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ ۱۹۸۰ کے عشرے کے آخری برسوں میں کراچی کے

Scanned with CamScanner

لسانی تصادم میں اضافہ ہوا۔ کئی سیاسی گروہوں نے مختلف بیانات میں ایم کیو ایم کو اس لسانی تصادم کا ذمے دار ٹھہرایا۔ تاہم، ایم کیو ایم اور کراچی میں برسوں سے جاری شورش کے درمیان تفریق کرنا ضروری ہے۔ ایم کیو ایم کے مطالبات محدود نوعیت کے ہیں: وہ درمیانہ طبقے کے مہاجروں کے مفادات کا تحفظ چاہتی ہے، الگ مہاجر شناخت کی بات کرتی ہے، ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں داخلے کے لیے کوٹا سسٹم کی مخالفت کرتی ہے اور سندھ کی آبادی میں مزید "غیر فطری" تبدیلیوں کو روکنا چاہتی ہے۔ ایم کیو ایم ایک منظم جماعت ہے اور اس کی مرکزی لیڈرشپ موجود ہے۔ دوسری طرف شہری شورش ناکافی سہولتوں، غیر موثر انتظامیہ اور مافیا کی طاقت کے خلاف ہے۔ اس کی کوئی مرکزی لیڈرشپ نہیں ہے اور اس کی اسٹریٹ پاور وہ کچی آبادیاں ہیں جن پر ابھی مافیا کا قبضہ نہیں ہوا ہے۔ ایم کیو ایم شہری بے اطمینانی اور شورش کی قیادت کرنے کے لیے کوشاں نظر نہیں آتی اور اپنے طبقاتی مزاج کی وجہ سے وہ شاید ہی ایسا کرے۔

***

بلدیاتی ادارے ــــ اختیار اور بے اختیاری

۱۹۸۷ میں سندھ کے بلدیاتی اداروں کے انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ایم کیو ایم کو کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن، اور شہر کی چار میں سے تین زونل کاؤنسلوں، کا کنٹرول حاصل ہو گیا۔ اس کے علاوہ اسے حیدر آباد میونسپل کارپوریشن میں بھی مطلق اکثریت حاصل ہوئی۔ مگر یہ کنٹرول ایم کیو ایم کو وہ اختیار نہیں بخش سکتا تھا جس کے ذریعے وہ ان شہروں کے انتظام میں کوئی تبدیلی لا سکتی، اور نہ ہی اس انتخابی کامیابی سے ایم کیو ایم کو ان شہروں کے ترقیاتی پروگراموں پر نمایاں طور پر اثرانداز ہونے کا موقع مل سکتا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ ۱۹۷۹ کے لوکل گورنمنٹ آرڈیننس نے شہروں کی میونسپل کارپوریشنوں کو مکمل طور پر صوبائی بیوروکریسی کے ماتحت کر دیا ہے۔

تاہم، اس انتخابی کامیابی کی سیاسی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ سندھ کے شہری علاقوں کی مہاجر آبادی نے نہ صرف نوجوان قیادت پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا بلکہ اس نظریے پر بھی اثبات کی مُہر لگائی کہ وہ خود کو الگ قومیت سمجھتی ہے۔ اس اثبات نے مہاجر تشدد پسندی کے ساتھ مل کر کراچی اور حیدر آباد کے بیشتر غیر مہاجر گروہوں میں تشویش پیدا کر دی۔ سندھی قوم پرست بھی، جو شروع میں ایم کیو ایم کے لیے ہمدردانہ جذبہ رکھتے تھے، اس صورت حال سے خطرہ محسوس کرنے لگے۔ اور اس طرح سندھ کے متعدد سیاسی اور لسانی گروہوں کے مابین نئے رشتے اور رابطے قائم کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔

۱۹۷۹ کا لوکل گورنمنٹ آرڈیننس منتخب میونسپل کاؤنسلوں اور صوبائی حکومت کے درمیان

Scanned with CamScanner

تعلق کو متعین کرتا ہے۔ اس قانون کی دفعہ ۲۷ کے تحت صوبائی حکومت کو شہری انتظامیہ کے مالی امور میں بالادستی حاصل ہے۔ صوبائی حکومت کارپوریشنوں کو ان تمام ٹیکسوں، محصولوں، چنگیوں اور فیسوں کو، جو کارپوریشنیں عائد کرنے کی مجاز ہیں، گھٹانے، بڑھانے، معطل یا موقوف کرنے کا حکم دے سکتی ہے۔ اس کے علاوہ صوبائی حکومت کارپوریشنوں کے منظور کردہ بجٹ میں ترمیم کرنے کا بھی اختیار حاصل ہے۔

کراچی اور حیدرآباد کے شہری علاقوں کی منصوبہ بندی کی ذمے داری منتخب میونسپل کارپوریشنوں پر نہیں بلکہ کراچی اور حیدرآباد ڈویلپمنٹ اتھارٹیوں پر ہے۔ ان دونوں اداروں کو سرکاری ٹیکنوکریٹ چلاتے ہیں جو کسی بھی طرح ان شہروں کے بلدیاتی اداروں کو نہیں بلکہ صوبائی حکومت کو جواب دہ ہیں۔ اس طرح محصولات جمع کرنے اور خرچ کرنے کا اختیار نہ رکھنے اور شہری علاقوں کی ترقیاتی منصوبہ بندی میں شرکت سے محروم ہونے کے باعث ایم کیو ایم کی حمایت یافتہ منتخب حکومتیں ان دونوں شہروں کے عظیم مسائل سے نمٹنے سے مکمل طور پر قاصر تھیں۔ حکومت کے وسیع اختیارات کے پیشِ نظر یہ بات قابلِ فہم ہے کہ کراچی اور حیدرآباد کے منتخب میئروں سے ان شہروں کے کمشنروں نے حلف لیا تھا۔

یہ منتخب کاؤنسلیں بہرحال حکومت کے خلاف احتجاج کر سکتی تھیں اور آرڈیننس میں دیے گئے منتخب بلدیاتی اداروں کے اختیارات میں اضافے کا مطالبہ اٹھا سکتی تھیں۔ لیکن اس امکان سے نمٹنے کے لیے بھی آرڈیننس میں متعدد دفعات موجود ہیں۔ دفعہ ۵۳ کے تحت صوبائی حکومت کو کارپوریشنوں کی عمومی نگرانی کا اختیار حاصل ہے تاکہ ان کی کارروائیاں آرڈیننس سے تجاوز نہ کریں۔ بصورتِ دیگر حکومت ایسے احکام جاری کر سکتی ہے جن سے کارپوریشنوں کے اقدامات آرڈیننس کے دائرے میں رہیں۔ اس دفعہ کے تحت صوبائی حکومت کارپوریشن کی کسی بھی ایسی کارروائی کو معطل کر سکتی ہے جو اس کے خیال میں آرڈیننس سے مطابقت نہ رکھتی ہوں، اور کارپوریشن کو حکومت کے تجویز کردہ احکام پر عمل کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ اگر حکومت یہ سمجھتی ہو کہ کارپوریشن آرڈیننس میں دیے گئے فرائض ادا کرنے میں ناکام رہی یا اپنی مالی ذمے داریاں پوری نہیں کر سکی، تو وہ دفعہ ۵۸ کے تحت کارپوریشن کو چھ ماہ کے لیے معطل کر سکتی ہے۔ تاہم اگر منتخب کاؤنسلوں کے احتجاج کو اسٹریٹ پاور کی حمایت حاصل ہو تو وہ، خاص طور پر کراچی جیسے باشعور اور پُراشتعال شہر میں، بہت بڑی طاقت بن سکتی ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں منتخب اداروں کی سرکشی کے اثرات کو کم رکھنے کی غرض سے حکومت نے کراچی کو چار خودمختار زونل میونسپل کارپوریشنوں میں تقسیم کر دیا جن میں سے ہر ایک کے انتظامیہ، مالیات، انجینئرنگ، صحت اور دوسرے شعبے الگ الگ ہیں۔ اگرچہ ان میں سے تین زونل کاؤنسلوں میں ایم کیو ایم کی اکثریت تھی، حکومت کے اہلکاروں کا خیال تھا کہ ایم کیو ایم کی اکثریت والی شہری کاؤنسل کی نسبت ان زونل کاؤنسلوں سے الگ الگ نمٹنا زیادہ آسان ہوگا۔ شہر کو اس طرح چار انتظامی حصوں میں تقسیم کر دینے کے اقدام سے بلدیہ کراچی کا اتحاد آنے والے وقتوں کے لیے بھی بہت کمزور ہو کر رہ گیا ہے۔ اس اتحاد پر

ایک اور ضرب زونل کاؤنسلوں کے مابین مالی نابرابری نے بھی لگائی ہے، کیوں کہ ایک کاؤنسل کے دائرہ اختیار میں بندرگاہ اور سائٹ کا صنعتی علاقہ ہونے کی وجہ سے اسے آکٹرائے کی مد میں بہت آمدنی ہو گی، جب کہ دوسری کاؤنسل کی آمدنی بہت کم ہو گی۔ اس کے علاوہ نکاس اور پانی کی لائنیں ایک دوسرے سے متصل علاقوں میں جاتی ہیں جو مختلف کاؤنسلوں کے انتظام میں ہیں، اور اس بنا پر تنازعات پیدا ہونا ناگزیر ہے۔

اس آرڈیننس کے تحت، ملک کی دیگر بلدیاتی کارپوریشنوں کی طرح، کراچی اور حیدرآباد کی کارپوریشنوں کے ذمے چند مخصوص کام ہیں، جن میں کوڑے کرکٹ کی صفائی، سڑکوں کی مرمت اور بندوبست، اور میونسپل حدود میں آنے والی کچی آبادیوں کو مستقل کرنے اور زمین اور جائیداد کا انتظام کرنے کے کام شامل ہیں۔ ان کاموں کو موثر طریقے پر انجام دینے کے لیے شہر میں رہائشی زمین کی ڈویلپمنٹ کے نظام کا درست ہونا ضروری ہے، اور یہ کارپوریشنوں کے نہیں بلکہ ڈویلپمنٹ اتھارٹیوں کے دائرہ اختیار میں ہے۔ کارپوریشنوں کی کم اہم سرگرمیوں میں پارکوں، چڑیا گھروں، ڈسپنسریوں، فائر بریگیڈوں اور محدود تعداد میں اسکولوں کا قیام اور انتظام شامل ہیں۔ ٹرانسپورٹ اور ٹریفک مینیجمنٹ جیسے اہم کام، جن کا شہر کی بدامنی سے خاص تعلق رہا ہے، کارپوریشنوں کے اختیار سے باہر ہیں۔

***

ایم کیو ایم اپنی نچلے درمیانہ طبقے کی لیڈرشپ اور شہری عوام کی حمایت کے ساتھ بہتر شہری سہولتوں کی فراہمی کے لیے ایک اہم سیاسی لابی کا کردار ادا کر سکتی تھی۔ لیکن اسے شہر میں بدامنی کی صورت حال اور شہری آبادی کے کئی لسانی گروہوں اور صوبائی حکومت کے اہلکاروں میں ایم کیو ایم مخالف جذبات کا بھی سامنا تھا۔ اس کے علاوہ زونل کارپوریشنوں کو مناسب طور پر ملازمین کی فراہمی اور ان کی سرگرمیوں کے شروع ہونے کے لیے خاصا وقت درکار تھا۔ ان تمام مسائل کی موجودگی میں، اور میونسپل کارپوریشنوں کے ٹیکنوکریٹوں اور اعلیٰ افسروں کے عدم تعاون کے پیش نظر، یہ صاف دکھائی دیتا تھا کہ ایم کیو ایم کے منتخب کاؤنسلر اپنے کام پر حاوی نہ ہو سکیں گے؛ نتیجتاً ترقیاتی بجٹ کا بڑا حصہ استعمال ہوئے بغیر ضائع ہو جائے گا اور یا تو ایم کیو ایم کے کاؤنسلروں کو سیاسی حکمت عملی کے تحت استعفیٰ دینے پر مجبور ہونا پڑے گا یا ان کی جگہ غیر منتخب نامزد کاؤنسلر مقرر کیے جائیں گے۔

۱۹۸۱ کی مردم شماری کے مطابق کراچی کی آبادی میں کل ۵۴ فیصد مہاجر، ۱۳ فیصد پنجابی بولنے والے (جن کی اکثریت مشرقی پنجاب سے ترک وطن کر کے آنے والوں پر مشتمل ہے)، ۱۱ فیصد سندھی اور بلوچ، ۱۱ فیصد میمن، کچھی، بوہری اور گجراتی بولنے والی دوسری برادریاں، اور ۱۰ فیصد پٹھان ہیں۔ بلوچوں اور سندھیوں کی اکثریت اندرون شہر رہتی ہے اور شہری پرولتاریہ کا حصہ ہے۔

Scanned with CamScanner

مشرقی پنجاب کے تارکینِ وطن اور گجراتی بولنے والے، تجارت پیشہ، کاریگر اور سفید کالر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا طبقاتی پس منظر ویسا ہی ہے جیسا ایم کیو ایم کی لیڈرشپ کا ہے، اور انھیں بھی روزگار اور تعلیم کے اُنھیں مسائل کا سامنا ہے جن سے مہاجروں کو دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ اس طرح یہ طبقے ایم کیو ایم کے پروگرام کو سمجھتے ہیں اور اس سے ہمدردی بھی رکھتے ہیں؛ انھیں صرف مہاجر قومیت کے تصور سے اختلاف ہے۔ ایم کیو ایم کے اُبھرنے کے باعث یہ گروہ خود کو شہری سیاست کے بڑے دھارے سے علیحدہ محسوس کرنے لگے اور نئے اتحاد کی تلاش میں سرگرم ہو گئے جو انھیں برابری کی سطح پر اپنے ساتھ شامل کرے اور ان کے مفادات کا تحفظ کرے۔

بلدیاتی انتخابات میں ایم کیو ایم کی کامیابی کا سب سے نمایاں اثر سندھی قوم پرستوں سے اس کے رشتے پر پڑا۔ ایم کیو ایم نے یہ موقف اختیار کیا کہ سندھی اور مہاجر سندھ میں دو مختلف قومیتیں ہیں۔ ایم کیو ایم کے برخلاف، جو مہاجروں کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکتی ہے، کوئی بھی سندھی قوم پرست گروپ سندھیوں کی نمائندگی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ جیے سندھ محاذ کو چھوڑ کر باقی تمام قوم پرست بڑی غیر صوبائی پارٹیوں کا حصہ ہیں۔ ابتدا میں جیے سندھ کی ایم کیو ایم کے ساتھ دوستی سندھیوں میں نامقبول بھی نہیں رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۸۳ کی تحریک کی ناکامی کے بعد یہ خیال زور پکڑ گیا تھا کہ مرکز کے خلاف سندھ میں کوئی بھی تحریک مہاجر اکثریت کے شہری علاقوں کی شرکت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔

سندھ کی آبادی میں اتفاقِ رائے پیدا کرنے کے لیے ایم کیو ایم اور سندھی قوم پرستوں کے درمیان مکالمہ ضروری ہے۔ اس سلسلے میں چار مسائل کو حل کرنا ہوگا:

(۱) مہاجر قومیت کا تصور سندھیوں کے لیے ناقابلِ تسلیم ہے کیوں کہ اس سے سندھ کی تقسیم کے عمل کو تقویت ملتی ہے۔ یہ تصور ملکی سطح کی پارٹیوں کو بھی منظور نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس طرح دوسری ثقافتی اقلیتیں بھی خود کو قومیت تسلیم کرانے کا مطالبہ کر سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایم کیو ایم شہری درمیانہ طبقے کی تنظیم ہے اور ایسے سیاسی ماحول میں کام کر رہی ہے جس پر جاگیردار طبقے اور اس کے حواریوں کا مکمل غلبہ ہے؛ یہ موجودہ سیاسی اسٹیبلشمنٹ ایم کیو ایم کو اپنے لیے ایک خطرے کے طور پر دیکھتی ہے۔

(۲) دوسرا مسئلہ ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں داخلوں کا ہے۔ ایم کیو ایم مہاجر آبادی کے تناسب سے ملازمتوں اور داخلوں کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سندھی آبادی ویٹیج (کوٹا سسٹم) کے موجودہ نظام کے فوائد سے محروم ہو جائے گی۔

(۳) اردو اور سندھی زبانوں کا تعلیمی اداروں اور انتظامیہ میں استعمال تیسرا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ شاید سب سے زیادہ آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔

(۴) چوتھا مسئلہ بنگلادیش سے محصورین کی واپسی کا ہے جس کی ایم کیو ایم حمایت کرتی ہے اور

سندھی مخالف ہیں۔

سندھی قوم پرست ایم کیو ایم سے مکالمے کے سلسلے میں کسی جلدی میں نہیں ہیں۔ ان کا اندازہ ہے کہ حالات ابھی ان کے حق میں ہیں۔ کا شور کے ایک سندھی کاؤنسلر نے، ۱۹۸۷ کے بلدیاتی انتخابات کے بعد، اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا: "سندھ میں اتفاقِ رائے ہو جائے گا، مگر اس سے پہلے ایم کیو ایم کو مرکز کی طرف سے اچھی طرح مار پڑنی چاہیے جیسا کہ ہمارے ساتھ ۱۹۸۳ میں ہوا تھا۔ پہلے انھیں اکیلے جدوجہد کرنی ہوگی، اس کے بعد ایم کیو ایم اور سندھی قوم پرستوں میں معاہدہ ہو سکتا ہے۔"

***

صوبائی اور قومی سیاست کا تناظر

نومبر ۱۹۸۸ کے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں پاکستان کے عوام نے ان قومی پارٹیوں کے حق میں ووٹ دیا جنھوں نے ۱۹۷۳ کے آئین کی بحالی، پارٹی کی بنیاد پر الیکشن اور بنیادی انسانی حقوق کے لیے جدوجہد کی تھی۔ بقیہ پاکستان میں ووٹنگ کے رجحان کے برخلاف، سندھ کی اردو بولنے والی آبادی نے مقامی اور لسانی تنظیم ایم کیو ایم کو ووٹ دیا۔ کراچی اور حیدر آباد میں ایم کیو ایم کی مکمل کامیابی اور دیہی سندھ میں پیپلز پارٹی کی اکثریت نے صوبے کو دو مختلف حصوں میں بانٹ دیا۔ ایم کیو ایم کے اُبھرنے کی اصل وجوہ کا کئی طرح سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سندھ کی مہاجر آبادی بتدریج پاکستان کے سیاسی دھارے سے کٹ گئی ہے۔ جاگیردارانہ پس منظر نہ رکھنے کے باعث ایم کیو ایم مرکز پرست سیاسی پارٹیوں کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اس پارٹی میں چھوٹے تاجر، سفید کالر ورکر اور کسی حد تک اردو بولنے والی پرولتاریہ شامل ہے۔ مگر ایم کیو ایم بائیں بازو کی پارٹیوں کا بھی ساتھ نہیں دے سکتی جنھوں نے ماضی میں پاکستان کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ تقسیم کے بعد کی نسل، جو کراچی اور حیدر آباد کے شہری ماحول میں جوان ہوئی ہے، ان رجعت پسند پارٹیوں کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں ہے جن کی ان کے والدین نے حمایت کی تھی۔

اگرچہ سندھ کی اردو بولنے والی آبادی تجارت اور پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں ترقی کر رہی تھی، یہ بات شدت سے محسوس کی جا رہی تھی کہ فوج، ملکی سیاست اور بیورو کریسی میں اس آبادی کی شمولیت دشوار ہو گئی ہے؛ اور پاکستان میں اصل اقتدار انھیں اداروں کے پاس ہے۔ ایم کیو ایم خوف اور علیحدگی کی اسی فضا میں وجود میں آئی۔ اس نے اس مسئلے کو مہاجروں کے لیے ایک الگ مضبوط پلیٹ فارم مہیا کر کے طے کیا ہے۔ اس پلیٹ فارم سے اس نے مہاجر قومیت کے تسلیم کیے جانے کی آواز بلند کی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ صوبائی اور ملکی سطح پر مہاجروں کی متناسب نمائندگی کا مطالبہ کیا ہے۔ ایم کیو ایم کی سب

Scanned with CamScanner

سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس نے اپنے مسائل اور ان کے حل کو بڑے صوبائی اور قومی مسائل کے ساتھ منسلک نہیں کیا۔

پاکستان کا آئین سوائے پاکستانی قومیت کے کسی اَور قومیت کو تسلیم نہیں کرتا اور ایم کیو ایم کے سوا باقی تمام قومیتوں پر اصرار کرنے والی پارٹیوں کو الیکشن میں شکست ہوئی ہے۔ پاکستان کے آئین میں ترمیم کیے بغیر مہاجر قومیت کا تسلیم کیا جانا یا مہاجر اکثریت کے ایک نئے صوبے کا قیام ناممکن ہے۔ مستقبل قریب میں ایسی کوئی آئینی ترمیم خارج از امکان نظر آتی ہے۔ ایسی کسی ترمیم کی غیر موجودگی میں صوبائی اور ملکی سطح پر ایم کیو ایم کی متناسب نمائندگی کی تجویز بھی ناقابلِ عمل ہے۔

جہاں تک کوٹا سسٹم کے خاتمے کا تعلق ہے، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سندھ کی آبادی کا ۴۸ فیصد حصّہ شہروں میں رہتا ہے۔ شہری آبادی کا ایک بہت بڑا حصّہ اردو بولنے والوں (یا مہاجروں) پر مشتمل ہے۔ دیہی سندھ کی آبادی کے ۸۹ فیصد لوگ سندھی، بلوچی اور سرائیکی بولنے والے ہیں۔ مہاجروں کی اکثریت تعلیم یافتہ ہے اور سندھ کی دیہی آبادی کی طرح جاگیرداروں کے تابع نہیں ہے۔ کوٹا سسٹم کا خاتمہ سندھیوں کے لیے خودکشی کے مترادف ہوگا۔ ان کے موقف کو نہ صرف ان کی ووٹنگ پاور کی حمایت حاصل ہے، بلکہ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جانا چاہیے کہ سندھ میں جاگیرداری نظام کے ہوتے ہوئے بھی ایک درمیانہ طبقہ اُبھر رہا ہے۔ یہ طبقہ پیشہ ورانہ ملازمتوں میں مہاجروں کی اجارہ داری کے لیے ایک چیلنج ہے، اگرچہ اس نے اب تک مہاجروں کو تجارت کے شعبے میں کوئی خاص نقصان نہیں پہنچایا ہے۔

قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں ایم کیو ایم کی اپنے حلقے میں کامیابی نے کئی اہم سوالات پیدا کیے: متشدد مہاجروں کو قومیت اور متناسب نمائندگی دلانے میں ناکامی کی صورت میں ایم کیو ایم کا مستقبل کیا ہوگا؟ کیا ایم کیو ایم کی لیڈرشپ میں شامل عملیت پسند وزارتیں اور غیر اہم مفادات حاصل کر کے خاموش بیٹھ جائیں گے؟ کیا ایم کیو ایم کے متشدد حمایتی اپنی جدوجہد کراچی اور حیدرآباد کی سڑکوں پر جاری رکھیں گے اور اس طرح مہاجروں اور سندھیوں کے درمیان خطرناک تفریق میں اضافہ کریں گے؟ کیا اس طرح کی تفریق کے بڑھنے سے مرکز کو صوبائی امور میں مداخلت کا موقع نہیں ملے گا اور صوبائی خودمختاری کی امنگوں کی حوصلہ شکنی نہیں ہوگی؟ اگر ایم کیو ایم نے اپنے مطالبات ترک کر کے پاکستان، بالخصوص سندھ، کے بڑے مسائل کے حل کے لیے متبادل حکمت عملی اختیار کی تو کیا مہاجروں کی آبادی ایم کیو ایم سے بددل ہو جائے گی؟ اس طرح کے سوالات پیدا نہ ہوتے اگر ایم کیو ایم نے کوٹا سسٹم کے مسئلے کو دیہی سندھ کی پس ماندہ صورتِ حال کے ایک لازمی حصّے کے طور پر دیکھا ہوتا، اور یہ کہا ہوتا کہ شہری علاقوں میں سہولتوں اور ملازمتوں کے فقدان کی وجوہ وہی ہیں جو دیہی علاقوں میں انارکی، بے روزگاری اور زرعی انفرااسٹرکچر کے انحطاط کی ذمے دار ہیں۔

سندھ کے مہاجر مسئلے کا حل، جس کے ذریعے صوبے میں تفریق کی فضا ختم ہو سکے، ایم کیو ایم کے نہیں بلکہ حکومت کے پاس ہے۔ بڑی حد تک یہ مسائل پورے پاکستان میں موثر لوکل گورنمنٹ کے ادارے قائم کر کے حل کیے جا سکتے ہیں۔

***

حل کی تلاش

نئے معاشرتی معاہدے (نیو سوشل کانٹریکٹ) کے تحت بلدیاتی اداروں کی تشکیل نو کی جائے گی اور انھیں بہتر بنایا جائے گا۔ ڈویژنوں کو مرحلہ وار ختم کیا جائے گا اور اقتدار براہ راست نچلی سطحوں پر منتقل کیا جائے گا۔
(وزیر اعظم بے نظیر بھٹو۔ منشور ۱۹۹۳: تبدیلی کے لیے ایک ایجنڈا۔)

کراچی کی صورت حال کے دو مرکزی کرداروں کے درمیان کسی تصفیے کی امیدیں کم از کم فی الوقت باقی نہیں رہی ہیں۔ حکومت نے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ وہ "دہشت گردوں" کے ساتھ گفت و شنید نہیں کرے گی۔ تاہم، کراچی کی بیش تر آبادی نے ان "دہشت گردوں" کے حق میں ووٹ دیا ہے اور سیاسی عمل سے بے دخلی انھیں اور زیادہ ان "دہشت گردوں" کی باہوں میں ڈھکیل رہی ہے۔ کراچی کے غیر مہاجر بھی، خاص طور پر نچلی آمدنی والے علاقوں میں رہنے والے جو گزشتہ دو سال سے قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کے محاصرے میں ہیں، ایم کیو ایم کو اصل مسئلے کے طور پر نہیں دیکھتے۔ فرقہ وارانہ یا لسانی کشیدگی کی جگہ ان علاقوں میں محلّے کی سطح پر یک جہتی پیدا ہوئی ہے اور ان میں یہ احساس بھی نمایاں ہوا ہے کہ جس انداز میں برسر اقتدار پارٹی کی قیادت کراچی کو دیکھتی ہے اور شہر پر حکومت کر رہی ہے، وہ سراسر غلط ہے۔ سالہا سال کی حکومتی بدعنوانیوں، استحصال، جور و ستم اور مافیا کی جانب سے (جس کے متعلق عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اسے حکومت کی سرپرستی حاصل ہے) جبری بھتوں کی وصولی کے باعث ان علاقوں میں رہنے والوں کے درمیان تعلقات مضبوط ہوئے ہیں۔

"دہشت گردوں" کے خلاف حکومت کی مہم اور برسر اقتدار پارٹی کے ترجمانوں کے کراچی کے بارے میں متضاد بیانات نے حکومت کی جانب سے کیے گئے فیصلوں کے اعتبار کو بری طرح مجروح کیا ہے۔ ان میں سے ایک فیصلہ رینجرز کو کراچی میں "دہشت گردوں" سے نمٹنے کے لیے بے انتہا اختیارات دینا ہے۔ جن علاقوں میں رینجرز نے آپریشن کیے ہیں، وہاں کے باشندے رینجرز کی بربریت، لوٹ مار اور مسلّمہ قانونی اصولوں کی خلاف ورزی کی شکایت کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس آپریشن کے

نتیجے میں ممکنہ دہشت گردوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک غیر جانبدار کمیٹی بنائی جائے جو ان الزامات کی تحقیق کرنے کے بعد بد اعمالی کا ارتکاب کرنے والے رینجروں کو سخت سزا دے۔ مگر ہم سب جانتے ہیں کہ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ حکومت کے دوسرے فیصلے کے ذریعے اسپیشل کورٹس ایکٹ ۱۹۹۲ میں ترمیم کر دی گئی ہے۔ اس ترمیم کی رو سے کسی ملزم کے پولیس کی تحویل میں دیے ہوئے اقبالی بیان کو سزا کے لیے کافی شہادت سمجھا جائے گا۔ ہماری قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں جس طریقے سے کام کرتی ہیں، اور جتنے لوگ ہر سال پولیس کے تشدد سے ہلاک ہو جاتے ہیں، اس کو دیکھتے ہوئے یہ ترمیم زیادہ بڑے پیمانے پر بدعنوانی، لوگوں کو ہراساں کرنے اور سیاسی مقصد کے لیے دھاندلی کی کھلی چھوٹ دینے کے مترادف ہے۔ کراچی کے نچلی آمدنی والے علاقوں کے لوگ اس ترمیم کے مفہوم اور اس کے اثرات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ان کا سوال یہ ہے: کیا برسرِ اقتدار پارٹی ان حلقوں کے حقوق کے بارے میں سوچنا گوارا نہیں کرے گی جہاں سے اسے معلوم ہے کہ اسے کبھی ووٹ نہیں ملیں گے؟

ان غریب علاقوں میں رہنے والے لوگ بتاتے ہیں کہ برسرِ اقتدار پارٹی کے افراد کراچی میں ہلاکتوں کے منصوبے کا ذمے دار ڈرگ مافیا اور بیرونی ایجنٹوں کو ٹھہراتے ہیں۔ لیکن منشیات کے اڈے اب بھی ان علاقوں میں موجود ہیں اور پولیس بدستور ان کی سرپرستی کر رہی ہے۔ ان اڈوں کے چلانے والوں میں سے کوئی شخص گرفتار نہیں کیا گیا۔ اور گرفتار کیے جانے والے افراد میں سے کسی پر بیرونی ایجنٹ ہونے کی فردِ جرم عائد نہیں کی گئی ہے۔ یہ بات بھی بار بار سننے میں آ رہی ہے کہ پولیس اپنی تحقیقات کے مطابق ایم کیو ایم (حقیقی) اور سپاہِ صحابہ کو ہلاکتوں کا ملزم ٹھہراتی ہے، جبکہ رینجرز کی تحقیقات میں ایم کیو ایم (الطاف گروپ) کو ملزم ٹھہرایا جاتا ہے۔ لوگ ان تحقیقات کو انتظامیہ کے مختلف گروپوں کے درمیان مفادات کے تصادم کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

برسرِ اقتدار پارٹی کی اعلیٰ ترین قیادت نے کہا تھا کہ کراچی کی صورتِ حال ڈیڑھ سال میں معمول پر آ جائے گی۔ کراچی کی صورتِ حال یہ ہے کہ پانی، نکاسِ آب، سڑکوں، ٹرانسپورٹ، تعلیم، صحت، روزگار اور جرائم کے مسائل تیزی سے بڑھ رہے ہیں، اور اسی رفتار سے ان سہولتوں کا انتظام کرنے کی ذمے دار ایجنسیوں کی نااہلی اور بدعنوانی بھی بڑھ رہی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ توانائی کے بحران پر قابو پا لیا جائے گا؛ مگر بجلی کی پیداوار بذاتِ خود اچھی حکومت، روزگار، جان اور عزت کے تحفظ اور طبعی اور معاشرتی طور پر قابلِ عمل انفرااسٹرکچر کا بدل نہیں ہو سکتی۔

کراچی کی آبادی اور برسرِ اقتدار پارٹی کے درمیان ایک بامعنی مکالمہ روز بروز دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ ایسی صورت پیدا کی جا رہی ہے کہ اگر دباؤ کے تحت امن قائم ہو بھی جائے تو کسی بھی بحران کے موقعے پر اسے تباہ کیا جا سکے۔ کراچی کی صورتِ حال کو سندھ کے تناظر میں دیکھنے والوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے؛ اور یہ بات برسرِ اقتدار پارٹی اور حزبِ اختلاف کے نمائندوں اور پریس پر بھی صادق آتی ہے۔

Scanned with CamScanner

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہر کی دیہی علاقوں سے امرِ واقع میں (de facto) علیحدگی ہو چکی ہے۔ سیاسی طور پر اس سے بڑا کوئی اَور المیہ نہیں ہو سکتا، اور اس کے نتیجے میں لسانی فسادات اور خوں ریزی کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

کراچی کے لوگ شہر کے بحران اور اس کو سیاسی عمل سے الگ کر دیے جانے پر بڑے پیمانے پر ردِ عمل کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس موضوع پر بے شمار ریلیاں، میٹنگیں، سیمینار اور ورکشاپ ہو چکی ہیں؛ ان میں سے کچھ شہر کی بیرونی سرحدوں پر واقع کچی آبادیوں کے شیڈوں میں، کچھ غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) کے دفتروں میں اور کچھ پنج ستارہ ہوٹلوں میں ہوئی ہیں۔ ان کا اہتمام کرنے والوں میں زندگی کے تمام شعبوں کے لوگ (مختلف، اور اکثر اوقات متصادم، سیاسی رجحانات اور لسانی پس منظر رکھنے والے) شامل ہیں۔ ان کے منتظمین نے پیشہ ور ماہرین، تاجروں، محلہ اور کمیونٹی انجمنوں، مذہبی تنظیموں اور خواتین کے گروپوں کو اپنے ساتھ ملایا ہے۔ ان تمام اجلاسوں میں — خواہ وہ کچی آبادیوں میں منعقد ہوئے ہوں یا پنج ستارہ ہوٹلوں میں — ایک مطالبہ مشترک تھا کہ بلدیاتی انتخابات فوراً کرائے جائیں اور منتخب کاؤنسلروں کو کراچی کی بحالی کے منصوبوں اور ترقیاتی پروگراموں میں موثر طور پر شریک کیا جائے۔ اس شہر سے وابستگی کے احساس کا اتنی شدت سے اظہار اس سے پہلے کبھی نہیں کیا گیا ہے، اور پاکستان کے کسی بھی شہر میں صورتِ حال کو بہتر بنانے کی خواہش کی اتنی دل سوز وکالت بھی اس سے پہلے کبھی نہیں کی گئی۔

تاہم، اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ بلدیاتی انتخابات اپنے طور پر کراچی کے بحران کا حل نہیں ہیں، اور انتخابات کے دوران اور اس کے فوراً بعد پیدا ہونے والے احساسِ مسرت کا خاتمہ مایوسی پر ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ نظام میں بلدیاتی اداروں کو "شہری حکومت" (city government) کے طور پر کام کرنے کے لیے ضروری اختیارات نہیں دیے گئے ہیں۔ منتخب بلدیاتی ادارے صرف اس صورت میں موثر طور پر اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں جب ان کا صوبائی ترقیاتی ایجنسیوں اور صوبائی بیورو کریسی کے ساتھ اعتماد کا رشتہ ہو، یہ ادارے اپنے محصولات وصول اور خرچ کرنے پر اختیار رکھتے ہوں اور انھیں صوبے میں برسرِ اقتدار پارٹی کا تعاون حاصل ہو۔ سندھ کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ ایک ناممکن مطالبہ ہے۔ بالفرضِ محال اگر باہمی اعتماد کی یہ فضا پیدا بھی ہو جائے تو اس امر کی ضمانت نہیں ہے کہ وہ پائیدار بھی ثابت ہو گی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ بلدیاتی اداروں کے پاس تکنیکی اور انتظامی پیشہ ورانہ صلاحیت موجود نہیں ہے۔ اس کے باوجود کراچی کے شہریوں کا مطالبہ بالکل جائز ہے، کیوں کہ موثر لوکل گورنمنٹ کی غیر موجودگی میں، اور باشندوں کی عملی شراکت کے بغیر، شہر میں واقع ہونے والی معاشرتی اور اقتصادی تبدیلیوں کو اداروں کی صورت نہیں دی جا سکتی۔

شہر کی موجودہ طبعی، معاشرتی اور اقتصادی صورتِ حال کے بارے میں کراچی کے باشندوں کی اس تشویش کو ضائع نہیں ہونے دیا جانا چاہیے، ورنہ معاشرے میں مزید تشدد اور انتشار پیدا ہو گا۔ اگر حکومت

Scanned with CamScanner

شہریوں کے اس جذبے کا تعمیری استعمال کرنے سے قاصر ہے تو کراچی کے باشندوں کو خود عملی قدم اٹھانا چاہیے۔ غیر سرکاری تنظیمیں، پیشہ ورانہ انجمنیں، کمیونٹی گروپ اور تاجر برادری کے نمائندے ایک نکاتی ایجنڈے پر متفق ہو سکتے ہیں۔ وہ شہر کے معاملے سے دل چسپی رکھنے والے تمام گروپوں کی ایک وسیع الاساس (broad-based) تنظیم قائم کر سکتے ہیں، اور موثر شہری حکومت قائم کرنے کے لیے انتظامیہ پر اجتماعی دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ اپنے مطالبے کو حقیقت پسندانہ اور قابلِ عمل بنانے کے لیے انھیں ایک کمیٹی بنانی چاہیے جس کے اراکین کو ان کی خدمات کے لیے معاوضہ ادا کیا جائے۔ اس کمیٹی کو یہ ذمے داری سونپی جائے کہ تمام پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عملی تجاویز پیش کرے۔ ان تجاویز میں کراچی میں موثر شہری حکومت قائم ہونے کے نتیجے میں ملک اور صوبے کی سیاست پر پڑنے والے اثرات کو مدِ نظر رکھنا خاص طور پر ضروری ہو گا۔ ان تجاویز کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی جائے اور کراچی سے منتخب ہونے والے قومی اور صوبائی اسمبلی کے ارکان اور منتخب یا نامزد کاؤنسلروں کو ان سے واضح طور پر آگاہ کیا جائے، تاکہ ان کو شہر کے تمام بلدیاتی، صوبائی اور قومی انتخابات میں ایک اہم نکتے کے طور پر پیش کیا جائے۔ شہری حکومت فوراً یا آسانی سے حاصل نہیں ہو گی۔ اس عرصے میں شہریوں کو (منتخب یا نامزد) کاؤنسلروں اور عوام کے درمیان رابطے کو مضبوط کرنا ہو گا اور اپنے محلوں میں شراکتی ترقیاتی ماڈل کے اصولوں کو اختیار کرنا ہو گا؛ کراچی میں ایسے ماڈل کے کامیابی سے چلنے کی ایک مثال اورنگی پائلٹ پروجیکٹ ہے۔

مندرجہ بالا ایجنڈے کے دو حصے ہیں۔ تبدیلی ہمیشہ اُس وقت آتی ہے جب سیاست داں، انٹرسٹ گروپ اور شہری عوام کسی متفقہ نتیجے پر پہنچتے اور قابلِ عمل متبادل دریافت کرتے ہیں۔ یہ متبادل ہمیشہ شہر کے انٹرسٹ گروپ اور عوام پہلے دریافت کرتے ہیں، اور وہی اس کے نفاذ پر اصرار کرتے ہیں۔ کسی تبدیل شدہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے موثر ادارے اور موزوں انتظامی اقدام ہمیشہ معاشرے کے معاشی اور اقتصادی رجحانات کو سمجھنے اور ان کا ساتھ دینے کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ کراچی میں ایک بڑا معاشرتی انقلاب رونما ہو چکا ہے۔ کراچی کے باشندوں اور ان کے نمائندوں کا فرض ہے کہ وہ ان تبدیلیوں کی مطابقت میں موزوں ادارے قائم کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔ ان معاشرتی تبدیلیوں کا ساتھ دینے سے پہلو تہی کرنے کا نتیجہ مزید انتشار اور خون خرابے کی صورت میں برآمد ہو گا۔

کراچی کی صورتِ حال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان میں سے اکثر تحریریں سینہ کوبی اور ماضی کے ماتم پر مشتمل ہیں۔ متعدد تحریروں میں معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی صورتِ حال کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے۔ چند ایک تحریروں میں شہری انتظامی ایجنسیوں، عدالتی نظام اور بلدیاتی اداروں کی تشکیلِ نو سے متعلق تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ کراچی کے مسایل کے مختلف عناصر کا احاطہ کرتے ہوئے صورتِ حال کا واضح جائزہ لیا جائے۔ اس طرح کے جائزے سے تین اہم امور سامنے آتے ہیں:

(۱) کراچی کے باشندے ملک کے سیاسی عمل سے مکمل طور پر علیحدہ کر دیے گئے ہیں اور اقتدار

Scanned with CamScanner

کے مراکز میں کسی بھی سطح کی رسائی نہیں رکھتے۔ کئی منتخب رہنما جیل میں ہیں اور جس سیاسی پارٹی کو انھوں نے ووٹ دیے تھے اسے برسرِ اقتدار پارٹی ظلم واستبداد کا نشانہ بنائے ہوئے ہے۔

(۲) کراچی کی انتظامیہ بدعنوان، نااہل اور بے بس ہے۔ شہری ایجنسیاں اور ان کے ملازمین ٹھیکے داروں اور لینڈ مافیا کے خدمت گزار بن چکے ہیں۔ شہر کے ترقیاتی ادارے بدعنوان سیاست دانوں، زمین کے قبضہ گیروں، ڈویلپروں اور ان کے حواریوں کے مفادات کی خدمت کرتے ہیں۔ متعدد قومی اور بین الاقوامی کنسلٹنٹ شہر کی ترقی کے لیے عظیم الشان منصوبے تیار کرتے ہیں جو شہر کی حقیقی صورتِ حال سے قطعی مطابقت نہیں رکھتے۔ نتیجتاً یا تو ایسے منصوبوں پر کبھی عمل نہیں ہوتا، یا انھیں ادھورا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کو مدتوں سے سیاسی مخالفین پر ظلم و تشدد کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے، چناں چہ وہ کسی کو جواب دہ نہیں رہ گئی ہیں۔ بے بس شہریوں سے جبراً پیسے بٹورنے اور پورے پورے محلوں کو یرغمال بنانے کے علاوہ وہ نہ صرف تمام مجرمانہ سرگرمیوں کو تحفظ دیتی ہیں بلکہ ان میں پوری طرح ملوث ہیں۔ کراچی کے شہری ان ایجنسیوں سے خوف کھاتے اور نفرت کرتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایجنسیوں میں مختلف سطحوں پر سفارش کی بنیاد پر ملازم رکھے گئے افراد متعین ہیں جو اپنے عہدے کے لیے ضروری قابلیت نہیں رکھتے۔ چوں کہ ان کا تقرر سیاسی بنیاد پر کیا گیا ہے، اس لیے وہ کسی نظم وضبط کے پابند نہیں ہیں۔

(۳) شہر کے اونچے طبقوں، تاجروں، پیشہ ور ماہروں اور دانش وروں کا شہر کے مسائل گرفتہ علاقوں اور ان میں رہنے والے شہریوں سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ درحقیقت کراچی کے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی منظر نے مختلف طبقوں کے درمیان اس قسم کے رابطوں کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ اسی لیے یہ اونچے طبقے، جو کسی بھی شہر کے لیے ایک اثاثہ اور شہر کے مسائل کے حل کا وسیلہ ہوتے ہیں، کراچی کے بحران کے حل کے لیے محض نیک اندیش (مگر بے معنی) امن ریلیاں اور سیمینار منعقد کرنے اور سفید جھنڈے لے کر جلوس نکالنے ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ قانون کے احترام اور اطلاق کی عدم موجودگی میں یہ طبقے بھی رشوت اور تعلقات کے ذریعے اپنے مالی مفادات کا دفاع کرنے پر مجبور ہیں اور اس طرح درحقیقت نہ صرف جرائم اور استحصال کے نظام کا سہارا بن چکے ہیں بلکہ سیاسی سازباز اور ظلم و جبر کے عمل میں ایک فریق بھی ہیں۔

***

کوئی بھی شہر، خواہ وہ معاشرتی اور آبادیاتی طور پر کتنا ہی مستحکم کیوں نہ ہو، پُرامن نہیں رہ سکتا اگر اسے سیاسی عمل سے علیحدہ اور اقتدار کے مرکزوں تک رسائی سے محروم کر دیا جائے، اگر اس کی انتظامیہ اور شہری ایجنسیاں بدعنوان اور نااہل ہوں اور اگر اس کے اہلِ رائے باشندے بے بس اور تنہا رہ جائیں۔

ایسی صورت میں انتہاپسند ـــــ جو ہر سیاسی نظریے یا رجحان کی بیرونی سرحد پر موجود ہوتے ہیں ـــــ حالات کے رخ کو کنٹرول کرنے لگتے ہیں۔ تاریخ میں کئی شہروں میں اسی طرح ہوا ہے اور حالیہ زمانے میں متعدد لاطینی امریکی، ایشیائی اور افریقی شہر انھیں حالات سے گزرے ہیں۔

کراچی میں انتشار کا عمل قیامِ پاکستان کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ تاہم، شہر کی موجودہ صورتِ حال ۱۹۸۰ کے عشرے سے شروع ہوئی ہے۔ افغان جنگ کے دوران کراچی منشیات اور اسلحے کے مافیا کا علاقائی ہیڈکوارٹر بن گیا۔ مافیا نے جلد ہی شہر کی معیشت اور سیاست میں اپنی اہم جگہ بنالی اور اس طرح انتظامی امور میں بھی دخیل ہو گیا۔ اہلِ اقتدار افراد اور اداروں نے مافیا کی بڑے پیمانے پر سرپرستی کی۔ انھیں دنوں میں مارشل لا حکومت نے شہر کے تمام انتہاپسند سیاسی، مذہبی اور لسانی گروپوں کو اسلحہ اور سرمایہ فراہم کیا تاکہ انھیں حکومت کی مخالف کسی شورش کو دبانے کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ رشوتیں اور ملازمتیں دے کر سیاسی وفاداریاں خریدی گئیں۔ اگرچہ یہ عمل کراچی یا پاکستان کے لیے نیا نہیں تھا، مگر ۱۹۸۰ کے عشرے میں اس طریقِ کار کو باقاعدہ رواج بنا دیا گیا، اور اس سے شہری زندگی کا ہر پہلو متاثر ہوا۔ اس عمل نے سیاسی تشدد اور ظالمانہ دھاندلیوں کے کلچر کو مستحکم کیا، اور کراچی کی انتظامی اور شہری ایجنسیاں اس عمل کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کرتی رہیں۔ بدقسمتی سے یہ عمل مارشل لا کے خاتمے کے بعد بھی جاری رہا اور نہ صرف کراچی کی انتظامیہ بلکہ شہر کے ڈرامے کے تمام سیاسی اداکار اپنا اپنا کردار ضیاالحق کے دور میں تیار کردہ مسودے کے مطابق انجام دیتے رہے۔ حکومتی ایجنسیوں اور پیپلز پارٹی کا کردار ایم کیو ایم (الطاف گروپ) اور ایم کیو ایم (حقیقی) کی تقسیم اور تصادم کی صورت میں واضح ہے۔ ایم کیو ایم کی جانب سے جام صادق کی حکومت کی غیر اصولی حمایت اسی ڈرامے کا دوسرا حصہ ہے۔ مراعات دینے کے لیے کراچی کے سرکاری شہری محکموں کو غیر ضروری ملازمین سے بھر دینا بھی اسی کی ایک مثال ہے۔

مارشل لا کے خاتمے کے بعد بھی مہاجر تشخص کے اُبھرنے اور نتیجتاً سندھ کے دو حصوں میں بٹ جانے سے پیدا ہونے والے مسائل پر کسی جانب سے کوئی اصولی اور حقیقت پسندانہ موقف اختیار نہیں کیا گیا؛ تمام پارٹیوں (بشمول ایم کیو ایم) نے موقع پرستی کا رویہ اختیار کیے رکھا۔ مسائل کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے اور انتہاپسندانہ موقف دونوں جانب اس قدر سخت ہو چکے ہیں کہ لوگوں نے اب اس پر اعتراض کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ مسائل کے حل کے سلسلے میں کراچی کے باشندوں کی آخری امیدیں "دہشت گردوں" کے خلاف آرمی ایکشن سے ختم ہو گئیں۔ کراچی کے غریب اور نچلی درمیانہ آمدنی کے تمام علاقوں نے (اپنی آبادی کے لسانی پس منظر سے قطع نظر) اس ایکشن کے نتیجے میں تکلیف اٹھائی ہے، اور بہت سوں کی جانیں ضائع ہوئی ہیں۔ جس بے حسی کے ساتھ یہ ایکشن شروع کیا گیا اور بعد میں پیپلز پارٹی کے رہنماؤں نے کراچی کے بارے میں جس قسم کے بیانات دیے ہیں، ان کے نتیجے میں کراچی کے سیاسی میدان میں کٹر انتہاپسندوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا اضافہ ہو گیا ہے۔ کراچی کی

Scanned with CamScanner

صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے مستحکم اقدامات کی ضرورت ہے جو صرف اسی وقت کیے جا سکتے ہیں جب تمام متعلقہ پارٹیوں کے قائدین کراچی اور پاکستان کے مجموعی مفاد کی خاطر ادنیٰ ذاتی اور پارٹی مفادات سے بلند ہو سکیں۔

(۱) سب سے پہلے پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے درمیان مکالمے کے لیے ایک سازگار فضا قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ابتدائی اقدامات حکومت کو کرنے ہوں گے اور ایم کیو ایم کو ان کا فراخ دلی کے ساتھ جواب دینا ہوگا۔ اگر اس کے لیے ایم کیو ایم کے رہنماؤں کے خلاف مقدمات کا واپس لینا ضروری ہو تو حکومت کو اس پہلو پر بھی ہمدردی سے غور کرنا چاہیے۔ یہ پہلی مرتبہ نہیں ہوگا (اور یقیناً آخری مرتبہ بھی نہیں) کہ "دہشت گرد" اور "مجرم" قرار دیے جانے والوں سے کوئی "جائز" حکومت مذاکرات کا آغاز کرے۔ ان مذاکرات میں پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کی لیڈرشپ سندھ میں شہری دیہی تفریق ختم کرنے، یا بصورتِ دیگر اسے تسلیم کر کے باقاعدہ ادارے کی صورت دینے پر اپنی توجہ مرکوز کرے۔ واضح رہے کہ اس کا مطلب لازمی طور پر سندھ کی تقسیم نہیں ہے، بلکہ بلدیاتی اداروں کو زیادہ اختیارات اور خود مختاری دے کر بھی ایسا کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جو فیصلے کیے جائیں وہ سیاسی طور پر حقیقت پسندانہ، انتظامی اعتبار سے قابلِ عمل اور اقتصادی اور آبادیاتی لحاظ سے پائیدار اور خود کفیل ہوں۔

(۲) کراچی کی انتظامیہ کو بامقصد بنایا جائے اور اس کی تشکیلِ نو کی جائے کیوں کہ اس کے بغیر پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے درمیان کوئی بھی معاہدہ کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ حکومت کو چاہیے کہ چیف سیکرٹری، کمشنر، انسپکٹر جنرل پولیس، کے ڈی اے کے ڈائرکٹر جنرل اور کے ایم سی کے سربراہ کو کم از کم پانچ سال کے لیے مقرر کرے۔ ان افسروں کا تقرر ایم کیو ایم کی رضامندی سے کیا جانا چاہیے۔ یہ سب ایک ٹیم کی صورت میں کام کریں اور انھیں کراچی کی انتظامیہ اور شہری ایجنسیوں کی مکمل تشکیلِ نو کا مکمل طور پر ذمے دار بنایا جائے۔ اس ضرورت کے تحت انھیں وسیع اختیارات دینے ہوں گے: وہ اپنا ماتحت عملہ خود منتخب کرنے اور نااہل ملازمین کو برطرف کرنے کے مجاز ہوں۔ حکومت اور ایم کیو ایم دونوں ان افسروں کو دھمکانے یا ان پر دباؤ ڈالنے سے باز رہنے کی ضمانت فراہم کریں۔ ان افسروں کی اعانت کے لیے ہر سطح پر شہر کی بنیادی صورتِ حال کا تجربہ اور ادراک رکھنے والی غیر سرکاری تنظیموں، کمیونٹی کے نمائندوں اور ان ماہرین پر مشتمل شہری کمیٹیاں قائم کی جائیں۔ ان تمام اقدامات کی نگرانی ایک غیر جانبدار کمیٹی کرے اور وہی ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کے معاہدے کے نفاذ کی بھی نگرانی کرے۔ اس طرح جواب دہی، نگرانی اور شفافیت کا نظام وجود میں آ سکتا ہے جس میں شہر کے باشندے نہ صرف شریک ہوں گے بلکہ اس کو کنٹرول بھی کریں گے۔

(۳) بلدیاتی اداروں کے انتخابات شہری انتظامیہ کی تشکیلِ نو کے فوراً بعد ــــ اور بحالی کا عمل شروع ہونے کے ۱۸ ماہ کے اندر اندر ــــ منعقد کرا دیے جائیں۔

(۴) بلدیاتی اداروں کے ڈھانچے میں مناسب تبدیلی کی جائے۔ لوکل گورنمنٹ کو ترقیاتی منصوبے تیار اور نافذ کرنے اور محصولات جمع کرنے کا اختیار دیا جائے اور امن و امان قائم رکھنے کے عمل میں ایک فریق کے طور پر شریک کیا جائے۔ منتخب کاؤنسلوں کے ادارے کو زیادہ مستحکم بنایا جائے اور انھیں اپنے علاقوں میں شہری سہولتوں کی منصوبہ بندی کرنے اور عمل میں لانے کا براہِ راست یا بالواسطہ ذمے دار بنایا جائے۔

اگر کراچی کی صورتِ حال کے تمام فریق دیانت داری سے اس بد قسمت شہر کو پُرامن بنانے کی خواہش رکھتے ہیں تو انھیں اس قابلِ عمل ایجنڈے کو مکمل طور پر نافذ کرنا ہوگا۔ پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے درمیان کوئی مفاہمت شہر کی انتظامیہ کو نئی شکل دیے بغیر شہر کے مسائل حل نہیں کر سکے گی۔ حکومت کی جانب سے غیر قانونی تارکینِ وطن پر سختی یا محلّہ کمیٹیوں کو اسلحہ دینے کی کوششیں نہ صرف ناکام ہوں گی بلکہ ان اقدامات سے صورتِ حال اور زیادہ بگڑ جائے گی۔ اوّل الذکر اقدام کے نتیجے میں بے بس شہریوں سے بڑے پیمانے پر جبری رشوت کی وصولی کا عمل تیز ہوگا جو ان میں اور زیادہ احساسِ بے گانگی پیدا کرے گا۔ دوسرے اقدام سے بیشتر صورتوں میں محلّے کی سطح پر نئے مافیا وجود میں آئیں گے جنھیں قانون نافذ کرنے والی بد عنوان ایجنسیوں کی سرپرستی حاصل ہو گی۔ بلدیاتی انتخابات کا انعقاد ہی وہ واحد طریقہ ہے جس سے کراچی کے لوگ اقتدار میں شراکت حاصل کر سکتے ہیں۔

کراچی جیسی صورتِ حال کئی اعتبار سے پاکستان میں ہر جگہ موجود ہے۔ سیاسی عمل سے کاٹ دی گئی آبادیاں اور بد عنوان اور نااہل انتظامیہ ہر جگہ موجود ہے۔ بحران کے موقعے پر ہر جگہ کراچی جیسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ کراچی کی صورتِ حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے مندرجہ بالا اقدامات کامیاب ہو کر پورے پاکستان کے لیے مثال بن سکتے ہیں۔ جو کوئی اس ملک کے زوال سے پہلے ان اقدامات پر عمل کرا سکے، اسے تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔

***

بحران کی شدّت

"کراچی آتش فشانوں میں گھرا ہوا ہے۔
اختر حمید خاں (۱۹۸۳ میں کراچی کی کچی آبادیوں سے متعلق ایک بیان۔)

کراچی کی صورتِ حال کی رپورٹوں کے مطابق گزشتہ ڈیڑھ سال کے عرصے میں بیسیوں افراد پولیس کی حراست میں مارے گئے، بہت سے افراد نام نہاد پولیس مقابلوں میں ہلاک کیے گئے اور ۱۲ سے ۷۰ سال تک کی عمر کے پچاس ہزار سے زائد افراد کو قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں نے زدو کوب کیا اور ان

Scanned with CamScanner

کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر انھیں تھانوں اور میدانوں میں لے جایا گیا جہاں نقاب پوش مخبروں سے ان کی شناخت کرائی گئی۔ ان کارروائیوں میں اکثر لوگوں کو (ان کی عمر سے قطع نظر) اپنی قمیصیں اتارنے کا حکم دیا گیا اور ان کی آنکھوں پر انھیں قمیصوں سے پٹی باندھی گئی۔ حراست میں لیے جانے والے متعدد افراد کا کہنا ہے کہ کئی گھنٹوں تک ان کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی رہیں اور اس دوران ان کو نہ پانی اور کھانا ملا اور نہ رفعِ حاجت کے لیے جانے دیا گیا۔ کئی لوگوں نے اپنی شلوار میں پیشاب کر دیا۔ اس کے علاوہ کراچی میں پولیس والے بھی سیکڑوں کی تعداد میں مارے گئے۔

محاصرے میں آنے والے تمام علاقوں سے ایک جیسی خبریں موصول ہوئی ہیں۔ قانون نافذ کرنے والے لات مار کر گھر کا دروازہ توڑ دیتے ہیں، وہ مکینوں کو گالیاں بکتے اور ذلیل کرتے ہیں، اور بہت سے موقعوں پر گھر کے افراد کے ساتھ ساتھ قیمتی اشیا بھی لے جاتے ہیں۔ کئی لوگوں نے بتایا کہ انھوں نے اپنے گھر کے افراد کو رہا کرانے کے لیے قانون نافذ کرنے والوں کو پانچ ہزار سے پچاس ہزار روپے تک رشوت کے طور پر ادا کیے ہیں۔ حراست کے دوران ان لوگوں پر اتنا تشدد کیا گیا کہ ان میں سے کم ہی اپنے پیروں پر چل کر گھر واپس پہنچ سکے۔ کئی افراد جنھوں نے قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں یا ان کے دلالوں کو رشوت دی ہے، بتاتے ہیں کہ یہ رقم انھوں نے اپنی قیمتی اشیا (زیادہ تر زیورات) فروخت کر کے، اپنا مکان گروی رکھ کر یا ۱۰ سے ۱۵ فیصد ماہانہ کی شرح پر پیشہ ور سود خوروں سے قرض لے کر ادا کی — انھیں نہیں معلوم کہ وہ یہ قرض کس طرح ادا کریں گے۔

اس کے علاوہ اپنے گرفتار شدہ رشتےداروں کا پتا لگانا بھی سخت دشوار کام ہے۔ کئی کئی دن دلالوں سے گفت و شنید میں گزر جاتے ہیں (یہ دلال قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں اور لوگوں کے درمیان رابطہ کرانے کے لیے اچانک نمودار ہو جاتے ہیں اور اپنی خدمات کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں)۔ گھر والوں کو انتظامیہ اور اس کے دلالوں کی طرف سے بار بار بتایا جاتا ہے کہ ان کے گھر کے زیرِ حراست فرد کے دہشت گرد ہونے کا ناقابلِ تردید ثبوت موجود ہے اور اسے موت کی سزا ملے گی؛ ان حربوں کی وجہ سے "تاوان" کی رقم بڑھ جاتی ہے۔ شہریوں کا کہنا ہے کہ رشوت کی رقم کا تعین زیرِ حراست فرد کی لسانی شناخت، اور اس کے رشتےداروں کی مالی حالت اور انتظامیہ یا حکومت کے حامی سیاست دانوں تک رسائی کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔

محاصرہ اٹھنے کے بعد علاقے میں متعدد ڈکیتیاں ہوتی ہیں۔ اسلحہ بردار افراد، جو کبھی کبھی اپنا چہرہ ڈھانکے ہوتے ہیں، لوگوں کے گھروں میں داخل ہو جاتے ہیں اور اسلحے کے زور پر قیمتی اشیا یا رقم لوٹ لیتے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ ان ڈکیتیوں میں پولیس ملوث ہوتی ہے کیوں کہ دوسرے تمام مشتبہ افراد علاقے سے بھاگ چکے ہوتے ہیں۔ لوگ خوف کے باعث ان واقعات کی رپورٹیں درج نہیں کراتے۔ اگر ان محاصروں کا مقصد لوگوں کو بے انتہا خوف زدہ کرنا اور ان کے دلوں سے شہر کی انتظامیہ پر رہے سہے اعتبار کو ختم کرنا ہے تو بلاشبہ یہ مقصد مکمل طور پر حاصل ہوا ہے۔

Scanned with CamScanner

جن علاقوں میں محاصرے کیے گئے ہیں وہ غریب اور مزدور پیشہ طبقوں کے علاقے ہیں۔ ان باشندوں کا قومی اسمبلی میں کوئی نمائندہ نہیں ہے، ان کے صوبائی اسمبلی کے رکن اور کاؤنسلر یا تو قید میں ہیں یا روپوش ہیں؛ پاکستان کے دوسرے علاقوں کے باشندوں کے برخلاف، ان کی کوئی برادری یا کوئی چودھری نہیں ہے، نہ جرگے یا پنچائت کی طرح کا کوئی ادارہ ہے جو ان کے اور حکومتی ایجنسیوں کے درمیان رابطے کا کام انجام دے سکے۔

پولیس اور رینجروں کی کارروائیوں کی وجہ سے ان علاقوں کے متموّل اور نسبتاً بااثر باشندے، جو ان حالات میں رابطے کا کام کر سکتے تھے، ان علاقوں کو چھوڑ چکے ہیں یا چھوڑنے والے ہیں۔ ان علاقوں میں مکانوں کی قیمتیں تیزی سے گری ہیں (جبکہ پُرامن علاقوں میں مکانوں کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے) اور ان میں سے بعض علاقوں میں ۳۰ فیصد کے قریب مکان خالی پڑے ہیں۔ اثرورسوخ رکھنے والے باشندوں کے چلے جانے سے ان علاقوں کے رہنے والے پولیس کے خوف زدہ کرکے جبری رشوت وصول کرنے، مافیا کے استحصال، کے ایم سی، کے ڈی اے اور کے ای ایس سی کی بے حسی اور بدعنوانی، اور دلالوں اور ٹھیکے داروں کی غنڈا گردیوں کے مقابل خود کو بالکل بےمدافعت سمجھنے لگے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: "اب تو کوئی فریاد سننے والا بھی نہیں رہا۔"

کراچی میں حکومت سے وابستہ یا غیروابستہ کچھ حلقے پولیس اور رینجروں کی کارروائیوں کی مکمل حمایت کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کارروائیوں کی وجہ سے سیاسی دہشت گردی کی کمر ٹوٹ گئی ہے اور انھیں جاری رکھ کر دہشت گردی کا مکمل خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جن علاقوں میں محاصرے کیے جا رہے ہیں وہاں دہشت گردوں کی حمایت کی جاتی ہے، چناں چہ ان علاقوں کو اس بات کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ اس کے علاوہ بعض لوگ ایسے ہیں جو ماورائے عدالت ہلاکتوں (extra-judicial killings) کو بھی درگزر کرنے کو تیار ہیں۔ ان کی دلیل ہے کہ اگر قانونی تقاضوں کا خیال رکھا جائے تو استغاثے کی نااہلی اور بدعنوانی، اور زیرِزمین مجرم گروہوں اور سیاسی اسٹیبلشمنٹ سے قریبی رابطوں، کی وجہ سے بیشتر گرفتارشدہ ملزم عدالتوں سے بری ہو جائیں گے۔ وہ اپنی بات کی شہادت میں کئی نظیریں بھی پیش کرتے ہیں۔

تاہم، اس طرح کی رائے رکھنے والے افراد دو اہم نکتوں کو نظرانداز کر رہے ہیں: (۱) پاکستان کے سیاسی اور انتظامی کلچر اور کراچی میں انارکی کی صورتِ حال کے پیشِ نظر لوگوں کو قتل کرنے کی آزادی کا لازماً سیاسی انتقام لینے کی غرض سے استعمال ہوگا اور اس کے نتیجے میں مروجہ عدالتی اور انتظامی طریقِ کار کو پسِ پشت ڈال کر لوگوں کا بدترین استحصال کیا جائے گا۔ اخباری رپورٹوں اور شہر کے مضافاتی (peri-urban) علاقوں سے ملنے والی خبروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ قتل کرنے کی آزادی کا بےروک ٹوک استعمال بڑھ رہا ہے۔ اگر یہ خبریں درست ہیں، اور اگر یہ عمل جاری رہتا ہے، تو تاریخ یہی کہتی ہے کہ اس کے ردِعمل میں اہم سیاسی تغیر یا انقلاب رونما ہوتا ہے۔

(۲) کراچی کی صورتِ حال کی بنیادی وجوہ صرف مہاجر حلقوں میں احساسِ محرومی، ایک موثر شہری حکومت کی عدم موجودگی، مہاجر نوجوانوں کا جنون اور سادہ لوحی اور مہاجر لیڈرشپ کی شرانگیز مگر سپرمین جیسی خصوصیات نہیں ہیں۔ نہ ہی اس کا سبب محض بے رحم ڈکٹیٹر اور سیاست داں، افغان جنگ کی باقیات یا شہر میں موجود مختلف مافیاؤں کی ہوسِ زر اور اندھی قوت ہے۔

یہ درست ہے کہ یہ تمام عوامل کراچی کی صورتِ حال پر اثرانداز ہوئے ہیں۔ لیکن اس صورتِ حال کی بنیادی وجہ شہری سرمایہ دارانہ کلچر کا پاکستان میں رائج طرزِ حکومت (جو اقرباپروری، بدعنوانی، تعصب اور استحصال پر مبنی ہے) سے تصادم ہے۔ یہ تصادم اس گہرے احساسِ علیحدگی سے پیدا ہوا ہے جو شہر کے نچلے درمیانہ اور مزدور طبقے میں موجود ہے۔ یہ علیحدگی کا احساس پاکستان کے دوسرے شہروں میں بھی پھیل رہا ہے، مگر اب تک کہیں اور اس احساس کا سیاسی شکل میں اظہار نہیں ہوا ہے۔ اس احساسِ علیحدگی کو ختم کرنے کے لیے کراچی کے مہاجر اور غیرمہاجر نوجوان ہر اُس قیادت کا ساتھ دینے کو آمادہ ہوں گے جو حکومت کے روایتی طرزِ عمل سے، یا خود حکومت سے، جنگ کرے گی۔ ایم کیو ایم کی لسانی شناخت کے باعث زیادہ تر غیرمہاجر اس سے اپنا تعلق قائم نہیں کر سکے؛ اس کے باوجود یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے کہ کراچی کی غیرمہاجر آبادی نے ایم کیو ایم کے خلاف پولیس اور رینجرز کی کارروائیوں کی حمایت نہیں کی ہے۔

ایس ایچ او بہادر علی کے قتل کے واقعے سے حکومت اور کراچی کے نچلے درمیانہ طبقے کے درمیان فاصلے کی بخوبی نشان دہی ہوتی ہے۔ مئی ۱۹۹۴ میں تیموریہ تھانے کے ایس ایچ او بہادر علی اور چار سپاہیوں کے "دہشت گردوں" کے ہاتھوں قتل ہونے کے بعد وزیراعظم پاکستان اور وزیراعلیٰ سندھ نے مقتول پولیس اہلکاروں کو خراجِ تحسین پیش کیا اور ان کے خاندانوں کو خاطرخواہ معاوضہ دیا، جب کہ مذکورہ تھانے کی حدود میں واقع محلوں میں شہریوں نے مٹھائی بانٹ کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

کراچی ماسٹر پلان کے سروے کے مطابق شہر میں نچلے درمیانہ طبقے کی آبادی، جو ۱۹۷۳ میں کراچی کی کل آبادی کا ۱۴ فیصد تھی، ۱۹۸۹ میں شہر کی آبادی کے ۳۱ فیصد تک پہنچ چکی تھی۔ ۱۹۷۳ میں شہر میں نچلی درمیانہ آمدنی والے گھروں کی تعداد ۷۰ ہزار تھی جب کہ ۱۹۸۰ میں یہ تعداد دولاکھ اور ۱۹۸۹ میں پانچ لاکھ کو عبور کر چکی تھی۔ ان طبقوں کی محرومیاں اور ان کا سیاسی اظہار شہر کی کچی آبادیوں سے اپنی قوت حاصل کرتا ہے۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ کراچی میں (سرکاری شمار کے مطابق) ۴۰ فیصد سے (غیرسرکاری شمار کے مطابق) ۵۰ فیصد تک شہری کچی آبادیوں میں رہتے ہیں۔ گزشتہ عشرے میں کچی آبادیاں ۹ فیصد سالانہ کی شرح سے بڑھی ہیں جب کہ شہر کی آبادی میں مجموعی اضافے کی شرح ۴.۸ فیصد سالانہ رہی ہے۔ ان میں سب سے پرانی کچی آبادیوں کے بیشتر مکین مہاجر ہیں جبکہ بعد میں قائم ہونے والی کچی آبادیوں کے مکینوں میں ملک کے شمالی علاقوں سے آنے والے لوگ بھی بڑی تعداد میں شامل ہیں۔

Scanned with CamScanner

کچی آبادیاں اس لیے وجود میں آئی ہیں کہ حکومت نچلے درمیانہ اور مزدور طبقے کو معقول قیمت پر اور جائز طریقے سے رہائشی زمین فراہم نہیں کر سکتی۔ ان کے لیے واحد راستا دلّالوں سے (جن کو بد عنوان سرکاری افسروں کی پشت پناہی حاصل ہے) غیر قانونی طور پر ڈویلپ کی ہوئی زمین خریدنے کا ہے۔ کچی آبادیوں میں ابتدائی پانچ سے دس سال تک ہر قسم کا استحصال ہوتا ہے۔ اس رقم کا بڑا حصہ جو کچی آبادیوں کے باشندے دلّالوں کو ادا کرتے ہیں، پولیس اور متعلقہ حکومتی ایجنسیوں کے اہلکاروں کو پہنچتا ہے۔ تاہم، اتنا وقت گزرنے پر بھی پولیس کے دلّالوں کے ہاتھوں جبری وصولی کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ جب کچی آبادی میں کوئی شخص اپنی زمین کے گرد پکی دیوار اٹھاتا ہے یا مکان میں لیٹرین بنواتا ہے، تھانے کے دلّال فوراً وصولی کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ جب کوئی اپنے مکان کو پکّا کراتا ہے، خاص طور پر جب کنکریٹ کی چھت ڈالی جا رہی ہوتی ہے، تھانے کے دلّال دوبارہ آ کر رقم وصول کرتے ہیں۔ جب بھی علاقے کے تھانے کو رقم کی ضرورت ہوتی ہے، نئی کچی آبادیوں کو ڈھا دینے کی دھمکی دی جاتی ہے، اور اس دھمکی کو مزید موثر بنانے کے لیے چند مکان ڈھا بھی دیے جاتے ہیں۔ آبادی کے باشندے پھر پیسے جمع کرتے ہیں اور دلّال کے حوالے کرتے ہیں۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ ابتدائی پانچ برسوں میں کچی آبادیوں کے غریب مکین کم از کم پندرہ سے بیس ہزار روپے تک مختلف ایجنسیوں کے دلّالوں کو رشوت کے طور پر ادا کرتے ہیں تاکہ اُس زمین پر سکون سے رہ سکیں جس کے لیے انھوں نے تین ہزار سے پندرہ ہزار روپے تک ادا کیے ہیں۔

یہ کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ بجلی کے کنکشن کا ڈیمانڈ نوٹ حاصل کرنے کے لیے کچی آبادیوں کے باشندوں کو ساڑھے تین ہزار روپے رشوت دینی پڑتی ہے۔ ڈیمانڈ نوٹ مل جانے کے بعد بعض اوقات دس ہزار روپے تک کنکشن دینے کے لیے رشوت کے طور پر طلب کیے جاتے ہیں۔ ایسی بھی مثالیں ہیں کہ رشوت دینے کے بعد بھی چار سال تک کنکشن نہیں دیا گیا۔ یہ بھی عام ہے کہ کنکشن دینے کے بعد اسے منقطع کر دیا گیا اور لوگوں کو کے ای ایس سی اور تھانے کے دلّالوں نے مجبور کیا کہ وہ "کنڈا سسٹم" کے تحت چوری کی ہوئی بجلی حاصل کریں۔ اس کے لیے انھیں مستقل بھتا ادا کرنا پڑتا ہے اور اکثر انھیں کنڈے ہٹانے کا خوف دلا کر ان سے مزید رقم وصول کی جاتی ہے۔

ایک عام طریقہ یہ بھی ہے کہ علاقے میں پانی کی فراہمی منقطع کر دی جاتی ہے اور پھر باشندوں سے پانی بحال کرنے کے لیے رقم وصول کی جاتی ہے۔ سندھ کچی آبادی اتھارٹی (SKAA) کے لیے اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے کیے ہوئے ایک سروے سے ظاہر ہوتا ہے کہ غریب آبادیوں کے لیے مختص پانی اکثر زیادہ آمدنی والے علاقوں کو فراہم کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مون سون کے دنوں میں خوش حال علاقوں میں جمع ہونے والے بارش کے پانی کا رخ نشیبی کچی آبادیوں کی طرف موڑ دیا جاتا ہے۔

ان آبادیوں کے رہنے والے اپنے مسائل سے بخوبی واقف ہیں، مگر ان مسائل کے حل کے لیے ان کی متواتر کوششیں اس لیے ناکام رہتی ہیں کہ انھیں اقتدار کے مرکزوں تک کسی بھی سطح پر رسائی حاصل

نہیں ہے۔ اُن دنوں میں جب لوگوں کی نمائندگی منتخب کاؤنسلروں کے ذریعے ہورہی تھی، صورتِ حال میں تھوڑی سی بہتری آئی تھی۔

نچلی آمدنی والے طبقوں کے لیے ایک اہم پیش رفت حکومت کا کچی آبادی ریگولرائزیشن اینڈ امپروومنٹ پروگرام ہے۔ تاہم یہاں بھی رشوت ستانی کا زور ہے۔ سوائے سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے تحت چلنے والی اسکیموں کے، جائز طریقوں سے لیز کا حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ لیز دلالوں کے ذریعے تقریباً سات ہزار روپے ادا کر کے حاصل کی جاتی ہے، جبکہ اس کی سرکاری قیمت دو ہزار سے تین ہزار روپے تک ہے۔ اس کے علاوہ ریگولرائزیشن پروگرام کے دوران سیاست داں اور حکومت کے اہلکار پولیس کی حمایت سے لوگوں کو اچھے مقامات پر بنے ہوئے اپنے مکانوں سے دست بردار ہونے پر مجبور کرتے ہیں۔ اسی طرح رفاہی پلاٹوں پر قبضہ کر لیا جاتا ہے اور آخرکار ان قبضوں کو سیاست دانوں، سرکاری اہلکاروں اور مفادات رکھنے والے مقامی گروپوں کے گٹھ جوڑ سے ریگولرائز کر دیا جاتا ہے۔

کچی آبادیوں میں کسی بھی قسم کا کاروبار قائم کرنے اور جاری رکھنے کے لیے پولیس کو بھتا دینا پڑتا ہے۔ افراطِ زر کی شرح کے ساتھ ساتھ بھتے کی رقم میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ نچلی آمدنی میں ایک چھوٹے کھوکھے سے روزانہ تیس سے سو روپے تک بھتا لیا جاتا ہے۔ ایک حالیہ سروے سے معلوم ہوا ہے کہ صرف صدر کے علاقے میں پولیس اور سرکاری انتظامیہ دکان داروں، ہاکروں اور ٹرانسپورٹروں سے گیارہ کروڑ روپے ماہانہ بھتا وصول کرتی ہے۔

شہر کی زیادہ غریب کچی آبادیوں میں وِڈیو ہال، جوئے کے اڈے اور جسم فروشی کے خفیہ اڈے قائم ہیں۔ ان کے چلانے والوں کا اصرار ہے کہ درحقیقت قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں اس کاروبار میں شریک ہیں۔ ان کے دعوے کی تصدیق ڈرگ مافیا کو حاصل ہونے والی پولیس کی حمایت سے ہوتی ہے جس کے بارے میں اخباروں میں گاہے گاہے رپورٹیں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ کس طرح منشیات کے خلاف مہم چلانے والے کارکنوں کو قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں نے ہلاک کر دیا۔

نچلی درمیانہ آمدنی والے افراد کو اپنا کاروبار بڑھانے کے لیے قرضوں اور تکنیکی امداد تک رسائی حاصل نہیں ہے۔ ان کو کھلے بازار میں سرگرم پیشہ ور سودخوروں سے ۱۰ سے ۱۵ فیصد ماہانہ کی شرح پر قرض لینا پڑتا ہے۔ اس طرح ان کی کاروباری سرگرمیاں محدود ہو جاتی ہیں اور ان میں کام کرنے والے مزدوروں کا استحصال ہوتا ہے۔ کراچی ماسٹر پلان کے سروے کے مطابق شہر میں ۷۵ فیصد روزگار غیر رسمی سیکٹر فراہم کرتا ہے۔ اس کی تصدیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ صرف اورنگی میں چالیس ہزار چھوٹے تجارتی اور صنعتی یونٹ قائم ہیں۔

اس استحصالی صورتِ حال کا کراچی کے بالائی طبقے کو بخوبی علم ہے۔ کراچی میں ایک برانڈ نیو کار شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بغیر نمبر پلیٹ کے چلائی جا سکتی ہے، مگر کوئی شخص موٹر سائیکل پر، خواہ اس کے کاغذات درست اور مکمل بھی ہوں، بغیر پولیس کو رشوت دیے سفر نہیں کر

سکتا۔ بہت سے دفتروں میں جہاں شام کو دیر تک کام ہوتا ہے، موٹر سائیکلوں پر آنے جانے والے ملازمین گھر واپس جانے کے بجائے دفتر میں سو رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، کیوں کہ رات کو سفر کرنے کی صورت میں انھیں پولیس کو پچاس روپے سے دو سو روپے تک رشوت دینی پڑتی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی، خاتون دوست یا خاتون رشتے دار کے ساتھ موٹر سائیکل پر سفر کر رہا ہو تو رشوت کی رقم اور زیادہ ہو جاتی ہے کیوں کہ رشوت ادا نہ کرنے کی صورت میں تھانے لے جانے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور عموماً اپنی آمدنی کا ایک تہائی حصہ پولیس کو بھتّے کی صورت میں ادا کرتے ہیں۔ باہر سے کراچی آنے والے غریب لوگ جو مختلف اشیاء صرف فروخت کرنے کے لیے لے کر آتے ہیں، انھیں پولیس کو کثیر رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ ٹرک ڈرائیوروں، ٹھیلے پر چلنے والی سوزوکیوں اور پرانی گاڑیوں سے بھی بھتا وصول کیا جا رہا ہے۔

کراچی کی کچی آبادیوں میں ایک غیر سرکاری تنظیم کے تحت ہونے والی میٹنگ میں لوگوں کو اپنے بچوں کو کام پر بھیجنے کے بجائے اسکول میں داخل کرنے کی ترغیب دلائی گئی تھی۔ ایک باشندے نے کہا: "اگر ہم انھیں اسکول جانے دیں تو پولیس اور سرکاری اداروں کا منھ کیسے بھریں گے؟" کچی آبادیوں اور نچلے درمیانہ طبقے کے لوگوں کا ایمان ہے کہ ان سے ہتھیائی ہوئی رقموں ہی کی وجہ سے سیاست دانوں کے خاندانوں اور سرکاری اہلکاروں کی دولت کی ریل پیل قائم ہے۔

کراچی میں کوئی سیاسی مسئلہ پیدا نہ ہوتا اگر نچلی اور درمیانہ آمدنی والے طبقوں اور مزدور پیشہ لوگوں نے اپنے استحصال کو خاموشی سے گوارا کر لیا ہوتا۔ تاہم، ایسا نہیں ہوا۔ یہ لوگ اپنی معاشی اور معاشرتی ترقی کے لیے متواتر جدوجہد کر رہے ہیں۔ شہر میں ایم کیو ایم کے وسیع ووٹ بینک کے موجود ہونے کے دو اسباب ہیں: اول، قومی سیاسی پارٹیوں کی لیڈر شپ، ایم کیو ایم کے برخلاف، درمیانہ یا محنت کش طبقے سے تعلق نہیں رکھتی اور نہ واضح طور پر ان لوگوں کے مسائل حل کرنے سے کوئی دل چسپی رکھتی ہے۔ دوم، مناسب شہری اداروں کی عدم موجودگی۔ اس عدم موجودگی کے نتیجے میں کیے جانے والے استحصال نے لوگوں کے درمیان لسانی اور نسلی بنیاد پر اتحاد کو مضبوط بنا دیا ہے۔

***

حل کہاں سے آئے گا؟

"دہشت گردوں" کے خلاف حالیہ مہم یا حکومت اور ایم کیو ایم کے درمیان مذاکرات کا جو بھی نتیجہ نکلے، کراچی میں طویل المدت امن شہر میں رونما ہونے والے معاشرتی انقلاب کو سیاسی طور پر مستحکم کیے

Scanned with CamScanner

بغیر حاصل نہیں ہو گا۔ یہ معاشرتی تبدیلیاں اُس وقت تک مستحکم نہیں ہو سکتیں جب تک اس شہر کے دانش ور شہر کی ترقیات اور ایک موثر لوکل گورنمنٹ کے لیے ایک تفصیلی خاکہ تیار نہ کریں۔ اس خاکے کی تیاری کے بعد انھیں ان سیاسی جماعتوں اور تنظیموں کی حمایت حاصل کرنی ہو گی جو اس شہر کی نمائندگی کا دعویٰ کرتی ہیں۔ انھیں اس سلسلے میں کراچی کی بے شمار کمیونٹی انجمنوں اور غیر سرکاری تنظیموں سے بھی رابطہ قائم کرنا ہو گا۔ انھیں اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سیاسی طریق کار کے تحت جدوجہد کرنی ہو گی اور اس تحریک سے حاصل ہونے والے نتائج کی احتیاط کے ساتھ نگہداشت کرنی ہو گی تاکہ انارکی کی دوسری بڑی لہر کو روکا جا سکے۔ یہ کام شروع کرنے سے پہلے اس بات کو تسلیم کرنا لازمی ہے کہ کراچی میں شہری منصوبہ بندی اور انتظام کا مروجہ طریقِ کار شاید محاصروں اور ماورائے عدالت قتل کی وارداتوں سے بھی بڑھ کر انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے، اور یہ طریقِ حکومت اور شہر کے نچلے درمیانہ اور مزدور طبقے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔

کراچی کی موجودہ صورت حال پاکستان میں پیش آنے والے بڑے بحران کا پیش خیمہ ہے۔ سرمایہ دارانہ زراعت، شہری آبادی میں اضافے اور شرحِ خواندگی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ پرانے طبقاتی رشتے تبدیل ہو چکے ہیں۔ لسانی گروہ اور نسلی برادریاں جنھیں تاریخ نے ایک خاص مقصد پورا کرنے کے لیے چنا تھا، اب اپنے سے زیادہ ترقی یافتہ گروہوں اور برادریوں سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس نئی صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے نئے ادارے اب تک وجود میں نہیں آئے ہیں اور قدیم ادارے غیر متعلق، غیر موثر اور مکمل طور پر بد عنوان ہو چکے ہیں۔

***

کسی معاشرے کی سماجی اور اقتصادی حقیقتوں کا ریاست کے فرسودہ ڈھانچے اور انتظامی کلچر کے ساتھ تصادم، جو پاکستان میں پیش آ رہا ہے، کوئی انوکھی بات نہیں۔ تاریخ میں اس قسم کا شدید ترین تصادم اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے یورپ میں پیش آ چکا ہے۔ تب بھی اس تصادم کا حل ـــــ خواہ وہ اصلاحات کی صورت میں ہو یا انقلاب کی شکل میں ـــــ بیورو کریسی، طاقت ور طبقوں یا اسٹیبلشمنٹ سے وابستہ سیاست دانوں کے ہاتھوں نہیں نکلا تھا، اور آج پاکستان میں بھی اُن سے موجودہ تصادم کا کوئی حل نکالنے کی توقع کرنا نادانی ہو گی۔

تبدیل شدہ معاشرتی اور اقتصادی حقائق کو اداروں کی شکل دینے کے لیے زمین ہموار کرنے کا کام ہمیشہ دانش ور طبقے، پیشہ ور ماہرین کی انجمنوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں نے کیا ہے۔ ادیب اور مفکر سماجی ناانصافیوں، معاشی محرومیوں اور غیر موزوں ریاستی اداروں کو اپنی تحریروں کا موضوع بناتے ہیں، معاشرے کو لاحق روگ کے اسباب تلاش کرتے ہیں اور ان اسباب کی بنیاد پر کسی ممکنہ حل کی سمت تجویز

Scanned with CamScanner

کرتے ہیں۔ پیشہ ور ماہرین کی انجمنیں اپنی کارکردگی کو عوام کے نقطۂ نظر سے پرکھتی ہیں اور صحت، قانون، انجینئرنگ، منصوبہ سازی اور دوسرے میدانوں میں ایسے متبادل طریقے وضع کرتی ہیں جو معاشرے کے حالات سے ہم آہنگ ہوں۔ اعلیٰ تعلیمی ادارے اپنے تدریسی اور تحقیقی طریق کار میں تبدیلیاں لاتے ہیں تاکہ ایسے تعلیم یافتہ افراد پیدا کر سکیں جو سماجی شعور رکھتے ہوں۔ یہ ادارے معاشرے کے مسائل کو جاننے، سمجھنے اور ان کے حقائق کو احتیاط سے اعداد و شمار کی صورت میں متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور معاشرتی اور طبعی ماحول میں تبدیلیوں کی ضرورت اور نوعیت کو واضح کرتے ہیں۔ ادیبوں، پیشہ ور ماہروں اور تعلیمی اداروں کی اس سرگرمی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بصیرت کو (جسے حقائق، اعداد و شمار اور ممکنہ تبدیلیوں کے حقیقت پسندانہ خاکے کا مضبوط سہارا حاصل ہوتا ہے) معاشرے کے اُبھرتے ہوئے طبقوں تک پہنچایا جاتا ہے جو اپنی نئی قائم شدہ کاروباری یا سیاسی تنظیموں کے ذریعے اصلاحات کے لیے دباؤ ڈالتے ہیں یا دوسری صورت میں انقلاب لانے کے لیے کام کرتے ہیں۔ اصلاحات کے لیے دباؤ ڈالنے کا طریقہ صرف اُس وقت کارآمد ثابت ہو سکتا ہے جب وہ نہ صرف مسائل کی درست نشان دہی کر سکے بلکہ ان کا ٹھوس حل بھی تجویز کر سکے جو خواہشات سے نہیں بلکہ حقائق سے مطابقت رکھتا ہو۔ خطابت اور نعرے بازی سے نہ کبھی اصلاحات ہوئی ہیں اور نہ کہیں انقلاب آیا ہے۔ جن معاشروں میں دانش ور طبقے کا لوگوں سے رابطہ برقرار رہا اور وہ ان کی زندگی اور ان کو درپیش سماجی اور سیاسی حالات کا اپنے معاشرے کی تاریخ کی روشنی میں مطالعہ کرتا رہا، وہاں یہ طبقہ معاشرے میں تبدیلی لانے کا مثبت کردار انجام دے سکا۔

تیسری دنیا کے بہت سے دوسرے ملکوں کی طرح پاکستان کے دانش ور بھی یہ مثبت کردار انجام نہیں دے رہے ہیں۔ اس کی متعدد وجوہ ہیں جن کو سمجھنا زیادہ دشوار نہیں۔ لیکن ان کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا زاویۂ نظر ان کے اپنے معاشرے کی معروضی حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتا اور نہ یہ حقیقت ان کی تخلیقی اور علمی دل چسپی کا محور ہے۔ رفتہ رفتہ ان کا رشتہ اپنے معاشرے کی حقیقت سے بالکل کٹ گیا ہے اور وہ ذہنی طور پر دنیا کے اُن ترقی یافتہ معاشروں سے وابستہ ہو گئے ہیں جن کے خدوخال مناسب اور حقیقت پسندانہ تبدیلیوں کے بغیر ہمارے معاشرے کی حقیقت سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔

یہی معاملہ پاکستان میں بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں اور دانش وروں کا بھی رہا ہے۔ ان کے تجزیوں کی بنیاد بھی اس معاشرے کے معروضی حالات نہیں بلکہ ریاست اور ترقی کے بارے میں ایسے نظریات پر رہی ہے جنھیں روس اور چین میں وہاں کے معروضی حالات اور حقائق کی بنیاد پر وضع کیا گیا تھا جو ہمارے معاشرے کے حالات اور حقائق سے بہت مختلف تھے۔

نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے بائیں بازو کے سیاست دانوں کے معاشرے کے علم کی بنیاد وجدان پر ہو تو ہو، معروضی حقائق کے مطالعے اور تجزیے پر بالکل نہیں ہے؛ ہمارے پیشہ ور ماہرین آبادی کی ایک

Scanned with CamScanner

بہت چھوٹی اقلیت کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں؛ اور ہمارے تعلیمی اور تحقیقی ادارے ایسے موضوعات پر کام کرتے ہیں جن کا پاکستانی معاشرے کو درپیش مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔ موخرالذکر رویے کی مثال یہ ہے کہ اقتصادی تحقیق کے میدان میں زرمبادلہ کی شرحوں اور ٹیکسوں کی پالیسیوں پر بے شمار مقالے تیار کیے جاتے ہیں لیکن غیر رسمی سیکٹر کو، جس پر ہماری آبادی کی اکثریت کے معاش کا انحصار ہے، ان میں سے کسی تحقیق میں شامل نہیں کیا جاتا اور نہ اس سیکٹر کو الگ سے کسی تحقیق کا موضوع بنایا جاتا ہے۔ اسی طرح انجینیرنگ کے میدان میں ٹیکنولوجی، طریق کار، اسٹینڈرڈز وغیرہ میں نئی تحقیق کے ذریعے تبدیلیاں کر کے انھیں ارزاں قیمت پر عام لوگوں تک پہنچانے کا کام نہیں کیا گیا۔ یہ فہرست نہایت طویل ہے اور اس میں طب، قانون، تعلیم، بین الاقوامی تعلقات، منصوبہ سازی اور باقی تمام شعبے شامل ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ عوامی سطح پر قائم کی جانے والی کاروباری اور فلاحی تنظیموں، شہریوں کی انجمنوں اور اسٹیبلشمنٹ سے تعلق نہ رکھنے والے سیاست دانوں کو ان کی مطلوبہ معلومات ان تعلیمی اور تحقیقی اداروں سے دستیاب نہیں ہوتیں، اور ان اداروں کی تحقیق کی بنیاد پر وضع کی ہوئی سرکاری پالیسیاں ہمارے عوام کی اکثریت سے غیر متعلق ہوتی ہیں۔

پاکستان کے دانش ور طبقے کی اس ناکامی سے قطع نظر، پاکستانی معاشرے کے عوامی رویوں میں تبدیلی کے اشارے صاف نظر آنے لگے ہیں۔ اگر ایک طرف ترقی یافتہ دنیا سے وابستگی رکھنے والے مقامی دانش وروں کی تعداد، اور مقامی حالات سے ان کی اجنبیت، بڑھ رہی ہے تو دوسری طرف خواندہ نوجوانوں کی قائم کی ہوئی غیر سرکاری اور فلاحی تنظیموں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ اکادکا اعلیٰ تعلیم کے اداروں نے بھی اپنے کام کو وسیع تر معاشرتی اور معاشی مسائل سے ہم آہنگ کرنے کی کوششیں شروع کی ہیں۔ انسانی حقوق، قیدیوں کی امداد، دیہی اور شہری آبادیوں اور چھوٹا کاروبار کرنے والے افراد کو تکنیکی امداد کی فراہمی وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جو کسی قدر منظم اور باقاعدہ شکل میں پیش منظر پر نمودار ہونے لگے ہیں، اور ان پر سابقہ عشروں والی سوشلسٹ، لبرل یا سیکولر رومانیت کا غلبہ نہیں ہے۔ یہ احساس روز بروز قوی ہوتا جا رہا ہے کہ موجودہ ریاستی ڈھانچا کوئی مثبت کردار ادا کرنے کا اہل نہیں اور نہ اس سے کوئی امید کی جا سکتی ہے؛ اور یہ کہ پاکستان کی تبدیل شدہ حقیقت کے مطابق نئے متبادل ڈھانچے کو مضبوط بنانا لازمی ہے۔ یہ احساس اتنا شدید ہوتا جا رہا ہے کہ اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے "سرکاری" دانش ور تک شراکتی جمہوریت، لوگوں کو بااختیار بنانے، اور اختیارات کی مرکزیت کو ختم کرنے جیسی اصطلاحات اپنی گفتگو میں استعمال کرنے لگے ہیں؛ حکومت کو قرض دینے والے بین الاقوامی ادارے بھی، اپنے مفادات کے پیش نظر، یہی لفظیات استعمال کر رہے ہیں۔ تاہم، مثبت تبدیلیوں کے ان اشاروں کے ساتھ ساتھ، غیر حل شدہ تنازعے کی تمام مریضانہ علامات ــــ یعنی تشدد، انارکی، مذہبی انتہاپسندی ــــ بھی روز بروز سنگین ہوتی جا رہی ہیں۔

Scanned with CamScanner

پاکستانی حالات کا جائزہ لینے والا کوئی کم فہم سیاسی مبصر بھی صاف دیکھ سکتا ہے کہ معاشرے کی حقیقت اور ریاستی ڈھانچے کے درمیان موجود، اور مسلسل بڑھتی ہوئی، خلیج کے پیشِ نظر تبدیلی کا آنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ حالیہ رجحانات کو دیکھتے ہوئے اس تبدیلی کا مطلب صوبوں، بلدیاتی اداروں اور عوامی تنظیموں کو زیادہ بااختیار اور خود مختار بنانا ہے۔ اسے ممکن بنانے کے لیے قانونی اور مالیاتی نظام میں ہمہ گیر تبدیلیاں کرنی ہوں گی۔ اب سوال یہ نہیں ہے کہ ایسا ہو گا یا نہیں، بلکہ یہ کہ ایسا کب اور کس طریقے سے ہو گا؟ یہ تبدیلی کس راستے سے آئے گی اور پاکستان کے مختلف طبقوں اور گروہوں پر اس کے اثرات کس نوعیت کے ہوں گے؟

اگر ہمارے دانش وروں نے تیز رفتاری کے ساتھ عوام کی زندگی، ان کے مسائل اور ان کے اندازِ فکر سے مطابقت پیدا نہیں کی اور ایک جدید اور جمہوری ریاست کا روشن خیال تصور رائج نہ کیا تو وہ ان نازک سوالات کا عملی جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ ایسی صورت میں تبدیلی تشدد کے ذریعے سے آئے گی اور اس پر فسطائیت اور مذہبی یا کسی اور قسم کی انتہاپسندی کا غلبہ ہو گا۔ اس کے برعکس اگر ہمارے دانش ور ملک بھر میں مقامی سطح پر تبدیلی اور فلاح کے لیے کام کرنے والے سماجی کارکنوں اور عوامی تنظیموں کے ساتھ اتحاد پیدا کر سکے تو تبدیلی بتدریج اصلاحات کے ذریعے بھی آ سکتی ہے اور تشدد اور انار کی کی شدت کو کم کیا جا سکتا ہے۔

وقت، دونوں صورتوں میں، اب بہت کم رہ گیا ہے۔

**

Scanned with CamScanner

ضمیمہ ۱

کراچی — چند اہم حقائق

آئندہ صفحات میں کراچی کے بارے میں کچھ اہم حقائق اعداد و شمار کی مدد سے پیش کیے گئے ہیں اور ان کی مختصر وضاحتیں بھی درج کر دی گئی ہیں۔

ان اعداد و شمار کے بارے میں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ آبادی سے متعلق ۱۹۸۱ کے بعد کے اعداد و شمار کسی سرکاری مردم شماری کے نتائج پر مبنی نہیں ہیں بلکہ ان کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔ مردم شماری نہ صرف کسی ملک کی آبادی سے متعلق رجحانات کا درست اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے بلکہ حکومتی سطح پر ہوش مندانہ منصوبہ بندی کے لیے بھی ناگزیر ہے۔ اس اہم کام کو ملتوی کرتے چلے جانے کے فیصلے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستانی معاشرے میں حقائق کا سامنا کرنے کی اہلیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس اہلیت کا فقدان بجائے خود ملک کو درپیش بحران کی شدت میں اضافہ کر رہا ہے کیوں کہ مسائل کا درست تناظر میں جائزہ لیے بغیر ان کے حل کی طرف قدم بڑھانا ممکن نہیں ہے۔

Scanned with CamScanner

Table 1	Percentage of Urban Population in Selected Regions of the World 1950 - 2000				
Region	1950	1986	2000	Annual Growth Rate 1990 - 2000	
				Urban	Rural
Europe	56%	73%	79%	1.2%	-0.9%
North America	64%	74%	78%	1.2%	-1.0%
(Former) Soviet Union	39%	71%	74%	1.4%	-1.1%
Latin America	41%	65%	77%	3.1%	0.8%
China	12%	32%	40%	3.2%	0.8%
Africa	15%	30%	42%	4.6%	1.7%
South Asia	15%	24%	35%	4.3%	1.1%

Source: United Nations Population Division.
Dr Mehtab Karim, "The Challenges of Urban Growth: A Case Study of Karachi."

اوپر دیے ہوئے ۱۹۵۰ سے ۲۰۰۰ تک کے آبادیاتی اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے خطے دیہی معاشرے سے شہری معاشرے میں منقلب ہونے کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ ترقی یافتہ خطے اپنے تاریخی ارتقا اور صنعتی ترقی کے باعث رفتہ رفتہ غالب طور پر شہری معاشرے بن چکے ہیں اور وہاں دیہی آبادی کے تناسب میں مسلسل کمی ہو رہی ہے۔ دوسری جانب ترقی پذیر، یا کم ترقی یافتہ، خطوں میں یہ تبدیلی دیر سے شروع ہوئی ہے اور نہایت تیز رفتار سے جاری ہے۔ جنوبی ایشیا میں شہری آبادی، جو ۱۹۵۰ میں کل آبادی کا صرف ۱۵ فیصد تھی، ۱۹۸۶ میں ۲۴ فیصد تک جا پہنچی اور، اضافے کی تیز رفتار کے پیشِ نظر، ۲۰۰۰ تک ۳۵ فیصد ہو جائے گی۔ اس تبدیلی کی رفتار جنوبی ایشیا میں، افریقا کو چھوڑ کر، تمام خطوں کے مقابلے میں زیادہ تیز ہے۔

Table 2	Percentage of Urban Population in South Asian Countries 1950 - 2000					
Country	**1950**	**1960**	**1970**	**1980**	**1990**	**2000**
Bangladesh	4.4%	5.2%	7.6%	11.2%	16.1%	22.2%
India	16.8%	17.9%	19.7%	22.3%	26.9%	34.1%
Nepal	2.3%	3.1%	3.9%	4.4%	6.8%	9.8%
Pakistan	**17.5%**	**22.1%**	**25.0%**	**28.2%**	**33.6%**	**41.1%**
Sri Lanka	14.4%	17.9%	21.9%	26.6%	32.9%	40.1%

Source: United Nations Population Division.
Dr Mehtab Karim, "The Challenges of Urban Growth: A Case Study of Karachi."

۱۹۵۰ سے ۲۰۰۰ تک کی چھ دہائیوں کے یہ اعدادوشمار جنوبی ایشیا کے ممالک میں دیہی معاشرے کے شہری معاشرے میں تبدیل ہونے کی صورتِ حال کا موازنہ پیش کرتے ہیں۔ اس موازنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی کل آبادی میں شہری آبادی کا تناسب پورے خطے میں سب سے زیادہ رہا ہے۔ پاکستان کی شہری آبادی، جو ۱۹۵۰ میں ملک کی کل آبادی کے ۱۷.۵ فیصد کے برابر تھی، ۱۹۹۰ میں ۳۳.۶ فیصد ہو گئی اور، تخمینے کے مطابق، ۲۰۰۰ میں ۴۱.۱ فیصد تک پہنچ جائے گی۔ جنوبی ایشیا کے دیگر ملکوں سے تقابل کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان سب سے زیادہ تیز رفتار سے اس تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہے۔ تاہم، جیسا کہ پچھلے صفحات میں پیش کیے گئے تجزیاتی مضامین نشان دہی کرتے ہیں، پاکستان کا ریاستی ڈھانچا اس تیز رفتار تبدیلی کو تسلیم کرنے اور ملکی نظام میں سمونے میں ناکام رہا ہے جس کے باعث معاشرے میں شدید تناو پیدا ہو گیا ہے۔

Scanned with CamScanner

Table 3	Percentage of Urban Population in Provinces of Pakistan : 1981		
Province	**Population**	**Urban**	**Rural**
Balochistan	4,332,000	15.6%	84.4%
NWFP	11,061,000	15.2%	84.8%
Punjab	47,292,000	27.4%	72.6%
Sindh	19,029,000	43.4%	56.6%

Source: Census Of Population, 1981
Dr Mehtab Karim, "The Challenges of Urban Growth: A Case Study of Karachi."

پاکستان کے چاروں صوبوں میں دیہی اور شہری آبادی کا یہ موازنہ، جس کی بنیاد ۱۹۸۱ کی سرکاری مردم شماری پر ہے، ظاہر کرتا ہے کہ صوبہ سندھ میں شہری آبادی کا تناسب باقی تمام صوبوں سے زیادہ ہے۔ یہاں ۱۹۸۱ میں شہری آبادی صوبے کی کل آبادی کے ۴۳.۴ فیصد کے برابر تھی۔ ۱۹۸۱ کے بعد سے کوئی مردم شماری نہیں ہوئی ہے، تاہم گزشتہ آبادیاتی رجحانات کو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ شرح اب مزید بڑھ چکی ہوگی۔ یہ حقیقت اپنے مضمرات کے لحاظ سے نہایت اہم ہے اور صوبے کی سماجی، معاشی اور سیاسی صورتِ حال کو سمجھنے میں بہت مدد دے سکتی ہے۔

Scanned with CamScanner

Table 4	Comparative Profiles of Five Big Cities of Pakistan: Karachi, Hyderabad, Faislabad, Lahore and Peshawar					
		Karachi	**Hyderabad**	**Faisalabad**	**Lahore**	**Peshawar**
Population:	1951	1,068,459	241,801	187,185	859,221	151,435
	1961	1,912,598	434,537	435,117	1,317,119	218,697
	1972	3,515,402	628,631	839,621	2,198,890	272,697
	1981	5,208,132	751,529	1,121,629	2,988,486	566,248
	1988	7,180,000	980,000	1,520,000	3,870,000	770,000
Population as a Percentage of Pakistan's Population:	1988	6.8%	0.93%	1.4%	3.7%	0.73%
Population as a Percentage of Pakistan's Urban Population:	1988	21.4%	2.9%	4.5%	11.5%	2.3%
Annual Growth:	1972 - 1981	4.50%	2.0%	3.6%	3.7%	8.4%
	1981 - 1988	4.96%	2.6%	4.6%	3.8%	3.3%
Population Density	1981	154	66	190	160	NA
Household Size	1972	5.8	5.96	8.51	6.19	5.9
	1981	6.6	7	6.7	6.9	6.9
Employment:						
Labour Force Participation %	Total	25.7%	23.6%	26.3%	26.4%	25.3%
(1981)	Female	2.9%	1.9%	2.6%	2.5%	2.6%
Civilian Labour Force (CLF)	1981	1,234,354	219,466	324,637	788,746	150,055
Unemployment (% of CLF)	1981	8.2%	2.6%	5.6%	8.9%	3.4%
Land:						
Publicly Owned		80%	-	17%	14%	-
Privately Owned		20%	-	83%	86%	-
Housing:						
Units per 1000 Persons		158	143	153	151	145
Persons per Unit		6.7	7.5	6.9	6.8	7.4
Persons per Room		3.1	3.8	3.5	2.9	3
Owner Ocuupied Houses		57%	77.4%	83.12%	67.8%	64.73%
Population in Slums		50%	60%	60%	50%	50%
Katchi Abadis:						
Population (% of City Population)		37%	25%	60%	21%	2%
Area (Hactares)		6,105	566	243	570	-
Services and Infrastucture:						
Piped Water Supply 1980						
Individual Connections (% of Units)		46%	63%	31%	65%	38%
Average Daily Piped Water Supply (Litre per Capita)		90	246	187	225	332
Sewrage 1980 (% of Units)		53%	27%	28%	30%	15%
Electricity 1980 (% of Units)		66%	81%	79%	86%	86%
Health and Education:						
Hospital Beds per 1000 Persons		1.4	2.85	0.79	2.03	4.37
Infant Mortality below 10 years (Number per 1000 Live Births)		85-107	126	128	108	112
School Enrolment Rate	Total	41.1%	21.1%	21.9%	25.8%	23.9%
	Female	39.9%	18.9%	20.1%	24.6%	19.7%
Literacy Rate	1972	51.7%	42.2%	36.1%	44.1%	34.6%
	1981	56.6%	41.2%	46.2%	53.4%	36.0%
Female Literacy Rate	1972	45.7%	32.2%	24.7%	35.6%	-
	1981	50.5%	33.0%	36.4%	46.4%	23.3%

Arif Hasan, "Seven Reports on Housing."

Scanned with CamScanner

پاکستان کے پانچ بڑے شہروں ــــ کراچی، حیدر آباد، فیصل آباد، لاہور اور پشاور ــــ کا یہ تقابل ان شہروں کے متعدد اہم حقائق کو سامنے لاتا ہے۔ کراچی ملک کا سب سے بڑا شہر ہے، یہ حقیقت آبادی کے اعداد و شمار سے عیاں ہے۔ ۱۹۸۸ کے تخمینے کے مطابق ملک کی مجموعی آبادی کے ۶.۸ فیصد اور ملک کی شہری آبادی کے ۲۱.۴ فیصد باشندے کراچی میں رہتے ہیں۔ آبادی میں اضافے کی رفتار بھی کراچی میں باقی شہروں کی بہ نسبت زیادہ ہے، جس کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ ملک کے دیگر علاقوں سے لوگ بڑی تعداد میں کراچی آ کر آباد ہوتے ہیں۔ دیہات سے شہروں کی طرف نقل مکانی کرنے کا یہ عمل ملک کے باقی شہروں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ چناں چہ دوسرے شہر بھی تبدیلی کے اسی عمل سے گزر رہے ہیں جو کراچی میں پیش آ رہا ہے۔ تجزیاتی مضامین میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اس عمل کو سمجھنے، تسلیم کرنے اور اس کی بنیاد پر حقیقت پسندانہ پالیسیاں وضع کرنے کی کوشش جلد شروع نہ کی گئی تو دوسرے شہر بھی کراچی کی طرح انتشار اور تشدد کی لپیٹ میں آ سکتے ہیں۔

روزگار کے اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ شہری آبادی کی لیبر فورس میں شمولیت کے لحاظ سے پانچوں شہر کم و بیش یکساں ہیں، لیکن شہری لیبر فورس میں بے روزگاری کی شرح لاہور اور کراچی میں باقی شہروں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔

زمین کی ملکیت سے متعلق اعداد و شمار سے یہ اہم حقیقت سامنے آتی ہے کہ کراچی میں ۸۰ فیصد زمین سرکاری ملکیت میں ہے اور اس اعتبار سے یہ شہر پنجاب کے دونوں شہروں ــــ فیصل آباد اور لاہور ــــ سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اس کا ایک اہم نتیجہ، جیسا کہ کچی آبادیوں کے موضوع پر لکھے گئے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے، یہ ہے کہ دلالوں کے ہاتھوں وجود میں آنے والی کچی آبادیاں کراچی میں سرکاری ملکیت کی زمین پر قائم ہوتی رہی ہیں اور سرکاری اہلکار اس عمل میں غیر قانونی طور پر شریک رہے ہیں۔ اس کا ایک ضمنی مطلب یہ بھی ہے کہ کراچی میں بڑھتی ہوئی آبادی کو بسانے کے لیے حکومت کے پاس طبعی وسائل موجود ہیں، لیکن ناقص سرکاری پالیسیوں کے باعث یہ کام غیر رسمی سیکٹر کے ہاتھوں انجام پا رہا ہے۔ فیصل آباد اور لاہور میں زمین کی ملکیت کے اعداد و شمار واضح کرتے ہیں کہ وہاں دیہات سے شہروں میں آنے والے لوگوں کی رہائشی ضروریات پوری کرنے کے لیے زمینوں کے مالک خود اپنی زمین کو ــــ جو بیشتر شہر کے مضافات میں واقع زرعی زمین ہوتی ہے ــــ غیر رسمی طور پر رہائشی پلاٹوں میں تقسیم کر کے فروخت کرتے ہیں۔ زرعی زمین کی مالیت زیادہ ہونے کے باعث ان شہروں کی کچی آبادیوں میں پلاٹ چھوٹے اور گلیاں تنگ ہوتی ہیں جس کا وہاں رہنے والوں کی زندگی پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے۔ البتہ یہ عمل، کراچی کے برعکس، غیر رسمی اور بے ضابطہ ہونے کے باوجود غیر قانونی نہیں ہے چناں چہ پلاٹ خریدنے والوں کو ملکیت کا قانونی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔

کراچی کی ۵۰ فیصد آبادی پسماندہ بستیوں (slums) میں رہتی ہے۔ باقی شہروں میں بھی یہ تناسب اس سے کم نہیں ہے، بلکہ حیدر آباد اور فیصل آباد میں یہ تناسب ۶۰ فیصد ہے۔ کراچی کے ۳۷ فیصد باشندے کچی آبادیوں میں رہتے ہیں جو ۶۱۰۵ ہیکٹیئر رقبے پر پھیلی ہوئی ہیں۔ لاہور کی پسماندہ بستیاں بیشتر اندرون شہر کے قدیم محلوں میں واقع ہیں جہاں رہائشی حالات سخت خراب ہیں۔

Scanned with CamScanner

شہری انفرااسٹرکچر اور سہولتوں کے اعداد و شمار کراچی میں پانی کی شدید قلت کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ شہر پانی کے کسی قدرتی منبع کے قریب واقع نہیں ہے جو شہریوں کی پانی کی ضرورت کو پورا کر سکے۔ پائپ کے ذریعے فراہم کیے جانے والے پانی کے کنکشن ۶۴ فیصد مکانوں کو میسر ہیں، اور یہ شرح فیصل آباد اور پشاور سے زیادہ مگر لاہور اور حیدر آباد سے کم ہے۔ پائپ کے ذریعے فراہم کیے جانے والے پانی کی مقدار کراچی میں باقی چاروں شہروں سے کم یعنی صرف ۹۰ لٹر فی کس روزانہ ہے۔ سیوریج یعنی گندے پانی کے نکاس کے باقاعدہ نظام سے منسلک مکانوں کا تناسب کراچی میں باقی شہروں سے زیادہ یعنی ۵۳ فیصد ہے۔ اس کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ پاکستان کے قیام کے وقت کراچی ملک کا واحد شہر تھا جہاں نکاس کا ایک جدید اور مکمل نظام موجود تھا۔ بعد میں یہ خصوصیت برقرار نہیں رکھی جا سکی جس سے شہری انتظام کی خراب ہوتی ہوئی صورت حال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تاہم، باقی شہروں میں نکاس کا نظام جدید خطوط پر کبھی قائم نہیں کیا گیا۔ بجلی کا کنکشن کراچی میں ۶۶ فیصد مکانوں کو میسر ہے، اور یہ شرح باقی شہروں کے مقابلے میں کم ہے۔ اس سے نہ صرف شہر میں ترقیاتی کام کی سست رفتاری کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ شہریوں کی بہت بڑی تعداد "کنڈا سسٹم" پر انحصار کرنے، یعنی چوری کی ہوئی بجلی خریدنے، پر مجبور ہے۔

صحت سے متعلق اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ کراچی میں آبادی کی مناسبت سے علاج کی سہولتیں بہت کم ہیں۔ اسپتالوں میں بستروں کی تعداد ۱.۴ بستر فی ہزار افراد ہے اور یہ شرح صرف فیصل آباد کے مقابلے میں بہتر ہے۔

تعلیم کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اسکول میں داخلہ لینے والے بچوں کی تعداد کا تناسب باقی چاروں شہروں سے زیادہ ہے، اور یہ بات بچیوں کے بارے میں بھی درست ہے۔ مردانہ اور زنانہ شرح خواندگی کے لحاظ سے بھی کراچی باقی شہروں سے کہیں آگے ہے۔

Table 5 **Population Growth in Karachi and Pakistan 1901 - 1988**

Year	Karachi			Pakistan	
	Population	Increase in 20 years	Annual Growth Rate	Increase in 20 years	Annual Growth Rate
1901	117,000	-	-	-	-
1921	217,000	85%	3.1%	27%	1.3%
1941	387,000	75%	3.0%	34%	1.5%
1961	1,917,000	400%	8.4%	52%	2.1%
1981	5,208,000	175%	5.0%	96%	3.0%
1988	7,950,000	-	6.0%	-	3.0%

Source: Census of Population, 1901-1981
Dr Mehtab Karim, "The Challenges of Urban Growth: A Case Study of Karachi."

آبادی میں اضافے کے یہ اعداد و شمار ۱۹۰۱ سے ۱۹۸۸ تک کے عرصے میں کراچی اور پاکستان کی آبادی میں اضافے کا موازنہ کرتے ہیں۔ ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کراچی میں آبادی کے بڑھنے کی رفتار ملک کی مجموعی آبادی میں اضافے کی شرح سے بہت زیادہ رہی ہے۔

Scanned with CamScanner

Table 6	Age Profile of Population Karachi, Rest of Sindh and Other Provinces			
	Below 15	15-29	30-39	40 & above
Karachi	41%	29%	12%	18%
Rest of Sindh	47%	23%	11%	19%
Balochistan	49%	22%	11%	18%
NWFP	48%	23%	10%	19%
Punjab	45%	24%	10%	21%

Source: Census of Population, 1901-1981.
Dr Mehtab Karim, "The Challenges of Urban Growth: A Case Study of Karachi."

کراچی کی آبادی کی ۴۱ فیصد تعداد ۱۵ سے ۳۹ سال تک کے باشندوں پر مشتمل ہے۔ تجزیے میں بتایا گیا ہے کہ ۱۳ سے ۳۰ برس تک کے باشندے کراچی کی کل آبادی کا ۳۹ فیصد حصہ ہیں۔ عارف حسن نے اپنے مضمون میں شہری آبادی کے اس حصے کی خصوصیات کو بہت خوبی سے بیان کیا ہے اور شہر کی زندگی میں اس حقیقت کی اہمیت واضح کی ہے۔

Table 7 **Karachi's Population by Place of Birth**

	Census Year		
	1921	1961	1981
Total Population	217,000	1,917,000	5,208,000
Total Number of Migrants	101,000	1,154,000	1,700,000
Percentage of Migrants	47%	60%	33%
Place of Birth of Migrants:			
Sindh (Exluding Karachi)	14%	2%	5%
Balochistan	14%	2%	1%
Punjab	8%	12%	25%
NWFP	4%	8%	17%
Kashmir, Frontier Region & Northern Areas		2%	1%
India and Other Countries	60%	74%	51%

Source: Census of Population, 1981.
Mrs Shireen Rehmatullah, "Ethnic Strife in Karachi".

کراچی اپنے مخصوص محلِ وقوع اور تجارتی سرگرمیوں کے باعث نقلِ مکانی کرنے والوں کے لیے شروع ہی سے پُرکشش رہا ہے۔ اوپر دیے گئے اعداد و شمار واضح کرتے ہیں کہ باہر سے آکر بسنے والوں کی تعداد کا شہر کی آبادی میں تناسب ۱۹۲۱ میں ۴۷ فیصد تھا جو ۱۹۶۱ میں ۶۰ فیصد تک جا پہنچا۔ تاہم، ۱۹۸۱ کی مردم شماری کی رو سے کراچی کی آبادی میں صرف ۳۳ فیصد افراد ایسے تھے جو باہر سے آئے تھے۔ باقی تمام باشندے کراچی ہی میں پیدا ہوئے تھے۔

نقلِ مکانی کر کے شہر میں آباد ہونے والوں میں موجودہ ہندوستان میں پیدا ہونے والے افراد کی تعداد کا تناسب ۱۹۲۱ میں ۶۰ فیصد تھا جو ۱۹۶۱ تک بڑھ کر ۷۴ فیصد ہو گیا جس کا سبب ۱۹۴۷ میں تقسیمِ ہند کے وقت ہونے والی اجتماعی مہاجرت تھی۔ تاہم، ۱۹۶۰ کے عشرے میں پاکستان کے دوسرے علاقوں سے لوگ بڑی تعداد میں کراچی آکر آباد ہونے لگے جس کے باعث ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے وقت ہندوستان میں پیدا ہونے والے کراچی کے شہریوں کا تناسب (نقلِ مکانی کرنے والوں کی کل تعداد کا) ۵۱ فیصد رہ گیا تھا۔ دوسری طرف کراچی سے باہر پیدا ہونے والے شہریوں میں پنجاب سے تعلق رکھنے والوں کا تناسب، جو ۱۹۶۱ میں ۸ فیصد تھا، ۱۹۸۱ میں ۲۵ فیصد ہو گیا۔ اسی طرح صوبۂ سرحد سے تعلق رکھنے والے افراد کے تناسب میں بھی اضافہ ہوا۔ نقلِ مکانی کر کے کراچی میں آباد ہونے والے لوگوں میں ۱۴ فیصد افراد ۱۹۲۱ کی مردم شماری کی رو سے سندھ کے دیگر علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ شرح ۱۹۶۱ میں کم ہو کر ۲ فیصد رہ گئی اور ۱۹۸۱ میں بڑھ کر ۵ فیصد ہو گئی۔

ان اعداد و شمار سے ایک اہم نکتہ یہ بھی سامنے آتا ہے کہ ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے وقت شہر کے ۶۷ فیصد باشندے کراچی ہی میں پیدا ہوئے تھے خواہ ان کے والدین کا تعلق کسی بھی مقام سے رہا ہو۔ ان باشندوں نے کراچی شہر ہی میں آنکھ کھولی ہے چنانچہ ان کے مزاج میں دیہی اثرات بہت کم ہیں۔

Scanned with CamScanner

Table 8	Population by Language Karachi and Other Areas of Pakistan 1981					
Area	**Urdu**	**Punjabi**	**Pushto**	**Sindhi**	**Balochi**	**Other**
Pakistan	7.60%	48.17%	13.14%	11.77%	3.01%	16.27%
Balochistan	1.37%	2.24%	25.07%	8.29%	36.31%	26.71%
NWFP	0.83%	1.10%	68.30%	0.05%	0.04%	29.68%
Punjab	4.27%	78.68%	0.76%	0.08%	0.57%	45.32%
Islamabad	11.23%	81.72%	4.16%	0.18%	0.16%	2.54%
Sindh	22.64%	7.69%	3.06%	52.40%	4.51%	9.71%
Karachi	54%	14%	10%	7%	4%	11%
Source: Census of Pakistan, 1981						
Mrs Shireen Rahmatullah, "Ethnic Strife in Karachi."						

مادری زبان کے اعتبار سے کی جانے والی اس تقسیم کی رو سے ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے وقت کراچی کے ۵۴ فیصد افراد کی مادری زبان اردو تھی۔ یہ شرح اس سے پہلے بہت زیادہ تھی اور اس کے کم ہونے کا رجحان واضح کرتا ہے کہ شہر کی آبادی میں ایسے لوگوں کی تعداد کا تناسب متواتر کم ہو رہا ہے جن کی مادری زبان اردو ہے۔ ملک کے دیگر علاقوں سے نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد کی شرح مسلسل بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۸۱ میں اردو بولنے والے مہاجر پورے پاکستان کی آبادی کا ۷.۶ فیصد اور صوبہ سندھ کی آبادی کا ۲۲.۶۴ فیصد تھے۔ دیگر لسانی گروہوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے سندھ اور خصوصاً کراچی میں داخل ہونے کے رجحان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہر کی آبادی میں اردو بولنے والے مہاجروں کی اکثریت ختم ہو چکی ہے، گو وہ اب بھی شہر کا سب سے بڑا لسانی گروہ ہیں۔

سندھ سے باہر جس شہر میں اردو لسانی گروہ کا تناسب سب سے زیادہ ہے وہ وفاقی دارالحکومت اسلام آباد ہے جہاں وہ ۱۹۸۱ میں کل آبادی کا ۱۱.۲۳ فیصد حصہ ہے۔

مادری زبان سے قطع نظر، کراچی شہر کی غالب زبان اب بھی اردو ہے، کیوں کہ تاریخی اور معاشرتی عوامل کے زیرِ اثر ملک کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ باہمی رابطے کے لیے اردو ہی کو اختیار کرتے ہیں۔ "بیسی نگری کی زبانی تاریخ" کے عنوان سے پیش کیے گئے متن سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کراچی کے باشندے، جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے، اپنا اظہار اس زبان میں بہت عمدگی سے کرتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

Table 9	Population Growth Trends Selected Megacities of the World				
City	Population			Rank	
	1994	2015	Increase	1994	2015
Tokyo	26,500,000	28,500,000	7.5%	1	1
New York	16,300,000	17,600,000	8.0%	2	11
Sao Paulo	16,100,000	20,800,000	29.2%	3	6
Mexico City	15,500,000	18,800,000	21.3%	4	10
Shanghai	14,700,000	23,400,000	59.2%	5	4
Bombay	14,500,000	27,400,000	89.0%	6	2
Calcutta	11,500,000	17,600,000	53.0%	9	12
Seoul	11,500,000	13,100,000	13.9%	10	18
Jakarta	11,000,000	21,200,000	92.7%	11	5
Karachi	9,500,000	20,600,000	116.8%	18	7
Istanbul	7,500,000	12,300,000	64.0%	23	20
London	7,300,000	7,300,000	0.0%	25	37

Source: United Nations Population Division, 1994.
Dr Mehtab Karim, "Violence in Karachi: A Global View."

اوپر دیے گئے اعداد و شمار کراچی کی آبادی میں اضافے کے رجحان کو دنیا کے دوسرے بڑے شہروں کے مقابل میں پیش کرتے ہیں۔ اس تخمینے کے مطابق کراچی اپنی آبادی کے لحاظ سے ۱۹۹۴ میں دنیا کا ۱۸ واں بڑا شہر تھا اور اگر آبادی میں اضافے کا یہ رجحان برقرار رہا تو ۲۰۱۵ میں دنیا کا ساتواں بڑا شہر بن جائے گا۔ تخمینے کے مطابق بیس برس کے اس عرصے میں کراچی کی آبادی میں ۱۱۶.۷ فیصد اضافہ ہوگا اور اس مدت کے خاتمے پر اس شہر کے باشندوں کی کل تعداد دو کروڑ چھ لاکھ ہو جائے گی۔ آبادی میں اضافے کی یہ شرح دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔

Table 10 — **Population Distribution by Distance to Central Business District (CBD) Karachi 1971 - 1987**

Distance to CBD (km)	1971		1981		1987	
	Population	% Distance	Population	% Distance	Population	% Distance
0 - 5	999,801	30.3%	1,316,937	27.9%	1,401,063	18.8%
5.1 - 10	1,088,588	33.0%	1,124,913	23.8%	2,085,778	28.0%
10.1 - 15	472,732	14.3%	910,065	19.3%	1,832,009	24.6%
15.1 - 20	411,198	12.4%	882,492	18.7%	1,273,400	17.1%
20.1 - 25	311,009	9.4%	425,115	9.0%	701,426	9.4%
25.1 - 30	13,335	0.4%	36,784	0.8%	80,665	1.1%
Over 30	6,157	0.2%	28,341	0.6%	69,322	0.9%
Total	3,302,820	100%	4,724,647	100%	7,443,663	100%

Source: Central Statistical Office; Karachi Metropolitan Transportation Study
Arif Hasan, "Karachi Overview for the Global Report on Human Settlements."

اوپر دیے گئے اعداد و شمار ۱۹۷۱، ۱۹۸۱ اور ۱۹۸۷ میں کراچی کی آبادی کے جغرافیائی پھیلاؤ کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس عرصے میں شہر کے مرکزی تجارتی علاقے سے پانچ کلومیٹر تک کے فاصلے پر رہنے والوں کی تعداد کا تناسب ۳۰.۳ فیصد سے کم ہو کر ۱۸.۸ فیصد رہ گیا۔ ۱۹۸۷ میں شہر کے ۶۹.۷ فیصد لوگ مرکزِ شہر سے پانچ سے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر رہتے تھے جبکہ ۱۹۷۲ میں یہ تعداد ۵۹.۷ فیصد کے برابر تھی۔ اس جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر کی بیشتر آبادی کو مرکزِ شہر تک پہنچنے کے لیے، جہاں روزگار کی بیشتر جگہیں واقع ہیں، زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔

Scanned with CamScanner

Table 1	Ownership of Land Karachi 1988	
Owner	**Area (Acres)**	**%**
Karachi Development Authority (KDA)	124,676	29.3%
Cantonment Board	18,596	4.4%
Karachi Municipal Corporation (KMC)	24,189	5.7%
Defence Housing Authority (DHA)	16,567	3.9%
Pakistan Steel	19,461	4.6%
Port Qasim	12,961	3.0%
Karachi Port Trust (KPT)	15,259	3.6%
Pakistan Railways	3,119	0.7%
Government of Pakistan	4,051	1.0%
Government of Sindh	137,687	32.4%
Sindh Industrial Trading Estate (SITE)	5,380	1.3%
Cooperative Housing Societies	15,721	3.7%
Private	27,862	6.5%
Total	425,529	100.0%

Source: Master Plan & Environment Control Unit, KDA.
Arif Hasan, "Karachi Overview for the Global Report on Human Settlements."

زمین کی ملکیت کے ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ کراچی کی ۶۱.۷ فیصد زمین حکومت سندھ یا اس کے ادارے کے ڈی اے کے تصرف میں ہے۔ شہر کے بلدیاتی ادارے کے ایم سی کی ملکیت میں صرف ۵.۷ فیصد زمین ہے۔

Table 12	Urban Land Conversion by Distance to CBD Karachi 1970 - 1985	
Distance to CBD (km)	**Land Developed (Acres)**	**Percentage of Total Increase**
0 - 5	2,078	3.7%
5.1 - 10	5,034	9.0%
10.1 - 15	11,609	20.9%
15.1 - 20	11,589	20.8%
20.1 - 25	5,855	10.5%
25.1 - 30	3,165	5.7%
Over 30	16,309	29.3%
Total	55,639	100.0%

Source: Master Plan & Environment Control Unit, KDA.
Arif Hasan, "Karachi Overview for the Global Report on Human Settlements."

ان اعداد و شمار میں مرکزِ شہر سے فاصلے کے اعتبار سے زمین کے شہری استعمال میں آنے کے عمل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ۱۹۷۰ سے ۱۹۸۵ تک کے عرصے میں زمین کے استعمال میں یہ تبدیلی زیادہ تر اُس علاقے میں ہوئی جو مرکزِ شہر سے پانچ سے بیس کلومیٹر دور واقع ہے۔ مرکز سے ۳۰ کلومیٹر سے زیادہ فاصلے پر واقع زمین کے اعداد و شمار کا تعلق پیپری سے ہے جہاں پاکستان اسٹیل واقع ہے اور اس سے ملحق تعمیرات ہوئی ہیں۔ مرکزِ شہر سے پانچ کلومیٹر تک کے فاصلے پر بہت کم زمین شہری استعمال میں آئی۔

Scanned with CamScanner

Table 13	Urbanised Land by Distance to CBD Karachi 1970 - 1985			
Distance to CBD (km)	1970		1985	
	Urbanised Acres	% Urbanised	Urbanised Acres	% Urbanised
0 - 5	7,612	58.6%	9,690	74.6%
5.1 - 10	14,562	31.5%	19,596	42.4%
10.1 - 15	6,610	11.5%	18,219	31.6%
15.1 - 20	8,981	11.5%	20,570	26.4%
20.1 - 25	5,482	6.2%	11,337	12.8%
25.1 - 30	1,223	2.4%	4,386	8.5%
Over 30	1,924	1.6%	18,309	5.1%
Total	46,394		102,107	

Source: Master Plan & Environment Control Unit, KDA.
Arif Hasan, "Karachi Overview for the Global Report on Human Settlements."

اوپر دیے گئے اعداد و شمار سے زمین کے اس رقبے کا اندازہ ہوتا ہے جو ۱۹۷۰ اور ۱۹۸۵ میں شہری استعمال میں آ چکی تھی۔ ان سے ایک اہم بات یہ سامنے آتی ہے کہ ۱۹۷۰ میں مرکزِ شہر سے پانچ کلومیٹر تک کے فاصلے پر واقع ۴۱.۴ فیصد زمین استعمال میں نہیں آئی تھی اور ۱۹۸۵ تک بھی ۲۵.۴ فیصد زمین استعمال نہیں ہوئی تھی۔ اس زمین کی مالیت بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے اور شہری پالیسیوں کے موجودہ رجحان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے کم آمدنی والے باشندوں کی رہائش یا سہولت کے لیے استعمال نہیں کیا جائے گا۔ انہیں مرکز سے دور آباد ہونا پڑے گا اور اپنے روزگار کی جگہوں تک پہنچنے کے لیے روزانہ زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔ چناں چہ شہر میں ٹرانسپورٹ کے مسائل میں بھی شدت پیدا ہوتی جائے گی۔

Scanned with CamScanner

Table 14

Residential Land Conversion by Distance to CBD Katchi Abadis and Planned Areas Karachi 1970 - 1988

Distance to CBD (km)	Land Converted (Acres)		Katchi Abadis as a Percentage of Total
	Katchi Abadis	Planned Areas	
0 - 5	100	641	13.5%
5.1 - 10	700	2,716	20.5%
10.1 - 15	4,700	2,219	67.9%
Over 15	1,000	7,604	11.6%
Total	6,500	13,180	33.0%

Source: Karachi Land & Housing Market Study 1989.
Arif Hasan, "Karachi Overview for the Global Report on Human Settlements."

ان اعداد و شمار میں مرکزِ شہر سے مختلف فاصلوں پر واقع اُس زمین کے رقبے کا جائزہ لیا گیا ہے جو ۱۹۷۰ سے ۱۹۸۸ تک کراچی کے شہریوں کی رہائشی ضروریات کے لیے استعمال ہوئی۔ مرکز سے پانچ کلومیٹر تک کے فاصلے پر واقع ۷۴۱ ایکڑ زمین رہائشی استعمال میں آئی جس میں کچی آبادیوں کے حصے میں آنے والی زمین صرف ۱۰۰ ایکڑ، یعنی ۱۳.۵ فیصد، تھی۔ کچی آبادیوں کے لیے استعمال کی جانے والی بیشتر زمین مرکزِ شہر سے بہت دور واقع ہے، اور اس بات کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے کہ کچی آبادیوں کے باشندے کم آمدنی والے طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ٹرانسپورٹ پر زیادہ رقم خرچ نہیں کر سکتے۔

Scanned with CamScanner

Table 15	Distribution of Katchi Abadis by Distance to CBD Karachi 1970 -1988					
Distance to CBD (km)	1970		1988		Change	
	Area (Acres)	% Distance	Area (Acres)	% Distance	Area (Acres)	% Distance
0 - 5	2,700	41.5%	2,800	21.5%	100	1.5%
5.1 - 10	3,100	47.7%	3,800	29.2%	700	10.8%
10.1 - 15	400	6.2%	5,100	39.2%	4,700	72.3%
Over 15	300	4.6%	1,300	10.2%	1,000	15.4%
Total	6,500	100%	13,000	100%	6,500	100%

Source: van der Linden; UNCHS Karachi Master Plan 1986-2000; PADCO.
Arif Hasan, "Karachi Overview for the Global Report on Human Settlements."

اوپر دیے گئے اعداد و شمار مرکزِ شہر سے کچی آبادیوں کے فاصلے کو ظاہر کرتے ہیں۔ ۱۹۷۰ میں کچی آبادیوں کے ۸۲.۶ فیصد باشندے مرکز سے دس کلومیٹر تک کے فاصلے پر رہتے تھے جبکہ ۱۹۸۸ میں ان کی تعداد کم ہو کر ۵۰.۷ فیصد رہ گئی۔ ۱۹۷۰ میں کچی آبادیوں کے صرف ۶.۲ فیصد باشندے مرکز سے دس سے پندرہ کلومیٹر دور مقیم تھے جبکہ ۱۹۸۸ میں یہ تناسب بڑھ کر ۳۹.۲ فیصد ہو گیا۔ شہر کے خوش حال لوگ مرکز سے کم فاصلے پر رہتے ہیں، اور یہ رجحان دنیا کے دوسرے شہروں کے رجحان کے برعکس ہے جہاں خوش حال لوگوں کی آبادیاں شہر کے مضافات میں واقع ہوتی ہیں کیوں کہ ان کے پاس ذاتی ٹرانسپورٹ ہوتی ہے۔

اس انتخاب میں شامل تجزیوں میں واضح کیا گیا ہے کہ شہر کی آبادی بہت تیزی سے ایک دوسرے سے جغرافیائی اعتبار سے دور دور واقع طبقاتی محلوں میں بٹتی جا رہی ہے جن کا ایک دوسرے سے سماجی تعلق نہایت کمزور ہو گیا ہے۔ شہر کے خوش حال لوگوں کو، جو مرکز کے نزدیک مقیم ہیں، مضافات میں واقع کم آمدنی والے علاقوں کو دیکھنے کا بہت کم اتفاق ہوتا ہے، چناں چہ وہ کچی آبادیوں کے باشندوں کے سماجی حالات سے اکثر بے خبر رہتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

کتابیات

انگریزی

Abbot, J., *Sind: A Reinterpretation of the Unhappy Valley*, 1924.
Advani, A. B., *Annexation of Sind*, 1933.
Advani, A. B., "The Early British in Sind", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-1, Part 2, 1934.
Ahmad, Kazi S., "A Geographical Study of the Refugee Problem", in *Pakistan Geographical Review*, Vol 10, No.2, 1955.
Ahmed, S. Haroon, Ed., *Contemporary Conflicts*, Karachi: Pakistan Psychiatric Society Sindh Chapter, 1991.
Ahsanullah, *The Goths of Karachi: A Study of Urban Villages*, Karachi: Karachi Geographers Association, 1967.
Ahsanullah & Izzatullah, *The Port of Karachi*, Karachi: Karachi Geographers Association, 1954.
Aitken, E. H., *Gazetteer of the Province of Sind*, Karachi: Mercantile Steam Press, 1907.
Ajwani, L. H., Ed., *The Golden Jubilee Book of the D J Sind College*, Karachi, 1939.
Alavi, Humza, "The Politics of Ethnicity in India and Pakistan", in *Sociology in Developing Societies*, (Ed. Humza Alavi & Ohn Haries.)
Ali, Dr. Mubarak, *A Social and Cultural History of Sindh , Based on the accounts of the European travellers who visited Sindh*. Lahore: Book Traders,1987.
Ali, Dr. Mubarak, *Sindh Observed, Selections from the Journal of Sind Historical Society*, Lahore: Gautam Publishers, 1993.
Ali, Dr. Mubarak, *Sindh Analysed*, Lahore, 1993.
Ali, Syed Mansoor, *Informal System of Solid Waste Recycling: Preliminary Findings in Karachi*, (Prepared for Water Engineering & Development Centre, Department of Civil Engineering, Loughborough University of Technology, England.) 1993.
All India Industrial Exhibition Guide Book, Karachi: Karachi Municipal Corporation, 1939.
Allen, Rev. I. N., *Diary of a March through Sind and Afghanistan*, 1843.
Amin, Mohamed, Duncan Willets & Brian Tetley, *Karachi*,

Karachi: Pak American Commercial Ltd., 1986. (Coffee table book.)
Andrews, W. P., *The Indus and Its Provinces, Thier Political & Commercial Importance, Considered in Connection with Improved Means of Communication,*
London: William H. Allen & Co., 1857.
Anonymous, *Draft History of the Port Trust*, 1905.
Anonymous, *A Guide to Karachi.* (79 pages with b/w plates.)
Bailie, A. F., *Kurrachee: Past, Present and Future,*
1890; Reprinted Karachi: Oxford University Press.
Bease, George, *The Sind Directory*, Bombay: Bombay Gazetteer Press, 1862.
Bellasis, A. F., *An Account of the Kurrachee Municipality*, 1860.
Bhojwani, T. J., *Municipal Post War Construction Schemes*, 1944.
Bilgrami, S. A. R., *The Pakistan Yearbook & Who's Who, 1949,*
Karachi: Kitabistan, 1949.
Billimoria, N. M., *Town Planning Scheme: Karachi No. 2*, 1936.
Billimoria, N. M., "Major General E T Marston", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-III, Part 3, 1936.
Billimoria, N. M., "Alexander Hamilton's Description of Sind", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-IV, Part 4, 1939.
Billimoria, N. M., "Life of Charles Masson & Masson's Notes on Kurrachee", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-IV, Part 3, 1940.
Billimoria, N. M., *Annual Report on Public Instruction in Sind*, 1943.
Billimoria, N. M., "Census Reports of Sind for 1931 & 1941: A Comparison", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-VI, Part 4, 1943.
Brow, D. B., *The Port of Karachi: Outline History 1843-1945*, 1945.
Brunton, John, *The Diary of John Brunton*
Complete title: "John Brunton's Book, Being the Memories of John Brunton, Engineer, from a manuscript in his own hand written for his grandchildren and now first printed,"
Cambridge: Cambridge University Press, 1939.
Burton, Richard F., *Scinde: The Unhappy Valley*, 1851.
Burton, Richard F., *Scinde and the Races that Inhabit the Valley of the Indus*,
London, 1851; Reprinted Karachi: Indus Publications, 1988.
Burton, Richard F., *Sind Revisited*, Reprinted Karachi, 1992.
Byron, Fraewell, *Burton: A Biography of Richard Francis Burton*,
London: Longman, Green & Co., 1964.
Carless, *Memoirs on the Bay, Harbour and Port of Kurrachee*, 1838.
Chablani, H. C., *The Separation of Sind from the Bombay Presidency: A Rejoinder to Khan Bahadur Mahomed Ayoob S. Khuhro's* "A Story of the Sufferings of Sind,"
Karachi: Koh-i-Noor Printing Works, 1931.
Chablani, S. P., *Economic Conditions in Sind*,
Bombay: Longman, Green & Company, 1951.
Chano, Saheb Khan, *The Movement for Separation of Sind from the Bombay Presidency, 1847-1937*,
(Ph. D. thesis for the University of Sindh.) 1983.

Scanned with CamScanner

Chaudhry, Amir Nazir, *Social Revitalisation, Case Study: Saddar, Karachi*, (B. Arch. thesis for Dawood College of Engineering & Technology, Karachi.) 1990.
Cory, A., *The Sind Gazette*, 1893.
Cory, A., *Minutes on the Administration of the Municipality from 1891 to 1894*, Karachi, 1894.
Crow, N., *Account of the Country of Sind*, 1799.
D'Souza, *Goan Society in Transition*, Bombay, 1975.
Dadachanji, F. K., *Parsis Ancient and Modern*, Karachi: Published by the author, 2nd edition, 1986.
Dalal, T. B., *A Quarter Century of Karachi Cotton Trade*, 1940.
Del Hoste, L. F., *Memoir on Sind*, Bombay: Secret & Political Department Report No.571, 1832.
De Verteuil, F. J., *Fifty Wasted Years*, 1938.
Dhalla, Dastur Dr Maneckji Nusserwanji, *The Saga of a Soul: An Autobiography*, Translated from Gujarati by Gool & Behram Sohrab Rustamji, Karachi: Dastur Dr Dhalla Memorial Institute, 1975.
Eastwick, E. B., *A Glance at Sind before Napier, or Dry Leaves from Young Egypt*, 1849; Reprinted Karachi: Indus Publications, 1989.
Elliot, H. M., *The History of India as told by its own Historians*, 1867.
Ellis, *Memoir on the State and Resources of Scinde*, 1809.
Ellis, B. H., *Report on Education in Scinde*, Bombay: Educational Society Press, 1856.
Feldman, Robert, *Karachi through a Hundred Years (1860-1960)*, Karachi: Oxford University Press, 1960.
Furber, Holen, *John Company at Work*, Cambridge: Cambridge University Press, 1951.
Gidumal, Dayaram, *Life and Life-work of B M Malabari*.
Golden Jubilee Book of Sindh Madressatul Islam, Karachi, 1935.
Haider, Dr. Azimusshan, *A History of Karachi*, Sub-titled: "With Special Reference to Educational, Demographic and Commercial Development, 1839-1900." (Ph.D. thesis for the University of Karachi.) Karachi: Pubilshed by the author, 1974.
Haig, M. R., *The Indus Delta Country*, London: Kegan Paul & Co., 1894.
Harrison, H. E. L. T., & G. W. Jog, *A Handbook of Karachi*, Karachi: Educational Printing Press, 1933.
Hart, S. V. G., *Town and Port of Kurrachee*, 1840.
Hasan, Arif, *Seven Reports on Housing*, Karachi: Orangi Pilot Project-Research & Training Institute, 1992.
Hasan, Arif, *Manual for Rehabilitation Programmes for Informal Settlements Based on the Orangi Pilot Project Model*,

Scanned with CamScanner

Karachi: Orangi Pilot Project-Research & Training Institute, 1992.
Hasan, Arif, *Scaling-up of the OPP's Low-cost Sanitation Programme,* Karachi: Orangi Pilot Project-Research & Training Institute, 1992.
Hasan, Arif, *Karachi Overview for the Global Report on Human Settlements,* (Prepared for the International Institute for Environment & Development, U.K.) 1992.
Hasan, Arif, *Karachi Master Plan 1986-2000: Report of the Evaluation Committee,* (Prepared for United Nations Development Programme.) 1994.
Hasan, Arif, *Coastal Environmental Management Plan for Pakistan: Environmental Profile of Coastal Communities,* 1989.
Hasan, Arif, *Evaluation of the Community Development Work at Rehri Carried out by the Coastal Ecosystem Unit, IUCN,* 1993.
Hasan, Khalid Shamsul, *Sindh's Fight for Pakistan,* Karachi: Shamsul Hasan Foundation, 1992.
Homji, H. B. M., *O Whither Parsis?,* Karachi: Published by the author, 1978.
Hotchand, Seth Naomal, *Memoirs of Seth Naomal Hotchand, CSI, of Karachi (1804-1878),* Complete title: "A Forgotten Chapter of Indian History, as told by Seth Naomal Hotchand, CSI, of Karachi (1804-1878), Written by Himself and Translated by His Grandson Rao Bahadur Alumal Trikamdas Bhojwani, BA, Edited with an Introduction by Sir H. Evan M. James, KCIE, CSI, Commissioner of Sind, 1891-1899, Printed for Private Circulation only." Exeter: William Pollard & Co. Ltd., 1915.
Hughes, A. W., *A Gazetteer of the Province of Scinde*, 1874.
Humphrey, J., *Story of the Sind Club*, Karachi, 1946.
Husain, Saleha Bilal, *In Karachi,* (A collection of newspaper columns), Karachi: Institute of Social Sciences, 1990,
Husain, Commander (Retd.) Syed Mazhar, *Indus Delta in Retrospect*, Karachi: Published by the author, 1990.
Hussain, Akmal, "The Karachi Riots of December 1986: Crisis of State and Civil Society in Pakistan," in Das, Veena, Ed., *Mirrors of Violence: Communities, Riots and Survivors in South Asia*, New Delhi: Oxford University Press, 1990.
Hussain, Mohammad, *Economic History of Hyderabad, W. Pakistan*, Hyderabad: Sind University Press, 1956.
In the Land of the Sindhi and the Baluchi: A Report on Catholic Activities in Sind and Baluchistan, 1935-1947, Karachi, 1947.
Jafri, Dr. S.M. H., *The Flora of Karachi (Coastal West Pakistan),* Karachi: The Book Corporation, 1966.
Jamshed Nusserwanji Mehta: A Memorial,

Karachi: Jamshed Nusserwanji Memorial Committee, 1954.
Jillani, M. S., *Resettlement of Displaced Persons in Pakistan*, (Ph.D. dissertation, Department of Sociology, University of Chicago.) 1962.
Katrak, Sohrab H. K., *Karachi that was the Capital of Sind*, Karachi: Published by the author, 1957.
Kennedy, R. H., *Narrative of the Campaign of the Army of Indus*, 1840.
Khamisani, Ameena, *Sind's Contribution to English*, Jamshoro: Institute of Sindhology, 1975.
Khan, H. H. Aga, *The Memoirs of Aga Khan*, London: Cassel & Company, 1954.
Khan, Ansar Zahid, *History and Culture of Sindh*, Karachi: Royal Book Company, 1980.
Khan, Mohammad Zafar Ahmad, *The Development of a Pre-industrial City: An Economic Geography of Karachi*, (Ph. D. Thesis, London University.) 1970.
Khan, Mohammad Zafar Ahmad, *Karachi: An Urban Development Profile* Karachi: Karachi Geographers Association Publication 8, 1970.
Khosla, G. D., *Stern Reckonings: A Survey of the Events Leading Up To and Following the Partition of India*, Delhi: Oxford University Press, 1989. (1st Edition 1949.)
Khuhro, Hamida, *The Making of Modern Sind: British Policy and Social Change in the Nineteenth Century*, Karachi: Indus Publications, 1978.
Khuhro, Hamida, Ed., *Sind Through the Centuries*, Karachi: Oxford University Press, 1981.
Khuhro, Hamida, Ed., *Documents on Separation of Sindh from the Bombay Presidency*, Islamabad: National Institue of Historical & Cultural Research, 1982.
Khuhro, M. A., *A Story of the Sufferings of Sind*, Karachi: Published by the author, Bharat Printing Press, 1930.
Khuhro, M. A., *A Convincing Case for Separation of Sind*, Karachi: Navalrai fatehchand, Bharat Printing Press, 1933.
Kincaid, C. A., *Forty-four Years of Public Service*, 1934.
Kincaid, Dennis, *British Social Life in India (1608-1937)*, 1939.
Kool, Maarten L., Dik Verboom and Jan J. van der Linden, *Squatter Settlements in Pakistan*, Sub-titled: "The Impacts of Upgrading", Lahore: Vanguard Books (Pvt) Ltd., 1988.
Kulke, Eckehard, *The Parsis in India: A Minority as Agents of Social Change*, Bombay: Vikas Publishing House, 19—
Lalji, Haridas, *Silver Jubilee of Buyers and Shippers Chamber*, 1941.
Lambrick, H. T., *Sind: A General Introduction*, Hyderabad: Sindhi Adabi Board, 1964.

Scanned with CamScanner

Lambrick, H. T., *Sir Charles Napier and Sind*,
Oxford: Clarendon Press, 1952.
Latif, Nargis, *Karachi O Karachi*, (A collection of newspaper columns),
Karachi: Published by the author, 1989.
Life History of Sir Jehangir Kothari,
Bombay: Times of India Press.
Linden, Jan van der & Frits Selier, *Karachi: Migrants, Housing and Housing Policy*,
Lahore: Vanguard Books (Pvt) Ltd., 1991.
Lupton, S., *Karachi Handbook*, 1920 edition.
Karachi: The Daily Gazette Press Ltd., Caxton House, 1920.
Malkani, Kewalram Rattanmal, *The Sindh Story*,
New Delhi: Allied Publishers Private Limited, 1984.
Mariwala, C. L., "The First Railway in Sind", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-I, Part 2, 1934.
Mariwala, C. L., "Karachi Town and its Trade and Taxation in the First Half of the 19th Century", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-IV, 1940.
Mariwala, C. L., "Two Great Occasions in British History in Sind", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-V, Part 1, 1940.
Mariwala, C. L., "Origin of the Karachi Municipality", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-V, Part 2, 1941.
Mariwala, C. L., "Treaty and Travels in Sind 1810-1820", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-VI, Part 2, 1942.
Mariwala, C. L., "British Administration in Sind in 1799", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-VI, Part 1, 1943.
Mariwala, C. L., *Essays on British Policy towards Sind upto the First Afghan War 1839*,
Bombay: 1947; Reprinted Karachi: Indus Publications, 1982.
Mehta, Jamshed N. R., *Karachi Municipaliy*, Karachi, 1925.
Mehta, Jamshed N. R., *Seperation of Sind*, Karachi, 1928.
Mehta, Jamshed N. R., *Karachi Extension*, Karachi, 1929.
Melvillia, J., *Scinde: 1848 Administrative Report by the Order of House of Commons*, 1854.
Merriman, R. D., "The Indian Navy: A Review of Activities in Sind from 1615 to 1863", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-VI, Part 3, 1943.
Mirams, A. E., *Report on the Development of Karachi*, Bombay, 1923.
Mirchandani, B. D., "Crow's Account of Sind", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-I, Part 2, 1934.
Moinuddin, *Sindh: Land of Legends*,
Karachi: National Book Foundation, 1975.
Morris, Jan, *Stones of Empire: The Buildings of British India*,
London: Penguin Books, 1994. (1st edition OUP, 1983.)
Mughul, M. Yakub, Ed., *Studies on Sind*; Jamshoro: University of Sindh, 1988.
Napier, William, *History of Sir Charles Napier's Administration of Scinde and Campaign in the Cuthee Hills*,
London: Chapman & Hall, 1851.

Scanned with CamScanner

Napier, William, *The Life and Opinions of Sir Charles Napier*, (4 vol.)
London: John Murray, 1857.
Neill, J. Martin Bladen, *Recollections of Four Years Service in the East with 40th Regiment*,
London: Richard Bentley, 1845.
Nientied, Peter, *Redevelopment in Karachi's Inner City: The Lines Area Project.*
(Preliminary report prepared for Department of Development Sociology, Free University, Amsterdam.) 1984.
Outram, J., *The Conquest of Sind: A Commentary*, (2 Vol),
Reprinted Karachi: Indus Publications, 1978.
Overview of Children in Armed Conflicts in Sindh,
(A report prepared by Raasta Development Consultants, Karachi for UNICEF.) 1995.
Panhwar, M. H., (Comp.), *Source Material on Sindh*,
Jamshoro: Institute of Sindhology, 1977.
Patel, D. N., *Karachi Guide & Directory for 1915*,
Karachi, 1915.
Pirzada, D. A., *Hatim A Alavi: A Pillar in the Pakistan Movement*,
Karachi: Mehran Publishers, 1994.
Pithawala, Maneck B., "Historical Geography of Sind", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-I, Part 2&3, 1934.
Pithawala, Maneck B., *Sind's Changing Map: An Album Containing 51 Old and Rare Maps of Sind with Critical and Explanatory Notes on them*,
Karachi: Published by the author, 1938.
Pithawala, Maneck B., *Greater Karachi*, Karachi, 1938.
Pithawala, Maneck B., *Problems of Greater Karachi*, Karachi, 1939.
Pithawala, Maneck B., & Martin Kaye, *Geology and Geography of Karachi and its Neighbourhood*, Karachi, 1946.
Pithawala, Maneck B., *An Introduction to Karachi, Its Environs and Hinterland*, Karachi: The Times Press, 1949 (or 1950.)
Pithawala, Maneck B., *Historical Geography of Sind*,
Jamshoro: Institute of Sindhology, 1978. (1st edition 1936.)
Postans, T., *Personal Observations on Scinde*,
London: 1843; Reprinted Karachi: Indus Publications, 1973.
Pottinger, H., *Travels in Baloochistan and Scinde*,
London, 1816, Reprinted Karachi: Indus Publications, 1986.
Preedy, Capt., *Selections from the Pre-Mutiny Records of the Commissioner in Sind*, Karachi: The Commissioner's Press, 1931.
Quadri, Syed Munir Zia, *Jungshahi: An Urban Profile*,
Karachi: Karachi Georaphers Association Publication 2, 1966.
Rahman, Mushtaqur, *Land and Life in Sindh, Pakistan*,
Lahore: Ferozsons Ltd., 1993.
Raza, M. Hanif, *Karachi: The Show Window of Sind*,
Karachi: Editions Mistiques, 2nd edition 1984, (1st edition 1970).
Rehmatullah, Shireen, *Ethnic Conflict in Karachi*,

Scanned with CamScanner

Islamabad: National Council of Social Welfare, 1988.
Report of the Christian Research Centre,
Karachi, 1973.
Rizvi, Taher, *Parsis: A People of Book,*
Calcutta: Imperial Art Cottage, 1928.
Ross, D., *The Land of Five Rivers in Sind,*
Sub-titled: "Sketches Historical and Descriptive,"
London: Chapman & Hall, 1883.
Rubie, C.B. & B. D. Shanker, *A History of the Sindh Cricket Tournament and Karachi Cricket in General,*
Karachi: Edwin Forster & Co., Caxton House, 1928.
Rustamji, Behram Sohrab H. J., *Karachi 1939-1947,*
Karachi: Kitabistan Ltd, 1952.
Sayed, G. M., *Struggle for New Sind: A Brief Description of Provincial Autonomy in Sind During a Decade* (1937-1947),
Karachi: Sind Observers Press, 1949.
Shafi, Mian Ahmad, *Haji Sir Abdoola Haroon: A Biography,*
Karachi: Herald Press.
Shaheed, Farida, "The Pathan Mohajir Conflicts, 1985-6: A National Perspective," in Das, Veena, Ed., *Mirrors of Violence: Communities, Riots and Survivors in South Asia*, New Delhi: Oxford University Press, 1990.
Shaikh, Abdul Hamid, *Informal Sector Housing Study of Goths in Karachi,* (B. Arch. thesis for Dawood College of Engineering & Technology, Karachi.) 1990.
Shaikh, Muhammad Ali, *Sindh Madressah: A Journey through Time,*
Karachi: Sindh Madressatul Islam, 1995.
Sidhwa, R. K., *The Corporation of the City of Karachi*, 1939.
Smith, N. H., *Correspondence between the Envoy of Sind and the Officers of Mir Gholam Ali Talpur of Karachi*, 1809.
Smyth, *Gazetteer of the Province of Sind*, Vol I-B, 1919.
Soomro, Faiz Mohammad, *Cultural History of Sind,*
Karachi: National Book Foundation, 1977.
Soomro, Muhammad Qasim, *Muslim Politics in Sindh (1938-1947),*
Jamshoro: Pakistan Study Centre, University of Sindh, 1989.
Sorley, H. T., *Gazetteer of West Pakistan: The Former Province of Sind,*
Karachi: West Pakistan Government Press, 1968.
Souvenir of Golden Jubilee of the Karachi Goan Association, 1886-1936,
Karachi, 1936.
Souvenir of Sind Multan Baluchistan Federation of Theosophical Society,
Karachi: Theosophical Society, 1943.
Souvenir Volume of the Karachi Goan Association, 1886-1956,
Karachi, 1956.
State of Human Rightsin 1995,
Lahore: Human Rights Commission of Pakistan, 1996.
Street Children of Karachi, (Report of a Study by the Institute of Social

Scanned with CamScanner

Research & Development, Karachi, conducted for UNICEF.) 1990.
Tahilramani, Persram V., *Why the Exodus from Sind?*
Taraporewalla, E. H., *The Karachi Residential & Mercantile Directory for 1938-39,*
Karachi: The Daily Gazette Press, 1939.
Temple, B., *The Karachi Hand-book and Directory,*
Karachi, 1914.
Temple, R., *Men and Events of My Time in India*, 1882.
Thomas, R. Hughes, *Selections form the Records of the Bombay Government,* Bombay: Government of Bombay, 1855.
Thomas, R. Hughes, Ed., *Memoirs on Sind,*
New Delhi: Low Priced Publications, 1993. (1st edition 1855.)
Walker, J., *Kurrachee Harbour in Scinde*, 1856.
Webb, Montague de P., *The Karachi Hand-book and Directory 1921*,
Karachi, 1922.
Webb, Montague de P., *The Karachi Who's Who and Why*,
Karachi: The Daily Gazette Press, 1932.
Wilton, J. H., *Scenes in a Soldier's Life*, 1848.
Wright, Theodore P., "Centre-Periphery Relations and Ethnic Conflict in Pakistan: Sindhis, Muhajirs and Punjabis", in *Comparative Politics*, Spring 1991.
Young, Keith, *Sind in the Forties*, Reprinted Karachi: Indus Publications, 1994.
Zaidi, S. Akbar, Ed., *Regional Imbalances & the National Question in Pakistan,* Lahore: Vanguard Books (Pvt) Ltd., 1992.
"Zarrin-Qulam", "Post Offices in Sind", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-V, Part 4, 1942.

اردو

آگینٹ، وی ایف، "سندھ: تاریخ کے آئینے میں (از ۱۹۱۸ تا ۱۹۸۵)"، ترجمہ: ڈاکٹر محمود صادق وغیرہ،
کراچی: ناوکا، مکتبہ دانیال، ۱۹۸۹ء۔
احد، شہناز، (مرتب)، "کراچی کیوں جلتا ہے؟"، (انٹرویوز)، کراچی: ورکنگ وومن پبلیکیشنز، ۱۹۸۷ء۔
احمد، پروفیسر عزیزالدین، "کیا ہم اکٹھے رہ سکتے ہیں؟ (پاکستان میں قومیتی مسئلے کا تجزیہ)"،
لاہور: مکتبہ فکرودانش، ۱۹۸۸ء۔
اسلم، پروفیسر محمد، "خفتگانِ کراچی"، لاہور: ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب، ۱۹۹۱ء۔
اطہر، خالد، (مرتب)، "سفرِ زندگی: ایم کیو ایم کی کہانی، الطاف حسین کی زبانی"،
لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۸۸ء۔
بھٹو، محمد موسیٰ، "پاکستان میں قومیتوں کے مسائل اور ان کا حل

Scanned with CamScanner

(سندھ کے موجودہ حالات کے پس منظر میں)"، حیدر آباد: سندھ نیشنل اکیڈمی، ۱۹۸۴۔
بیگ، میرزا عبدالقادر، "کراچی کا تاریخی مقدمہ"، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۵۔
پرکاش، سری، "پاکستان: قیام اور ابتدائی حالات"، ترجمہ: محمد حمایت الحسن، لاہور: تخلیقات، ۱۹۹۴۔
چوہدری، زاہد، "جناح لیاقت تضاد اور پنجابی مہاجر تضاد"، ("پاکستان کی سیاسی تاریخ"، جلد ۴)،
لاہور: ادارہ مطالعہ تاریخ، ۱۹۹۰۔
چوہدری، زاہد، "سندھ: مسئلہ خود مختاری کا آغاز"، ("پاکستان کی سیاسی تاریخ"، جلد ۶)،
لاہور: ادارہ مطالعہ تاریخ، ۱۹۹۴۔
خان، فرحت شیر، "کتاب سے کلاشنکوف تک"، کراچی: پاکستانی ادب پبلی کیشنز، ۱۹۹۴۔
"دعویٰ جوابِ دعویٰ: ایم کیو ایم، حکومت سپریم کورٹ میں"، لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۵۔
رامے، حنیف، (مدیر)، ہفت روزہ "نصرت"، لاہور (مہاجرین نمبر)، ۵ جولائی ۱۹۵۹۔
رزداری، ڈاکٹر محمد لائق، "غدار سندھ (برطانوی فتحِ ہند کے کردار)"،
مورو: سندھ ہسٹاریکل اینڈ کلچرل سوسائٹی، ۱۹۹۴۔
رشید، جمال، "سندھ دوراہے پر"، کراچی: پاکستانی ادب پبلی کیشنز، ۱۹۹۴۔
رضویہ، محمودہ، "ملکہ مشرق"، کراچی:
علی، ڈاکٹر مبارک، "سندھ: خاموشی کی آواز"، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۴۔
سلیم، احمد، (مرتب)، "سلگتا ہوا سندھ"، لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۰۔
شیریں، زہت، "اغوا برائے تاوان"، کراچی: مطبوعات محمود، ۱۹۹۱۔
صدیقی، احمد حسین، "گوہرِ بحیرۂ عرب (کراچی)"، کراچی: محمد حسین اکیڈمی، ۱۹۹۵۔
مرزا، محمود، "آج کا سندھ — پاکستان کی یکجہتی کے مسائل"، لاہور: پروگریسو پبلشرز، ۱۹۸۶۔
منظر، شہزاد، "سندھ کے نسلی مسائل"، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۴۔
ناصر، حمید، (مدیر و مولف)، "وادی ملیر"، کراچی: حمید ناصر، ۱۹۸۷۔
ناصر، حمید، (مدیر و مولف)، "وادی لیاری"، کراچی: حمید ناصر، ۱۹۹۲۔
یوسف، اقبال، "کراچی پیپرز"، کراچی: رِکتاب، ۱۹۹۵۔

سندھی

ایاز، شیخ، "ساہیوال جیل جی ڈائری" (ساہیوال جیل کی ڈائری)، حیدر آباد: نیو فیلڈس پبلی کیشنز، ۱۹۸۶۔
ڈوڈیجا، لوک رام، "منھنجو وطن منھنجا ماڻھو" (میرا وطن میرے لوگ)،
حیدر آباد: نیو فیلڈس پبلی کیشنز ۱۹۹۳۔
راشدی، پیر علی محمد، "اُھے ڈینھں اُھے شینھں" (وہ دن وہ شیر)،
حیدر آباد: سندھی ادبی بورڈ، جلد اوّل ۱۹۶۶، جلد دوم ۱۹۸۰۔

راشدی، سید حسام الدین، ''ہُوڈو تھی ہُوڈ سنڌ''، حیدر آباد: سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۷۷ء۔
سید، جی ایم، ''جنب گذاریم جن سین''، (دو جلدوں میں)، حیدر آباد: سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۷۹ء۔
علی، میر امداد، ''مس کراچی''، حیدر آباد: پرھ پھُٹی اشاعت گھر، ۱۹۷۰ء۔
کلپنا، موہن، ''بکھ، عشق، ادب'' (بھوک، عشق، ادب)، حیدر آباد: سپی پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء۔
گیانچندانی، سوبھو، ''تاریخ جا وساریل ورق'' (تاریخ کے بھلائے ہوئے اوراق)، حیدر آباد: سندھی ساہت گھر، ۱۹۹۴ء۔
نظامانی، رئیس کریم بخش خان، ''کیئی کتاب''، (جلد اول)، حیدر آباد: نیو فیلڈس پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء۔
ہوت چند، سیٹھ ناؤں مل، ''یادگیریوں'' (یادداشتیں)، ترجمہ: محمد حنیف صدیقی،
حیدر آباد: سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۶۸ء۔

***

aaj

an urdu journal of literature and ideas

Published quarterly from Karachi, *aaj* presents each time a selection of contemporary writings from many languages of the world, translated in Urdu, as well as some ground-breaking Urdu writings of today. At the end of each regular issue a special section - a small anthology in itself - is devoted to a particular writer or subject. The special issues of *aaj* published so far have presented selections of Arabic, Persian and Hindi short stories, selected fiction of Gabriel Garcia Marquez, writings from different parts of the world covering the tragedy of Bosnia, and, recently, the "Story of Karachi" in two volumes - a third volume is to be published shortly.

Subscription

Pakistan:
Rs 300 (one year), Rs 500 (two years)
Please send the subscription through
cheque/pay order/draft drawn in favour of
"Quarterly Aaj, Karachi"
to the following address:
Managing Editor, aaj,
A-16, Safari Heights,
Gulistan-e-Jauhar, Karachi 75290.
Tel: (021) 811-3474
e-mail: aaj@biruni.erum.com.pk

Outside Pakistan:
Individuls: US$ 25 (one year), US$ 45 (two years)
Institutions: US$ 40 (one year), US$ 70 (two years)
Please send the subscription in US dollars to
Dr Muhammad Umar Memon,
5417, Regent Street,
Madison, WI 53705, USA.
Tel: (608) 233-2942
Fax: (608) 265-3538
e-mail: mumemon@factstaff.wisc.edu

Subscription includes registered air mail charges.

Scanned with CamScanner

شمارہ ۱ : خزاں ۱۹۸۹

تاراشنکر بنرجی — ستیہ جیت رے — اسد محمد خاں
محمد خالد اختر — ڈونلڈ بارتھیم — ولیم سیرویان
افضال احمد سید — ذی شان ساحل — نسرین انجم بھٹی — سعیدالدین
نیر مسعود — فروغ فرخ زاد — بابا مقدم

(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۲ : سرما ۱۹۹۰

نجیب محفوظ — لیو تالستائی — یکیم مُوزنو
مظفر علی سید — فہمیدہ ریاض — عذرا عباس
احمد فواد — محمد خالد اختر — اکرام اللہ

(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۳ : بہار ۱۹۹۰

اتالو کلووینو — امین مالوف — محمد عمر میمن
محمد سلیم الرحمٰن — جیک لنڈن — محمد انور خالد
زیبا الیاس — محمد خالد اختر — تادیوش روزے وچ
زبگنیو ہربرٹ — وسلاوا شمبورسکا — الیگزانڈر وات

(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۴ : گرما ۱۹۹۰

وجے دان دیتھا — انور خاں — حسن منظر
محمد سلیم الرحمٰن — شمس الرحمٰن — شمس الحق
فہمیدہ ریاض کی طویل تحریر: "زندہ بہار ـــ ایک سفر کی روداد"

(دستیاب نہیں ہے)

Scanned with CamScanner

شمارہ ۵ : خزاں ۱۹۹۰

منوچہر خسروشاہی　　بابا مقدم　　جمال میرصادقی
ثروت حسین　　ذی شان ساحل　　اوکتاویو پاز　　یہودا امیخائی
جولین بارنز　　فاروق خالد　　محمد خالد اختر　　علی امام نقوی
ایک مختصر انتخاب ــــ خورخے لوئس بورخیس
(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۶ : سرما ۱۹۹۱

اے بی یہوشوا　　صلاح الدین محمود　　فہمیدہ ریاض
نیر مسعود　　یانس رِتسوس　　انطون شماس　　اسما راجہ
وِلاس سارنگ ــــ چار کہانیاں
(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۷ : بہار ۱۹۹۱

خصوصی شمارہ ــــ گابریئل گارسیا مارکیز
(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۸ : گرما خزاں ۱۹۹۱

منوج داس　　ضمیر الدین احمد　　نیر مسعود　　اکرام اللہ
خالدہ حسین　　نکانور پارّا　　افتخار جالب　　اوسِپ ماندلستام
افضال احمد سید　　عذرا عباس　　بیری پین　　ذی شان ساحل
گریگور فان ریزوری ــــ ناول کا ایک باب
(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۹ : سرما ۱۹۹۲

خصوصی شمارہ

مصر، جنوبی افریقا، موزمبیق، زمبابوے، ہندوستان،
امریکا، میکسیکو، انگلستان، آئرلینڈ اور اٹلی کے ادیبوں کی کہانیاں
(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

Scanned with CamScanner

شمارہ ۱۰ : بہار ۱۹۹۲

معاصر اردو فکشن : تیرہ کہانیاں اور ایک ناول

نیر مسعود اسد محمد خاں حسن منظر

مسعود اشعر انور خاں قمر احسن

فہمیدہ ریاض کا مکمل ناول ـــ "گوداوری"

صغیر ملال ـــ منتخب کہانیاں

(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

شمارہ ۱۱ : گرما خزاں ۱۹۹۲

محمد خالد اختر اسد محمد خاں نیر مسعود

فہمیدہ ریاض افضال احمد سید میروسلاو ہولب سیمون دُبووار

ژاں ژینے کا مکمل کھیل "خادمائیں"

(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

شمارہ ۱۲ : سرما ۱۹۹۳

پریم چند گابریئل گارسیا مارکیز ٹیڈ ہیوز فہمیدہ ریاض

ضمیر الدین احمد ذی شان ساحل سعید الدین محسن خاں

آئزک باشیوس سِنگر ـــ منتخب کہانیاں

(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

شمارہ ۱۳ : بہار ۱۹۹۳

خصوصی شمارہ ـــ عربی کہانیاں

توفیق الحکیم عبدالسلام العجیلی زکریا تامر محمد برّادا

علیفہ رفعت حنان شیخ بہا طاہر محمود دیاب ابراہیم الکونی

یوسف ادریس یوسف شارونی ادوَرد الخراط طیب صالح

نبیل جورجی محمد خضیر غسان کنفانی

(دستیاب نہیں ہے)

Scanned with CamScanner

شمارہ ۱۴ : گرما خزاں ۱۹۹۳

وسیلی شوکشن　محمد خالد اختر　افضال احمد سید　افتخار جالب
محمد انور خالد　نیر مسعود　اسد محمد خاں
مصطفیٰ ارباب　سیمون دُبووار　ابار ربی
ریشارد کاپوشنسکی کی مکمل کتاب "شہنشاہ"
(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

شمارہ ۱۵ : سرما بہار ۱۹۹۴

خصوصی شمارہ ـــــ فارسی کہانیاں

صادق ہدایت　بابا مقدم　بزرگ علوی　جلال آلِ احمد
غلام حسین ساعدی　جمال میر صادقی　غلام حسین نظری
اسماعیل فصیح　فریدون تنکابنی　سیمین دانشور　ابراہیم گلستان
نادر ابراہیمی　محسن دامادی　محمود دولت آبادی
نسیم خاکسار　امین فقیری　منیرو روانی پور　فریدہ رازی
(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۱۶ : گرما ۱۹۹۴

گابریئل گارسیا مارکیز　فہمیدہ ریاض　رگھوویر سہائے
ثروت حسین　نیر مسعود　حسن منظر　سید محمد اشرف
اکرام اللہ　مظفر علی سید　سیمون دُبووار
وِجے تینڈولکر کا مکمل کھیل "خاموش! یہ عدالت ہے"
(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

شمارہ ۱۷ : خزاں ۱۹۹۴

خصوصی شمارہ ـــــ سرائیوو سرائیوو

بوسنیا سے متعلق تحریروں کا ایک انتخاب
(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

Scanned with CamScanner

شمارہ ۱۸ : سرما ۱۹۹۵

خصوصی شمارہ — ہندی کہانیاں

امر کانت　　رام کمار　　اُشا پریم ودا　　راجیندر یادو
کاشی ناتھ سنگھ　　موہن راکیش　　بھیشم ساہنی
نرمل ورما　　شانی　　اصغر وجاہت　　منو بھنڈاری
راجی سیٹھ　　سودیش دیپک　　گووند مشر　　عبدل بسم اللہ
شری لال شکل　　گیان رنجن　　اُدے پرکاش

(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۱۹ : بہار گرما ۱۹۹۵

نیر مسعود　　ذی شان ساحل　　حسن منظر　　افضال احمد سید
محمد انور خالد　　افتخار جالب　　سعید الدین　　ثروت زہرا
آصف فرخی　　انور خاں　　نکہت حسن　　اپیتاو گھوش　　ایوان کلیما
فہمیدہ ریاض　　اُدے پرکاش　　گریس او گوٹ　　جونا تھن ٹرائٹل
برنارڈ مالاڈ — منتخب کہانیاں

(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

Scanned with CamScanner

آج کی کتابیں

افضال احمد سید

چھینی ہوئی تاریخ (نظمیں)

(دستیاب نہیں ہے)

خیمۂ سیاہ (غزلیں)

قیمت: چالیس روپے

دو زبانوں میں سزائے موت (نظمیں)

قیمت: ساٹھ روپے

ذی شان ساحل

چڑیوں کا شور (نظمیں)

قیمت: چالیس روپے

کہر آلود آسمان کے ستارے (نظمیں)

قیمت: ساٹھ روپے

کراچی اور دوسری نظمیں

قیمت: سو روپے

ضمیر نیازی

صحافت پابندِ سلاسل

انگریزی کتاب The Press in Chains کا اردو ترجمہ

قیمت: سو روپے

محمد عمر میمن

گم شدہ خطوط

اور دیگر تراجم

قیمت: اسی روپے

Scanned with CamScanner

گابریئل گارسیا مارکیز

منتخب تحریریں

("آج"، شمارہ ۷: بہار ۱۹۹۱، کتاب کی صورت میں)

لاطینی امریکا کے ملک کولمبیا سے تعلق رکھنے والے نوبیل انعام یافتہ ادیب
کی تحریروں کا ایک جامع انتخاب

دو مکمل ناول
"کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" اور "ایک پیش گفتہ موت کی روداد"
تیرہ منتخب کہانیاں
دو ناولوں "تنہائی کے سو سال" اور "وبا کے دنوں میں محبت" کے منتخب ابواب
مارکیز کی نوبیل انعام پیش کیے جانے کے موقعے کی تقریر اور ایک اہم مضمون
"کولمبیا کا مستقبل"
مارکیز کے فن پر دو مغربی نقادوں کے مضامین
اپنی زندگی، فن اور خیالات پر مارکیز کی ایک طویل گفتگو
مارکیز کی شخصیت اور حالاتِ زندگی کے بارے میں
ان کے ایک ہم وطن دوست ادیب کی ایک طویل تحریر

قیمت: دو سو روپے

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

فہمیدہ ریاض — اختر حمید خاں — آصف فرخی

محمد حنیف — زینت حسام — بنجمن انتھونی

شریف سوز — لیاقت منوّر — بیکسٹر بھٹی

نسرین اسٹیفن — آصف شہباز — محبوب جان

تسنیم صدیقی — کینتھ فرنانڈیز — یان فانڈرلِنڈن

اکبر زیدی — مارک ٹلی — عارف حسن

قیمت ۱۰۰ روپے

آج کی کتابیں
اے ۱۶، سفاری ہائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

Scanned with CamScanner